

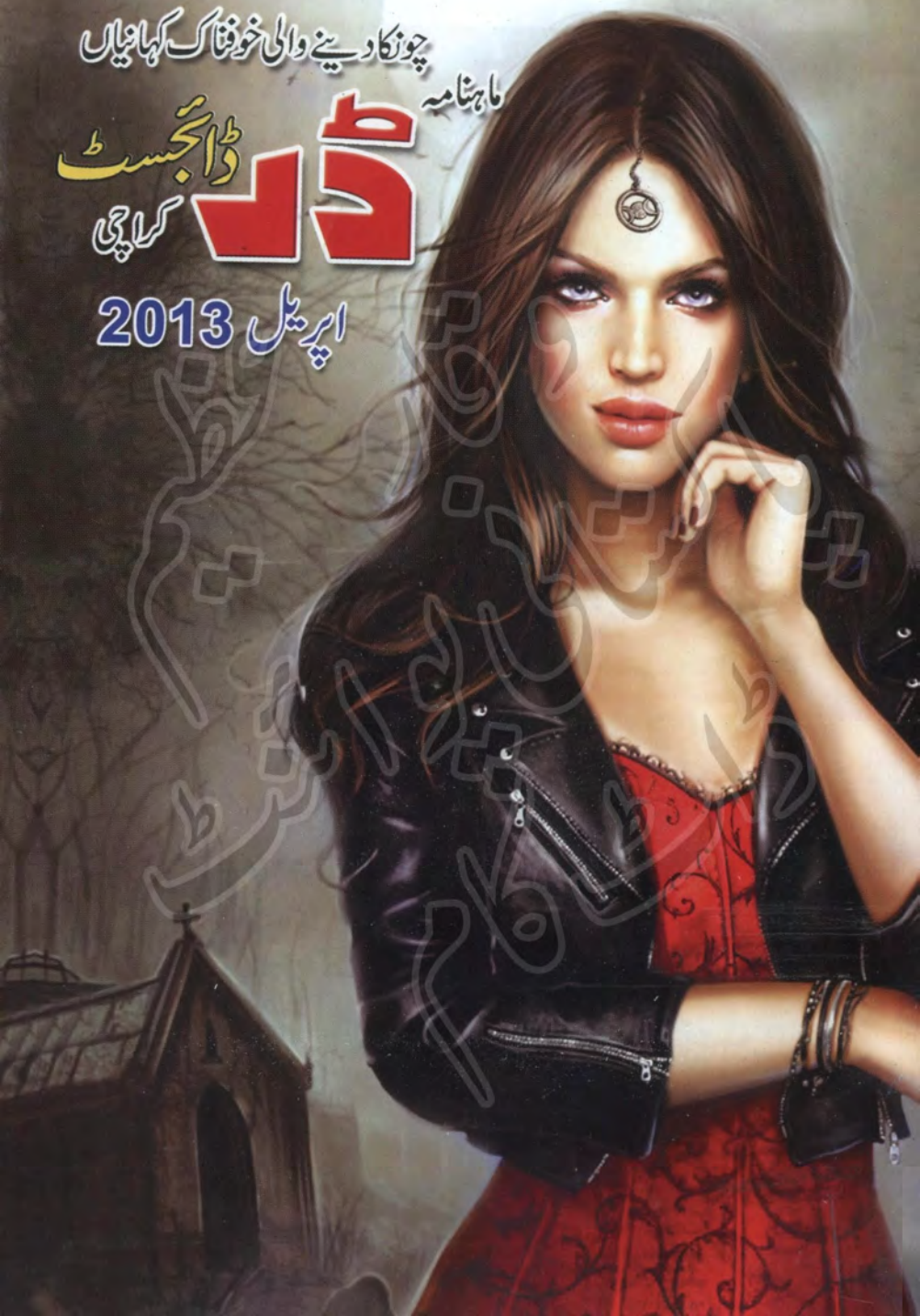
چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

اپریل 2013





## ڈاڑی

شاہکار کہانیوں کے حلائی لوگوں کے لئے ایک بہت ہی فطریہ اور دل موہ لینے والی کہانی

## جناتی دنیا

دو اورانی مخلوق کی لرزاوے والی خوفناک اور ڈراؤنی ناقابل یقین..... خونی روداد

## خوبصورت

ایک ماورائی مخلوق کی گوش اور فطریہ دیدہ دلیری جو کہ پڑھنے والوں کو انجمن میں ڈل دیتی

## خونی عمل

کیا یہ حقیقت ہے کہ چادور چڑھ کر بولتا ہے۔ اس حقیقت سے پردہ اٹھائی ایک انہونی کہانی

## خاموش موت

خود غرضی اور مفاد پرستی کی روٹنے کھڑے کرتی بہت ہی عبرتناک اور تجرہ انگیز کہانی

## رولو کا

وہ وقتی پرہیزگار قلم کار کا کہتا ہے اس کی حیرت انگیز اور چلبلی کشمکشیں آپ کو کھک کر دیں گی

## انوکھا کیس

عشق و محبت میں سرشار ایک ماورائی مخلوق کی عجیب و غریب اور گوش روداد ایک شاہکار کہانی

## خونی اسپتال

خوفناک و ہشت تاک اور دل کو دہلا دینے والی رات کے اندھیرے میں جنم لیتی کہانی

## سنہری تابوت

شاہکار کہانیوں کے حلائی لوگوں کے لئے انجمن میں ذاتی حیرت انگیز اور تجرہ انگیز کہانی

## راج دلاری

صدیوں پر محیط عجیب و غریب سوچ کی حامل ناقابل فراموش..... دل کو مسوتی کہانی

## مہمان

کیا برصِ پہلے مرے ہوئے لوگوں کی رو میں اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے سرگرم رہتی ہیں

## قوس قزح

قارئین کے پیچھے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....

## مسکن

حدود سے تجاوز انسان کے لئے کبھی بھار جان لیوا ثابت ہوتا ہے، کہانی پڑھ کر قند کیجئے

## ناگ منی

خوف کے لہجے میں لپٹی خونی وادی کی طرف نحو پرہاز ذہن پرستہ طاری کرتی انوکھی کہانی

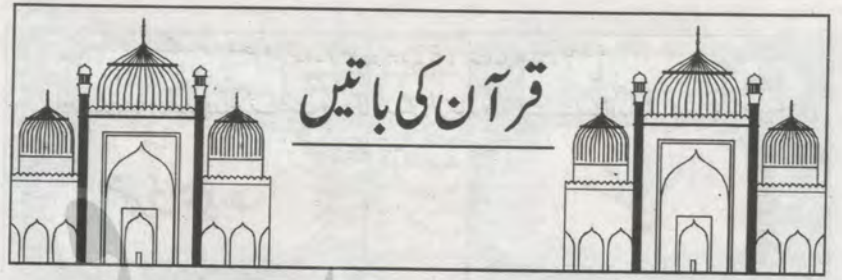
## بلیک ٹائیگر

تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو درپردہ حیرت میں ڈال دیں گے

## ما فوق الفطرت

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی اور جاندار، اشرف المخلوقات انسان پر سبقت لے سکتا ہے





## قرآن کی باتیں

☆ بہت سے اہل کتاب اپنے دل کی جلن سے یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لا چکنے کے بعد تم کو پھر کافر بنادیں، حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے تو تم معاف کر دو اور درگزر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا دوسرا حکم بھیجے۔ بے

شک اللہ ہر بات پر قادر ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 109)

☆ کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں تسلیم کی گئی ہے، اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں۔ اور ہم میں کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا کار ساز نہ سمجھے۔ اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ ہو کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل ان کے بعد اتاری ہیں اور وہ پہلے ہو چکے، تو کیا تم عقل نہیں رکھتے میں کچھ لوگ حکم اللہ پر قائم بھی ہیں جو رات کے وقت اللہ کی آیتیں پڑھتے اور اس کے آگے سجدے کرتے ہیں۔ اور اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے اور اپنے جھگڑے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے اور نیکیوں پر لپکتے ہیں اور یہی لوگ نیکوکار ہیں۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 113 سے 114)

☆ اے کتاب والو! قبل اس کے کہ ہم لوگوں کے منہوں کو بگاڑ کر ان کی پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا ان پر اس طرح لعنت کریں جس طرح پہلے والوں پر کی تھی۔ ہماری نازل فرمائی ہوئی کتاب پر جو تمہاری کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے ایمان لے آؤ۔ اور اللہ نے جو حکم فرمایا سو سمجھ لو کہ وہ چکا۔ (سورۃ نساء 4 آیت 47)

☆ کہو کہ اے اہل کتاب جب تک تم تورات اور انجیل کو اور جو اور کتابیں تمہارے رب کی طرف سے تم لوگوں پر نازل ہوئیں، ان کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں ہو سکتے اور یہ قرآن جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے اس سے ان میں سے اکثر سرکشی اور کفر اور بڑھے گا تو تم قوم کفار پر افسوس نہ کرو۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 68)

☆ اور تم اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کئے رہو تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو اور جب اٹھا کرو تو اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کیا کرو اور رات کے بعض واقعات میں بھی اور ستاروں کے غروب

ہونے کے بعد بھی اس کی حمد کیا کرو۔ (سورۃ طور 52 آیت 48 سے 49)

☆ اور زمین پر اکڑ کر (اور تن کر) مت چل کہ تو زمین کو پھاڑ تو نہیں ڈالے گا اور نہ لمبا ہو کر پہاڑوں (کی چوٹی) تک پہنچ جائے گا۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 37)

☆ اور ازراہ غرور لوگوں سے گال نہ بھلانا اور زمین میں اکڑ کر نہ چلنا۔ کہ اللہ کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں اعتدال کئے رہنا اور بولتے وقت آواز نہ بنی رکھنا۔ کیونکہ اونچی آواز گدھوں کی سی ہے اور کچھ شک نہیں کہ سب سے بری آواز گدھوں کی ہے۔ (سورۃ انبیاء 21 آیت 18 سے 19)

☆ اور بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔ (سورۃ مومنون 23 آیت 96)

☆ مومنوں تمہارے ملازم، کنیزیں اور جو بچے تم میں سے بلوغ کو نہیں پہنچے، تین دفعہ یعنی تین اوقات میں تم سے اجازت لیا کریں ایک تو نماز صبح سے پہلے اور دوسرے گرمی کی دوپہر کو جب تم کپڑے اتار دیتے ہو اور تیسرے عشاء کی نماز کے بعد تین وقت تمہارے پردے کے ہیں ان کے آگے پیچھے (یعنی دوسرے وقتوں میں) نہ تم پر کچھ گناہ ہے اور نہ ان پر کہ کام کاج کے لئے ایک دوسرے کے پاس آتے رہتے ہو۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے اور اللہ بڑا علم والا اور بڑا حکمت والا ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 58)

☆ اور اللہ کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے جاہلانہ گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔ (سورۃ فرقان 25 آیت 63)

☆ اور جب بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمہارے اعمال۔ تم کو سلام۔ ہم جاہلوں کے خواستگار نہیں ہیں۔ (سورۃ قصص 28 آیت 55)

☆ اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتا۔ تو (سخت کلامی کا) ایسے طریقے سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے۔ (سورۃ تمجیدہ 41 آیت 34)

☆ اور اگر معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بھی بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ تغابن 64 آیت 14)

☆ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 85)

☆ دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 19)

(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“، بشکر یہ شیخ بک ابجنی کراچی)



نورین اعظم راوی پنڈی سے، السلام علیکم، میری طرف سے تمام راتیں، پوری ڈرٹم اور قارئین کو میرا پورا سلام قبول ہو، اس دفعہ ڈرٹم وراثت ملا۔ قرآن کی باتیں زبردست تھیں۔ پھر خطوط میں اپنا نام دیکھ کر اتنی خوشی ملی کہ میں نہیں بتا سکتی۔ بہت شکر یہ اپنا نام دیکھ کر لکھنے کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ پہلے میں دوسرے رسائل پڑھتی تھی۔ اس وقت میرا دل کرتا تھا کہ اتنے رسالے چھپتے ہیں۔ کوئی ہمارا رسالہ بھی ہونا چاہیے اس وقت مجھے ڈر کے بارے میں پتہ نہیں تھا ایک دن یونہی مارکیٹ میں کچھ خریدے تو ڈر پر نظر پڑی بس یوں سمجھے کہ میں پاگل ہو گئی اور میں ہمارے کہانیوں کی دیوانی جھٹ پٹ خرید لیا۔ بس اس وقت سے ڈر کی مستقل قاری ہوں اب تو ڈر میں جلو خط میں بھی میرا نام چھپتا تو بے میرے لئے یہی بہت اہم از کی بات ہے۔ اب بات کرتے ہیں کہانیوں کی، سب بہت اچھی تھیں، سب راتیں بہت محنت کرتے ہیں، جن کی محنت کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ پلیز اب آپ میری کہانی شائع کر دیں جو ”لو کھا تعلق“ بھی تھی۔ اس کا ہی بتا دیں کیسی تھی۔ کہانی شائع ہو جائے گی تو سمجھو میری بہت بڑی خواہش پوری ہو جائے گی۔ اس دن یہ نہیں میری خوشی کا عالم کیا ہوگا۔ پورا فروری کا مہینہ میں نے یہ نہیں کس طرح گزارا ہے یہ میں جانتی ہوں پھر میری کہانی نہیں شائع ہوئی چلے کوئی بات نہیں آپ نے اگلے ماہ کا کہا ہے پلیز شائع کر دیں۔ میں نے ایک اور کہانی شروع کی ہے وہ جلد ہی آپ کو مل جائے گی۔ شکر ہے۔

☆☆ نورین صاحبہ: آپ کی کہانی انوکھا تعلق حقیقت پر مبنی ہے مگر اس قدر حقیقت ہے کہ پڑھنے والوں کے مزاج پر جو بوجھ محسوس ہوگا، بہت سی باتیں ہم محسوس کرتے ہیں مگر زبان خاموش رہتی ہے، لہذا پلیز آپ دوسری کہانی ارسال کریں، امید ہے شکر یہ کاموقع ضرور دیں گی۔

ساحل دعا بخاری بصیر پورا کا وہ سے، ڈر آج یعنی 2 مارچ کو سنہری دوپہر کو ملا سب سے پہلے لیڈر دیکھے، اپنا لیڈر دھوندا مگر..... ہم تو آخری بار ”آس“ کا دامن تھامے آپ کے در پر آئے تھے مگر یہ ”آس“ بھی کبھی کبھی کٹتا ہے ”آس“ کر دیتی ہے نا! یہ آس ہی ہوتی ہے جو باپو بیس کی اتھاہ تاریکیوں میں جگنو بن کر غمناکی رہتی ہے۔ اس کا دامن تھام کر انسان دیکھوں کے پھاڑ سر کر لیتا ہے۔ یہ واحد چیز ہے جو ”خط“ کا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ جب یہ دامن چڑھ لے تو پھر باقی کچھ نہیں رہتا۔ اور یہ ہم سے اپنی آنکھوں میں ہزاروں حسرتیں لے دامن چھڑا کر بیٹھ کے لئے رخصت ہو گئی ہے، آس کے ہالے میں لپٹ کر، امید کی خوشبو چھڑک کر خوش فہمی کے لبادے میں بیک کر کے ”دروپ“ بھیجی تھی۔ یقین تھا آپ کے معیار پر پوری اترے گی مگر..... آس کا ہالہ چاک ہو گیا، امید کا نور ہو گئی، خوش فہمی نے بیٹھ کی طرح منہ کی کھائی اور ”یقین“ کو گمان نے نکل لیا..... آپ نے اسے شائع کرنا تو دور، اس کی بات بتایا تک نہیں..... خط تک شائع نہیں کیا۔ بعض مرتبہ ہم ذرہ خاک ہو کر بھی چاند کو پانے کی تمنا کر بیٹھتے ہیں۔ عالم دیوانگی میں اسے سمجھتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یکلفت ایک ٹھوک لگتی ہے اور سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور پھر خالی آنکھوں سے سب کچھ ”ختم“ ہوتا دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر سب کچھ خالی ہو جاتا ہے۔ خالی دل، خالی دامن، خالی روح اور خالی آنکھیں..... مگر خالی دل میں کیسی اذیت انگڑوں پلوٹتی ہے، خالی دامن میں شکست کا کیا بوجھ ہوتا ہے، خالی روح اپنے ”خالی پن“ کس طور پہنچتی ہے اور خالی آنکھوں میں کرب کا کیا میل رواں ہوتا ہے، یہ کوئی بھی نہیں جان پاتا۔ زمین قدموں تلے رہتی ہے، نہ سر پہ آسمان اور نہ بس غلام میں محقق ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہ تو ہوتا ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ ”ٹھوک“ معمولی نہیں ہوتی۔ یہ ”ٹھوک“ ”تقدیر“ کی ٹھوک ہوتی ہے اور ہمیں بھی یہی ”ٹھوک“ لگی ہے۔ ویسے جب تقدیر گرانے پہ آ جائے تو منہ کے بل گرنے کے لئے کسی ٹھوک کی ضرورت نہیں رہتی..... گزشتہ دنوں ہمارے ایک اہل ”شاہ حسین بخاری“ بالکل اچانک دنیا چھوڑ گئے۔ موت برحق ہے مگر کچھ لوگ مرتے ہوئے اپنے ساتھ سب خوشیاں بھی لے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ دنیا میں صرف محبتیں بانٹنے کے لئے آتے ہیں اور وہ انہی میں سے تھے۔ اکثر لوگوں سے سنا تھا کہ فلاں شخص کا چہرہ مرنے کے بعد بھی تروتازہ تھا اور ہم سوچتے تھے کہ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ اس کا جواب ہمیں ان کی ڈیجھ پہ ملا۔ ان کا چہرہ اگلے دن بھی روشن اور مسکراتا محسوس ہوتا تھا بلکہ دوسرے روز مزید پر نور اور پر شمع ہو گیا تھا۔ زندگی کتنی مختصر ہے اور ہم اسے فضول کاموں میں ضائع کر رہے ہیں۔ اللہ ہمیں زندگی اپنے اور اپنے محبوب کے پسندیدہ طریقے کے مطابق گزارنے کی توفیق دے۔ آمین! وارث آصف کی محسوس ہوئی

ڈر میں اپنی دے! ”دروپ“ اور ہماری دیگر نگارشات ”دروپ“ کی نوکری کی نذر ہو گئی ہوں گی۔

☆☆ ساحل دعا صاحبہ: حقیقت پر مبنی خطوط نامہ ملا پڑھ کر دل افسردہ ہوا، اور ساتھ ہی ہم معذرت خواہ ہیں کہ یہ کہنے میں ہم حق بجانب ہیں کہ دروپ اور خط ہمیں ملا نہیں اور آپ نے ایک طرف طور پر بہت کچھ سوچ لیا۔ یہ تو بات یہی ہے ناں کہ ”ہم میں مشتاق اور وہ بیزار“ امید ہے آپ سنجیدگی سے غور فرمائیں کی اور شکر یہ کاموقع ضرور دیں گی۔ قارئین کی اور ہماری دعا ہے کہ آپ کے اہل حسین بخاری کو اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو ہر جیل عطا کرے۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم، آداب عرض ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ڈر ڈر آنکھت دن دو گئی رات چو گئی ترقی کرے، آمین، ماہ مارچ کا ڈر ڈر آنکھت 21 فروری کو ملا، ناٹل کچھ خاص تاثر نہ دے سکا مگر ناٹل پر موجود حسین انگشت فلوں کی دن لڑکی ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ڈر آنکھت کھولا۔ مگر اپنی کہانی کو نہ پا کر تھوڑی ناامیدی سی چھا گئی دل پر، خیر سب سے پہلے میں ایک بہت اہم بات گزارش کرنا چاہا کہ اس کی ماہ مارچ 23 تاریخ ہم سب کے لئے بہت ہی زیادہ اہم ہے۔ مگر میرے لئے یہ تاریخ سب سے زیادہ اہمیت کی حامل رہی ہے۔ کیونکہ 23 مارچ کو میری سالگرہ ہے اور میں اپنی سالگرہ میں ڈر اور تمام قارئین کو شریک کرنا چاہتی ہوں۔ سو پلیز، میرے لئے اس دن پر ڈھیر ساری دعاؤں میں ضرور یاد رکھئے۔ ڈر میں سب سے پہلے قرآن پاک کی روشن باتوں سے دل کو نوکری روشنی سے منور کیا۔ اس کے بعد خطوط پڑھے، سب دوستوں کا بہت بہت شکر یہ! خاص کر نوش خان، افشاں رمضان ہاشم، صابر رمضان، نورین اعظم، قاریہ تبسم، انوری رمضان اور تمام دوستوں کا، اپنا خط شامل دیکھ کر دل کی خوشی ہوئی، نقطہ وار تحریر میں رول کو زبردست رہی، روشا شک اپنے انجام کو پہنچا، اور خوشبو اس شیطان سے محفوظ رہی۔ سنہری تابوت ابھی رہی، ان میں ابھی مزید لکھنے میں وقت لگے گا۔ بے چین روح، شہزادہ چاند زیب عباس کی تحریر، اس بار کچھ خاص تاثر نہیں دے سکی۔ پاگل بیٹی عمران قریشی کی تحریر نے واقعی پاگل خانہ کار کا ریکاڈ تو ڈالا، بدر دھول کا مسکن صفدر شاہین کی زبردست تحریر رہی۔ سب کہانیاں بہت زبردست انوکھی و اچھوتی رہیں، قوس قرمز، غزنیوں، نقیصین بھی اچھی رہیں۔ عثمان غنی کا شعر اچھا لگا، جبکہ سنگل اسٹوریز میں نبرہن تحریر صابر رمضان کی نیلی کوٹھی رہی، ویلڈن صابر رمضان، ڈر اور خوف کہانی میں کوٹ کوٹ کر میرا تھا.....

☆☆ بلقیس صاحبہ: خلاصہ نامہ بمعہ کہانیوں کی تعریف کے ارسال کرنے کے لئے ویری ویری تھینکس، آپ کی کہانی اس ماہ شائع نہ ہو سکی، اگلے ماہ کے لئے وعدہ اور تو امید ہے کہ اگلے ماہ بھی نوازش نامہ ارسال کرنا ہوگی کی نہیں۔ Thanks۔

عصمت اقبال منگلا ڈیم سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں آپ اور ڈر کا پورا ایشاف بالکل خیریت سے ہوں گے۔ میں پچھلے چند ماہ سے ڈر کا مطالعہ کرتی ہوں۔ یہ ہم سب مگر والوں کا پسندیدہ رسالہ ہے اور دعا ہے کہ یہ اسی طرح سے اپنی پسندیدگی اور دلچسپی قائم رکھے۔ میں اس بزم میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں اور اپنی ایک غزل بھی بھیج رہی ہوں۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو انشاء اللہ آئندہ بھی شرکت کرتی رہوں گی۔ ڈر کے تمام لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کی طرف سے سلام قبول ہو۔

☆☆ عصمت صاحبہ: ڈر ڈر آنکھت میں موٹ و ٹیک، آپ اور آپ کے گھر والوں کا بہت بہت شکر ہے کہ آپ لوگوں کو ڈر ڈر آنکھت کی کہانیاں اچھی لگتی ہیں، پہلے حوصلہ افزائی ہو گئی، امید ہے آپ آئندہ بھی خط لکھ کر ڈر ڈر آنکھت کو یاد رکھیں گی۔ شکر ہے۔

ساجدہ راجا ہندواں سرگودھا سے، میری طرف سے تمام ڈر رائٹرز اور ریڈرز کو السلام علیکم، ہر ماہ ڈر کا ناٹل چونکا دینے والا ہوتا ہے جو بہت زبردست بات ہے، کہانیاں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں، قسط وار میں بلیک ناٹنگ کا کافی سے زیادہ بولنے ہو چکی ہے۔ اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ ڈر ڈر آنکھت کو ہر عمر کے لوگ پڑھتے ہیں۔ پلیز توجہ فرمائیں۔ میری کہانیاں یقیناً آپ کو مل گئی ہوں گی۔ کیا پیرل کے شمارے میں میری کوئی کہانی شامل اشاعت ہے۔ آئندہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

☆☆ ساجدہ صاحبہ: خط لکھتے، کہانیاں ارسال کرنے اور کہانیوں پر بلیک ناٹنگ کے لئے تبصرہ کے لئے تھینکس، آئندہ ماہ نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔ غنی کہانی کے ساتھ۔

فاریہ تبسم ٹھیک موٹو تصور سے، آداب! سب سے پہلے ڈر کے تمام رائٹرز قارئین اشاف کو میری طرف سے سلام دعا! ڈر مارچ 2013 کا شمارہ ملا تو دل بیوں اچھلنے لگا قرآن کی باتیں زبردست تھیں۔ خطوط میں غلام نبی انوری، نوش خان، بلقیس خان، سنبل ط، افشاں رمضان، انوری رمضان اور نورین اعظم کے خطوط زبردست تھے۔ ویری گڈ کہانیوں میں رول کوک میں روشا شک کا خاتمہ ٹھیک



ہوا، سنہری تابوت اور بلیک ٹائگر بھی زبردست تھیں۔ پاگل بیتی ایک منفرد کہانی تھی۔ بے چین روح، بدروحوں کا مسکن، آسیب، نیلی کوشی، موہلی کا کرشمہ اور قوم جنتا ہولناک کہانیاں تھیں۔ قوس قزح میں افشان رمضان، انوری رمضان، انصی رباب، غلام نبی نور، نوشین خان اور عاصمہ رمضان کے کلام دل کو مومہ لینے والے تھے۔ ویری گلد۔ امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی ہمارے خط کو جگہ دی جائے گی۔ اللہ حافظ۔

☆ فارسیہ صاحبہ: آپ کا بہت بہت شکریہ کہ زیادہ مصروفیات کے باوجود بھی آپ ڈرڈا بجسٹ کو یاد کرنے کے لئے وقت نکال لیتی ہیں اور قیام امید ہے کہ خط بھیج کر شکر یہ کا موقع دیتی رہیں گی۔

☆ شفیق شیکسی سیالکوٹ سے، السلام علیکم، خیریت مطلوب ہے۔ ”ڈرڈا“ کا مطالعہ کیا، اسے بہت بہتر اور اچھا پایا ہے۔ ”ڈرڈا“ کا معیار، مواد، کاغذ اور حوصلہ افزائی کا طریقہ بہت ہی اچھا۔ ”ڈرڈا“ بجسٹ کے لئے بالکل تازہ کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ ”ڈرڈا“ کے لئے یہ ”جو کہانی“ میں نے ارسال کی ہے، یہ بے حد دلچسپ، ڈراور سہنس بھی اس میں شامل ہے، ڈرڈا، تجس، خوف کو اس میں بہتر مواد کے ساتھ پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے میری یہ کاوش ضرور پسند آئے گی۔ اور امید ہے کہ ضرور حوصلہ افزائی ہوگی۔ ڈرڈا کے تمام لکھاری بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ سب کے لئے بہت سی خیر، کی دعا میں۔ سوئے کراچی کے لئے بہت سی دعا میں۔

☆ شفیق صاحبہ: ڈرڈا بجسٹ میں خوش آمدید، شاعری شامل اشاعت ہے، کہانی کے لئے اچھی امید رکھیں، امید ہے آئندہ ماہ بھی ڈرڈا محفل میں شامل ہونا بھولیں گی نہیں۔ Thanks۔

☆ مریم ماہ منیر لاہور سے، السلام علیکم، نیک تمناؤں کے ساتھ یہ امید لئے کہ ڈرڈا بجسٹ کا تمام اشاف اپنے لکھاری اور قاری سمیت خیریت سے ہوگا اور مارچ کے شمارے کی تیاری میں زور و شور سے لگا ہوگا۔ ٹائٹل انفرادیت لئے ہوئے فیروز کی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ عابد علی کا انتخاب ”خلا سے واپسی“ بہت اچھا رہا۔ جادو کرنے کا کافی عطراری کئے رکھا۔ سنہری تابوت کی قسط نے ہمیشہ کی طرح اپنے حصار میں شروع سے آخر تک جکڑے رکھا۔ بہرہ وران ایس حبیب خان کی اچھی کاوش رہی۔ ”کلون“ کا انداز تحریر دل کو بھایا۔ احسان حری ”خونی پاؤں“ لا جواب تھی۔ شاعری میں شرف الدین نیلانی، عثمان غنی، منیر احمد ساغر، واید گینوی کا کلام اثر انگیز تھا۔ میرے کلام کی اشاعت پر شکریہ، اس کے ساتھ اگلے ماہ تک کے لئے اجازت، ڈرڈا ترقی کے لئے دعا گو۔

☆ مہریم صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks۔ غزل شامل اشاعت ہے اور یہ بھی امید ہے کہ آپ آئندہ ماہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرنا بھولیں گی نہیں۔

☆ ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ رواں کا شمارہ سامنے ہے۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ آرٹیکل لگانے کا شکریہ، ہماری ”راج دلاری“ آپ کے پاس ہے پلیز دیکھئے گا۔ مزید Ad میٹر میں۔ شعلے کی موت، زندگی اور موت، جھ، ارسال خدمت ہے، پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں، آپ کو اور دیگر اشاف اور ”ڈرڈا بجسٹ“ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رانٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دو یورز کو دعا سلام۔

☆ امتیاز صاحبہ: نیک تمناؤں کے ساتھ ویری ویری شکس، آپ کی والہانہ چاہت ڈرڈا بجسٹ سے قابل تحسین ہے، آپ کی صحت یابی کے لئے دعا گو۔ آپ کی راج دلاری ہمارے پاس ہے اب منظر عام پر آگئی۔

☆ نائیک محمد اعظم رضوی کھاریاں کینٹ سے، سب سے پہلے تو میری طرف سے ادارہ ڈرڈا بجسٹ کے تمام در و در کو السلام علیکم قبول ہو۔ فروری 2013 کا شمارہ جلدی مل گیا۔ سرورق بہت ہی خوب صورت تھا۔ اس کے بعد قرآن کی باتیں پڑھیں، ولی سکون ملا اور سب کہانیوں میں پہلے روٹو کا پڑھی بہت شاندار جاری ہے۔ اس کے علاوہ دل کے رشتے، قاتل، بہرہ وران، زندگی، خونی پاؤں، دعا کی طاقت، موت کا چھپا سب بہت اچھی رہی، برائے مہربانی Request کرتا ہوں کہ قسط وار کہانی زیادہ شائع کیا کریں، کیوں کہ ایک تو نام نہیں ملتا اور جب نام ملے تو آگے 18 صفحات پر مشتمل قسط وار کہانی ختم ہوتی ہے پھر میں بھرا انتظار، اف اللہ کہاں جائیں؟

☆ عظیم صاحبہ: ڈرڈا بجسٹ میں ویکم، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، آئندہ ماہ بھی آپ کے تجزیہ کا انتظار ہے گا اور امید ہے آپ ضرور شکریہ کا موقع دیں گے۔

☆ باسط مظہر حامد چنگی، راولپنڈی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈرڈا اشاف خیر و عافیت سے ہوگا، مارچ کا شمارہ ہاتھ میں ہے، خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے بہتر رہے۔ خطوط میں اپنا خط نہ پا کر دکھ ہوا، پچھلے ماہ دودھ دار ٹیکل ارسال کئے تھے۔ مگر دونوں میں سے ایک بھی شامل اشاعت نہ تھا۔ شائستہ حری کہانی ”آسیب“ بہت پسند آئی۔ ان کی کہانی فروری کے شمارے میں ”قاتل“ بھی کافی پسند آئی تھی۔ قسط وار کہانیاں زبردست جاری ہیں۔ باقی تمام کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ شاعری تقریباً ٹھیک ہی تھی۔ کچھ کہ نہیں سکتا کیونکہ شاعری کا بس جائزہ ہی لیا ہے۔ ایڈیٹر صاحب آپ نے جنوری کے شمارے میں خط کے جواب میں کہا تھا کہ آپ کی سبھی ہوئی کہانی شائع ہوگی مگر ابھی تک نہ شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ میں نے پچھلے ماہ ایک اور کہانی ”پریت آتما“ بھیجی تھی وہ کب شائع ہوگی۔ اس کے علاوہ خط کے ہمراہ میں ایک اور کہانی ”سمندری سفر“ بھیج رہا ہوں۔ ساتھ غزل، شعر اور آرٹیکل بھی ہیں۔ میں مسلسل تین ماہ سے آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ مجھے ”ماہ نومبر 2012“ کا شمارہ ارسال کیا جائے مگر آپ جواب نہیں دے رہے اور وجہ میں اپنے پچھلے خطوط میں لکھتا رہا ہوں امید کرتا ہوں اس بار آپ جواب دیں گے، اب آئندہ ماہ تک کے لئے اجازت دیں۔ خدا حافظ۔

☆ باسط صاحبہ: قسط وار کہانیوں کے علاوہ دیگر کہانیاں لائن میں لگی ہوئی ہیں، آپ گھر آئیں نہیں آپ کی کہانی بھی شائع ہوگی، سمندری سفر مل گئی ہے نومبر کا شمارہ حاضر اشاف نہیں، اس لئے معذرت، آئندہ ماہ بھی نیک دعاؤں کا انتظار رہے گا۔

☆ فاقہ بشیر لاہور سے، ڈرڈا بجسٹ کے سارے اشاف کو اور آپ کو براہ بہت بہت سلام، معذرت کہ میں اختراع محفل سے دور رہا۔ مصروفیات بڑھ گئی تھیں مگر مطالعہ جاری تھا۔ قلبی رشتہ بنا ہے ڈرڈا بجسٹ سے، میں پہلے بھی لکھتا رہا ہوں اس بار بھی ایک کہانی ارسال کر رہا ہوں، امید ہے قریبی شمارے میں شامل اشاعت کر کے شکریہ کا موقع دیں گے خونی اسپتال کے نام سے ہے۔

☆ فاقہ صاحبہ: عوام کو درد زمرہ کے حالات میں ناقابل حد تک الجھایا گیا ہے جو تو میں اپنا لوہا منواتی ہیں وہ خوش و خرم رہتی ہیں اور جو دوسروں پر انحصار کرتی ہیں وہ دال روٹی کے چکر میں سرگرداں ہی رہتی ہیں، جیسے کہ ہم عوام، آج کل ہر شخص مصروف ترین وقت گزار رہا ہے، امید ہے اب آپ ہر ماہ شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔

☆ محسن علی جنت ساہیوال سے، جناب میں اپنی دوسری کاوش یعنی کہانی ”وہا پاز کی محبت اور دنیا بھیج رہا ہوں امید ہے آپ کو پسند آئے گی اور حوصلہ افزائی کریں گے، کہانی شائع ہونے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اب بات کریں مارچ 2013 کے شمارے کی تو یہ شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ تمام کہانیاں بیسٹ تھیں مگر جو مجھے اچھی لگیں ان میں روٹو کا، بلیک ٹائگر، پاگل بیتی اور بد دعا میں تمام رانٹرز اچھا لکھ رہے ہیں۔ اس مرتبہ غزل میں بھی اچھی تھیں۔ قرآن کی باتیں والا صفر میرا پسندیدہ صفحہ ہے۔ وہا کا قاعدہ شروع میں پڑھتا ہوں اور اس پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ اجازت چاہوں گا اللہ پاک ڈرڈا بجسٹ کو دن رات چوکی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔ بشرط زندگی اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

☆ حیدر صاحبہ: کہانی مل گئی ہے مگر مصروفیات کی بنا پر ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو عنقریب شائع ہوگی۔ اپنا خیال رکھئے گا اور ساتھ میں ڈرڈا بجسٹ میں شمولیت بھولنے کا نہیں۔

☆ پروفیسر واجد نگینوی کراچی سے، ماہ مارچ ڈرڈا بجسٹ کا شمارہ مارچ 2013، قارئین کے ہاتھوں کی زینت بن چکا ہے، اس میں شائع ہونے والی دلچسپ حیرت انگیز نثری خیر کہانیاں قارئین کے دن اور رات کا چین حرام کر دیتی ہیں۔ ہر ماہ ایک نیا ج دج کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ غزلیں، پچھلے نہایت اعلیٰ معیاری اور نئی سوچ کا پیغام دیتے ہیں۔ یہ ہمیں سروری اور گری کا سنگم ہوتا ہے۔

☆ واجد صاحبہ: ویری ویری شکس، اپنی رائے اور خط بھیجنے کے لئے، امید ہے آئندہ ماہ بھی اپنا قلبی لگاؤ ارسال کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

☆ غلام نبی فوری کھڈیاں خاص سے، ڈرڈا شمارہ مارچ 2013 کا بہت لیٹ ملا۔ سرورق پر پراسرار و شہرہ کی تصویر کش تھی۔ قرآن کی باتیں دل افروز تھیں، خطوط کی محفل میں پہلے اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے روٹو کا میں روٹو کا حال پڑھا۔ گلد، سنہری تابوت اور بلیک ٹائگر سہرہ تھیں، اس کے بعد آسیب شائستہ حری، ویری گلد، نیلی کوشی مبارک رمضان بہت خوب تھی۔ پاگل بیتی، عمران قریشی زبردست۔ ڈیوٹھ ہاؤس منفرد تھی۔ بے چین روح، گمشدہ جزیرہ اور خون جگر بھی خوب صورت تھیں۔ میں ایک حد کہانی بنام ”خون کا دنیا“ بھیج رہا ہوں امید ہے کہ پسند آئے گی۔



☆ غلام نبی صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، بلکہ بہت بہت شکریہ، آپ کے خلوص نامہ کا اگلے ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

☆ شرف الدین جیلانی: ٹڈوالہ یار سے، ٹھنڈی اور گرم ہواؤں میں رسالے کے لطف اندوز ہو رہے ہیں، ہر کہانی کو گہری نظر سے پرکھ رہے ہیں۔ شائد سحر..... ساجدہ راجا بہت مختصر کہانی لکھ رہی ہیں..... جبکہ ہم پڑھنے والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کم از کم دس بارہ صفحات کی کہانی ہونی چاہئے۔ راحیلہ مشتاق کی قسط دار کہانی کا انتظار آج کل ڈر سے غائب ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی امان میں رکھے۔ کچھ تھک رہے ہیں ہم اتفاق کرتے ہیں، رائٹر صاحبان قلموں سے ملتی جلتی کہانیاں نہ لکھیں۔

☆ شرف الدین صاحب: آپ اپنے مہتمم ٹیڑھ ایک ہی لفظ میں ارسال کر دیا کریں۔ ہم آپ کی چاہت و خلوص کی قدر کرتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام قلمی رشتوں پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ (آمین)۔

☆ اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں بسم اللہ پر ماہ مارچ کا ڈرڈائجٹ دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ پرچے نے پہلے سے کافی ترقی کی ہے اور سورت بھی اب معیاری اور خوب صورت ہے۔ تمام تحریریں پہلے سے زیادہ بہتر ہیں یہ ایک دلکش اور معیاری جریہ ہے یاد آوری کا بہت بہت شکریہ! غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں، آپ کا خلوص اور محبت ہی ہمارے لئے کافی ہے ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر پرچے کا بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ موسم بھی آہستہ آہستہ بدل رہا ہے اور کاروباری حالات بھی آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہے ہیں، مصروفیات میں سے وقت نکال کر یہ خط تحریر کر رہا ہوں تمام عنوان مثلاً قرآن کی باتیں، خطوط، قوس غزلیں اور دیگر کہانیاں انگوٹھی میں گھیننے کی طرح فٹ ہیں۔ آئیے، موت کا گھر، بدعا اچھی کہانیاں تھیں ان قلم کاروں کو میری طرف سے مبارکباد، چند غزل ارسال خدمت ہے۔ قریبی شمارے میں جگہ دے دیں۔ ہر لمحہ ہمیں آپ کی دعاؤں کی ضرورت رہتی ہے خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں، زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

☆ جاوید صاحب: خلوص نامہ ارسال کرنے کے لئے شکریہ، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے تمام اہل خانہ پر اپنا کرم و کرم کرے، کاروبار میں ترقی اور خوشیوں سے نوازے، آئندہ ماہ پھر ملیں گے قلبی لگاؤ کے ساتھ اللہ حافظ۔

☆ قدیر رانا راولپنڈی سے، آداب عرض: آپ کی خیریت کا طالب ہوں، دو غزلیں ارسال خدمت ہیں، کسی بھی آنے والی اشاعت میں جگہ دیکر مشکور فرمائیں۔ ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆ قدیر صاحب: غزل شامل اشاعت ہے۔ آپ کی خوشی کیلئے دعا گو ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید خوشیوں سے نوازے، غزل بھیجیں گے شکریہ۔

☆ بشیر احمد بیٹھی فوجی ہسپتال بہاولپور سے، السلام علیکم جناب! مارچ 2013ء کے شمارے کی تمام کہانیاں خوب ہیں، پہلی کہانی پاگل بیتی نرالی انداز میں لکھی گئی، دیکھی ادب کی ایک شاہکار کہانی ہے۔ فرار، موکل کا کرشمہ، گمشدہ جزیہ، خون، مگر، موت کا گھر، سنہری بھوت، آئیے، نیلی کوٹھی، بدردحوں کا مسکن، قوم جنات، بدعائے جینین روح یہ تمام کہانیاں اپنے عنوان کی طرح حسین احتجاج کا پیکر رہیں۔ ڈیڑھ ماہ اس عنوان سے پہلے بھی ایک ایک کہانی نظر سے گزر چکی ہے۔ ڈر کے لئے پڑھ دو روز دعا گو ہوں۔

☆ بشیر صاحب: آپ کی یادداشت قابل دید اور قابل تحسین ہے۔ قلبی لگاؤ سے تجزیکار آئندہ ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا شکریہ۔

☆ عثمان صاحب: آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ ہر ماہ اپنی کاوش ارسال کرتے ہیں، پچھلے ماہ آپ کا خط پروف ریڈنگ کی غلطی کی وجہ سے رہ گیا، سو معذرت، کہانی اگلے ماہ متوقع ہے، امید ہے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجا بھولیں گے نہیں۔ Thanks-

☆ احسان سحر زادہ خیال نوالہ میا نوالی سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں ڈر کے پڑھنے والے اور ڈر کو تخلیق کرنے والے خیریت سے ہوں گے اور بات آگے بڑھانے سے پہلے ایک خاص بات آپ سب سے شیئر کرتا ہوں اور کچھ عرصہ پہلے مجھے کالج میں ایک دوست نے مشورہ دیا تھا کہ احسان میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ بنا لکھیں۔ اس طرز پر کہ جو آج تک بہت کم لکھا گیا ہو سو فیصد حقیقت پر مبنی بھی ہو اور آج کل کے دور کی عکاسی بھی کرتا ہو۔ یہ جنوں بھوتوں والے قصے لکھنا کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس دن سے میں نے سوچنا شروع کیا کہ ایسا کیا ہو جس میں نیا نپا لے۔ جو پڑھنے والوں کو نہ صرف چونکا دینے بلکہ ان کی آنکھیں بھی کھول دے اور اس حقیقت کو وہ مان بھی لیں۔ ایسا بلاٹ تخلیق کروں جو بین آموز اور حقیقت پر مبنی ہو، تو ایک ایسا ہی خیال اور پلاٹ میرے ذہن میں آئی گیا جس پر میں نے کافی سخت سخت کی ہے، پڑھنے والوں کے لئے جو ایک ہی موضوع پر پڑھ پڑھ کر بور ہو رہے ہیں۔ پچھلے ماہ جو میں نے آپ کو بحث کے موضوع میں اسٹوری لکھی تھی وہ تو آپ نے تلف کر دی تھی مجھے صدمہ ہے کہ کیا محبت کا کوئی موضوع نہیں۔ خیر یہ تو بعد میں بات ہوگی، اس دفعہ جو اسٹوری بھیج رہا ہوں اسے جلد از جلد قریبی شمارے میں جگہ عنایت فرمائیں۔ آپ کی نوازش ہوگی۔ اللہ پاک ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

☆ احسان صاحب: کوئی کہانی تلف نہیں ہوتی، موقع مناسب کو مد نظر رکھتے ہوئے کہانی شائع ضرور ہوتی ہے۔ امید ہے قلبی لگاؤ کے ساتھ آپ آئندہ بھی نئی سوچ کو قارئین کی خدمت کے لئے ارسال کرتے رہیں گے۔ Thanks-

☆ عامر ملک راولپنڈی سے، آداب! اسٹیک اور سلامتی کی دعائیں..... آپ سب اور قارئین کے نام مارچ کا "ڈرڈائجٹ" شائع اور سورت اور عمدہ تحریروں سے مزین ہے..... اتنا اچھا شمارہ نکالنے پر مبارکباد قبول کریں میری تحریر کی اشاعت کا شکریہ۔ ایک تحریر ارسال کر رہا ہوں..... اگلے ماہ دو تحریریں ارسال کر دوں گا کیونکہ گزشتہ ہفتے میری نانی صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ادھر مصروف رہا ہوں۔ تمام ایشاف کو آداب و سلام۔

☆ عامر صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی نانی کی مغفرت فرما کر اپنی رحمت کے فضل جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے اور خوشیوں سے ہمکنار کرے۔ کہانی بہت لیت موصول ہوئی، لہذا اشاعت سے وہ گئی۔ معذرت مزید یہ کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks-

☆ محمد کامران حیدر آباد سے، السلام علیکم! ماہنامہ ڈرڈائجٹ مارچ کا شمارہ میرے سامنے ہے، میں نے کچھ کہانیاں پڑھ لی ہیں جو کہ میری خواہش کے عین مطابق ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو کافی عرصہ سے پاکستان میں بھی مختلف چینلوں پر ہارڈ راسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جا رہے ہیں۔ ورنہ پہلے صرف چند انٹریں چینلوں پر ہی ہارڈ راسے دکھائے جاتے تھے۔ شروع میں ایک دو ڈرڈائجٹ میں ہارڈ کہانیاں چھتی تھیں مگر اب تو ہر ڈرڈائجٹ اپنے شمارے میں ایک ہارڈ کہانی ضرور شائع کرتا ہے، ہارڈ کہانیوں کی ڈیمانڈ سب سے بڑا ثبوت بنی ہے جہاں تک میرا اپنا خیال ہے کہ ڈرڈائجٹ پاکستان کا وہ واحد ڈرڈائجٹ ہے جو پچھلے نوے فیصد صرف ہارڈ کہانیاں چھاپ رہا ہے اور اس سے ہارڈ کہانیاں پڑھنے والوں کی دل کی تسکین ہو رہی ہے۔ میں کوئی دو سال سے ڈرڈائجٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں مگر فرسٹ ٹائم خط ارسال کر رہا ہوں، وجہ یہ کہ اب ڈرڈائجٹ کی مشہور و معروف کہانی "رولوکا" جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا، یہ ایسی کہانی ہے جو کہ اپنے پڑھنے والوں کو جکڑ رکھا ہے اس کی ہر قسط میں ایک نیا نپا، اچھوتے طریقے سے نظر آتا ہے، کوئی بھی قسط اپنے سابقہ قسط سے ملتی جلتی نہیں بلکہ ہر ماہ نیا واقعہ قاری کو پڑھنے کے لئے ملتا ہے، اس کے علاوہ سنہری تابوت ہر قسط میں الجھن کا شکار نظر آتی ہے اور پھر بلیک ٹائیگر جس کے لئے صرف اتنا کہوں گا کہ بس چل رہی ہے۔ دیے مجموعی طور پر ڈر سے منسلک تمام رائٹرز خوب سے خوب تر لکھ رہے ہیں۔ ان لوگوں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میری دعا ہے کہ ڈرڈائجٹ باقاعدہ باقاعدہ حاصل کرے، دن دگنی رات چوٹی، اگر میرے خط کی حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ ماہ بھی اپنی رائے بھیجیں گی بہت کی بہت کروں گا ورنہ.....

☆ کامران صاحب: ڈرڈائجٹ میں موسٹ ویکم، طے حوصلہ افزائی ہو گئی اور اب امید ہے کہ آپ آئندہ ماہ بھی اپنی رائے بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ Thanks-



ایک روح کا عجیب و غریب طریقہ اپنے قاتل سے بدلہ لینے کا، ایسا انوکھا طریقہ کہ کوئی اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ قاتل واردات پر واردات کرتا رہتا تھا اور پھر جب وہ روح سامنے آئی تو.....

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ایک بہت ہی دلچسپ اور دل موہ لینے والی کہانی

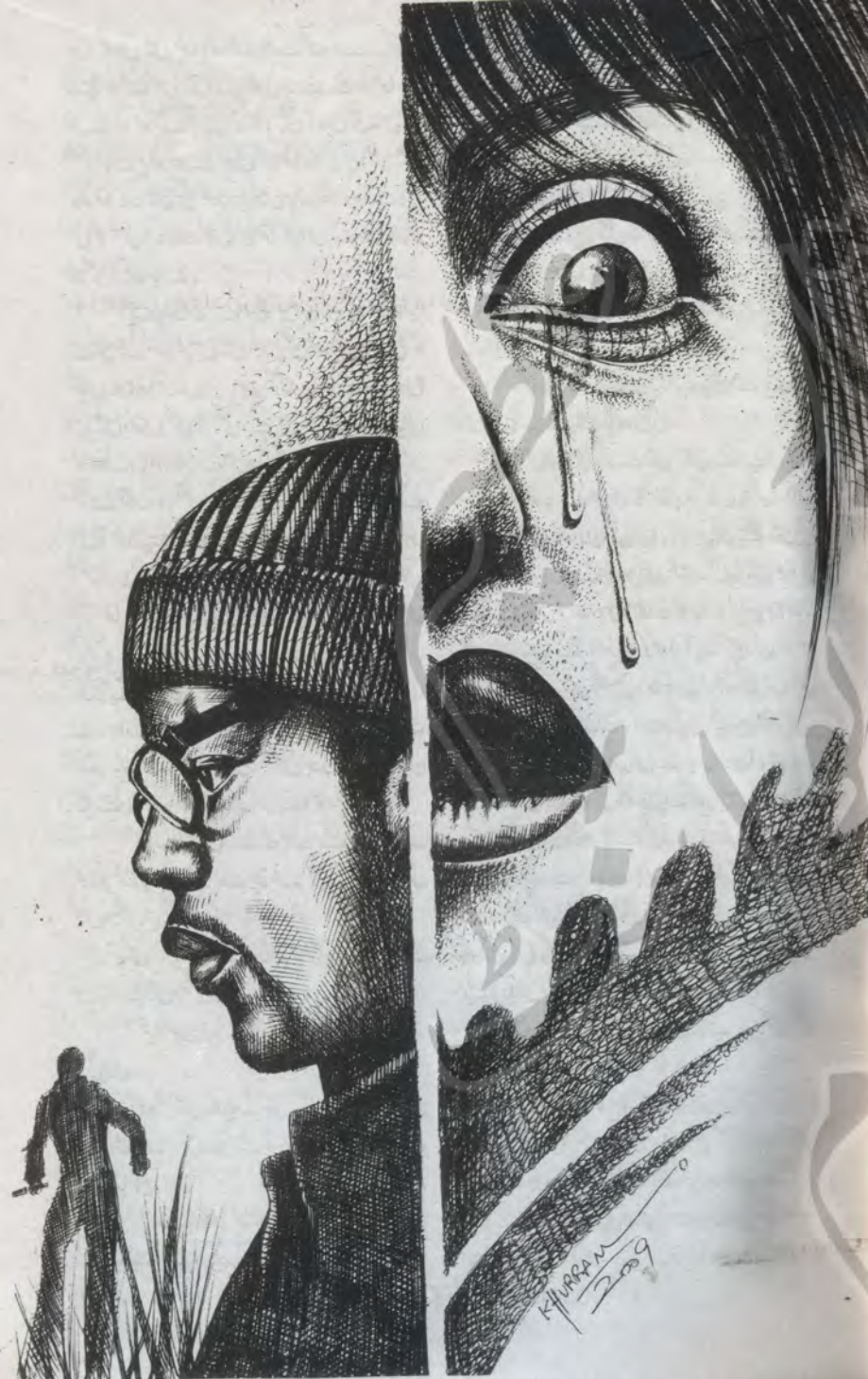
**ڈائری** لکھنے کا شوق مجھے ہمیشہ سے رہا ہے، میرا روزانہ کا معمول ہے کہ اپنی زندگی کے شب و روز اپنی پریسل ڈائری میں لکھا کرتا ہوں تب جا کے کہیں مجھے نیند آتی ہے ورنہ تو ایسا لگتا ہے کہ نیند کی دیوی مجھ سے روٹھ گئی ہے گویا کہ ڈائری لکھنا میرے لئے نیند کی گولی سے مترادف ہے۔ اپنے حالات کا احاطہ کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ پر مسرت واقعات، دل بہار زندگی کے حسین شب و روز، دوست احباب کی کرم نوازیاں، محبتوں کے صلے، وفاؤں کی داستان، اپنے خیالات کا مخور، جو روزمرہ زندگی کے ساتھ بچ ہیں، انہیں قلم کی زباں دے کر صفحہ قرطاس پر بکھیرتا ہوں یہ سب میرا شوق ہے۔

آج بھی میں سارا دن بازاروں میں پھرتا رہا مگر میری مطلوبہ چیز مجھے نہیں مل رہی تھی ڈائری۔ نئے سال کی آمد آمد تھی۔ جس طرح کی ڈائری مجھے چاہئے تھی اس کی تلاش میں میں سارا دن سرگرداں رہا۔ میں ناکام واپس لوٹ آیا یہی کچھ سوچ کر ہاسٹ چلا آیا، ہاسٹ پہنچا تو ایسا لگا کہ میرا بدن تھکن سے چور ہے، بوچھل قدموں کے ساتھ بستر پر دراز ہو گیا۔ شام بھی ہونے کو تھی۔ خاص بھوک کی شکایت بھی نہیں تھی اس

لئے سونے میں بھی عافیت جانی اب کھانے کا تکلف کون اٹھائے گا۔ انہی خیالوں میں مستغرق نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

مجھے ایسا لگا کہ میں سو یا نہیں بلکہ جاگ رہا ہوں۔ سامنے کھلے ہوئے دروازے پر نظر پڑی تو میں دنگ رہ گیا ایک خوبصورت سی دوشیزہ دروازے کے ساتھ ٹپک لگائے پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی ہنسی مسلسل اس کے چہرے پر رقصاں تھی۔ کئی ہی دیر وہ دروازے سے لگی مجھے دیکھتی رہی اور میں بھی آنکھیں جھپک جھپک کر اسے گھورتا رہا۔ میں اس دوشیزہ کا سواکت کرنا چاہتا تھا۔ جو ایک ناکام عاشق کے دروازے پر آن وارد ہوئی تھی اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں اٹھ بیٹھا۔ حالانکہ میرا تھکا ہوا پورا جسم اجازت نہیں دیتا تھا کہ میں اٹھ کر کسی اجنبی کا خیر مقدم کروں پھر بھی مجھے جانچ پڑتال کرنی تھی کہ وہ حین کون ہے؟

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ وہ ہرنی کی سی چال چلتی ہوئی میرے قریب آنے لگی۔ میں اپنی زندگی میں ایسی دلکش و دلچسپ اور خوبصورت دوشیزہ شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔ مٹھی اور کالی زلفیں شانوں پر پھسل رہی تھیں۔ نیلے رنگ میں ڈوبی گہری آنکھیں





اور آنکھوں میں چھایا ہوا تمار دھوٹ گناہ دے رہا تھا۔  
ریسلے ہونٹ من میں رس گھول رہے تھے، مسکراتے  
ہوئے وہ میرے قریب بڑھتی چلی آ رہی تھی اس کی  
مسکراہٹ پر فدا ہونے کو دل کرتا تھا۔ اس کی بغل میں  
کچھ تھا جسے میں صحیح طور پر دیکھ نہیں پا رہا تھا اور ویسے بھی  
اس کا حسن اجازت نہیں دیتا تھا کہ اس کے علاوہ کچھ  
اور بھی دیکھا جائے۔

ایک بات میرے لئے حیران کن تھی کہ وہ سر  
سے پیر تک سفید لباس میں ملبوس تھی اور اس پر روح کا  
گماں ہوتا تھا مگر میں ان باتوں کو نہیں مانتا کہ ایک روح  
دنیا میں واپس بھی آ سکتی ہے اس لئے اپنے خیال  
کو جھٹک دیا اور پھر اسے اس کے جسم سرایا کا بغور معائنہ  
کرنے لگا۔ وہ بالکل میرے قریب آ گئی تھی اور میرے  
پاس آ کر ایسے بیٹھ گئی کہ ہماری برسوں سے شناسائی ہو،  
مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھی بھی تیر رہی تھی۔ ایسا  
لگتا تھا کہ وہ پرانی یادیں لے کر ہمارے ماضی  
کو کریدنے لگے گی۔ وہ جس چاؤ سے میرے قریب آئی  
تھی اس سے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے برسوں سے جانتی  
ہے۔ ہماری دیرپا شناسائی ہے۔ ہم نے بہت سا وقت  
ساتھ میں گزارا ہے، میں مسلسل منہ کھولے حیران  
نسائے دیکھ رہا تھا جسے مجھے اس کے وجود پر شبہ ہو۔

”اوے!“ اس نے میرے کھلے ہوئے منہ  
کو بند کر دیا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ ”پہلے لڑکی  
نہیں دیکھی کیا۔“

میں دل میں سوچنے لگا۔ ”دیکھی تو ہے مگر اتنے  
قریب سے نہیں دیکھی۔“

”کیا سوچ رہا ہے؟“ ایک بار پھر اس کی آواز  
سنائی دی۔

”وہ!“ میں ہلکایا۔ ”یہی کہ آپ کون  
ہیں اور میرے کمرے میں.....؟“ میں نے بات  
کو ادھورا چھوڑ دیا۔

”اوے یہ چھوڑ کہ میں کون ہوں؟ تو نے آج  
مجھے دیکھ لیا نا، اب ہر روز دیکھتا رہے گا۔“ وہ ایسے بات

کرتی تھی کہ اسے ذرا بھی خوف نہ ہو کہ میں کدھر اور کس  
کے پاس ہوں۔

”کیا مطلب میں سمجھا نہیں؟“ اور سوالیہ نظروں  
سے اسے دیکھنے لگا۔

”چل چھوڑا یہ لے تجھے یہ چاہئے تھی  
ناں۔“ اس نے اپنی بغل سے ایک خوبصورت ڈائری  
میری طرف بڑھادی۔

میں نے جھٹ سے اس کے سر میں ہاتھوں  
سے ڈائری اچک لی۔

”اوے آرام سے پکڑا اب یہ تیرے پاس ہی  
رہے گی جب تک میں چاہوں گی۔“

واپسی ڈائری پکڑنے میں، میں نے بے صبری کا  
مظاہرہ کیا تھا۔ بے صبری کا مظاہرہ کیوں نا کرتا جس  
کے لئے میں سارا دن بھل ہوتا رہا، وہ مجھے تحفے میں مل  
رہی تھی، میرے لئے تو وہ ایک خزانہ تھی۔ میں جلدی  
سے اسے کھول کر اندرونی صفحات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔  
جیسے ہی میں نے ڈائری کو کھولا ایک مسکون خوشبو  
سارے کمرے میں بکھر گئی، خوشبو کی موجودگی میں اس  
حینہ کے قرب کی لذت اور بڑھ گئی۔ مجھے ایسا کہ یہ  
خوشبو ڈائری سے نہیں بلکہ اس کے بدن سے آ رہی ہے  
نور اور ڈائری کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ بالکل  
ویسی ہی تھی جیسی مجھے چاہئے تھی۔ میں نے ڈائری کو بند  
کر کے سینے سے لگایا اور اس حینہ کو شکر بھری نظروں  
سے دیکھنے لگا۔ ”شکریہ جی آپ کا، مگر آپ نے اپنے  
بارے میں کچھ بتایا نہیں؟“ اس کے بارے میں جان  
لینے کا جس ابھی بھی میرے اندر بیدار تھا۔

”اوے تیرا کام ہو گیا ناں۔ اب میرا بھی تجھے  
کام کرنا ہے۔“

”کام کیا کام؟“ میں حیران تھا۔ ”تم کہانی  
لکھتے ہوناں۔ مگر بس میری کہانی بھی لکھنی ہے۔ اب  
میں چلتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مگر تم نے اپنی کہانی تو سنائی نہیں۔“ میں نے  
اسے روکنا چاہا۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ”پتہ چل جائے  
گی۔“ وہ اتنا کہہ کر جانے ہی والی تھی۔

”آپ رہتی کہاں ہیں؟“ میں نے دوسرا سوال  
کر ڈالا اس دفعہ اس نے ناک بخون چڑھائی اور جل بھن  
کر کہا۔ ”قبرستان میں چلو گے میرے ساتھ۔“ میں  
ابھی کچھ کہہ پاتا کہ وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔

میں اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا اس کا عکس  
اندھیرے میں دھندلا ہوتا جا رہا تھا پھر میں آنکھیں مل  
کر اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر فاصلے کی دوری  
سے اندھیرا ہمارے درمیان حائل ہو گیا۔ اور مجھے ایسا لگا  
کہ وہ بھی اندھیرا کا ایک حصہ بن گئی ہو۔ آنکھوں کو ملتے  
ملتے میری آنکھ مل گئی میں اپنے بستر پر دراز ابھی بھی  
اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ جیسے کہ اسے دروازے کے  
پارہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں، میں نے اپنے ہاتھ،  
آنکھوں پر سے ہٹائے اور آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں  
کھول دیں میں بستر پر لیٹا رہا تھوڑی دیر کیلئے میں  
بھول چکا تھا کہ میں نے کیا پسند دیکھا ہے مگر اچانک ہی  
میں اٹھ بیٹھا کیونکہ رات کا دھندلا چھٹنے لگا تھا اور صبح کی  
سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ میں بستر پر بیٹھا اپنے  
گرد و نواح کا جائزہ لینے لگا کہ اچانک میری نظر نیل  
پر پڑی ڈائری پر پڑی تو میرے اوسان خطا ہو گئے، میں  
تکلی ہی دیر نیل پر پڑی ڈائری کو نکلتا رہا، میں ہمت نہیں  
کر پا رہا تھا کہ خواب کی مانند ڈائری کو اچک لوں۔ مجھے  
سب کچھ یاد آنے لگا کہ کس طرح سپنے میں وہ حینہ مجھے  
یہ ڈائری تھما گئی تھی۔

میں نے اپنے اندر ہمت جمع کی اور اپنا ہاتھ  
ڈائری کی طرف بڑھا دیا۔ ڈائری میرے ہاتھوں میں  
تھی اور اس کے بیرونی حصے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔  
ڈائری کو کھولتے ہی وہی مسکون خوشبو میری ناک سے  
نکلانی۔ مجھے اپنا پسند حقیقت لگنے لگا۔ تکلی ہی دیر  
میں ڈائری کی ورق گردانی میں لگا رہا۔ بالکل ویسی ہی  
تھی جیسی مجھے چاہئے تھی ایک بار پھر میں خود سے کہنے  
لگا۔ میں نے ڈائری کو واپس نیل پر رکھا اور بستر سے نکل

کر کھڑکی کے پاس آ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ سورج  
نئے دن کی نوید لے کر نکل پڑا تھا اور اپنی کرنیں زمین  
پر بکھیر رہا تھا ابھی تو میں سویا تھا پھر یہ اتنی جلدی رات  
کیسے بیت گئی۔ صرف ایک پسند دیکھا تھا وہ بھی پل بھر کا  
شاید، خوابوں کی دنیا آہستہ چلتی ہے انسان رات بھر  
میں ایک ہی پسند دیکھ پاتا ہے۔ اور رات گزر جاتی ہے  
انہی باتوں کو سوچتا ہوا میں دال روم چلا گیا روزمرہ کے  
معمولات سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا اور کالج کے لئے  
روانہ ہو گیا۔

ڈائری کا اسرار ابھی بھی میرے سر پر سوار تھا کہ  
کس طرح وہ میرے کمرے میں آن وارہ ہوئی تھی۔  
انہی باتوں میں الجھا میں کالج کے لئے رواں دواں تھا۔  
کالج پہنچا تو میرا دوست کاشف پہلے ہی سے میرا  
منتظر تھا۔ مجھے دیکھ کر کے میری طرف لپکا۔ ”ہلو کیسے  
ہو؟“ اس نے میری طرف آتے ہوئے کہا۔

”فائن! تم سناؤ تم کیسے ہو؟“ وہ آتے ہی مجھ  
سے بغلیں ہو گیا۔ ”آج تو بڑی اچھی پرفیومن لگا کر آئے  
ہو۔“ اس نے مجھ سے جدا ہوتے ہوئے کہا۔

شاید یہ وہی خوشبو تھی جو میرے پاس موجود  
ڈائری سے پھوٹ رہی تھی۔ ڈائری پر نظر پڑتے ہی  
نجست سے اس نے ڈائری پکڑ لی واہ!“ یہ ڈائری تو بڑی  
خوبصورت ہے کہاں سے لی ہے۔“ کاشف ڈائری  
کو نظر انداز کر کے میری طرف دیکھنے لگا۔

”کہاں سے لی تھی بازار سے اور کہاں سے۔“  
”اوہ! میں سمجھا کسی لڑکی وغیرہ نے دی ہوگی۔“

اس نے اپنی عاشقانہ طبیعت کا ثبوت پیش کیا اور ڈائری  
مجھے پکڑادی۔

”یار کینٹین چل کر چائے وائے پیتے  
ہیں۔“ اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کینٹین کی طرف لے  
جانے لگا۔ کینٹین میں آ کر ہم ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے  
اتفاقی سے دوسرے ٹیبل پر شائلہ اور ثوبیہ بیٹھی چائے پی  
رہی تھیں۔ ثوبیہ کو دیکھ کر تو کاشف آہیں بھرنے لگا۔  
اور زور زور سے دیر کو آواز دینے لگا۔ ”اوے چائے



لے آ۔“

وہ شاید ٹوبہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ دونوں نظریں جھکائے چائے پینے میں مصروف رہیں۔

”یارنیر یہ ٹوبہ بھی ناکیا بتاؤں دیکھتی بھی نہیں، کسی دن اپنا دل چیر کے دکھانا پڑے گا۔ تب جا کے یہ محبت کا یقین کرے گی۔“ یہ بات وہ بڑے سرسب ہوا کر کہہ گیا تھا اتنے میں چائے آگئی اور ہم چائے کی چسکی لینے لگے، کافی دیر تک ہم دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔

کاشف تھوڑا اداس لگنے لگا تھا۔ اور سر جھکائے میز کو گھور رہا تھا میں نے اسے دلاس دینا چاہا۔ ”میرا کبھی تو تیری زندگی میں بھی بہا آئے گی مجھے دیکھ کوئی لڑکی پیار نہیں کرتی پھر بھی خوش ہوں۔ شاید ہماری زندگی میں یہی سب کچھ لکھا ہے۔“

”نہیں! میرا اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، انکرام ہوتے ہی میں کالج چھوڑ کر چلا جاؤں گا اب اور مجھ سے سنگدلوں کی نظروں میں نہیں رہا جاتا۔“ وہ یہ بات بڑے ایڈوشنل طریقے سے کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی جھپکنے لگی تھیں اس سے پہلے کہ اسے میں دلاس دیتا میں نے خود کو روک لیا شاید وہ اپنے دل کا درد نکال باہر کرنا چاہتا تھا۔ اور میں بھی غم میں ڈوبی اس کی باتیں سننے لگا۔ ”نیر! وہ اچانک سے گویا ہوا۔

میں ہمتن گوش اسے دیکھنے لگا۔ وہ کہنے لگا ”نیر! یہ دنیا ہے یہاں سب کچھ چلتا ہے یہاں پر انسان کچھ خواب لے کر آتا ہے۔ کچھ خواہشیں ہوتی ہیں ہر انسان کی۔ نیر! میں جاگتے میں بھی خواب دیکھنے کا عادی ہوں۔ اور خیالوں کی دنیا میں بہت آگے نکل جاتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے چائے کا ایک گھونٹ پیرا اور اپنی سائڈ پر دیکھنے لگا۔ جیسے وہ مزید کچھ کہنا چاہتا ہو اور الفاظ کا چناؤ کر رہا ہو۔ دوبارہ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

”نیر! کبھی کبھی میں چاہتا ہوں ایک پیارا سا

دلہن ہو، جہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو۔ پیارا سا موسم اور خوشنما پھول آنکھوں کا مرکز بن رہے ہوں۔ ان پھولوں کے بیچ میں اور ٹوبہ ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے تنک رہے ہیں اچانک سے مجھے شرارت سوچتی ہے اور میں ایک پھول تو رکھ ٹوبہ کو مار دیتا ہوں۔ ٹوبہ بھی جواب میں مجھے ایک پھول تو ڈک مار دیتی ہے۔ یہ سلسلہ چل نکلتا ہے، پھولوں کے تبادلے ہم ایک دوسرے کو پھول مار رہے ہیں اسی اثناء میں ٹوبہ پھول توڑنے کے لئے ٹپٹی کو حرکت دیتی ہے تو گلاب بھی ساتھ آ جاتا ہے۔ پھول کے ساتھ وہ مجھے گلاب بھی مار دیتی ہے۔ تو میں خیالات کی دنیا سے باہر نکل جاتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور میں گلے والی بات پر ہنسنے لگا۔ کاشف چائے کے دوران مجھے دیکھ رہا تھا جیسے اسے میرا اپنا پسند نہ ہو۔

”تم تمہیں کیوں رہے ہو تمہیں پتہ ہے میرے پر کیا بیت رہی ہے؟“

”یار تم نے بات ہی ایسی سنائی ہے، اپنے آپ میری ہنسی نکل رہی ہے۔ آؤ کلاس روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ میں نے قدرے ہنسی روکتے ہوئے کہا، پھر ہم دونوں اٹھ کر کلاس روم کی طرف بڑھ گئے۔ تب تک شاملہ اور ٹوبہ بھی جا چکی تھیں۔ کلاس روم میں آ کر کاشف تو کتاب کھولے اس کی ورق گردانی کرنے لگا قدرے غمگین بھی تھا۔

جبکہ میں ابھی تک کاشف کے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”محبت بھی عجیب شے ہے۔ ہنسنے مسکراتے چہروں کو رلا دیتی ہے، محبت میں انسان یہ بھی بھول جاتا ہے کہ وہ خود کیا ہے، اپنے مشن سے نا آشنا ہو جاتا ہے اب کاشف کو بھی دیکھ لو۔ اچھا بھلا ہنسائے رکھتا تھا۔ آج خود بخود بنا بیٹھا ہے۔“

کاشف میرا سب سے اچھا دوست ہے میں نہیں چاہتا کہ وہ اداس ہو۔ لیکن اس وقت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ میں نے یہ عہد کر لیا کہ اسے اس کی محبت دلو کر رہوں گا۔ واپسی پر بھی کاشف

کا غمگین چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومتا رہا کسی پل مجھے آرام نہیں تھا۔ میں کچھ کر گزرتا چاہتا تھا کاشف کے لئے۔

میرا روز کا معمول تھا کہ کسی پارک یا کوئی خوبصورت جگہ میں چل قدمی کر کے دن بھر کی تھکن دور کر لیتا تھا مگر آج میں ہر چیز سے دلبرداشتہ ہو کر ہاسٹل آ پہنچا ہاسٹل آ کر میں اس ڈائری کو دیکھنے لگے میں فراموش ہی کر چکا تھا کہ کس پراسرار طریقے سے وہ میرے پاس موجود تھی۔ ڈائری کھولتے ہی وہی محور کن خوشبودی میری ناک سے نکلئی۔ میں بھی سانس لے لے کر اس خوشبو کو اپنے اندر سونے لگا میں ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگا، دیدہ زیب کاغذ اور عمدہ جلد سازی کا نمونہ تھی۔

ایک چیز میرے لئے حیران کن تھی۔ ڈائری کے ہر چرچہ کو نے میں ایک انسانی کھوپڑی اور اس پر کراس کا نشان تھا۔ جو شاید خطرے کی علامت بھی مگر یہ تصویر چند ایک صفحہ پر ہی تھی آگے کے صفحات الٹے تو بڑی حیران کن تصویر میرے سامنے تھی۔ ایک لڑکی لڑکے کو گلاب کا پھول پکڑ رہی تھی ایک دو صفحات پر یہی تصویر تھی مگر آگے چل کر منظر بدل گیا۔ دل دہلا دینے والی تصویر میری منتظر تھی میں نے دیکھا ایک لڑکی جو سفید لباس میں ملبوس ہے۔ ایک فنان کے سینے پر چڑھ کر بیٹھی ہے اس کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا ہے اس کا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند ہے۔ شاید وہ اس انسان کو مار دینا چاہتی تھی۔ کافی صفحات پر یہ تصویر نمایاں تھی تصویر بھی نہیں کہا جا سکتا بس ایک شبیہ تھی، آگے کے صفحات پر بھی بہت سی تصویریں تھیں۔ مگر وہ میرے لئے اتنی اہم نہیں تھیں۔

میں واپس صفحات پلٹنے لگا اور اس تصویر پر آ کر ٹھہر گیا جہاں وہ لڑکی لڑکے کو پھول پکڑ رہی تھی ایک بار پھر مجھے کاشف کی باتیں یاد آنے لگیں۔ یہ دنیا ہے یہاں پر سب کچھ ہوتا ہے۔ ہر انسان ڈھیر دل خواب لے کر کے اس دنیا میں آتا ہے اور ضروری نہیں کہ اس کے خواب پورے ہوں۔ حسرتیں باقی رہ جایا کرتی ہیں۔ پھولوں کی وادی ہو۔ جہاں پر میں اور ٹوبہ

ہوں۔“ یہ کاشف کی وہ باتیں تھیں جن سے میرا دل بھرا آیا تھا۔

میں اپنے دوست کے خیال کو حقیقت کا رنگ دینا چاہتا تھا اسے یادگار کے طور پر لکھ لیتا چاہتا تھا ممکن ہے یہی سب کچھ حقیقت کا روپ دھار لے۔ اور وہ سارے منظر میری ڈائری کی زینت بن جائیں۔ میں نے قلم اٹھایا اور ایک ایسی کہانی لکھنے لگا جس میں کاشف کو اس کی محبت مل جاتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو میری کہانی ہٹ کھلائے گی۔ لڑکی والا بیچ میرے سامنے تھا اور اس کی محبت کو کامیابی کا دنگ دے کر کچھ اس طرح لکھا۔

ہماری کلاس کا گروپ پکنک پر جاتا ہے اور پکنک کیلئے ہمیشہ ایسی جگہوں کا انتخاب کیا جاتا ہے، جو خوبصورت ہوں۔ جہاں پر سکون ہی سکون ہو، ہر طرف خاموشی کا راج، جہاں پر انسانوں اور گاڑیوں کا شور نا ہو، سبز علاقہ اونچی پستی پہاڑیاں، ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے باریک سے راستے جن پر چلتے سے انسان کا من خوش ہوتا ہے ہماری بس بھی ہمیں لے کر کے ایسی ہی جگہ پہنچتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں دل و دماغ کو فرحت بخش رہی تھیں۔ پرندوں کی ملی جلی آواز میں مجھے ایک ایک آواز سنائی دیتی ہے۔

کاشف ٹوبہ سے مخاطب تھا۔ ”ٹوبہ! آئی لو یو۔“ ٹوبہ نے پلٹ کر کاشف کو دیکھا۔ چلتے ہوئے اس کے قریب آئی اور ایک زوردار چھڑکاشف کے منہ پر مار دیا۔ یو یا سڑو تمہاری یہ حال! شکل دیکھی ہے اپنی، چلا ہے آئی لو یو بولنے، بات تیرے دماغ میں نہیں اترتی کیا۔ تجھے کتنی بار بولا ہے کہ اپنی منہوں شکل میرے سامنے لے کر نہ آیا کر۔ اگر آئندہ یہ حرکت کی تو دانت توڑ دوں گی تیرے۔ ٹوبہ آئی لو یو بچوں بنتا ہے سالا!“ ٹوبہ یہ سب کچھ سنا کر ایک طرف کوچل دی۔ کاشف اس کی جلی کٹی باتیں سن کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ



لے شاید رونانا چاہتا تھا مگر نہیں۔ اس نے اپنا منہ زمین کی طرف کر کے زور سے کہا۔ ”ٹوبیہ آئی لو۔“ ہاں اب وہ رونے لگا تھا۔ اس کے بلکنے کی آواز مجھے سنائی دینے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہر روز کی طرح اسے آج بھی دلاسہ دینے لگا مگر کاشف تھا کہ روئے جا رہا تھا۔

مجھے ٹوبیہ پر سخت غصہ آنے لگا۔ ”پاگل کی بچی محبت کا مطلب نہیں سمجھتی۔“

کافی دیر کاشف اسی طرح روتا رہا شاید روکر اپنا غم ہلکا کرنا چاہ رہا تھا یہی کچھ سوچ کر میں نے اسے رونے دیا اور ٹوبیہ کو برا بھلا کہنے لگا۔ اس کی سسکیاں بند ہو گئیں تو میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ لائق بچے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اسے لے کر اس طرف چل دیا۔ جہاں پر ہمارا گروپ شرارتوں میں لگن دنیا جہاں سے بے خبر تھا کہ کسی کے دل پر کیا بیتی ہے مگر ان لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو دوسروں کے لئے درد دل رکھتا تھا شام۔

میں کاشف کو لے کر آگے بڑھ رہا تھا مگر کاشف نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ اور وہیں پر ایک بڑے سے پتھر پر جا بیٹھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسی سچویشن میں آدمی تنہائی پسند بن جاتا ہے اس لئے اسے اکیلا چھوڑ کر اپنے گروپ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ شامہ اور ٹوبیہ ایک طرف کوسب سے الگ تھلگ کھڑی کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ میں سننا چاہتا تھا کہ کیا باتیں چل رہی ہیں جب میں نے غور کیا تو مجھے کاشف کا نام سنائی دیا، میں سمجھ گیا اور پھر آہستہ سے ان کے قریب ہوتا ہوا ایک پتھر سے ٹیک لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔

شامہ کچھ کہہ رہی تھی۔ ”ٹوبیہ یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔“

”کیا اچھا نہیں کیا۔“

”یہی کہ کاشف کو پھر مار کر اچھا نہیں کیا اور کتنا رسوا کر دے گی اسے۔“

”نہیں شامہ میں نے اسے رسوا نہیں کیا بلکہ وہ

مجھے رسوا کرنا چاہتا تھا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی آئی لو پو بولتا ہے اگر کوئی اور سن لیتا تو۔“

”دیکھو ٹوبیہ اس کی محبت میں سچائی ہے اس لئے وہ کسی سے بھی نہیں ڈرا اس نے سرعام کہہ ڈالا وہ بے چارہ اکب سے تمہاری راہ تک رہا ہے تمہارے منہ سے اپنے لئے دوپول سننے کے لئے بے تاب ہے۔ مگر تم ہو کہ یہ نہیں کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو، کتنی بھی بات تم نے اسے ٹھکرایا ہے۔ مگر وہ آس لے کر پھر چلا آتا ہے۔ ٹوبیہ یہ دنیا مکافات عمل ہے یہاں پر جیسا کرو گی دیا ہی پاؤ گی۔“

”اگر یہ سب تمہارے ساتھ ہوتا، تب میں تم سے پوچھوں گی۔“

”اور اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تاں تو کب سے محبت کا جواب محبت سے دے چکی ہوتی۔ دکھ ہوتا ہے تم پر، اچھے بھلے انسان کو کھوکھرا رہتی ہو۔ ایسا محبت کرنے والا تمہیں پھر نہیں ملے گا۔ کبھی کبھی مجھے افسوس سا ہونے لگتا ہے کہ میں تمہاری دوست کیوں ہوں اور تمہارے ساتھ برابر کی شریک ہوں۔“ یہ سب سنا کر شامہ ایک طرف کوچل دی مگر ٹوبیہ کو گہری سوچوں میں ڈال گئی تھی۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ٹوبیہ کے مردہ ضمیر میں جان پڑ گئی ہے وہ تنہا کھڑی اپنے ماضی کی غلطیوں کو دہرا رہی ہے اپنے کئے پر شرمندہ تھی وہ انہی سوچوں میں ڈوبی اس طرف کوچل دی جہاں پر کاشف تنہا بیٹھا تھا۔ شاید وہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہتی تھی پھر میں نے دیکھا کہ وہ کاشف کے پاس جا پہنچی ہے۔ میں ان کی باتیں تو نہیں سن سکتا تھا۔ مگر پھر بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے کئے پر کاشف سے معافی مانگ رہی ہے۔

اور ایسا ہی لگا کہ اس نے کاشف کی محبت کے آگے ہتھیار ڈال دئے ہیں۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا کیونکہ مجھے کاشف کی آواز سنائی دی تھی جو پکار پکار کر باہر نکلا تھا اور پھر میری آنکھوں نے حیران کن منظر دیکھا ٹوبیہ کاشف کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے شاید اسے سب سے الگ لے جانا

چاہتی ہے تاکہ کچھ راز و نیاز کی باتیں ہو سکیں۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ٹوبیہ نے اپنا سر کاشف کے کاندھے پر ٹکایا ہوا ہے اور وہ دونوں ایک طرف کوچا رہے تھے میں کتنی ہی دیر انہیں اس طرح دیکھتا رہا جیسے محبت اسی کا نام ہے دو لوگ ایک دوسرے میں اس طرح سما جاتے ہیں جیسے وہ ایک ہوں، میرا سن خوشی سے جھومنے لگا کیونکہ میرے دوست کاشف کو اس کی محبت مل گئی تھی۔ کاش ایسا ہی ہو یہ سب کچھ، لکھ کر ایک سرسری نظر کہانی پڑائی اور ڈائری ایک طرف کو ٹیبل پر رکھ دی خود آنکھیں بند کر کے بستر پر دراز ہو گیا اور جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اچانک سے مجھے ایسا لگا کہ ٹھک ٹھک کی آواز کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی ہے میں نے چہرے سے کبھل ہٹایا شاید دروازے پر کوئی تھا۔ اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھولنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ایک دم سے دروازہ کھل گیا یاہر وہی دوشیزہ سفید لباس میں لمبوں کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی میں کہنیوں کے بل تھوڑا اوپر کواٹھا اسے دیکھ رہا تھا وہ بغیر اجازت ہائے کرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی میں اٹھ کر بیٹھنا چاہتا تھا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے لیٹے رہنے دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اس کی نظر ٹیبل پر رکھی ڈائری پر پڑ گئی۔ آگے بڑھ کر اس نے ڈائری کو اٹھا لیا۔ اور وہ سب کچھ دھیمی آواز میں پڑھنے لگی جو میں لکھ کر سوچا تھا۔

”اوئے!“ اس نے اپنا مخصوص انداز اپنایا۔ اس کے بولنے کا اسٹائل بڑا عجیب تھا۔ کسی لڑکے کی مانند اُوئے کہہ کر مخاطب ہوتی تھی۔

”تیری یہ کہانی بہت ہو جائے گی۔ بلکہ حقیقت کا روپ دھارے گی تو فکر نہ کر میں تو بس تجھے دیکھنے آئی تھی میں نے کہا تھا تاں کہ اب ہم روز ملتے رہیں گے چل اب سو جا۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتا اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا اور پھر اچانک سے میری آنکھوں کے سامنے اندھرا چھا گیا اور میں حقیقی

معنوں میں نیند کے مزے لینے لگا۔

صبح کو میں یہ بھول چکا تھا کہ رات کو میرے ساتھ کیا بیتی ہے۔ کاج بچپنا اور اپنے دوست کاشف کو تلاش کرنے لگا، تلاش بے سار کے بعد بھی کاشف مجھے نظر نہ آیا۔ کچھ سوچ کر کے میں کینٹین کی طرف بڑھ گیا۔ اور میرا اندازہ درست نکلا کاشف کینٹین میں بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ ”میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا تھا اور تم یہاں بیٹھے ہو۔“ میں نے کاشف کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”میرا آؤ! چائے پیو!“ اس سے پہلے کہ میں بیٹھتا وہ چائے کا آرڈر دے چکا تھا۔ ”آج تم نے میرا گیٹ پر بھی انتظار نہیں کیا۔“ میں نے بیٹھے ہوئے شکایت کی۔

”نہیں پارا ایسی کوئی بات نہیں۔ بس آج کچھ طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لئے کینٹین میں چائے پینے چلا آیا۔ اور ویسے بھی میں جانتا تھا کہ تم مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ جاؤ گے۔“ اس نے عذر پیش کیا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دے پاتا چائے آ گئی۔ اور پھر ہم دونوں چائے پینے لگے۔

”میرا تمہیں کچھ پتہ چلا۔“

”کس بارے میں؟“ میں نے ٹیبل پر کہنیاں رکھتے ہوئے کہا۔

”یہی کہ ہماری کلاس کا گروپ پکنک پر جا رہا ہے۔“

”کیا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”ہاں آج صبح ٹیچر نے یہ خوشخبری سنائی ہے ویسے تم چلو گے ناں؟“ اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں اگر میرا یا کاشف جائے گا تو ضرور چلوں گا۔“ میں نے اسے خوش کرنا چاہا اور پھر ہم دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

میں کاج کے وسیع لان میں پتھر سے بنے بیچ پر بیٹھا خیالوں میں گم تھا کہ میری نظر شامہ لکھ کر پڑ گئی جو اپنی دوست کے ساتھ خوش گپوں میں مصروف تھی۔



شاملہ ایک سادہ سی لڑکی ہے اس کا معیار اور اسٹینڈرڈ دوسری لڑکیوں سے مختلف ہے۔ سائنوی سی لڑکی ہے مگر دلکشی اس کے چہرے سے عیاں ہے۔ خاص کر کسی سے گپ شپ بھی نہیں رکھتی مگر بولہائے ہر ایک کے ساتھ ہی ہے وہ ایک غریب لڑکی ہے زیادہ اونچے لوگوں میں نہیں بیٹھتی بولہائے مجھ سے بھی ہے مگر میرے ساتھ اس کا انداز بڑا ہی سنجیدہ ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہمارا احترام کا رشتہ ہے۔ ایک دوسرے سے مذاق کرنا ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ کسی بھی موضوع پر سنجیدہ گفتگو ہو جاتی ہے بالآخر اتفاق اگر کسی بھی بات میں مذاق کا عنصر نظر آ جائے تو ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اتنا ضرور ہے کہ کبھی کسی دوسرے کی بات پر ہنس لیا جائے۔ جیسا کہ کاشف کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو ہنسائے رکھے۔

میں شاملہ کے بارے میں یہ سب کچھ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ بقول کاشف کے ہر آدمی اس دنیا میں ڈھیروں خواب لے کر آتا ہے جن کے لئے وہ ساری زندگی سرگرداں رہتا ہے۔ پھر بعض کو تو خوابوں کی تعبیر مل جاتی ہے اور بعض کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ شاملہ کے بارے میں میرا جو خیال ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کے اپنے کوئی خواب نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کا مقصد کچھ بھی ہو جیسا کہ ہر آدمی کچھ سوچ کر تعلیم حاصل کرتا ہے۔ مگر شاملہ کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں۔

میں نے پہلے بھی کہا کہ سادہ سی لڑکی ہے سادہ سے لباس میں ملبوس اس پر ترس سا آنے لگتا ہے۔ پرانی کتابیں لے کر کالج آتی ہے اور سب سے بچ بچا کر کلاس روم میں چلی جاتی ہے۔ پھر بھی راستے میں ایک دو کو بولہائے بولنا پڑتا ہے اور وہ ہشاش بشاش سی مسکراہٹ سے سب کی طرف دیکھتی ہے ایسا لگتا ہے کہ صبر اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ استقامت کا پہاڑ ہے اس کے مقابلے میں کچھ غریب لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جو پلوگوں پر ڈھیروں خواب سجائے رکھتی ہیں۔ کسی امیر زادے پر نظر پڑتے ہی دل میں کک محسوس کرنے لگتی

ہیں حسرت سی ان کے دلوں میں جاگ اٹھتی ہے ان کے دل کے کسی کونے میں حسد بھی بیدار ہو جاتا ہے کہ کاش! یہ سب کچھ ہمیں مل جائے۔

ابھی دو ماہ قبل ایک لڑکا عاطف کالج میں انڈیشن لینے آیا یوپی سی گاڑی اور اچھے سوٹ بوٹ میں ملبوس کسی رئیس کی اولاد لگتا تھا کافی پسند بھی تھا وہ جیسے ہی گاڑی سے اتر لڑکیاں تو اسے دیکھ کر آئیں بھرنے لگیں۔ اتفاق سے اس وقت شاملہ میرے پاس کھڑی تھی اور کسی موضوع پر ہمارے درمیان بات چیت چل رہی تھی۔ ہم نے بھی اسے دیکھا کہ وہ اپنی گاڑی سے اتر کر ارد گرد کا جائزہ لے رہا ہے مگر انسان ہر نئی چیز کو ایک بار دیکھتا ضرور ہے شاملہ نے اس وقت یہ ثبوت پیش کیا کہ کسی سے باتوں کے دوران باتوں پر توجہ دینا کتنا ضروری ہے تاکہ سامنے والے کا دل نا دکھے کچھ اسٹوڈنٹس تو آگے بڑھ کر اس سے جان پہچان بنانے لگے ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ وہ اسے اس کی مطلوبہ جگہ یعنی پرنسپل کے دفتر چھوڑ آئے اس دوران میں نے نوٹ کیا کہ شاملہ کی پیشانی پر ہل پڑ گئے ہیں شاید اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

شاملہ کے اندر جو خوبیاں تھیں وہ مجھے پسند ہیں ایسے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا نام میری پرنسپل ڈائری میں موجود ہو۔ کچھ ایسے واقعات لکھ لئے جائیں جن سے ان کی خوبیاں عیاں ہوں اور خیالات کی دنیا میں انہیں وہ مقام دے دیا جائے جس کے وہ مستحق ہیں خود سے تو ان کی اپنی کوئی خواہش نہیں لیکن ہم لوگوں نے ان کے بارے میں سوچنا ہے کہ ان کی اصل جگہ کیا ہے۔ اصل مقام کیا ہے یہی کچھ سوچ کر کے شاملہ کے بارے میں کچھ لکھنا ہے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے دن پلنگ پر بھی جانا تھا جس کے لئے سارے شیڈول بنائے گئے تھے ہر ایک نے اپنے طور پر تیاری کرنی تھی یہی باتیں سوچتا ہوا میں ہاسٹل کی طرف بڑھ گیا۔

ڈائری کے جس صفحہ پر لڑکی اور لڑکے کی تصویر تھی وہ صفحہ میرے سامنے تھا میں شاملہ کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا تھا میرے ذہن میں شاملہ کے بارے میں کچھ اس طرح کا خیال ابھرا۔

شاملہ کالج کے وسیع لانا میں پتھر کے بچ پر بیٹھی خیالوں میں گم ہے تھوڑی اداس بھی تھی۔ شاید اسے کوئی پریشانی لاحق ہے۔ اور یہ اس کی عادت رہی ہے کہ وہ اپنی پریشانی کسی سے شیئر نہیں کرتی۔ آج بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ اسی پکچیشن میں تنہائی پسند بن جاتی ہے اور خود سے اپنی پریشانی کا حل تلاش کرتی ہے یہ اس کی عادت بہت اچھی ہے خوشیوں میں سب کو شامل کرنا اور غم میں خودی ٹوٹ کر بکھرتے رہنا۔ شاملہ بہت گہرے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی اپنے ارد گرد سے بھی بیگانگی کس پاس کیا فلم چل رہی ہے۔ اچانک سے وہ ہلکی آواز سن کر چونک جاتی ہے ”ہیلو شاملہ!“ شاملہ جلجت میں ارد گرد نظر دوڑاتی ہے تو ٹھوڑے فاصلے پر اسے عاطف نظر آتا ہے جواسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا شاملہ اسے مسکراتے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ ”ہائے شاملہ“ عاطف نے شاملہ کو بیگانی دنیا سے واپس دیکھ کر ایک بار پھر گفتگو کے ابتدائیاں کلمات دہرائے۔ ”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔“ عاطف نہیں چاہتا تھا کہ شاملہ میری وجہ سے ڈسٹرپ ہو۔

”پلیز، بیٹھے۔“ شاملہ نے ایک طرف سرکتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کو کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ نہ جانے کن خیالوں میں گم پریشان لگتی ہیں۔“ عاطف نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اوہ تو ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ شاملہ نے اپنی پریشانی زائل کرنا چاہی۔

”شاملہ کوئی بات تو ہے کہ آپ پریشان ہیں۔ آپ مجھے اپنی پریشانی بتائیں، ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی کچھ مدد کروں۔“ عاطف نے کہا۔

”عاطف صاحب ایسی کوئی بات نہیں کہ میں

پریشان ہوں، اکیلا بیٹھا آدمی خیالوں میں گم ہی لگتا ہے کہ وہ پریشان ہے اور باقی داوے آپ میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“ شاملہ نے تھوڑا سا تلخ لہجہ اپنایا۔

”انسانیت کے ناطے میں آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔“

”مگر آپ یہ انسانیت کہیں اور بھی تو دکھا سکتے ہیں مجھ پر ہی کیوں۔“

”دیکھو شاملہ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“ دراصل بات یہ ہے کہ عاطف بات کرتے ہوئے پکچایا!!!

”ہاں ہاں بولو کیا بات ہے؟“ شاملہ نے عاطف کو خاموش دیکھ کر کہا۔

”دیکھو شاملہ ہر انسان کے اندر ایک جذبہ پایا جاتا ہے ہمدردی کا جذبہ، کب کس وقت، کس کے لئے وہ بیدار ہو جائے یہ کوئی نہیں جانتا، آپ کے ساتھ ہمدردی جتنا ناکیا معانی رکھتا ہے آپ اسے کوئی بھی نام دے سکتی ہیں۔“

”کوئی بھی نام کیا مطلب؟“ شاملہ نے عاطف کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مثلاً دوستی کا رشتہ، اس کے علاوہ۔“ عاطف کہتے کہتے رک گیا۔

”اس کے علاوہ۔ اس کے علاوہ کیا؟“ شاملہ عاطف کی باتوں سے ڈسٹرپ تھی۔

”اس کے علاوہ ایک اور رشتہ بھی ہوتا ہے۔ محبت کا رشتہ۔“ اتنا کہہ کر عاطف خاموش ہو گیا۔

”محبت کا رشتہ۔“ شاملہ نے عاطف کی بات کو دہرایا۔

”ہاں شاملہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں میں نہیں جانتا کہ مجھے تمہاری کون سی ادال پسند آگئی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ پچھلے تین ماہ سے میں تمہیں نوٹ کرتا چلا آ رہا ہوں چپ چپ سی اداس سب سے الگ تھلگ تمہاری اپنی دنیا ہے آج موقع ملا ہے تو تم سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی اپنی اس دنیا میں شامل کرلو۔“ کتنی ہی لڑکیاں اس کالج میں ایسی ہیں جنہوں نے



اشارہ اور بعض نے صراحتاً مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ مگر دل ہے کہ مانتا ہی نہیں، میری متلاشی نظروں کا مرکز ہمیشہ تم ہی ہو، آج میں اپنی محبت کا اظہار کرتا ہوں آگے تمہاری مرضی۔“ عارف بہت جلد آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ ”چاہے تو میری محبت کا بھرم رکھ لو۔ چاہے تو ٹھکرا دو میں جانتا ہوں کہ ابھی تم میری کسی بات کا جواب نہیں دے پاؤ گی۔ اس کے لئے میں تمہیں کچھ وقت دیتا ہوں تم مجھ سے اپنے دل کی بات کہہ دینا، اوکے میں چلتا ہوں مگر مجھے تمہارے مثبت جواب کا انتظار رہے گا۔ اتنا کہہ کر عارف اٹھا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

مگر جاتے جاتے وہ ٹائلڈ کو سوچوں کے عمیق سمندر میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ ٹائلڈ جو کسی سے دوستی کرنے سے پہلے سو بار سوچتی تھی، اسے نئی منزل کا پتہ دے گیا تھا وہ، ٹائلڈ جو دوسروں کو محبت کی تلقین کرتی تھی آج خود محبت کے سمندر میں پھنس گئی تھی، عارف اسے کڑے امتحان میں دھکیل گیا تھا۔ امتحان بھی تو تھا کہ اگر وہ محبت کا جواب محبت سے دیتی ہے تو اسٹوڈنٹس کیا کہیں گے، ٹائلڈ دولت پر مبنی اور اگر وہ محبت کو ٹھکرا دیتی ہے تو اس کی وہ باتیں کہاں جائیں گی جو وہ ٹوبیہ سے کہہ چکی تھی۔ ”اگر تمہاری جگہ میں ہوتی ناں تو ضرور محبت کا جواب محبت سے دیتی۔“

پریشانی اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی۔ ایک عجیب سا احساس اسے ستانے لگا، دل و دماغ کی جنگ جاری تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پار ہی تھی کہ کس کا انتخاب کیا جائے ایک طرف اس کا بھرم تھا جو وہ پچھلے کئی سالوں سے قائم رکھے ہوئے تھی اور دوسری طرف محبت تھی جو اس کی دنیا میں بسنا چاہتی تھی، کتنی ہی دیر وہ سوچ و بچار کے پنجرے میں قید رہی پھر اچانک سے وہ ایک فیصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی مگر اس کے چہرے سے ایسا لگتا تھا کہ وہ فیصلہ ایک حلقی حصار ہے جس حصار میں اسے قید رہنا پڑے گا۔ ٹائلڈ آہستہ سے چلتی ہوئی بوجھل قدموں کے ساتھ مین گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

دوسرے دن ہم سب نے پکنک پر جانا تھا۔ ہم سب پکنک کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ اپنے تصور میں کاشف اور ٹوبیہ کو ملا چکا تھا اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے میں نے لکھا۔

ٹائلڈ ٹوبیہ کو اس کی غلطی کا احساس دلا کر ایک طرف کوچل دی۔ سامنے سے اسے عارف اپنی گاڑی میں آتا نظر آیا کیونکہ وہ سب کے ساتھ نہیں آیا تھا عارف نے گاڑی ٹائلڈ کے قریب آ کر روک لی۔ عارف اپنی گاڑی کا فرنٹ دروازہ کھول دیتا ہے۔ ”پلیز! ٹائلڈ تم ان“ عارف نے ٹائلڈ کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ ٹائلڈ تھوڑا ہچکچائی اپنے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

ٹائلڈ ابھی بھی غصے میں تھی ٹوبیہ کی وجہ سے وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا ری ایکشن کیا ہوا ہے۔ ”ہیلو ٹائلڈ کیسی ہو؟“ عارف نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

ٹائلڈ نے ایک نظر عارف کو دیکھا اور پھر شیشے سے پار دیکھنے لگی اس نے عارف کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

”تو کیا سوچا آپ نے کل کی باتوں کے بارے میں!“ عارف نے مقصد کی بات کہہ دی! ٹائلڈ ابھی بھی خاموش تھی اور پھر کچھ سوچنے کے بعد وہ گویا ہوئی۔

”دیکھو عارف!“ عارف ہمہ تن گوش ہو گیا جیسے اس کو یقین ہو چلا تھا کہ بات میرے ہی حق میں ہوگی۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ محبت بھی کسی سے کی جائے، آج تک اس بارے میں میں نے کبھی نہیں سوچا، بس میری زندگی جس طرح گزر رہی تھی میرا حال میں خوش تھی مگر آج میں نے کاشف کی بے بسی اور ٹوبیہ کی بے بسی دیکھی تو جان گئی کہ محبت کیا ہے، دو اجنبی لوگوں کا ایسے بندھن میں جڑ جانا جو احساس کے رشتے سے بنا ہو، اس کا نام محبت ہے، میں نہیں چاہتی کہ کاشف کی طرح تم بھی بے بس ہو جاؤ اور پکار پکار کر کہو۔“ ٹائلڈ آئی لوپو، ٹائلڈ آئی لوپو۔“

محبت میں ناکامی اکثر انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ وہ اپنے آپ سے بھی لاپرواہ بن جاتا ہے۔ چونکہ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں کہ کسی کی محبت کو ٹھکرا دوں بشرطیکہ اس میں خلوص اور سچائی ہو اب تک میں سمجھتی تھی کہ میری غربت اور سادگی کو دیکھ کر کون مجھے اپنا لے گا، کون ایسا ہوگا جو میرے دکھ درد کا سمیٹ جائے گا۔ کون میرے زخموں پر مرہم رکھے گا مگر جس طرح تم نے مجھ سادہ اور غریب لڑکی پر دل باریا دیے اس سے تو یہی لگتا ہے کہ تمہاری محبت میں سچائی ہی سچائی ہے، خلوص ہی خلوص بھرا ہے، میں ساری رات تمہارے ہی بارے میں سوچتی رہی۔

عارف میں ایک شرط پر تمہیں اپنے دل میں جگہ دے سکتی ہوں۔ ہماری یہ محبت راز رہے گی۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں جن سے ٹکنا میرے لئے ممکن نہیں کبھی اکیلے میں ملاقات ہوئی تو ٹھیک ہے ورنہ نظروں کا ٹکراؤ ہی کافی ہے۔“ ٹائلڈ اپنے دل کی بات کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”دیر ہی ٹھیکس ٹائلڈ! تم نے میری محبت کا بھرم رکھ لیا۔ ٹائلڈ میں تمہاری عزت پر کبھی آنچ نہیں آنے دوں گا، میں تمہاری مجبوریاں سمجھتا ہوں، ضرور میں تمہاری امیدوں پر پورا اتر دوں گا۔“ عارف نے اپنے طور پر یقین دہانی کرائی کچھ دیر گاڑی میں خاموش رہی انہیں اپنا گروپ آتا نظر آیا۔

”عارف میرے خیال میں مجھے چلنا چاہیے اس سے پہلے کہ ہمیں کوئی دیکھ لے اور ٹرک کی چادر پھیلائے۔“ اتنا کہہ کر ٹائلڈ گاڑی سے نکل کر ایک طرف کوچل دی۔

سارے اسٹوڈنٹس نے عارف کو دیکھ لیا تھا اس لئے اس کی طرف بڑھ گئے، تب تک عارف بھی گاڑی سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ ”اوہ! عارف صاحب۔ ہمیں نہیں لگتا تھا کہ تم بھی پکنک پر آؤ گے۔“ کئی لڑکوں کی آواز سنائی دی اور باری باری عارف سے ملنے لگے۔ سب سے مل کر عارف نے مٹھائی کا ڈبہ گاڑی کے بونٹ پر رکھ دیا جیسے پوری دکان خرید لایا ہو۔ ”واہ یہ

کس لئے؟“ سب نے مٹھائی لیتے ہوئے کہا۔ ”بس ویسے ہی میں نے سوچا دوستوں کے لئے کچھ لے چلوں۔“ یہ بات کہتے ہوئے اس نے دور کھڑی ٹائلڈ کی طرف ایک نظر دیکھا جو ایک درخت سے ٹیک لگائے ایک پیر پر ہاتھوں کو باندھے بڑے اسٹائل سے کھڑی تھی۔

ٹائلڈ سمجھ گئی کہ یہ سب اہتمام کس لئے ہے اور پھر جواب میں وہ ہلکا سا مسکرا دی۔ میں اپنی تحریریں پر ختم کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ جس منظر پر قلم ڈرامہ یا کوئی کہانی ختم کی جائے وہ منظر آنکھوں میں سا جاتا ہے۔ کاش! ایسا ہو۔

یہ بات لکھنا میں اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ میرا خیال ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں بس میں چاہتا ہوں کہ ایسا ہو جائے، یہ سب لکھ کر ایک سرسری نظر تحریر پر ڈالی اور ڈائری بند کر کے ٹیبل پر رکھ دی۔ اب میں سونا چاہتا تھا، میں ٹھکن سی محسوس کرنے لگا شاید لکھنے کی وجہ سے یا کوئی اور بات تھی! آنکھیں بند کئے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ جلد ہی نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہو گئی اور میں نیند کی آغوش میں ہر شے سے بیگانہ ہو گیا۔ ہر روز کی طرح مجھے ایسا لگا کہ میں سویا نہیں تھا بلکہ جاگ رہا ہوں اور بھینسی بھینسی سی خوشبو مجھے مدھوش کر رہی تھی یہ خوشبو کسی کے آنے کی اطلاع تھی اور پھر ایسا ہی ہوا، وہ پھر روز کی طرح چلتی ہوئی میرے قریب آ رہی تھی، اس کے چلنے کا اسٹائل بڑا خوبصورت تھا۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اسی طرح میری طرف بڑھتی رہے اور میں اسے دیکھتا رہوں۔ وہ آ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ اتنا قریب کہ جب وہ منہ میری طرف کر کے سانس لیتی تو ہماری سانسوں کا تبادلہ ہونے لگتا، میں بھی کتنا عجیب ہوں میں اسے نہیں جانتا کہ وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے؟ میرے پاس ہی کیوں آئی ہے۔ مجھے اپنی سانسوں کی ہوا دینے روز چلی آتی ہے میں اس کی سانسوں کی گرمی سے کپھلنے لگتا ہوں، بے خود سا ہو جاتا ہوں اور یہ خواہش میرے



رہے ہو۔“ اس نے پہلے کی طرح اپنی کہانی کا ذکر کر دیا تھا مگر میں ابھی تک اس کی کہانی سے انجان تھا۔  
”جی آپ کی کہانی؟ مگر میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔“ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

”ہوں۔“ اس نے خاموش رہ کر میری بات کی تصدیق کی۔ ”دو دن بعد میری کہانی تمہارے سامنے ہوگی، کل میں تم سے ملنے نہیں آؤں گی تم پک پک پر جاؤ گے ناں اس لئے تھک ہار کر سونا چاہو گے، میں نہیں چاہتی کہ کل تمہارے آرام میں خلل ڈالوں۔“ اسے میری تھکن کا بھی احساس تھا۔

یہ بات برحق ہے کہ جب دو لوگوں میں احساس کا رشتہ پیدا ہو جائے تو وہ محبت کا درجہ لے لیتا ہے۔ اسے میرا احساس تھا، حقیقت میں، میں بھی اس سے محبت کرنے لگا تھا۔

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں یہ وہ نقد ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا  
”اب سو جاؤ۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا شاید مجھے سلاتا چاہتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ کچھ دیر میں م میں خود سے بھی بیگانہ تھا شاید معنوں میں بوجھا تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے جلد ہی میری آنکھ کھل گئی میں بستر پر دراز اوپر چھت کو گھور رہا تھا میں کچھ یاد کرنا چاہ رہا تھا۔ ہاں یاد آیا اس رات والی حسینہ کو جو روزانہ مجھ سے ملنے چلی آتی ہے اس نے مجھے وہ ڈائری دی تھی مگر اس کے باوجود ابھی تک مجھے اس چیز کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھ سے حقیقت میں ملتی ہے یا کہ خواب میں۔ ایک بات جس طرح وہ مجھے ڈائری دے گئی تھی اس سے تو یہ لگتا تھا کہ وہ حقیقت میں مجھ سے ملتی ہے، دوسری بات اس کی موجودگی میں مجھے اپنے وجود کا احساس نہیں رہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کے تابع ہوں اور وہ میری نیندوں پر قابض آ جاتی ہے۔ اس کی موجودگی میں میں نے زندگی کا لطف نہیں اٹھایا تھا اس

من میں مچلنے لگتی ہے۔  
آج سانوں کو سانوں سے مہک جانے دو  
آج ہونٹوں کو ہونٹوں سے ٹکرانے دو  
دل ہے پیاسا نہ ترساؤ قطروں سے اب  
آج بادل یہ کھل کر برس جانے دو  
دوریوں میں جھلٹے رہے رات دن  
اب جوبلیں ہیں توحہ سے گزر جانے دو  
اس نے کل کی طرح آج بھی ڈائری کو اٹھالیا  
اور وہ سب کچھ دھیمی آواز میں پڑھنے لگے جو میں لکھ کر  
سویا تھا، کافی دیر وہ ڈائری پڑھتی رہی شاید پوری کہانی  
پڑھنا چاہتی تھی، میں اسے اسی طرح تنکٹا رہا کہ اس  
کے حسن میں کھوسا گیا تھا، میں اسے دیکھنا چاہتا تھا،  
بہت دیر بہت دیر تک اس کے ہلتے ہوئے لبوں کو دیکھنا  
چاہتا تھا، جب ایک انسان بات کرتا ہے تو اس کے  
دونوں ہونٹ آپس میں ٹکراتے ہیں، بالکل ایسے ہی  
اس کے ہلتے ہوئے ہونٹ میرے من میں رس گھول  
رہے تھے۔

”اوئے!“ اس نے اپنا مخصوص انداز اپنایا  
شاید وہ کہانی بڑھ کر ختم کر چکی تھی ”تو یہ حال احوال اتنا  
رومانک کیوں لکھتا ہے اور طویل بھی، مختصر بھی تو لکھ سکتا  
ہے ناں۔“

واقعی اس نے وہ بات کہہ ڈالی تھی جس کا میں  
نے اپنی کہانی میں خاص خیال رکھا تھا کہ کوئی لمحہ نہ نہ  
جائے۔ ”وہ جی!“ میں ہلکایا۔

”کیا جی بولو جی۔“ اس نے جی کی گردان  
بنا ڈالی۔ شاید میرے ساتھ مذاق کر رہی تھی مگر اس کے  
مذاق میں بھی بیاہر تھا۔

”وہ دراصل اصل زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے  
ناں۔ اس لئے میں نے کہانی کو طویل دیا ہے۔“ میں  
نے جواز پیش کیا۔

”اچھا تو یہ سب بھی ایسے ہی ہوگا جیسا تو نے  
لکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تو لوگوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی  
ہمدرد ہے۔ خیر چورو! اب یہ بتاؤ کہ میری کہانی کب لکھ



سے تو یہ لگتا ہے کہ وہ مجھ سے خواب میں ملتی ہے کتنی ہی دیر، میں ایسی باتوں میں الجھا رہا اس کی ملاقات پر مجھے آج حیرت ہو رہی تھی۔

اتنے میں مجھے کاشف کی آواز سنائی دی جو آج مجھے لینے چلا آیا تھا اس کی آواز سن کر میں نے بستر کی جان چھوڑ دی روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہو کر میں کاشف کے ساتھ کان روانہ ہو گیا

کانچ پہنچے تو ہر ایک کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی کیونکہ ایسے مواقع روز بروز نہیں آتے۔ اور پھر ایسے میں بہت سارے اسٹوڈنٹس کا یہ آخری سال شمار کیا جاتا ہے۔ کچھ تو اپنی مرضی سے کانچ کو خیر آباد کہہ دیتے ہیں اور کچھ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے کسی یونیورسٹی وغیرہ میں ایڈمشن لینا ہوتا ہے۔

پکنک پارٹی پر جانے کے لئے کانچ کی انتظامیہ نے ایک عدد بس کا انتظام کیا تھا باری باری سارے اسٹوڈنٹس بس میں سوار ہو گئے قریب تھا کہ بس روانگی کا الارم بجائی میں اور کاشف بھی اپنے گرد و نواح کا جائزہ لیتے ہوئے بس میں سوار ہو گئے جلد ہی بس اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی بس کے اندر خوب ہنگامہ مچا تھا کبھی کوئی لڑکا گنگناٹے لگاتا تو کبھی کوئی پر جملہ کس دیتا، جس سے تمام اسٹوڈنٹ کے قہقہے کو گونجنے لگتے، سفر خوب دلچسپ تھا، تقریباً چار گھنٹوں کے بعد ہماری بس اپنی منزل پر پہنچ گئی، تمام اسٹوڈنٹ باری باری نیچے اترنے لگے، جو بھی نیچے اترتا ”واہ!“ کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکراتی یہ لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی خوشن واقعہ وقوع پذیر ہو جائے اپنی حیرت یا خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

”واہ کیا خوبصورت علاقہ ہے۔“ یہ ٹوپیہ کی آواز بھی جو نیچے اترتے ہوئے کہہ گئی تھی۔ ٹوپیہ کی آواز سن کر کاشف بھی ہولے سے کہہ گیا۔ ”واقعی کیا خوبصورت جگہ ہے۔“

”پہلے کچھ دیکھ تو لے کیا علاقہ ہے ایسے بھی بول دیا۔“ میں نے کاشف کو متنبہ کیا۔

”تو نے سنا نہیں ٹوپیہ کیا کہہ رہی تھی جب اسے پسند آ گیا ہے تو مجھے کیوں نہیں آئے گا۔“ ایک بار پھر کاشف نے اپنی محبت کا ثبوت پیش کیا۔

”اچھا مجنوں چل اب نیچے چلتے ہیں ہم بھی تو دیکھیں کہ کتنا خوبصورت علاقہ ہے۔“ پھر ہم دونوں بھی بس سے باہر آ گئے۔

واقعی علاقے کو خوبصورتی کی داد دینی پڑی، ہماری آنکھیں وہ سارا علاقہ اپنے اندر جذب کرنے لگیں۔ کیا ہی خوب علاقہ تھا، ایسا علاقہ ایک رائٹر اور عاشق کی ضرورت ہوتا ہے، رائٹر میں خود تھا اور عاشق میرے پہلو میں کھڑا تھا۔ بالکل ویسا ہی علاقہ تھا جس کا تصور میرے دماغ میں موجود تھا۔ رنگ رنگ کے پھول کھل رہے تھے سرد ہوا کے جھوکے آپس میں ٹکراتے تھے۔ میں ابھی تک وادی کی منظر کشی میں لگا ہوا تھا میں نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کہ اچانک مجھے کاشف کی آواز سنائی دی کاشف کی نظر ضرور ٹوپیہ پر پڑ گئی تھی جو زمین پر پڑی کچھ چیزوں کو سمیٹ رہی تھی میں نے دیکھا کہ کاشف ٹوپیہ کے ساتھ چیزوں کو سمیٹنے میں مدد کر رہا ہے حالانکہ یہ بات ٹوپیہ کو بالکل بھی پسند نہیں تھی مگر میں یہ سب سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کیوں چل رہا ہے ٹوپیہ چیزوں کو سمیٹ کر جانے لگی تو کاشف کی آواز سن کر اس کے بڑھتے قدم رک گئے اور پلٹ کر کاشف کو دیکھنے لگی۔

”بی جناب! فرمائیے۔“ ٹوپیہ نے تاؤ میں آتے ہوئے کہا۔

”ٹوپیہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ کاشف کے لہجے میں قدرے جھجک تھی۔

”ہاں تو پھر کہو! میں کس لئے رکی ہوں تمہاری شکل تو نہیں دیکھنی میں نے۔“ ٹوپیہ کی باتوں سے اکتاہٹ جھلک رہی تھی اور وہ کولہوں پر ہاتھ رکھے کاشف کو گھورنے لگی۔

”ٹوپیہ! میں آخری بار تم سے وہی بات کہنا چاہتا ہوں جو میں کئی بار پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس

امید کے ساتھ کہ ہو سکتا ہے اس پر سکون اور خوبصورت ماحول نے تمہارے اندر چاہت بھردی ہو۔ یہاں پر آ کر انسان کا من خوش ہونے لگتا ہے کچھ خواہشیں پھر سے سر اٹھاتی ہیں۔“ کاشف یہ باتیں کرتے کرتے فضاؤں میں بھی گھور رہا تھا شاید وہ اس حسین منظر کی عکاسی کر رہا تھا۔ اور اگر ایسے ہی ماحول میں انسان کو کوئی بڑی خوشی میسر آ جائے تو یہ سب کچھ کتنا اچھا لگنے لگتا ہے۔ اور اگر ایسے ہی ماحول میں کوئی بڑا غم میسر آ جائے تو انسان ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ ٹوپیہ نے اس کی بات کو متضاد صورت میں پیش کیا۔ شاید وہ جان گئی تھی کہ کاشف صاحب کیا کہنے والے ہیں۔

”ٹوپیہ اب بھی میں تم سے وہی کہوں گا جو پچھلے کئی مہینوں سے کہتا چلا آیا ہوں۔“ پھر کاشف نے وہ کہہ دیا جسے سن کر میں منہ کھولے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا! یہ کہتے ہوئے کاشف ٹوپیہ کے بہت قریب ہو گیا تھا، ٹوپیہ آنکھیں پھاڑے کبھی اسے گھورتی اور کبھی زمین کی طرف دیکھنے لگتی۔ اس دوران وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مسل رہی تھی لگتا ہے ری ایکشن سخت ہو گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔

”تیرا!! کی آواز مجھے سنائی دی۔“ ٹوپیہ نے کاشف کو پتھر مار دیا تھا، میری حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، یہ تو سب کچھ ایسا ہی چل رہا ہے جیسا کہ میں اپنی ڈائری میں لکھ چکا تھا اور پھر وہ سب باتیں ٹوپیہ نے کہہ سنائی تھیں جو میں لکھ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ کاشف گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر آئی لوہو کی صدائیں بلند کرتا، میں بھاگ کر بس میں داخل ہو گیا اور اسے بیک سے وہ ڈائری نکال لایا۔ میں نے جلدی ڈائری کو کھولا اور اپنی لکھی ہوئی تحریر تلاش کرنے لگا۔ میں اپنی لکھی ہوئی تحریر اور موجودہ صورت حال کا موازنہ کرنا چاہتا تھا مگر یہ کیا جس صفحہ پر میں نے وہ تحریر لکھی تھی وہ صفحہ خالی تھا، یہاں تک کہ اس پر موجود لکیریں بھی مٹ چکی تھیں مجھے وہم لگا شاید اگلا صفحہ ہو مگر اگلے صفحہ پر لکھا ہوا تھا۔

کاشف نے اپنے دونوں ہاتھوں اپنے چہرے پر رکھ لئے اسی اثناء میں میں نے کاشف کی طرف دیکھا تو واقعی اس کے دونوں ہاتھ اس کے چہرے پر موجود تھے۔ ٹوپیہ دور جاتی نظر آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کاشف زور زور سے پکارتا۔ ”ٹوپیہ آئی لوہو! ٹوپیہ آئی لوہو!“ تحریر کے مطابق مجھے اپنا رول ادا کرنا تھا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا میں کاشف کے قریب جانا ہی چاہتا تھا کہ مجھے کاشف کی آواز سنائی دی۔ ”ٹوپیہ آئی لوہو!“ نہجانے وہ کوئی طاقت تھی کہ میں خود بخود کاشف کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ چکا تھا اور اسے دلاستہ دینے لگا مگر ایک بات جو میں نہیں لکھ پایا تھا کہ اس سب کچھ کے دوران میں حیرت کا جسمہ بنا رہوں گا۔ دلاستہ کے اندر جو جو صلہ ہوتا ہے وہ میرے اندر موجود نہیں تھا، موجود تھا تو وہ اسرار کہ یہ سب کیا ہے، بالکل ویسا ہی ہو رہا ہے جو میں نے لکھا تھا اس سے بڑا اسرار کہ ڈائری سے تحریر کہاں چلی گئی؟

میرا دماغ اس طرح کی سوچوں میں الجھا ہوا تھا، واقعی بات حیران کن تھی جو کچھ ہوتا چلا گیا وہ مٹا چلا گیا میں ڈائری کو دوبارہ کھول کر دیکھتا مگر میں کاشف کو اٹھانا چاہتا تھا جو ابھی بھی سسک رہا تھا۔

میں کاشف کو لے کر ایک طرف کوچل دیا مگر کاشف نے میرے ساتھ آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور میں اکیلا ہی آگے بڑھ گیا یہ کوئی انہونی طاقت تھی جو مجھے آگے لے کر بڑھ رہی تھی۔

باقی بھی سب کچھ ویسا ہی ہوا جو میں لکھ چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ٹوپیہ اور شاید آپس میں کچھ باتیں کر رہی تھیں، میں پتھر سے ٹیک لگائے ان کی باتیں سننے لگا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ٹوپیہ شرمندہ سی ایک طرف چل دی جہاں پر کاشف اکیلا بیٹھا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد مجھے کاشف کی خوشی سے لبریز آواز سنائی دی۔

میں خوشی سے جھومنا چاہتا تھا مگر نہجانے کیا سوچ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں، آنکھیں بند کر لینے سے انسان کا دماغ تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے کچھ بھی



دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے، مگر میں اس اندھیرے میں بھی کسی کو دیکھ سکتا تھا۔ یہ وہی تھی جو روزانہ مجھ سے ملنے آتی تھی وہ فضا میں معلق کوئی پری لگ رہی تھی اور مسکراتے ہوئے مجھے دیکھنے لگی وہ اڑتی ہوئی میرے قریب آ کر اتر گئی میں بھی آنکھیں بند کئے اسے دیکھتا رہا کہ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

”اُونے“ وہ اپنے مخصوص انداز کے ساتھ مجھ سے مخاطب تھی۔ ”آگے نہیں دیکھنا کیا۔ کہانی کا دوسرا سین ابھی بھی باقی ہے چل آ نکھیں کھول اور دیکھ کیا ہونے والا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ ایک طرف کوچل دی میں بھی اس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا یہی سوچ کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مگر آنکھیں کھولتے ہی اس کی جگہ مجھے شائد نظر آئی جو ایک طرف کو جا رہی تھی میں آنکھیں بند کر کے اسے دوبارہ دیکھنا چاہتا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں مگر اب کی بار وہ مجھے نظر نہ آئی مجبوراً آنکھیں کھولنی پڑی۔ ایک اور حیران کن منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

شائد عاطف کی گاڑی کے پاس کھڑی تھی اور گاڑی کا فرنٹ دروازہ کھلا ہوا تھا کہانی کا دوسرا سین چل رہا ہے یہی سوچ کر میں ڈائری کو کھولنے لگا کاشف کے متعلق لکھی گئی ساری تحریر مٹ چکی تھی اور شائد کی کہانی کا تھوڑا حصہ باقی تھا۔ مجھے سو فیصد یقین ہو چلا تھا کہ ایسا ہی ہوگا میں نے ڈائری کو بند کر دیا اور اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔

مجھے اس کی باتیں یاد آنے لگیں۔ ”اُونے“ تو کہانی اتنی رومانٹک کیوں لکھتا ہے اچھا تو پھر یہ فکر ہو جا ایسا ہی ہوگا۔ مگر میری کہانی کب لکھو گے۔“ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا سب ایسا ہی ہو گیا تھا مگر وہ تحریریں میری ڈائری سے مٹ چکی تھیں وہ اپنی کہانی مجھ سے کیوں لکھوانا چاہتی ہے اسے کیا ضرورت پڑ گئی اس کی کہانی میں ایسا کیا ہے جو وہ لکھوانا چاہتی ہے کیا جو میں لکھوں گا وہ سب ایسے ہی ہوگا کہ حقیقت کاروبار بن کر سامنے آ جائے گا یا کوئی اور بات سامنے آئے

گی۔“ کتنی ہی دیر میں انہی خیالوں میں الجھا رہا کہ مجھے اسٹوڈنٹ کا شور سنائی دیا۔ وہ سب عاطف کی گاڑی کے پاس موجود مٹھائی سے انصاف کر رہے تھے اور ایک طرف درخت سے ٹیک لگائے شائد مسکرا رہی تھی۔ میری کہانی اختتام پذیر ہوئی اور میں بھی اٹھ کر ان کی طرف چل دیا شاید کوئی گلاب جاسن میرے جیسے میں بھی آ جائے۔

اب سب کچھ نارمل چلتا تھا دو لوگوں کو ملا کر مجھے ایسا لگنے لگا کہ ہر چہرے کی خوشی دیدنی ہے یہ بات کسی کے علم میں نہیں تھی کہ یہ سب کچھ میں دو دن پہلے سے جان لیا تھا اور اپنی ڈائری میں لکھ بھی چکا تھا۔ مگر وہ سب لکھا اب میرے پاس موجود نہیں تھا۔ میں کسی سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا آگے جو کچھ ہوتا تھا وہ میں نے لکھا ہی نہیں تھا۔ اگر لکھ دیتا تو شاید وہ بھی میری تحریر کا حصہ بن جاتا۔ مگر میں ابھی بھی بہت خوش تھا۔

واپسی پر بھی خوب ہنگامہ رہا۔ میرا دوست کاشف جو پکنک پر روانگی سے پہلے اداں تھا۔ اب اس کا چہرہ خوشی سے سرشار تھا وہ جمجمہ رہا تھا اور پھر شائد کی طرف دیکھا جو بس کی کھڑکی سے باہر خوبصورت مناظر کا نظارہ کر رہی تھی میں نے اس کے دل کی بات جان لی تھی کہ وہ کن خیالوں میں گم ہے اور پھر ہماری گاڑی ہنگولے بھرتی ہوئی واپسی کے لئے رواں دواں رہی۔

رات نو بجے میں اپنے ہاسٹل کے کمرے میں موجود تھا، ڈائری کے خالی اوراق میرے سامنے تھے، میں اپنی پکنک پارٹی کی ساری کارگزاری لکھنا چاہتا تھا مگر جس پر اسرار طریقے سے میری لکھی ہوئی تحریر ڈائری سے مٹ گئی، اس سے یہ لگتا ہے کہ جو کچھ بھی لکھا جائے گا وہ بھی مٹ جائے گا اور ویسے بھی پکنک پر بیٹے لکھوں کو میں پہلے ہی قلم بند کر چکا تھا یہ اور بات تھی کہ وہ سب کچھ میرے پاس موجود نہیں رہا اس میں خوشی کی بات یہ ہے کہ میری چاہت کے عین مطابق سب کچھ ہوا اور اس کے لئے مجھ سے میری تحریر چھین لی گئی مگر میں اپنے

دوست کاشف کی خوشی کے لئے اپنی ایسی سوجھریں قربان کر سکتا ہوں کیا ہوا جو میری تحریر کا خراج مانگا گیا۔ کوئی بات نہیں! میں اس سارے واقعہ کو حقیقت کا روپ دے دوں گا اور پھر ایک ہٹ کہانی سامنے آئے گی۔

کتنی ہی دیر میں ایسی باتیں سوچتا رہا، بدن بھی محسوس سے نڈھال تھا اس لئے نیند بھی اپنا اثر دکھانے لگی، میں سونا چاہتا تھا یہی سوچ کر میں نے ڈائری کو ایک طرف رکھا اور بستر پر دراز ہو گیا جلد ہی میری آنکھ لگ گئی اب مجھے کسی نے نہیں جگایا تھا اور ساری رات میں مٹھی نیند سوتا رہا۔

صبح کو میری آنکھ کھل گئی۔ آج کالج سے چھٹی تھی اس لئے میں ایسے ہی بستر پر دراز رہا مگر اب میں تازگی محسوس کر رہا تھا میرا جسم پرسکون تھا۔ مجھے ایسا لگنے لگا کہ کوئی رات بھر میرے پہلو میں بیٹھ کر مجھے سلاتا رہا ہو۔ میرے ہونٹوں پر ہنسی تیر گئی اور غالب کا یہ شعر میری زبان سے پھسلنے لگا۔

یار کو رات بھر پہلو میں بٹھا کر غالب جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ کمال کرتے ہیں

آج رات وہ نہیں آئی تھی۔ اپنے وعدے کے مطابق آنے والی رات میں وہ مجھے اپنی کہانی بھی سنانا چاہتی تھی نجانے اس کی کہانی میں ایسا کیا تھا کہ وہ میری مدد لینا چاہتی تھی۔ یا پھر میرے ذریعے اپنی کہانی نشر کرانا چاہتی تھی۔ آج سارا دن گھر پر ہی گزارنا پڑا۔ کوئی کام وغیرہ بھی خاص نہیں تھا۔ ناول پڑھتے ہوئے اور اس کی یادوں میں دن گزر گیا چہل قدمی کے طور پر کچھ ٹائم باہر گزارا، کھانا وغیرہ بھی باہر کھا لیا تھا اس لئے نوبے میں اپنے ہاسٹل میں موجود تھا۔ پچھلی رات وہ میرے پاس نہیں آئی تھی تو مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اس سے ملے برسوں گزر گئے۔ میں جلد از جلد اسے دیکھنا چاہتا تھا اور اسے دیکھنے کے لئے آنکھیں بند کرنا ضروری امر تھا۔ ورنہ تو میں ساری رات مایہ آبی کی تصویر بنا رہتا اس سے ملنے کی چاہت میں، میں نے آنکھیں بند کر لیں اچانک سے

وہی مسوور کن خوشبو میرے نغٹوں سے نگرانی اور میں نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

میں خود سے بگاڑ ہو کر سوچتا تھا خواب میں بھی مجھے اس کی چاہت تھی مجھے ایسا لگتا کہ میں خود موجود نہیں ہوں۔ مگر میرا دماغ حاضر ہے جو دیکھ اور سن سکتا ہے۔ یہ سب نیند کا سامع تھا اور میرا دماغ اس تاریکی میں ہٹک رہا تھا میں اسے ڈھونڈنا اور دیکھنا چاہتا تھا مگر اس اندھیرے میں وہ مجھے نظر نہ آئی۔

مگر پھر اچانک سے میرے سامنے ایک منظر ابھرنے لگا۔ سب کچھ دھندلا تھا مگر پھر بھی میں ٹھیک طرح سے دیکھ سکتا تھا میں نے دیکھا کہ ایک جوان لڑکی ایک بوڑھی عورت کو سہارا دے کر ایک طرف کوچل رہی تھی۔ میں اس لڑکی کو غور سے دیکھنے لگا میں اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا اور پھر جلد ہی میرے دماغ نے اس کا چہرہ محفوظ کر لیا، یہ وہی تھی بالکل وہی جو روزانہ مجھ سے ملنے آتی تھی مگر آج اس حالت میں یہ بات مجھے سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک بڑی سی گاڑی ان کے قریب آ کر رکتی ہے گاڑی سے ایک پیڈم سانو جوان (نوجوان بھی نہیں کہا جا سکتا 35-40 سال کے لگ بھگ ہوگا) اترتا ہے بہت جلد وہ ان کے پاس موجود تھا۔ یہ سب مجھے بہت تیزی سے دکھایا جا رہا تھا۔

”گیا“ میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ سکتا ہوں۔“ اس انہی کے لہجے میں ہمدردی تھی مگر نجانے ایسی کیا بات تھی کہ ہمدردی میں بھی مجھے وہ شیطان لگ رہا تھا۔

”نہیں جی شکر یہ ہم چلے جائیں گے۔“ یہ اس لڑکی کی آواز تھی، دوبارہ اس آدمی کی آواز میرے کانوں سے نگرانی۔ ”دیکھیں آپ لوگوں نے کافی دور جانا ہے اور آپ کے ساتھ مرلیضہ بھی ہے یہ وہاں تک نہیں جا پائیں گی۔ آپ مجھ پر بھروسہ کریں میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔“ اس بار اس آدمی کے لہجے میں اپنائیت تھی اس لڑکی نے ایک نظر اس بوڑھی عورت کی



طرف دیکھا۔ جیسے کچھ پوچھنا چاہ رہی ہو۔ پھر میں نے ثابت کث میں یہ سب دیکھا گاڑی میں وہ بیٹھی ہوئی تھی اور گاڑی ایک بوسیدہ سے مکان کے پاس آ کر رک گئی۔

وہ دونوں گاڑی سے باہر نکل گئیں۔ اس لڑکی نے گاڑی والے کو تشکر بھری نظروں سے دیکھا اور اپنے مکان کی طرف بڑھ گئی۔ ”ایکسوڑی“ اس لڑکی نے پلٹ کر دیکھا تو اس آدمی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی تب تک بوڑھی عورت اندر جا چکی تھی۔ ”لگتا ہے آپ کے مالی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“ اس انہنی نے اس بوسیدہ مکان پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

لڑکی اس کی بات سن کر خاموش ہی رہی۔ ”یہ رکھ لو میرا کارڈ، کبھی میری ضرورت پڑے تو ضرور فون کرنا۔“ لڑکی نے ڈرتے ہوئے کارڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ابھی وہ مڑنے ہی والی تھی کہ ایک بار پھر اس آدمی کی آواز سنائی دی۔ ”یہ کچھ پیسے ہیں رکھ لو کام آئیں گے۔“ لڑکی جو بیٹے لکھوں سے ہی خوف زدہ تھی پیسے کیسے رکھ لیتی۔

”نہیں صاحب! ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔“ دوسری بار لڑکی گویا ہوئی تھی۔ ”کوئی بات نہیں رکھ لو جب آپ کے پاس ہو جائیں تو واپس کر دیتا۔“

اتنا کہہ کر اس آدمی نے زبردستی وہ پیسے اس لڑکی کے ہاتھوں میں تھما دیے اور خود گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ لڑکی غربت سے تنگ آ کر وہ پیسے لینے پر مجبور تھی ورنہ خود داری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اور پھر بوڑھی ماں کا سوال تھا جو کہ بیمار تھی اس کی دوا دارو کے لئے پیسے چاہئے تھے وہ لڑکی بھی حیرت کدہ بنے اپنی جگہ پر ساکت تھی اور پھر اچانک سے منظر بدل گیا۔

وہی لڑکی ہاتھوں میں کتابیں تھا کہ نہیں جارہی تھی شاید کالج پھر سے وہی گاڑی اس کے پاس آ کر رک گئی اس آدمی نے گاڑی کا فرنٹ دروازہ

کھولتے ہوئے لڑکی کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ ”پلیز! کم ان لڑکی نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا اور پھر تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی چلنے لگی۔ ”لگتا ہے آپ کے مالی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“ آدمی نے رات والی بات دہرائی اور گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے بارے میں تو آج جان گئی ہوں گی میرا نام جمشید ہے اس شہر کا بہت بڑا سیٹھ! سیٹھ جمشید۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

اس کے انداز گفتگو سے ٹکریاں تھا۔ سیٹھ جمشید مزید کچھ کہتا اس سے پہلے اس نے گاڑی کو بریک لگا دیئے۔ ”میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ لڑکی خاموشی کی تصویر بنے گاڑی میں بیٹھی تھی اور شیشے سے پار دیکھ رہی تھی۔ ”اس کے لئے زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم کافی شاپ میں چل کر کافی بھی پیتے ہیں اور باتیں بھی ہو جائیں گی۔“

لڑکی اس کے کسی بات کا جواب نہیں دے پاری تھی۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ کافی شاپ میں جانا نہیں چاہتی مگر پھر! میں نے دیکھا کہ دونوں کافی شاپ میں بیٹھنے کافی پار رہے تھے۔

اس آدمی کی آواز سنائی دی لڑکی نظریں جھکائے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ”دیکھو شیرازیہ“ گویا کہ وہ اس کا نام بھی جانتا تھا اور جب سے وہ لڑکی مجھے ملی تھی مجھے بھی اس کا نام ابھی معلوم ہوا تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہارے گھر بیلو حالات ٹھیک نہیں ہیں اور پھر ایسا کوئی گھر کا فرد بھی نہیں ہے جس کے سہارے جیا جائے۔ کب تک غربت کی چلی میں پستی رہو گی میں چاہتا ہوں کہ تمہاری کچھ مدد کروں اس کے لئے زیادہ بہتر ہوگا کہ ہماری شادی ہو جائے۔“ شادی کا سن کر شیرازیہ اسے نظریں اٹھا کر دیکھنے لگی اس کی آنکھوں میں کوئی سوال تھا جو کہنا چاہتی تھی مگر۔ ”ہاں شیرازیہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس طرح ہم دونوں میاں بیوی کے روپ میں رہیں گے تو کوئی انگلی بھی نہیں اٹھائے گا۔“

شیرازیہ ابھی تک خاموش تھی اسے کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔ ”میں جانتا ہوں تم میری کسی بات کا جواب نہیں دے پاؤ گی۔ اس لئے سوچ کر جواب دینا میں تم سے پھر مل لوں گا۔“

یہ سب کچھ مجھے دکھایا گیا مگر پھر اچانک سے منظر بدل گیا۔ جس طرح کسی فلم کو فادرز کے دیکھا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر جو میں ابھی تک دیکھ پایا تھا اس سے ساری ہنسی میری کچھ میں آ رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی دلہن کے لباس میں ملبوس سج درج کے پھولوں سے سجی سج میں بیٹھی ہوئی ہے اسنے میں سیٹھ جمشید اندر داخل ہوا دھیرے سے اس نے لڑکی کا کھنٹ اٹھایا تو وہ شرم سے سنسنے لگی۔ ”بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ وہ شیرازیہ کی تعریف کرتا ہے شیرازیہ آنکھیں اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھتی ہے ”اوہ تمہاری تو آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔“ یہ سن کر شیرازیہ کے ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ پھر وہ اپنا سر شیرازیہ کی گود میں رکھ دیتا ہے ان دونوں میں پیار بھری سرشاری ہونے لگتی ہے قربت کی پیاس بڑھنے لگتی ہے یہ سب کچھ میں دیکھ نہیں پا رہا تھا نجانے کیوں۔ رقابت کی آگ میرے اندر جلنے لگی اور میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

میں اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا یہ حقیقت ضرورت تھی جو گزر گئی مگر اس وقت تو وہ سب ایک خواب تھا۔ شیرازیہ تو یہ میری ہے روز مجھ سے ملنے آتی ہے یہ حقیقت نہیں ہو سکتی میں اپنے آپ کو دلا سے دینے لگا اور پھر کچھ سوچ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں مگر اب منظر یکسر بدل گیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ سیٹھ جمشید ایک بڑے ریسٹورنٹ میں ایک دوسری خوبصورت دوشیزہ کے ساتھ بیٹھا اس کے من کو لبھانے کی کوشش کر رہا ہے وہ لڑکی بھی اس کی ہر بات سن کر خوشی سے جھومنے لگتی ہیں نے سنا کہ وہ کہہ رہا تھا۔ ”زادہ تم میری زندگی میں

سب سے خوبصورت لڑکی ہو میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا اپنا سب کچھ تمہارے نام کر دوں گا۔ میں دل و جان سے تمہیں چاہتا ہوں بس ایک بار ہماری شادی ہو جائے پھر سب کچھ ہمارا ہوگا۔“ شادی کا سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

”یہ کیا اس کی تو شادی ہو چکی ہے شیرازیہ کے ساتھ یہ تو اس کے ساتھ دھوکا ہوگا۔“ مجھے اس انسان پر غصہ آنے لگا میں بے خود سا ہونے لگا قریب تھا کہ میں کچھ کر گزرتا! شاید میں نے کچھ اور بھی دیکھنا تھا۔

ایک دوسرا منظر میرے سامنے تھا۔ میں اس آدمی کا نام نہیں لیتا چاہتا، میں اس پر سخت برہم ہوں مجھے اس آدمی کی آواز سنائی دی۔ جو سائل سمندر پر موجود کسی کو آوازیں لگا رہا تھا میں نے غور کیا تو مجھے ایک نام سنائی دیا۔ عذرا میں نے دیکھا کہ وہ پانی کی لہروں کے درمیان سے گزرتی ہوئی اس آدمی کی طرف بڑھ رہی تھی لڑکی نے جیس جیس پہنچی ہوئی تھی اور اس کے بال کھلے تھے وہ بھی کافی حسین تھی میں نے دیکھا کہ اس آدمی نے لڑکی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا جیسے ان میں گہرے مراسم ہوں پھر وہی پیار و محبت کی باتیں جھوٹی محبت کی قسمیں ساتھ بھانے کے وعدے میں یہ سب دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی مجھے دیدہ دکھایا جا رہا تھا شاید اس انسان کی شیطانیت سے پردہ فاش کیا جا رہا تھا مجھے یہ بات بتلائی گئی کہ یہ انسان نہیں۔ حسین دوشیزاؤں کی عزت کا لیرا ہے ابھی تک تو میں یہ سمجھ پایا تھا شاید آگے بھی کچھ ہو۔

میں نے دیکھا کہ وہ آدمی اس ریسٹورنٹ والی لڑکی کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے اپنی بیوی شیرازیہ کو اپنا منتظر پاتا ہے مگر یہ کیا! شیرازیہ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی کو کچھ کر دنگ رہ جاتی ہے جبکہ اس آدمی کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ مجھے اس آدمی کی آواز سنائی دی۔ ”شیرازیہ! ان سے ملو یہ ہیں زادہ“ آدمی نے لڑکی کے بارے میں بتانا چاہا شاید شیرازیہ بھی اس کے بارے میں جان لینا



چاہتی تھی۔ ”زاہدہ کون زاہدہ؟“ شیرازیہ نے معنی خیز نظروں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”شیرازیہ! میرے ساتھ بھلا کون ہو سکتی ہے اب تمہیں بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“

”نہیں جیشید مجھے بتاؤ کہ یہ لڑکی کون ہے؟ اور تمہارے بازو سے لگی کیوں کھڑی ہے؟“ اس بار شیرازیہ کے لہجے سے اس لڑکی کے لئے نفرت جھلک رہی تھی۔

آدی نے ایک نظر اس زاہدہ نامی لڑکی کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ بتادوں اور پھر وہ بول پڑا۔ ”شیرازیہ مجھے تمہیں پہلے بتادینا چاہئے تھا مگر میں تمہیں سب کچھ پہلے ہی بتا دیتا تو تم میرے بستر کی زینت کبھی تانہی تمہارا قرب حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ میں نے کیا وہی بات اس لڑکی کی تو اب ہم دونوں میں بیوی ہیں۔“

”یہ سن کر شیرازیہ پر تو جیسے پہاڑ گرا پڑا“ کیا میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔“ شیرازیہ کی غم میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

”نہیں شیرازیہ تم میری بیوی تھی مگر اب نہیں ہو۔ اگر تم اس گھر میں رہنا چاہتی ہو تو اب تمہاری حیثیت نوکر کی سی ہوگی آگے تمہاری مرضی کہ تم کیا فیصلہ کرتی ہو۔“ آدی نے لا پرواہی سے کہا جیسے وہ شیرازیہ کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔

”ذلیل انسان میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ۔ میں اس عورت کو نہیں چھوڑوں گی جس نے مجھ سے میرا شوہر چھین لیا۔“ اتنا کہہ کر شیرازیہ اس لڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ مگر درمیان میں وہ شیطان کھڑا ہو گیا۔

”اگر اسے ہاتھ بھی لگایا تو ہاتھ کاٹ دوں گا۔“ آدی نے اس لڑکی کا دفاع کیا جو اس ساری سچویشن سے سنبھلی ہوئی اس آدی کے پیچھے کھڑی تھی۔

شیرازیہ نے اس آدی کو دھکا دیا تو وہ ایک طرف کوچا گرا اور وہ خود اس لڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کی گردن پر ہاتھ رکھ لئے اور زور سے دبانے لگی قریب تھا کہ وہ لڑکی کو جان سے مار ڈالتی۔

میں نے دیکھا کہ وہ آدی خنجر لینے شیرازیہ کے پیچھے کھڑا ہے وہ خنجر شیرازیہ کی پیٹ میں اتار دینا چاہتا تھا۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا مگر میں کچھ نہیں کر پار ہاتھا بس دیکھ اور سن سکتا تھا اس نے خنجر کے پے درپے وار شیرازیہ پر کر ڈالے اور اسے خون میں نہلا دیا۔ شیرازیہ کے ہاتھوں کی گرفت دھمکی پڑ گئی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گئی وہ لڑکی اپنا سانس بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی میں یہ سب دیکھ نہیں پار ہاتھا کہ میری آنکھوں کے سامنے شیرازیہ کو قتل کر دیا گیا۔

میں نے دیکھا کہ ایک بوسیدہ سے کپڑوں میں ملبوس شخص اندر داخل ہوتا ہے چال ڈھال سے وہ ان کا نوکر ہی لگتا تھا اس نے لاش کو دیکھا تو حیرت کا مجسمہ بنے اس آدی کو بٹکنے لگا۔ جس کے ہاتھ میں ابھی بھی خنجر موجود تھا اور اس سے خون ٹپک رہا تھا۔ ”صاحب جی آپ نے ایک اور خون کر دیا۔“ نوکر کی آواز سنائی د گویا کہ وہ پہلے ہی قتل کر چکا ہے۔

”ہاں میں نے ایک اور خون کر دیا ہے۔“ ایسا لگتا تھا کہ اس کا سانس پھولا ہوا ہے۔ ”تم جانتے ہونا لاش کا کیا کرنا ہے۔“

”جی صاحب یہی نا کہ اس کو بھی باقی لاشوں کی طرح گندے نا میں ڈال دیا جائے۔“

”ویری گڈ! اب تم جاؤ لاش کو غائب کرنے کا بندوبست کرو۔“ وہ نوکر باہر کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ ابھی وہ نوکر دروازے تک بھی پہنچا تھا کہ اس آدی کی آواز سنائی دی۔ ”ٹھہرو!“ نوکر کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ پلٹ کر اس آدی کو دیکھنے لگا۔ ”ایک لاش نہیں بلکہ دو لاشوں کو کھانے لگانا ہے۔“ یہ بات کہتے ہوئے اس آدی نے لڑکی کی طرف دیکھا تھا جو ابھی سنبھلی ہوئی کھڑی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ خنجر لئے اس لڑکی کی طرف بڑھنے لگا لڑکی خوف سے پیچھے ہٹنے لگی۔ اور اس سے رحم کی بجائے مانگنے لگی۔ ”جیشید تم مجھے نہیں مار سکتے دیکھو میں تمہاری ہونے والی بیوی ہوں۔“

”ہاں زاہدہ یہ بات درست ہے مگر کیا کروں سب کچھ تمہارے سامنے جو آ گیا ہے تمہیں مارنا میری مجبوری ہے۔“ اس آدی نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

”دیکھو جیشید میں کسی سے کچھ بھی نہیں کہوں گی خدا کے لئے مجھے مت مارو!“

”نہیں زاہدہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی سے کچھ بھی نہ کہو اور واقعی میں اگر تم کچھ نہ بھی کہو تو مجھے ہر وقت خوف لگا رہے گا اور میں خوف سے آزاد زندگی گزارنے کا عادی ہوں۔ زاہدہ مجھے معاف کر دینا میں یہ سب کرنے پر مجبور ہوں۔“

خنجر ہی دیر بعد وہ لڑکی خون میں لت پت فرش پر پڑی تھی میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا مگر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا میں بے بسی کی تصویر بنے یہ سب کچھ دیکھتا رہا جب مزید مجھ سے دیکھا نہ گیا تو میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں بند آنکھوں میں ظالم کا ظلم میرے دماغ میں گردش کر رہا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ دو لاشیں مجھ سے مدد مانگ رہی ہیں۔ اور میں بے حس سا ہو کر کھڑا ہوں کچھ سوچ کر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

مگر اب میں نے اپنے آپ کو پولیس اسٹیشن میں پایا میں نے دیکھا کہ اس طرح کئی کیس انسپکٹر کے سامنے موجود تھے مگر وہ گہرے خیالوں میں قاتل کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا اتنے میں ایک کانٹیل اندر داخل ہوا۔ ”آؤ آخر! بناؤ کچھ پتہ چلا قاتل کا۔“

”نہیں سر پچھلے ایک ماہ سے ہم قاتل کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر لگتا ہے پچھلے قتل کی طرح یہ دو قتل بھی لکے رہیں گے اور پھر مجبوراً ہمیں یہ کیس بھی بند کرنا پڑے گا۔“

اور پھر ایسا ہوا قاتل کا سراغ نہ لگنے کی وجہ سے کیس بند کر دیا گیا اور سیٹھ جیشید کے خلاف گرفتاری تک کے وارنٹ جاری نہ ہو سکے۔

میں انسپکٹر جمال کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا مگر میں کچھ بھی نہیں بتا پایا کہ میری آنکھوں کے سامنے

اندھیرا چھا گیا اور میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا۔ اندھیرا چھٹا تو میں اپنے کمرے میں موجود تھا میں نے دیکھا کہ اسی اندھیرے سے وہ لڑکی برآمد ہوئی جو روز مجھ سے ملنے آتی تھی وہ اندھیرے کو کاٹتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی اور میں اپنے بستر پر درازا سے اپنی طرف آتا دیکھ رہا تھا بہت جلد وہ میرے قریب آ کر بیٹھ چکی تھی مگر اب وہ قدرے اداس لگتی تھی کتنی ہی دیر وہ خاموشی سے سر جھکائے میرے پاس بیٹھی رہی۔ ”یہ ہے میری کہانی۔“ اس بار اس نے اوئے نہیں کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ غم میں ڈوبی ہوئی ہے اور غم میں ڈوبا انسان بے تکلفانہ گفتگو نہیں کر سکتا۔

”میں چاہتی ہوں کہ میرا قاتل کیفر کر دار تک پہنچے اور تم میری بے بسی کی کہانی لکھ کر نشر کرو۔ تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ میں کتنی مظلوم تھی اور سیٹھ جیشید کے چہرے سے شیطانیٹ کا پردہ فاش ہو جائے۔ میں چاہتی تو کب کی سیٹھ جیشید سے اپنی موت کا انتقام لے سکتی تھی۔ مگر میں یہ سب راز نہیں رکھنا چاہتی تھی یہی سوچ کر سب کچھ نہیں دکھلایا تاکہ ایک مظلوم کی داستان تم لوگوں کو سناسکو۔ اور میں خود بھی اسے مارنا نہیں چاہتی تاکہ یہ لوگوں کے لئے اسرار نا بن جائے کہ سیٹھ جیشید بلاوجہ اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا بلکہ پولیس کے ہاتھوں اسے سزا یافتہ مجرم ٹھہرا کر پھانسی کے پھندے تک پہنچانا ہے، ہاں اس سے پہلے ایک کام میں کرتی جاؤں گی وہ اپنی ساری جائیداد تمہارے نام کر دے گا، اب میں چلتی ہوں ہو سکتا ہے نہ ہماری آخری ملاقات ہو تم سمجھ گئے ہو گے، تم نے کیا لکھنا ہے۔“

”مگر آپ یہ سب لکھوانا چاہتی ہیں یہ سب تو ویسے بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے اس کے اٹھنے سے پہلے سوال کر ڈالا۔

”اس سے پہلے جو ہوا تھا وہ کیوں لکھوایا گیا تھا۔“ اس نے حاضر جوابی سے کام لیا۔

اس کا اشارہ کا شف اور شانلہ کے بارے میں لکھی گئی تحریر کی طرف تھا۔ وہ میری بات کا جواب دے



کر باہر کوچل دی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کہیں باہر اندھیرے میں گم ہو گئی اور میں اسے الوداع بھی نہ کہہ سکا۔

میں غنودگی کی حالت میں تھا کہ میرے موبائل کی رنگ ٹون بجنے لگی اور میری آنکھ کھل گئی میں موبائل اٹھا کر نمبر دیکھنے لگا۔ کاشف کا نمبر تھا۔ میں نے کال اوکے کی۔ ”بلو کاشف کیسے ہو؟“

”یار! منیر کہاں ہو؟ آج کالج کیوں نہیں آئے؟“ میری بات کا جواب دینے کی بجائے اپنا سوال کر ڈال۔

”ابھی ابھی آنکھ کھلی ہے بس تیار ہو کر نکلتا ہوں۔“ میں نے یہ بات ایسے کہہ دی جیسے میں ارد گرد سے بیگانہ تھا۔

”تیار ہو کر نکلتے ہو، تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا، ٹائم دیکھا ہے۔“ یہ سن کر میں نے گھڑی کی طرف نظر ڈالی تو گھڑی دن کے بارہ بج رہی تھی ”اوہ! تو“ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا ”سوری یار! پتہ نہیں آج میں ابھی تک کیوں سوتا رہا۔“

”اوکے اوکے شام کو میں تم سے ملتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر کاشف نے کال کنکٹ کر دی۔

”میں ابھی تک سوتا رہا ہوں۔ رات کو بھی جلدی ہی سو گیا تھا اور خاصا تھکا ہوا ابھی نہیں تھا۔“ میں خود سے باتیں کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ مجھے سب کچھ یاد آنے لگا کہ کس طرح وہ میرے خواب میں موجود تھی اور یہ بھی کہ خواب میں، میں نے اور بھی بہت کچھ دیکھا ہے کتنے ہی سین مجھے دکھائے گئے وہ مجھے سب یاد تھے۔

میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹاول لے کر واش روم چلا گیا فریش ہو کر کھانا کھانے باہر کوچل دیامیری واپسی تقریباً تین بجے ہوئی اب میں اپنے اندر تازگی محسوس کر رہا تھا۔ رات والا سارا خواب حقیقت بن کر میرے دماغ میں گھومنے لگا۔ اس نے میری تحریر کا خراج مانگا تھا اور مجھے اس بات سے دلچسپی نہیں تھا اس لئے میں نے ڈائری اٹھائی اور جس صفحہ پر وہ لڑکی اس

انسان کے سینے پر سوار تھی جیسا کہ اسے مارنا چاہ رہی تھی مجھے کچھ یاد پڑنے لگا کہ جیسے اس صفحہ پر اس کی کہانی لکھنی ہو۔ اور پھر یہی کچھ سوچ کر میں نے اس کہانی کے مجرم کو اس طرح کیغیر کردار تک پہنچایا۔

”سر آپ سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔“ ملازم نے اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے اسے باہر لان میں بیٹھاؤ میں آتا ہوں۔“ تھوڑی ہی دیر بعد میں لان میں بیٹھا تھا۔ میں لان میں بیٹھا لان کا جائزہ لینے لگا میرے خیال میں ایک رائٹر میں وہ ساری خوبیاں ہونی چاہئیں جو ایک پرائیویٹ سرائرساں میں ہونی ہے کچھ ایسے ہی میں گرد و نواح کا جائزہ لینے لگا شاید لکھنے کے لئے کچھ اچھا مل جائے۔ اتنے میں مجھے انسپکٹر جمال آتا نظر آیا میں ادب کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہیلو سر کیسے ہیں۔“ میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

”پلیز! بیٹھے۔“ انہوں نے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ انسپکٹر نے مجھے تعارف طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سر آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو جانتا ہوں۔ ویسے بھی ایک اسٹوڈنٹ کی کیا پلٹنی ہو سکتی ہے سر میرا نام منیر ہے اور میں سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں۔“ میں نے اپنا مختصر سا تعارف کرایا۔

”ہوں! تو میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔؟“ انسپکٹر نے میرے آنے کی وجہ جانتا چائی۔

”میں سر مجھے آپ کی خدمت نہیں چاہئے بلکہ یہ سمجھ لیں کہ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”میری مدد کرنا چاہتے ہو، میں سمجھا نہیں۔“ انسپکٹر نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

”میں سمجھا تا ہوں سر! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے علاقے میں ایسے کی قتل سانسے آئے جن

کا قاتل ابھی تک روپوش ہے۔ اور آپ بھی انتھک کوششوں کے باوجود قاتل کا سراغ لگانے میں ناکام رہے۔“

انسپکٹر جمال قتل کا سن کر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ”مگر تم یہ باتیں کیسے جانتے ہو؟“ انسپکٹر نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”سر میں ہی کیا بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ چھ ماہ سے لڑکیوں کا خون ہو رہا ہے اور ان کی لاشیں گندے نالے سے نکالی گئی ہیں۔“ میں نے ان کی حیرت دور کرنا چاہی۔

”دیکھو تم جو کوئی بھی ہو بات گھما پھرا کر کرنے کی بجائے سیدھے پوائنٹ پر آؤ۔“ انسپکٹر کا جیس بڑھتا جا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے سر! میں پوائنٹ پر آتا ہوں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قاتل کون ہے؟“

”قاتل کون ہے؟ مگر تم قاتل کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟“

”سر! اگر میں آپ سے کہوں کہ میں مقتولوں کی ردحوں سے مل چکا ہوں تو آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے اس لئے میں قاتل کے چہرے سے پردہ ہٹا دینا چاہتا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم قاتل کو جانتے ہو تو پھر تمہارے خیال میں قاتل کون ہے؟“

”سر! میرا خیال نہیں ہے بلکہ یقین سے کہہ رہا ہوں۔ آپ سیٹھ جشید کو تو جانتے ہی ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ سیٹھ جشید قاتل؟“

”انسپکٹر نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اپنا خدشا ظاہر کیا۔

”جی سر! آپ بالکل صحیح سمجھے ان لڑکیوں کا قاتل سیٹھ جشید ہی ہے۔“ میں نے انسپکٹر کے خدشے کو یقین کا رنگ دیتے ہوئے کہا۔

”دیکھو منیر! تم سمجھ رہے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو ایک ایسے شخص پر قتل کا الزام عائد کر رہے ہو جو اس

شہر کا بہت بڑا سیٹھ اور اثر و رسوخ کا مالک ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ اس شہر میں اس کی بہت عزت ہے اور ایسے میں اس کے خلاف قتل کا مقدمہ دائر کرنا ہمارے لئے مشکل ہوگا۔“

واقعی انسپکٹر نے مقتول بات کی تھی۔ ”سر آپ کی مشکل، میں آسان بنادیتا ہوں۔ یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ قتل ثابت کرنے کے لئے آپ کو چشم دید گواہ کی ضرورت پڑے گی اور میں ایسے چشم دید گواہ کو جانتا ہوں، پہلے آپ اس پر ہاتھ ڈالنے سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا۔“

”اچھا تو پھر چشم دید گواہ کون ہے؟“

”سر! چشم دید گواہ سیٹھ جشید کا نوکر کر مو ہے۔ جس نے اپنی آنکھوں سے یہ سارے قتل ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔“

”مگر کر مونے ابھی تک کسی کو بتایا کیوں نہیں؟“

”سر پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک ملازم ہے اور اس دور میں ملازمت ملنا مشکل ہے دوسری بات یہ ہے کہ پیسوں کے لالچ میں انسان کچھ بھی کر گزرتا ہے، بس سیدی سی بات ہے کہ اسے پیسے ملتے رہے اور وہ سیٹھ جشید کے کارناموں پر پردہ ڈالتا رہا۔“

”دیکھو منیر! تمہاری باتوں میں مجھے کچھ سچائی نظر آتی ہے مگر پھر بھی یہ سب جھوٹ ثابت ہوا تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“ انسپکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا اور میں بھی کھڑا ہو گیا۔

”بہر حال منیر! ہم اپنی کارروائی شروع کرتے ہیں تم اپنا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ دے دو، ہو سکتا ہے ہمیں تمہاری ضرورت پڑ جائے۔“

ایڈریس اور فون نمبر لکھنے کے بعد! ”اچھا سر! میں چلتا ہوں، اگر میری مدد کی ضرورت پڑے تو ضرور یاد کرنا۔“ میں نے تحریر پر سرسری نظر ڈالی کہ کچھ رہ تو نہیں گیا۔ ہاں یاد آیا اور پھر لکھنے لگا۔ پولیس نے سیٹھ جشید کو حراست میں لے لیا ہے، علاقے میں کئے گئے تمام قتل ثابت ہو گئے کہ سیٹھ جشید ہی ان کا قاتل تھا





## خاموش موت

شائستہ رحمر - راولپنڈی

انتقام کی آگ جب بھڑکی تو اس نے سب کچھ جلا کر فنا کر دیا، کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انتقام لینے والا اپنی ہی آگ میں جل کر خاکستر ہو جائے گا، مگر پھر بھی ایک ناقابل یقین واقعہ سامنے آیا۔

خود غرضی اور مفاد پرستی کی روٹے کھڑے کرتی بہت ہی عبرتناک اور تحیر انگیز کہانی

کبھی کسی میں سوچتا ہوں یہ دولت یہ بے کیا چیز ہے جو انسان کو رشتوں کی پیمان بھلا دیتی ہے اور انسان انسانیت کے مقام سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسے کبھی فراموش نہ کر پایا۔ یہ آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے اس وقت میں بی بی کام کا اسٹوڈنٹ تھا

کچھ مالی وجوہات کی بنا پر میرے والد کو اپنا گھر فروخت کرنا پڑا تھا اور پھر ہم کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گئے تھے۔ میں یعنی عارف اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اس لئے بہت لاڈلا بھی تھا میرے والد کا خواب تھا کہ وہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلائیں گے مگر اچانک کاروبار میں بھاری نقصان ہونے کی بنا پر ان کو اپنا کام دھندلاند کرنا پڑا تھا اور ایک دوست کے مشورے پر انہوں نے مکان

کچھ اور یاد آیا۔

وہ صیت کے مطابق سیٹھ جشید نے اپنی ساری جائیداد منیر چوہدری کے نام کر دی، یہ بات میں نے شیرازی کی خواہش کے مطابق لکھی تھی ورنہ تو میں ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ ایسے لکھا جائے۔

میں اپنے طور پر تحریر مکمل کر چکا تھا اس لئے ڈائری کو ایک طرف رکھ کر بستر پر دراز ہو گیا۔

ٹوویک لیٹر!

اب یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں کہ انسپکٹر جمال سے کب اور کیسے میری ملاقات ہوئی اور تحریر میں موجود ساری باتیں ہمارے درمیان ہوئیں ایک انجانی قوت مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کرتی رہی اور میں نے اپنے تمام کردار نبھائے۔

میں اور میرا دوست کاشف کافی شاپ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ میرے کانوں سے آواز نکل گئی۔

”ہیڈ لائنز کے ساتھ میں ہونیلا بانو! آج کی سنسنی خیز خبر! شہر میں ہونے والی لڑکیوں کے قتل سے پردہ فاش، قاتل اب پولیس کی حراست میں! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ قاتل کوئی اور نہیں بلکہ شہر کی مشہور شخصیت سیٹھ جشید ہے۔“

پھر سیٹھ جشید کو دکھایا گیا اس سے پہلے میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا

”سیٹھ جشید پر تمام قتل ثابت ہو چکے ہیں۔ سیٹھ جشید کا کہنا ہے کہ عورت میرا من بہلانے کے لئے ہے، کسی بھی عورت کو میں اپنے بستر کی زینت سمجھتا ہوں۔“

اتنے گندے نظریات رکھنے والا شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے والا انسپکٹر جمال ہے لیکن انسپکٹر جمال کا کہنا ہے کہ اس کیس کی دوبارہ اوپن کروانے والا ایک اینٹی ہے جس نے قاتل تک پہنچنے کے لئے ہمیں چشم دید گواہ پیش کیا۔

یہ سب دیکھ کر میرے چہرے پر خوشی رقص کرنے لگی۔ ”یا منیر! یہ سیٹھ جشید تو بڑا ہیچ آدمی نکلا۔“

سیٹھ جشید کے متعلق ہی ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں کے دوران بھی ایک بات میرے





فروخت کر دیا اور اس رقم سے انہوں نے بیرون ملک جا کر کام کرنا مناسب سمجھا یہ ان کا ایک اچھا فیصلہ تھا اور یوں وہ دینی چلے گئے۔

بینک میں وہ کچھ رقم ہمارے گھریلو خرچے اور دوسری ضروریات کے لئے جمع کروائے گئے تھے۔ جو کئی ماہ تک ہمارے لئے کافی تھی۔

جس مکان میں ہم شفٹ ہوئے تھے وہ مکان ایک بوڑھی عورت کا تھا جس کی دو بیٹیاں تھیں وہ دونوں بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ اس کی ایک بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ بیرون ملک سیٹل تھی۔ اور وہ اس بہت بڑے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ اس نے یہی بتایا تھا مگر جب ہم وہاں شفٹ ہوئے تب مجھے پتہ چلا کہ اس مکان میں ایک کمرہ ایسا بھی تھا جہاں ایک درمیانی عمر کا لاغر شخص رہتا تھا۔ مالک مکان عورت کے بقول وہ اس کا دیور مراد تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ ”مراد نے کوئی ایسا چلہ کیا تھا جس کو کائنات کے دوران وہ ہوائی چیزوں سے خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا تھا۔“

بس پھر اس کے بعد مراد کا ذہنی توازن بگڑ گیا وہ پاگل تھا اور کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔

اس لئے مالک مکان جس کا نام رضیہ تھا اس نے ہمیں منع کیا تھا کہ ہم مراد نامی شخص سے دور رہیں۔

اس عورت نے مجھے اور میری والدہ کو مراد سے اس قدر خوف زدہ کر دیا تھا کہ میں اس کے کمرے کے نزدیک سے گزرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اس کا کمرہ راہداری میں ہی موجود تھا۔

مراد خود بھی کم ہی اپنے کمرے سے نکلتا تھا۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے تین ماہ تک اس کی شکل دیکھی ہو۔ مراد کے متعلق قریبی دکان دار سے ہی سننے میں آیا تھا کہ وہ صرف اس دکان دار پر ہی بھروسہ کرتا ہے اور وہ دکان دار جو شاید اس کا کوئی قریبی دوست تھا اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتا تھا۔

مجھے آج بھی یاد ہے ان دنوں میرے

ایک از مشرورع ہوئے تھے میں پیپر کی تیاری کے لئے چھت پر گیا، ابھی میں چھت پر موجود چارپائی پر بیٹھنے لگا تھا کہ مجھے لگا میرے عقب میں کوئی موجود ہے۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو میرا اوپر کا سانس گویا اوپر ہی رہ گیا ہو۔

میرے سامنے انتہائی غلیظ حلیہ میں ایک شخص کھڑا تھا میلی کچیلی بنیان اور پٹھی پڑانی شلوار پہنے اس کے جسم پر تہہ در تہہ میل جم چکی تھی۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال جھاڑیوں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے چند قدم فاصلے پر کھڑا تھا مگر اس کے جسم سے اٹھنے والے بدبودار بھسکوں سے میرا سر پھٹنے لگا تھا۔

میں ایک دم اسے اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گیا اور وہ مجھے دیکھ کر یوں ڈر گیا اور پلٹ کر میزبوں کی طرف بھاگا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

یہ مراد سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس دن کے بعد میں نے کئی روز تک مراد کو دوبارہ نہ دیکھا اس کا دروازہ بند ہی رہتا تھا ایک طویل اور خوف ناک خاموشی کا راج اس کے کمرے پر طاری ہوتا تھا، وہ اپنے کمرے میں یوں بند رہتا تھا جیسے کوئی گمنام قبر میں دفن ہو۔ میں اس سے خوف زدہ تھا۔ اس کے باوجود میرے دماغ میں کئی سوالات تھے ”یہ نہیں وہ کیسے اس کمرے میں ناکل تہا رہتا ہے؟ نہ وہ کسی سے ملتا ہے اور نہ ہی بات کرتا ہے آخر وہ کیسے لوگوں سے کٹ کر رہا ہے؟ کیا اس کا دل نہیں گھبراتا اس کا دم نہیں گھٹتا اس غلاظت میں؟“ ایسے بے شمار سوالات تھے جن کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔

وہ دن اتوار کا تھا، میں دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل کر دوپہر کے وقت گھر لوٹا تھا۔ امی گھر میں نہیں تھیں، وہ مالک مکان رضیہ کے ساتھ اسی کے کسی رشتہ دار کی شادی میں گئی تھیں، امی کی بہت گہری دوستی رضیہ کے ساتھ ہو گئی تھی اس لئے وہ بازار وغیرہ اکٹھے ہی جایا کرتی تھیں۔ کھانا امی بنا کر گئی تھیں اور مالک مکان تھا کہ وہ رات آٹھ نو بجے سے پہلے گھر نہیں لوٹیں گی۔

میں بیرونی گیٹ میں داخل ہوا، جیسے ہی میں راہ

داری سے گزرا مجھے اس بند کمرے میں کراسنے کی آواز سنائی دی آواز سن کر میں فوراً ٹھٹک گیا اور شش و پنج میں مبتلا اس دروازے کو کچھ دیر تک گھورتا رہا مگر دوسری بار ابھرنے والی کراسنے کی آواز نے گویا مجھے سوچنے مجھنے سے عاری کر دیا اور میرے قدم غیر اداری طور پر اس کمرے کی طرف اٹھ گئے۔

میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا بدبو کے کئی غلاظت بھرے بھسکوں نے میرا استقبال کیا، تاہم میں انہیں نظر انداز کر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ مراد دروازے کے قریب انتہائی بے تربیتی کے عالم میں زمین پر پڑا تھا میں نے فوراً اس کے لاغر وجود کو چھوا تو ایک جھک سا مجھے لگا۔ اس کو اتنا تیز بخار ہو رہا تھا کہ اس کا پورا وجود کسی انگارے کی طرح تپ رہا تھا۔

میں نے فوراً مراد کو سہارا دے کر زمین پر پڑی میلی کچیلی چٹائی پر لٹا دیا وہ کچھ ہوش میں تھا اور مسلسل کراہ رہا تھا میرے گھر میں بخاری کچھ گولیاں موجود تھیں میں فوراً بھاگا اور جلدی سے بخاری کی گولیاں اور دودھ کا گلاس لے آیا، مراد کو دودھ کے ساتھ دو گولیاں دیں تو وہ سکون سے سو گیا، تب میں اس کے بستر کے قریب ہی بیٹھ کر اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے کمرے میں بوسیدہ بستر اور چند پرانے برتنوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا، میں کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ گیا۔

رات ہوئی تو میں نے سوچا مراد کی خیریت دریافت کر لوں اس لئے میں اس کے کمرے میں گیا، آہٹ کی آواز سن کر وہ فوراً بیدار ہو گیا مگر گفتا بہت کی وجہ سے وہ اٹھ کر بیٹھ نہ سکا، مجھے دیکھ کر وہ چونکا ضرور تھا مگر دوپہر کے وقت والا میرا سلوک اسے یاد تھا اس لئے وہ مانوس انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کھانے کا پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ میں فوراً بازار سے روٹیاں لے آیا سالن گھر میں موجود تھا، وہ گرم کر کے جب میں کھانے لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا، میں کھانا اس کے قریب ہی رکھ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اس نے

کپکپاتے ہوئے لاغر ہاتھوں کے ساتھ میرے ہاتھ کو تھاما اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں سخت حیران ہوا کہ وہ کیوں ایسے رد عمل کا مظاہرہ کر رہا ہے تاہم اس کو کھانا کھلانے کے بعد میں وہاں سے اٹھ گیا اپنے کمرے میں آتے ہی میرے دماغ میں مزید کئی سوالات ابھرنے لگے۔

”مجھے مراد بالکل بے ضرر اور قابل رحم لگا تھا اس کا لاغر وجود اس قابل تھا ہی نہیں کہ وہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا پھر رضیہ نے کیوں اس کو خطرناک پاگل کہا تھا؟“

کیا وہ نہیں چاہتی تھی کہ مراد کے قریب کوئی آئے؟

”وہ ایسا کیوں چاہتی تھی؟“ یہ باتیں میری سمجھ میں نہ آسکتیں۔ میری توقع کے مطابق امی رات نو بجے گھر لوٹیں وہ بہت تھکی ہوئیں تھیں اس لئے میں نے مراد کا ذکر کرنا ان سے مناسب نہ سمجھا۔ صبح جب میں کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا تب میں نے مراد کے متعلق ساری بات امی کو بتائی۔

میری امی ایک رحم دل خاتون تھیں ان کو مراد پر ترس آ گیا انہوں نے مراد کے لئے بھی ناشتہ بنایا میں ناشتہ مراد کے کمرے میں رکھ کر چلا گیا، مراد منہ سے کچھ نہ بولا بس منمون نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا تھا۔

یہ ایک رات کی بات ہے اس رات شدید طوفان آیا تھا بادل ہولناک آواز میں گرج رہے تھے اور شدید موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ایسے میں دفعتاً مجھے چھت سے کسی کے چیختے چلانے کی آواز سنائی دی۔ میں اور امی بیک وقت گھبرا کر اپنے اپنے کمروں سے نکل کر صحن میں آ گئے میں فوراً دروازہ کھول کر چھت کی طرف بھاگا تو مجھے مراد چیخ و پکار کرتا ہوا وہاں دکھائی دیا۔ وہ ٹھیک طرح سے بول نہیں پارہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

”کیا ہوا.....“ میں شدید بارش اور بادلوں کے شور میں چیختے ہوئے بولا۔



آواز میں بولی۔ ”میں..... میں چاہتی تھی کہ کوئی تو ایسا ہو جس کے سامنے میں اپنی حالت زار بیان کر سکوں میں اپنے اندر کی گناہوں کا بوجھ چھپائے ہوئے ہوں۔“

وہ گویا پھٹ پڑی تھی ”میں نے فوٹل کئے ہیں ایک اپنے شوہر کا اور دوسرا اپنے دیور مراد کا“ رضیہ کے منہ سے یہ حیرت ناک انکشاف سن کر ای لرز گئیں اور پریشانی سے میری طرف دیکھنے لگیں، میں نے آنکھوں کے اشارے سے ان کو پرسکون رہنے کا کہا۔

”آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں آئی؟“ میں نے فوراً اس سے پوچھا تو وہ نم ناک لہجے میں بولی۔ ”میں آج اس دورا پر پکڑی ہوں جہاں موت کا خوف ختم ہو جاتا ہے۔ میرے سامنے ایک ہی خوف ہے اور وہ اپنے خدا کا خوف ہے، مجھے یقین ہے خدا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میں نے اس دنیا میں جو سفاکی اور بربریت کا کھیل کھیلا ہے وہ میری آخرت برباد کر دے گا۔“

میرا شوہر کمال اولاد زینہ نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں فطری طور پر ایک جاسد اور جنونی عورت ہوں جو کبھی اپنے شوہر کو دوسری عورت کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتی تھی، میں نے پہلے کمال کو بہت سمجھایا کہ وہ دوسری شادی نہ کرنے جب وہ کسی طرح بھی نہ مانا تو میں نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو زہر دے دیا، میں نے اس وقت ہر رشتہ پر لحاظ کو بھلا کر یہ سب کیا تھا، یہ بھی نہ سوچا کہ وہ میری بیٹیوں کا باپ ہے۔

مراد ان دنوں انگلینڈ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا بھائی کی موت کا سن کر وہ فوراً پاکستان آیا مگر اس نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی جب وہ پاکستان پہنچا تو کمال کی تدفین ہو چکی تھی پورا خاندان جانتا تھا کہ کمال بیمار رہتا تھا اس لئے سب ہی کمال کی موت کو طبعی موت سمجھ رہے تھے مگر مراد کو یقین نہیں تھا اس نے پاکستان آتے ہی میرا جینا دوہر کر دیا، وہ میرے سامنے بر ملا کہتا تھا۔ ”میں نے کمال کو مارا ہے اور وہ لازمی اس

کچھ اسے ناپسندیدہ لگا ہوں سے دیکھنے لگے تھے کہ وہ اس عمر میں ایسی حرکتیں کر رہی تھی۔

کچھ ہی دنوں میں اس کی بیٹی اور داماد اس کے گھر آ گئے پہلے میرا خیال تھا کہ وہ کچھ دن کے لئے آئے ہیں۔ مگر اب ان کا ارادہ رضیہ کے گھر مستقل رہنے کا لگتا تھا اس لئے اس کے داماد نے مجھے فوری طور پر گھر خالی کرنے کا کہہ دیا اور دس دن کی مہلت دی تاکہ میں کوئی اچھا گھر دیکھ سکوں۔

رضیہ نہیں چاہتی تھی کہ ہم وہاں سے جائیں مگر اپنے داماد سے تھوڑی بہت بحث کے بعد اس نے خاموشی اختیار کر لی، میں نے بہت جلد ایک اچھا مکان تلاش کر لیا اور اپنی امی کے ساتھ وہاں شفٹ ہو گیا۔ دو ماہ گزر گئے۔ میں بی کام میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا اور یونیورسٹی میں ایڈمیشن بھی مجھے مل گیا اور میں نے اپنی تمام تر توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کر دی۔

ایک شام امی نے مجھ سے رضیہ سے ملنے کا اصرار کیا تو میں امی کو رضیہ سے ملانے لے گیا، ابھی ہم دونوں راہ داری میں ہی داخل ہوئے تھے کہ راہداری میں واقع کمرے سے کسی کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ کمرہ کبھی مرحوم مراد کا تھا۔

میں فوراً امی کے ساتھ دروازہ کھول کر اس کمرے میں داخل ہوا اور دنگ رہ گیا میرے سامنے رضیہ انتہائی بری حالت میں چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی، وہ کئی دنوں کی بیمار لگتی تھی حد یہ کہ اس کے پاس کوئی اس کی تیمارداری کے لئے بھی موجود نہ تھا۔

رضیہ مجھے اور میری امی کو دیکھ کر بہت حیران ہوئی اور روئے لگی میری امی نے اس کے قریب ہی بیٹھ کر اسے دلاسا دیا تو وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میرا آخری وقت قریب ہے، میں کتنی بد قسمت ہوں کہ اس وقت بالکل تنہا ہوں، میرے داماد نے مجھے اس بوسیدہ کمرے میں بیکار سامان کی طرح پھینک دیا ہے میری اولاد کو بھی میری کوئی پرواہ نہیں۔“

مچھراس نے میری امی کا ہاتھ پکڑ لیا اور نجیف

آنکھ کھلی، میں یہ نہیں کس وقت سویا تھا، رونے کی آواز سن کر میرا بے چین دماغ فوراً بیدار ہو گیا۔ میں جلدی سے بیڈ سے اتر اور رجن میں آ گیا جہاں میری امی پہلے سے موجود تھیں ”کیا ہوا امی؟“ میں نے پریشانی سے پوچھا۔

”بیٹا مراد فوت ہو گیا ہے۔“

”کیا؟؟؟“ امی کی بات سن کر مجھے شدید غم کا جھٹکا لگا۔ میں مزید کچھ پوچھے بغیر فوراً اپنا حلیہ درست کر کے صرور تھال کا جائزہ لینے باہر نکلا۔ مراد واقعی فوت ہو گیا۔

سننے میں یہی آیا تھا کہ رات کے کسی پہر وہ فوت ہوا تھا اس کی موت بڑی اچانک تھی، سب یہی سمجھ رہے تھے ”شدید سردی کی وجہ سے مراد کی موت واقع ہوئی ہے۔“ اور ان سب میں ایک میں بھی شامل تھا۔

مراد کفن میں ملبوس میرے سامنے چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کا مچھایا ہوا چہرہ آخری غسل کے بعد کہیں بہتر لگ رہا تھا وہ کئی اسرار لئے منوں مٹی تلے دفن ہونے جا رہا تھا اور میں حسرت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے سوائے افسوس کے کچھ نہ کر سکتا تھا اب سب کچھ ختم ہو چکا تھا وہ وجود ہی مٹ گیا تھا جو میرے لئے باعثِ حس تھا، اب میں مراد کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کرتا بھی تو کس لئے؟ اس کا فائدہ کیا تھا؟

کیونکہ یہ سب کر کے مراد تو واپس آنے والا نہیں تھا۔ اس لئے میں نے خاموشی اختیار کر لی مگر پھر عجیب صورت حال رہنے لگی۔ مراد کی بھیجا رضیہ کی حالت بہت حد تک ایب نارمل سی ہونے لگی تھی۔ وہ ساری ساری رات اونچی آواز میں گانے سنتی رہتی یا اکثر کسی بے چین روح کی طرح ادھر ادھر ٹپکتی رہتی تھی وہ اندر ہی اندر اندہ ناک پریشانی کا شکار تھی، وہ پریشانی کیا تھی یہ تو میں وہی جانتی تھی مگر اس کی ان حرکتوں کے سبب آس پاس رہنے والے لوگوں نے اس کے متعلق کچھ گویاں شروع کر دی تھیں کچھ کا خیال تھا کہ اس کا ذہن توازن بگڑ گیا ہے

مراد بول نہیں پارتا تھا بس بچے کی طرف اشارہ کر رہا تھا جیسے اس کے کمرے میں کوئی ہو، میں نے مراد کو سہارا دیا اور اس کے کمرے کی طرف لے جانے کی نیت سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ مراد اپنے کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا وہ بہت خوف زدہ تھا مگر یہ نہیں کیوں وہ مجھ پر اس حد تک بھروسہ کرنے لگا تھا کہ میرے سامنے انکار نہ کر پایا۔ میں اسے تھاتے ہی نیچے اس کے کمرے میں لے آیا اس کا پورا وجود جھجک گیا تھا۔

میری امی بھی مراد کے کمرے میں آ گئیں وہ کبل اور میرے کپڑوں کا ایک جوڑا لائی تھیں وہ بولیں۔ ”اس کے کپڑے تبدیل کرو اگر اسے لٹا دو۔“ میں نے ایسے ہی کیا۔ جب میں دروازے سے نکلے لگا تو چونک گیا میرے سامنے مالک مکان رضہ جانے کی پیالی تھا۔ کھڑی تھی وہ سرگوشی سے بولی۔

”مجھے اس پاگل سے ڈر لگتا ہے تب میں اسے دیکھنے نہیں آئی تم ایسا کرو یہ قبوہ اسے پلا دو بہت ٹھنڈ ہے اس کو سردی لگ گئی ہوگی۔“

میں نے فوراً پیالی کو پکڑا اور پھر مراد کے کمرے میں چلا آیا اس کے پاس بیٹھ کر میں نے اس کو قبوہ پلایا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

وہ طوفانی رات بڑی لمبی اور وحشت بھری تھی یوں لگتا تھا جیسے وقت ختم سا گیا ہو۔ ایک ایک لمحہ کسی صدی کی طرح گزرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا کیسا عجیب وحشت بھرا احساس مگر اس تمام کیفیت کی وجہ مراد ہی تھا۔ میں ساری رات کروٹیں بدل بدل کر اس کے متعلق سوچتا رہا۔ ”کچھ تو تھا ایسا جو پوشیدہ تھا۔“

مراد کی جو حالت تھی، دل نہیں مانتا تھا کہ وہ کسی چلے میں اس حالت کا شکار ہوا تھا، میں تنجیدگی سے مراد کے معاملے کے متعلق سوچ رہا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ میں ضرور مراد کی گزشتہ زندگی سے پردہ اٹھاؤں گا۔“

مگر اگلے دن کا سورج گویا ہر بات کا اختتام بن کر طلوع ہوا تھا وہ ہو گیا جس کا مجھے کبھی اندازہ بھی نہ تھا۔ صبح رونے اور چیخ و پکار کی آواز سن کر میری





## جناتی دنیا

ساجدہ راجا - ہندواں سرگودھا

اچانک کمرے میں موجود جن کو ایک بہت ہی کرخت ڈرائونی اور خوفناک آواز سنائی دی، جسے سن کر وہ دھل گیا، پھر وہ خوفناک کریہہ صورت مخلوق کمرے میں وارد ہوگئی اور اس کی قہر برساتی نگاہوں سے.....

دو ماورائی مخلوق کی لرزادینے والی خوفناک اور ڈراؤنی ناقابل یقین..... خونی رو داد

صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ ”زرباش“ جو اسے بہت منتوں مرادوں کے بعد ملا تھا اور اسے بہت پیارا تھا اس کی ہر جائز بات ضرور پوری ہوتی تھی۔

لیکن گوباش اپنے اصول کا بہت پکا تھا، جہاں بات اصول کی آتی وہ کسی صورت پیچھے نہیں ہٹتا تھا یہی بات تھی کہ زرباش اس کا بہت لاڈلا ہونے کے باوجود بگڑا ہوا ہرگز نہ تھا اور نہ ہی اسے اس بات پر غور تھا کہ

”بابا“ مجھے ایک بار انسانی دنیا میں جانے کی اجازت دے دیں۔ مجھے بڑا شوق ہے انسانوں کو دیکھنے اور ان کے ساتھ رہنے کا۔“ زرباش نے اپنے والد گوباش سے التجائیہ لہجے میں کہا لیکن وہ کسی صورت ماننے پر تیار نہیں تھا۔

ان کا تعلق قبیلہ جنات سے تھا اور وہ مسلمان جنات تھے گوباش عمر رسیدہ اور قبیلہ کا سردار جن تھا اس کا

پڑا اور چھت کی طرف بھاگ گیا، میں پریشانی کے عالم میں تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی رہی پھر موقع دیکھ کر فوراً اپنے پورشن میں آگئی پھر میں نے قبوہ بنایا اور اس میں زہر ڈال کر تمہیں وہ پیالی پکڑائی، مجھے یقین تھا کہ مراد تم پر اعتبار کرنے لگا تھا اس لئے وہ قبوہ پی لے گا اور وہی ہوا، وہ قبوہ پی کر مر گیا۔ میں بڑی گناہ گار ہوں مجھے پتہ ہے آپ دونوں بھی مجھ سے یہ سب سننے کے بعد نفرت کرو گے۔“

میں حیرت کے عالم میں اس کے منہ سے وہ تمام رو داد سن رہا تھا، وہ رورور کرتا رہی تھی کہ ”جب سے مراد فوت ہوا ہے، اس کی روح اس گھر میں منڈلاتی رہتی ہے وہ میرے بستر کے ارد گرد گھوم پھرتا ہے، میں اسے دیکھ کر چیختی چلاتی ہوں، تب میرے داماد نے تنگ آ کر مجھے اس کمرے میں منتقل کر دیا ہے، وہ مجھے پاگل سمجھتا ہے مگر میں سچ بتا رہی ہوں مراد اس گھر سے گیا نہیں بلکہ میرے بدترین اعمالوں کی سزا بن کر میرے آس پاس رہتا ہے۔“

وہ اپنے بال پکڑ کر نوچنے لگی ”میں کیا کروں میرے خدا! میں مریوں نہیں جاتی، مجھے نجات دے اس تکلیف سے“ وہ ہڈیانی آواز میں مسلسل چیخ رہی تھی اور میری امی اسے سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

میں اپنی جگہ ساکت کسی گہرے صدمے میں غرق تھا، رضیہ نے میرے ہاتھ سے مراد کو زہر دیا تھا، وہ بے چارہ تو مجھ پر اعتبار کرنے لگا تھا۔

اس سارے خونریز واقعہ میں میرا کوئی قصور نہ تھا مگر میں پھر بھی خود کو گناہ گار سمجھتا ہوں، ہر دعائیں اپنے رب سے اپنے لئے بخشش کی دعا مانگتا ہوں۔ رضیہ تو کچھ ہی دنوں بعد مر گئی مگر میں آج تک اس خلش سے آزاد نہ ہو پایا اور نہ ہی میں مراد کی موت کو کبھی فراموش کر سکتا ہوں۔



سارے معاملے کی تفتیش کروائے گا۔“

میں نے اس کے سامنے بالکل بھی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کیا مگر میں مجرم تھی اور دل ہی دل میں مراد کی دھمکی سے خوف زدہ ہوگئی اسے ایک دم راستے سے ہٹانے سے مجھ پر شک بھی کیا جاسکتا تھا۔

اس لئے میں ایک سفلی علم کرنے والے عامل کے پاس پہنچ گئی اور اس کو منہ مانگے پیسے دے کر مراد پر ایسا سفلی عالم کروایا کہ وہ لپٹے حواسوں میں ہی نہ رہا، وہ غلاظت کو پسند کرنے لگا اور غلاظت زدہ حلیہ میں سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔

میں نے خاندان میں یہی مشہور کر دیا کہ وہ چلہ میں کوتاہی کی وجہ سے اس حالت کا شکار ہوا ہے۔“ مگر اس کی حالت کی ذمہ دار صرف اور صرف میں تھی۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ مراد بد حواس ہو کر بہت جلد مر جائے گا یا وہ خوشی کر لے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔

بد حواس ہونے کے باوجود اس کی مجھ سے نفرت برقرار رہی تھی وہ کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی بند رہتا تھا یہی میرے حق میں بہتر تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کوئی بھی اس کے قریب آئے اس لئے مراد کے متعلق لوگوں میں ایسی باتیں مشہور کر دی تھیں کہ جو بھی منتا مراد سے خوف زدہ ہو جاتا۔

مراد اس مکان کے آدھے حصے کا مالک تھا اس کے علاوہ اس کی زمینیں بھی تھیں میں چاہتی تھی کہ وہ مر جائے اور اس کی جائیداد میرے اور میری بیٹیوں کے حصے میں آجائے اس لئے میں نے ایک خطرناک منصوبہ بنایا۔

مراد کو قتل کرنے کا، اس طوفانی رات میں جب مراد بیمار تھا تم مراد کو کھانا دے کر سونے چلے گئے تب میں دے بے قدموں نیکے لے کر مراد کے کمرے میں پہنچی میرا ارادہ یہی تھا کہ اس نیکے کو مراد کے منہ پر رکھ کر اس کا سانس بند کر دوں گی مگر میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی اور مراد کے قریب پہنچی تو وہ بیدار ہو گیا بجلی کی گرج چمک میں اس نے مجھے پہچان لیا اور خوف زدہ ہو کر چیخ



وہ سردار کا بیٹا ہے۔

ہر چند وہ نہایت شرارتی کھنڈر اور سن موجی قسم کا نوجوان جن تھا لیکن اس کی کسی عادت میں بھی دوسروں کا نقصان نہیں تھا بلکہ وہ ہر ممکن طریقے سے مصیبت زدوں کی مدد کرتا تھا قلیلے کا ہر جن اس سے خوش تھا اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتا تھا۔

زرباش ہر وقت خوش رہتا اور اپنی شرارتوں سے دوسروں کو خوش رکھتا تھا پھر اس نے اپنے بزرگوں اور قبیلے کے دوسرے جنات سے انسانوں کے بارے میں سنا تو اس کے دل میں بھی انسانی دنیا کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی جس کا اظہار اس نے اپنے والد کو زرباش سے کیا کیونکہ سردار کی اجازت کے بغیر کوئی بھی جن انسانی دنیا میں نہیں جاسکتا تھا اگر وہ ایسا کرتے تو ان کو اس کی بہت بھیاں سزا ملتی تھی۔ زرباش کو اس بات کی توقع تھی کہ اسے اتنی جلدی اجازت نہیں ملے گی لیکن اس نے بہت نہ ہاری۔

”بابا مان جائیں ناں۔ میں وہاں جا کر انسانوں کو صرف دیکھنا اور ان کی عادات کو مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں مان جائیے پلیر!“

اس کی اس بات پر گوباش نے خشکیں نگاہوں سے گھورا اور بولا۔ ”یہ پلیر وغیرہ کے الفاظ تم نے کہاں سے سیکھے؟“

اس کے سوال پر زرباش گڑبڑا کر وضاحت کی۔ ”وہ بابا..... دراصل..... مجھے کھانے بتایا ہے کہ انسانی دنیا میں انسان ہر بات پر پلیر، پلیر! کارنا لگائے رکھتے ہیں اس لئے میری زبان پر بھی.....“ زرباش نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”مجھے یہ تھا یہ بات اسی کم بخت نے تمہیں بتائی ہوگی۔ ایک بار کیا انسانی دنیا میں گیا سارے انہی کے طور طریقے سیکھ کر آ گیا، میں آج ہی اسے بلا کر سرزنش کرتا ہوں کہ آئندہ وہ آدم زادوں والی کوئی بات نہیں کرے گا اور تم بھی کان کھول کر سن لو۔ آئندہ تم بھی ادھر جانے کی ضد نہیں کرو گے آدم زادوں نے بھی

ہماری دنیا میں مداخلت نہیں کی تو ہم کیوں ان کو تنگ کریں ان کی زندگی میں مداخلت کریں؟ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کی کچھ حدود بتائی ہیں جن سے نکلنے کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم انسانی دنیا میں جا کر وہاں کچھ غلط کرو جس کی تمہیں سزا ملے۔ تم میرے اکلوتے بیٹھے ہو۔ میں کبھی تمہیں کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر گوباش خاموش ہو گیا لیکن اس کی آنکھوں کی نمی نے اس کے دل کی حالت کی وضاحت کر دی۔

زرباش نے لاڈ سے باپ کے گلے میں بائیں ڈال دیں اور بولا۔ ”بابا کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں؟ بابا آپ کی تربیت کبھی مجھے کچھ غلط نہیں کرنے دے گی اور میں آدم زادوں کا ذن تو نہیں ہوں جو میں کچھ ایسا کروں گا۔ آپ مجھ پر یقین رکھیں۔ بالکل میں کچھ بھی غلط نہیں کروں گا۔ پلیر! بابا پلیر!“

گوباش نے سرزنش کرنے والی آنکھوں سے دیکھا تو زرباش گڑبڑا کر خاموش ہو گیا پھر دونوں باپ بیٹے کی ہنسی نے پرسکوت فضا میں ایک طلسم بکھیر دیا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! میں تمہیں وہاں جانے کی اجازت تو دے رہا ہوں لیکن وعدہ کرو کہ وہاں بے گناہ اور معصوم لوگوں کو تنگ نہیں کرو گے اور مظلوموں کو جہاں تمہاری ضرورت ہوئی تو ضرور مدد کرو گے۔“ گوباش نے زرباش کو جانے کی اجازت دی تو وہ خوشی سے پاگل ہونے لگا۔

”بابا بہت بہت شکریہ۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ بالکل وہی کروں گا جیسا آپ نے کہا ہے۔“

”لیکن بیٹا! ابھی تو تم انسانوں میں گئے بھی نہیں اور ان کی اتنی باتیں تم نے اپنی اپنی اگر ان کے پاس چلے گئے تو یہ نہیں اپنے طور طریقے بالکل بھول ہی نہ جاؤ۔“ گوباش نے زرباش کے ”تھینک یو“ کہنے پر ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو زرباش کی ہنسی چھوٹ گئی.....

زرباش انسانی دنیا میں آیا تو حیران ہو گیا اس

نے خواب میں بھی اس طرح کی چیزیں نہیں دیکھی تھیں۔ بڑی بڑی آسمان کو چھوئی عمارتیں ٹریفک کا اڑدھام۔ لوگوں کا جھوم۔ غرض ہر چیز اسے حیران کئے دے رہی تھی وہ ابھی کھڑا ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس کی نظر لوگوں کے زیادہ جھوم پر پڑی وہ اس جھوم کی طرف بڑھ گیا اس وقت وہ انسانی شکل میں ایک خوبصورت نوجوان کے روپ میں تھا قریب جا کر اسے پسہ چلا کہ وہ بارات تھی جو روانہ ہونے کے لئے تیار تھی شادی بارات کا مطلب تو وہ بہر حال جانتا تھا۔ دولہا گھوڑے کے قریب اس پر چڑھنے کے لئے پرتول رہا تھا جب زرباش گھوڑے کے سامنے جا کھڑا ہوا پھر گھوڑے کی نظر زرباش پر پڑی تو وہ بدک گیا کیونکہ جانور جنوں کی موجودگی فوراً محسوس کر لیتے ہیں گھوڑے کا بدکنہ تھا کہ دولہا جو گھوڑے پر چڑھنے کے لئے چھلانگ لگا چا تھا دوسری طرف ذہن پر جا کر۔

سب لوگوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر انہوں نے گھوڑے کو قابو کیا اور دو لمبے کو اس پر سوار کر دیا۔ زرباش اس وقت تک گھوڑے کے سامنے سے ہٹ چکا تھا اس لئے گھوڑے نے پھر کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بارات پیدل ہی روانہ ہوئی، زرباش بھی ساتھ ساتھ تھا کسی کی توجہ اس کی طرف نہیں گئی بھلا اتنی بیٹھڑ میں کون اس پر توجہ دیتا اور یہی سبھی وہ انسانی شکل میں تھا۔

سفر زیادہ طویل نہیں تھا وہ بہت جلد ہی دلہن کے گھر پہنچ گئے ساری رسموں کو اس نے بڑے غور اور دل چسپی سے دیکھا پھر کھانے کے وقت اس نے خوب پیٹ بھر کھا یا۔ بے چارے ویڈیو بھی حیران تھے کہ شکل سے معصوم نظر آنے والا نوجوان اتنا خوش خوراک تھا بلکہ خوش خوراک سے بھی کچھ آگے۔

پہاڑی علاقے میں پہنچ کر وہ سمور ہو گیا قدرت کے حسین نظارے دل موہ رہے تھے۔ اتنی خوبصورتی اس نے کہاں دیکھی تھی مانا کہ ان کی اپنی دنیا بھی کافی حسین تھی لیکن جو دل کشی یہاں تھی وہ اس نے کہیں نہیں دیکھی تھی ندی کے پاس جا کر وہ بیٹھ گیا ندی سبک

روی سے بہتی ہوئی دیکھنے والوں کو سحر کر رہی تھی۔ پانی اتنا شفاف تھا کہ ندی کی تہ تک ہر چیز نظر آ رہی تھی زرباش کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ ندی کے صاف شفاف پانی میں کود جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی جان جانے کا بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔

جن چونکہ آگ سے بنے ہوتے ہیں اس لئے پانی ان کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ان کی اپنی دنیا میں بھی پانی تھا لیکن وہ اس پانی سے اس لئے مختلف تھا کہ اس میں نہانے یا اسے پینے سے انہیں کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ ہر مخلوق کی اپنی کچھ حدود ہوتی ہیں جنہیں بہر حال انہیں پورا کرنا ہوتا ہے۔

زرباش ٹنگلی باندھے ندی کے پانی پر نظر پس جمائے ہوئے تھا۔ ندی کی تہ شفاف پانی میں واضح تھی اور اسی تہ میں زرباش کو کچھ ایسا نظر آیا جس سے وہ چونک پڑا۔

☆.....☆.....☆

”گوما تم جانتے ہو۔ مجھے جنات سے کتنی نفرت ہے میرا دل چاہتا ہے میں انہیں تہس نہس کر دوں۔ وہ ہر کام نہیں جو ہم فطرت کے خلاف کرتے ہیں روڑے اٹکاتے ہیں خاص کر گوباش نامی وہ جن۔ جسے جنات کے قبیلے کی سرداری ملی ہے وہ بہت زیادہ مداخلت کر رہا ہے اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑے گا ورنہ ضرور ہمیں تہس نہس کر دے گا۔“ گوما کے سردار نے اسے مخاطب کیا۔

وہ ایک ایسی مخلوق سے تعلق رکھتے تھے جو نہ انسان تھے نہ جنات، بلکہ وہ ان دونوں کے خلاف تھے ان کی ہیئت اتنی خوفناک تھی انسان تو انسان جنات بھی حیران اور خوف زدہ ہو جاتے تھے۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سردار..... اب کیا حکم ہے؟“ گومانے مودبانہ لہجے میں سردار کو مخاطب کیا تو جواباً وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا۔ ”انہیں یک مشت ختم کرنا ناممکن ہے۔ ہمیں



کچھ ایسا سوچتا ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ ہوئے.....“

”تم ایسا کرو خود بھی اور کچھ دوسروں کو بھی لے کر جنات قوم پر نظر رکھو اور جیسے ہی موقع ملے سردار گوباش کے پاس جواگٹھی ہے وہ چرائی ہے اور مجھے لاکر دینی ہے۔“

”لیکن اس سے کیا ہوگا سردار.....؟“ گومانے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تم شاید نہیں جانتے کہ اس انگوٹھی کی خاص بات یہ ہے کہ جب تک جنات کی شادی کے وقت وہ انگوٹھی موجود نہ ہو اس وقت تک شادی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جس طرح مسلمانوں میں قاضی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا اسی طرح جنات میں اس انگوٹھی کی غیر موجودگی میں نکاح واقع نہیں ہوتا اور تم تو جانتے ہو مسلمان جنات ہو یا آدم زاد..... غلط طریقے سے عورت سے تعلقات قائم نہیں کرتے۔“

اگر وہ انگوٹھی غائب ہو جائے تو وہ شادیاں نہیں کر سکیں گے اور شادی نہیں ہوگی تو لازمی بات ہے بچے بھی پیدا نہیں ہوں گے اس طرح جو بوڑھے جنات ہیں وہ آہستہ آہستہ مرتے رہیں گے چونکہ بچے پیدا نہیں ہوں گے تو آہستہ آہستہ جنات کا وجود ختم ہو جائے گا ہمیں خود کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔“ سردار نے گومان کو اپنا منصوبہ بتایا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔

”واہ سردار..... کمال کر دیا..... اتنا اعلیٰ منصوبہ صرف آپ ہی بنا سکتے ہیں۔“ گومانے خوشامداندہ انداز اختیار کیا جبکہ سردار اپنی تعریف پر مزید خوش ہو گیا۔

تعریف کے بری لگتی ہے چاہے انسان ہو یا کوئی بھی مخلوق۔ اپنی تعریف سننے میں سب کو مزہ آتا ہے۔ پھر وہ مل کر منصوبے کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

جب منصوبہ ہر طرح سے مکمل ہو گیا تو سردار نے گومانے کہا۔ ”کیا تم آدم زادوں کی دنیا سے وہ چیز لائے ہو جن سے پیٹے ہی عجیب سا سرور آ جاتا ہے.....؟“

”جی سردار۔ میں کل ہی مزید وہ چیز لایا تھا بہت زیادہ مقدار میں۔ آدم زاد اسے شراب کہہ کر پکارتے ہیں، مسلمان تو اس سے دور رہتے ہیں لیکن پھر بھی بہت سے چوری چھپے پیتے ہیں۔“

”بہت خوب..... ہم تم سے بہت خوش ہیں گومانے یہ انسان ہے کمال کی چیز..... ایسی ایسی چیزیں تیار کر لی ہیں کہ ہم تو بس سوچتے رہ جاتے ہیں۔ اب شراب کو بھی دیکھ لو۔ کتنے مزے کی چیز ہے۔ تم کیا کہہ رہے تھے کہ مسلمان زیادہ تر اس سے دور رہتے ہیں۔“ سردار نے سوالیہ نظروں سے گومان کی طرف دیکھا۔ ”آئی زبردست چیز انہوں نے تیار کی ہے اور ان کے پاس ہے بھی زیادہ مقدار میں تو پھر وہ کیوں اس سے دور رہتے ہیں؟“

”سردار مسلمانوں کے مطابق یہ حرام چیز ہے جو انسان کو حیوان سے بدتر بنا دیتی ہے اور وہ اپنے پرانے کی تمیز بھول جاتا ہے۔ ان کے مذہبی پیشوائے بھی انہیں شراب پینے سے منع فرمایا ہے اس لئے وہ اس سے دور رہتے ہیں لیکن میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ کچھ ہیں جو شراب کو پانی کی طرح پیتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔“ گومانے تفصیلاً ساری معلومات سردار کو فراہم کر دی تو وہ حیران رہ گیا۔

”واہ گومانے..... تم تو آدم زادوں کے متعلق کافی کچھ جانتے ہو اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم ضرور جنات کے سردار سے وہ انگوٹھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ بس اب جلدی سے وہ انگوٹھی لاکر دو تاکہ ان جنات کا خاتمہ یقینی ہو سکے۔“ سردار نے اٹھتے ہوئے کہا تو گومانے بھی سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا.....

وہ ایک بد نظرت مخلوق تھی نہایت سرکش..... قدرت کے قانون کے خلاف چلنا ان کا وطیرہ تھا خاص کر مسلمان جنات کے خلاف تھے، انسان کی نظروں سے تو وہ دور تھے لیکن جنات کو ان کی ساری سرگرمیوں کی خبر تھی اور وہ ان کو غلط کاموں سے روکتے رہتے تھے

ان جنات کی وجہ سے وہ کھل کر نہیں کھیل سکتے تھے اس لئے وہ ان کے خلاف تھے اور ان کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔

لیکن جنات ان سے زیادہ طاقتور تھے اس لئے وہ کھل کر ان کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتے تھے اس لئے بہت سوچ بچار کے بعد ان کے سردار کے ذہن میں انگوٹھی چرانے والا منصوبہ آیا۔ اس طرح جنات کا خاتمہ ہونے میں بہت عرصہ لگ جاتا لیکن کچھ نہ ہونے سے ہونا بہر حال بہتر ہوتا ہے۔

وہ اسی اصول پر کاربند ہو کر رہنا اور جنات کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے انگوٹھی چرانے کے لئے کوششیں شروع کر دیں اور انہیں جلد ہی اس میں کامیابی ہو گئی۔ ہر قوم میں کچھ نہ کچھ خدائے ہوتے ہیں جو میر صادق کا کردار ادا کرتے ہیں۔

سردار گوباش کے پاس بھی ایک خادم آستین کا سانپ ثابت ہوا..... اس نے لالچ میں آ کر وہ انگوٹھی چرا کر گومانے کے حوالے کر دی بعد میں اس کی غداری ظاہر ہوئی تو اس کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو عموماً غداروں کے ساتھ ہوتا ہے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا لیکن وہ انگوٹھی واپس نہ حاصل کر سکے اس وجہ سے ان کے قبیلے میں شادیاں رک گئیں۔

سردار گوباش بہت زیادہ فکر مند تھا اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ انگوٹھی حاصل کر لے لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی دیے بھی انگوٹھی اس مخلوق کے قبضے میں ہونے کی وجہ سے جنات کا زور ان میں نہیں چل سکتا تھا۔

اور پھر سردار کو پتہ چلا کہ وہ انگوٹھی انسانی دنیا میں پہنچ گئی ہے اور کسی پہاڑی علاقے میں کسی بچے جیسے میں پھینک دی گئی ہے تو وہ مایوس ہو گیا ایک توان کی جنتی طاقتیں پانی پر بے اثر تھیں اور سارا وہ جیسے سارا سال بچے رہتے ہیں یہ نہیں وہ انگوٹھی کہاں سے کہاں چلی گئی ہوگی اب سوائے صبر اور خدا سے دعا کے اور کوئی چیز نہیں تھی انہیں یہ تو بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کس پہاڑی علاقے کے کس چشمے میں پھینکی گئی ہے اگر اسے پتہ ہوتا تو انسانوں

کی مدد بھی حاصل کر سکتا تھا۔

اس وقت زرباش بہت چھوٹا تھا لیکن بڑا ہونے تک یہ بات اسے ازبر ہو چکی تھی اور ویسے بھی ان کے قبیلے میں شادیاں رک چکی تھیں اور جو بوڑھے تھے وہ مرتے جا رہے تھے اور کبھی کبھی ہونے والے حادثات میں نوجوان بھی مرنے لگے تھے یہ بات بہت تشویش ناک تھی اگر یہی صورت حال رہتی تو وہ دن دور نہیں جب ان کا خاتمہ یقینی ہو جاتا۔

اسی سوچ نے گوباش کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ زرباش بڑا ہو گیا تھا؟ جنات کی عمریں ہزاروں سال کی ہوتی ہیں اور کئی ہزار سال تو وہ جوان ہی رہتے ہیں۔

زرباش کو انسانی دنیا دیکھنے کا بہت شوق تھا اس لئے وہ اپنے باپ یعنی سردار گوباش کی اجازت سے انسانی دنیا میں آیا تھا۔

ایک دن جس چیز کو دیکھ کر زرباش چونکا تھا وہ انگوٹھی نما کوئی چیز تھی جو ایک پتھر کے پاس بڑی چمک رہی تھی اس میں سرخ یا قوت جڑا تھا جو شفاف پانی میں اور بھی دمک رہا تھا۔

اچانک زرباش کے ذہن میں جھماکا ہوا جواگٹھی اس کے والد سردار گوباش کے پاس سے چوری ہوئی تھی اس میں بھی سرخ یا قوت جڑا ہوا تھا اور وہ بھی کسی پہاڑی علاقے میں بہنے والے چشمے میں پھینکی گئی تھی۔

زرباش اس انگوٹھی کو حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو گیا چونکہ وہ خود پانی میں نہیں جاسکتا تھا اس لئے اسے کسی انسان کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی اسے ایک نو عمر لڑکا اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

زرباش نے اسے آواز دی تو وہ اس کی طرف آ گیا۔

”کیا بات ہے صاحب..... مجھے کیوں بلایا.....؟“ لڑکے نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف



دیکھا تو زرباش بولا۔

”بیارے لڑکے کیا تم اس ندی کے پانی میں اتر کر تہ تک جاسکتے ہو؟“

”ضرور کیوں نہیں۔ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن تمہاری معلومات کے لئے بتا دوں کہ پانی کی گہرائی اتنی نہیں ہوتی جتنی ہمیں نظر آتی ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس شفاف پانی کو دیکھ کر تم سمجھ رہے ہو گے کہ اس کی گہرائی میں نہیں تو یہ تمہاری بھول ہے یہ اس سے دو گنا گہری ہے جتنی تمہیں نظر آ رہی ہے ویسے تم کیوں پوچھ رہے ہو۔“ لڑکے نے دوبارہ سوال کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”دراصل میری انگلی پانی میں گر گئی ہے وہ دیکھو۔“ زرباش نے انگلی کے اشارے سے اسے وہ جگہ دکھائی جہاں انگلی پڑی چک رہی تھی۔ ”مجھے پانی سے خوف آتا ہے اس لئے میں اس میں جا نہیں سکتا۔ تم ذرا جا کر مجھے وہ انگلی نکال کر دوے دو میں تمہیں اس کا انعام دوں گا۔“

”ابھی لایا۔“ یہ کہہ کر لڑکے نے ندی میں چھلانگ لگادی۔ تھوڑی دیر بعد انگلی زرباش کے پاس تھی وہ خوشی سے پھولے نہیں سار ہاتھ لیکن ابھی مزید تصدیق کرنی لازمی تھی۔

اس نے لڑکے کا شکریہ ادا کیا اور جب میں ہاتھ ڈالا اس کے ہاتھوں میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی جو اس نے لڑکے کے ہاتھوں میں تھما دی لڑکا حیرانی سے آنکھ پھاڑے نوٹوں کی گڈی کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکے نے خواب میں بھی اتنے پیسوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا غریب لوگوں کی خواہشیں اور خواب بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں ان کی چادر کی طرح.....!

زرباش ایک طرف بڑھ گیا اب مزید یہاں رہنا فضول تھا اس لئے وہ واپس اپنی دنیا میں آ گیا اور جب اس نے وہ انگلی سردار گوباش کے سامنے رکھی تو وہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا رہا پھر انگلی کو زرباش کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا۔ ”یہ..... یہ تمہیں

کہاں سے ملی.....؟“ خوشی سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔ جواباً زرباش نے انہیں سارا واقعہ سنایا وہ سن کر بہت خوش ہوئے پھر ایک غلام کو حاضر ہونے کا حکم دیا تھوڑی دیر بعد پورے قبیلے میں اعلان کر دیا گیا کہ اب سے تین دن بعد ایک بڑا جشن ہوگا انگلی ملنے کی خوشی میں، اس کے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر اجتماعی شادیوں کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔

سارے جنات بہت خوش تھے اور زرباش کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ وہ ان کے لئے ایک فرشتہ ثابت ہوا ہے۔

☆.....☆.....☆

غضب ہو گیا سردار..... غضب ہو گیا..... گوجا، اب کافی حد تک بوڑھا ہو چکا تھا پھولی ہوئی سانسوں سے سردار کے پاس آیا اور بولا۔

”کیا ہوا ہے گوجا..... کچھ منہ سے پھوٹو.....“ سردار نے گوجا کی گھبراہٹ دیکھ کر سوال کیا۔ ”سردار آج سے بہت سال پہلے جنات کی جواگوشی ہم نے انسانی دنیا میں ایک ندی میں پھنکوائی تھی وہ دوبارہ ان کے ہاتھ لگ گئی ہے ان کا جو بیٹا ہے زرباش وہ آدم زادوں کی دنیا میں گھومنے گیا تھا اتفاقاً اس کی نظر اس انگلی پر پڑ گئی اور وہ اسے حاصل کر کے سردار گوباش کے حوالے کر چکا ہے اور اب سے دو دن بعد بڑے پیمانے پر اجتماعی شادیوں کا انتظام کیا گیا ہے۔“ گوجا نے سردار کو تفصیلاً ساری بات بتائی۔ سردار کے کمروہ چہرے پر فکرو پریشانی کے آثار پھیل گئے پھر وہ بولا۔ ”یہ تو بہت پریشانی والی بات ہے۔ اب وہ دوبارہ طاقتور ہو جائیں گے ان کی نسل ختم ہونے کی بجائے اور بڑھے گی ہمارے ہر کام میں روڑے لگانا میں گے۔ کچھ اور کارنہ پڑے گا۔“

کچھ اور..... ”سردار نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا۔ ”تم ایسا کرو سردار گوباش کے بیٹے زرباش کو اٹھوا کر اپنی اس دنیا

میں لے آؤ۔ پھر اس کے بعد جو کرتا ہے میں تمہیں بتا دوں گا۔“

زرباش اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا خوش گپوں میں مصروف تھا کہ ایک جن موہ بانہ حاضر ہوا اور نہایت ادب سے بولا۔ ”چھوٹے سردار۔ سردار گوباش نے آپ کے لئے پیغام بھیجا ہے کہ فوراً ان کے پاس حاضر ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ میں آتا ہوں۔“ زرباش نے غلام جن کو کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ پھر زرباش نے دوستوں سے اجازت لی اور سردار گوباش کے پاس روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک جگہ اسے ایک پریشان حال جٹی ملی وہ زرباش کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف آئی اور بولی۔ ”چھوٹے سردار خدا کے لئے میری مدد کریں وہ کمینہ رومان جن زبردستی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ کہتا ہے اگر میں نے اپنی رضامندی سے اس سے شادی نہ کی تو وہ میری عزت لوٹ لے گا اور مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ خدا کے واسطے میرا اس بد بخت سے پیچھا چھڑائیں چھوٹے سردار، میں تمام عمر آپ کو دعاؤں دوں گی۔“ اس لڑکی کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ واقعی مسئلہ گھمبیر ہے۔

”ٹھیک ہے موٹی..... تم گھر چلو۔ میں تھوڑی دیر میں آ کر اس معاملے کو نپٹاتا ہوں۔“ موٹی حسرت آمیز نظروں سے زرباش کو دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی زرباش ایک ٹھنڈی سانس بھر کے وہاں سے چلا گیا۔

موٹی حد سے زیادہ خوبصورت جٹی تھی اور زرباش دل ہی دل میں اسے بے حد چاہتا تھا لیکن اس نے بھی اپنے انداز سے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے کیونکہ وہ سردار کا بیٹا تھا اور اپنے کسی بھی انداز سے وہ لوگوں کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے اپنے دل کی بات کبھی کسی سے نہیں کہی۔

دوسری طرف موٹی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی

اسے دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی لیکن کچھ کہنے سے اس لئے ڈرتی تھی کہ وہ سردار کا بیٹا تھا۔ حیثیت و مرتبے میں اس سے بڑا..... اگر وہ موٹی کو ٹھکرا دیتا تو وہ صدمے سے شاید ہی زندہ رہ پاتی اور ایسا اس لئے بھی تھا کہ زرباش کے کسی انداز میں موٹی کو اپنے لئے بھی پسندیدگی محسوس نہیں ہوئی وہ اس سے بھی سب کی طرح نارمل انداز میں بات کرتا تھا اس لئے موٹی کے قدم اس کی طرف اٹھتے اٹھتے پلٹ آتے۔

زمان نامی ایک جن عرصے سے اس کے پیچھے پڑا تھا وہ بڑا بد خصلت اور کمینہ صفت تھا جب موٹی کے والدین زندہ تھے تو وہ اپنی حد میں تھا لیکن جب سے ان کا انتقال ہوا تھا اسے گویا کھلی چھوٹ مل گئی تھی موٹی کو تنگ کرنے کا کوئی بہانہ نہ تھا کہ نہ جانے دیتا۔ اور اب بھی موٹی کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس سے شادی پر رضامند نہ ہوئی تو وہ اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر دے گا بھی وہ خوف زدہ ہو کر زرباش کے پاس آئی حالانکہ وہ بڑے سردار گوباش کے پاس بھی جاسکتی تھی لیکن وہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زرباش کے پاس چلی آئی جس نے اپنے کسی بھی انداز سے یہ ظاہر نہ کیا کہ اسے زمان پر غصہ آیا ہے یا نہیں؟۔

موٹی کا خیال تھا زرباش اس کے بتانے پر شدید رد عمل ظاہر کرے گا اور زمان کو جان سے مارنے کا کہے گا لیکن وہ یوں نارمل تھا جیسے وہ اک عام بیات ہو۔ وہ گھر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے شام ہونے کے قریب تھی اور اسے ڈرتا تھا کہ زمان آج کی رات پھر آئے گا اور ہو سکتا ہے اس کے انکار پر اپنی حد سے بڑھ جائے تھی وہ ست قدموں سے چل رہی تھی لیکن گھر تو بہر حال اسے جانا تھا۔

جب وہ رات کو سونے کے لئے لیٹی تو زمان آ موجود ہوا وہ خوف زدہ ہو گئی۔ ”پھر کیا سوچا ہے تم نے میری جان.....؟ زمان خباثت بھرے لہجے میں بولا۔ ”مجھ سے شادی کرو گی یا اپنے اس خوبصورت وجود کو میرے حوالے کرو گی؟“



”میں تم پر تھوکتا بھی پسند نہیں کرتی شادی تو دور کی بات۔ دغ ہو جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ۔“ وہ ہذیبی انداز میں چلائی اور زمران کے چہرے پر غصے بھرے تاثرات نمودار ہوئے۔ ”یہ کہہ کر وہ اس کی طرف بڑھا تو موٹی پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار کے ساتھ لگ گئی اور زمران مکروہ انداز میں ہنسنے لگا۔“

پھر اس سے پہلے کہ وہ موٹی کو چھوٹا زرباش ایک جھماکے سے نمودار ہوا۔ ”موٹی سے دور ہو زمران اگر تم نے موٹی کو ہاتھ بھی لگایا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”چھوٹے سردار! آپ درمیان میں نہ آئیں میں اس لڑکی کو حاصل کئے بنا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“ زمران نے اٹل لہجے میں کہا تو زرباش کے چہرے پر غصے کے تاثرات نمودار ہو گئے۔

”ٹھیک ہے پھر اپنا انجام دیکھو۔“ یہ کہہ کر زرباش نے اپنے ہاتھوں کا رخ اس کی طرف کیا، زرباش کے ہاتھوں سے برقی لہریں نکلیں اور زمران کے وجود میں پھوست ہو گئیں۔ زمران کے منہ سے اذیت ناک چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔ موٹی نے تشکرانہ انداز سے زرباش کی طرف دیکھا جو مسکرا کر موٹی کو ہی دیکھ رہا تھا۔

”اب تمہیں زمران کی طرف سے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ ہمیشہ کے لئے اپنا ج ہو چکا ہے۔“

”بہت بہت شکریہ چھوٹے سردار۔“ موٹی نے کہا تو زرباش بولا۔

”موٹی کیا تم مجھے زرباش کے نام سے نہیں پکار سکتی۔“

زرباش یک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا، موٹی جھینپ گئی۔ ”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں آپ؟“ موٹی کی آواز شدت جذبات سے لبریز ہوئی۔

”دیکھ رہا ہوں کہ آج سے دو دن بعد جب تم میری دلہن بنو گی تو کیسا لگے گا؟“

زرباش کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور موٹی آنکھیں پھاڑے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی وہ اس بات پر شرمنا بھی بھول گئی تھی۔

”کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہی ہو.....؟ یا ربچین سے آج تک محبت کرتا آیا ہوں لیکن کبھی ہمت ہی نہیں ہو سکی، آج موقع خدا نے دیا تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاؤں۔ یہی سوچ کر تم سے کہا، اگر تمہاری رضا مندی ہو تو دو دن بعد ان شادیوں میں سے ایک ہماری بھی ہو سکتی ہے۔“ اور موٹی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اس کا مطلب ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ زرباش نے اس کی شرمیلیں مسکراہٹ کی طرف دیکھ کر کہا تو موٹی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

سردار گوباش نے زرباش کو بلا کر اسے رات کو سرحدی علاقے کی حفاظت سونپی تھی حالانکہ سردار کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اسے خصوصی رعایت اور مراعات حاصل تھی لیکن سردار گوباش اس چیز کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی نظر میں سب برابر تھے اس لئے باقی جنات کی طرح زرباش کو بھی سرحدی علاقے کی رکھوالی کے لئے ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

زرباش اپنی ڈیوٹی مکمل چاک دیتی سے دے بار تھا کہ اچانک اسے کچھ عجیب سی آوازیں آنا شروع ہو گئیں وہ تجسس سا آگے بڑھا آوازیں اور دور ہو گئیں وہ اور آگے بڑھا یہ جانے بغیر کہ وہ اپنی سرحد سے آگے نکل آیا ہے۔

اچانک آوازیں بند ہو گئیں اس نے چونک کر آس پاس دیکھا اور حیران رہ گیا وہ اپنے علاقے سے کافی آگے نکل آیا تھا اس کو اچانک خطرے کا احساس

ہوا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا اک دھواں سا اس کے نتھنوں میں گھسا اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ جب زرباش کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ اس کو خود نے چھڑانے کی کافی کوشش کی لیکن بے سود..... اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی وہ اک عجیب و غریب جگہ پر بندھا ہوا تھا کمرے کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوئی کہ وہ کمرہ کی چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔

اچانک ایک طرف سے زوردار گڑگڑاہٹ کی آواز آئی تو زرباش نے چونک کر ادھر دیکھا۔ دیوار کا پتھر ایک طرف زوردار آواز سے سرک رہا تھا پھر اس میں سے ایک نہایت عجیب و غریب مخلوق اندر داخل ہوئی جس کی شکل اور جسامت نہایت خوف ناک تھی وہ خود جن تھا لیکن ان کی خوف ناک دیکھ کر خود بھی حیران رہ گیا۔ پھر وہ مخلوق زرباش سے مخاطب ہوئی..... ”سنو جن زادے۔ تمہاری زندگی کی ضمانت صرف اس صورت میں دی جاسکتی ہے اگر تم وعدہ کرو کہ وہ اگلی بھی ہمیں لا کر دے دو گے، ورنہ ایک بھیا تک موت تمہاری منتظر ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے رکنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی اور واپس اسی طرف بڑھ گئی جہاں سے داخل ہوئی تھی۔ ”کل تک سوچ لو ورنہ.....“ یہ کہہ کر وہ مورخ کی دوسری طرف غائب ہو گئی۔

زرباش نے اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ وہ ان کی شرط پر موت کو ترجیح دے گا۔ اس لئے دوسرے دن اس نے ان کی شرط پوری کرنے سے انکار کر دیا وہ مخلوق بہت غصے میں آ گئی عجیب الحلقہ گوما آگے بڑھا اور وہ پانی جو وہ انسانی دنیا سے لایا تھا زرباش کے برہنہ جسم پر پھینک دیا، زرباش کی اذیت ناک چیخیں غار کی دیواروں سے گمرانے لگیں اور اس مخلوق کا جو سردار تھا وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اس پر پانی پھینکتے ایک گرجدار آواز نے انہیں اپنی جگہ ساکت ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ ”خبردار اگر کسی نے اب زرباش

کو کچھ بھی کہا تو..... پہلے بہت عرصے سے تمہاری عادتوں کو نظر انداز کرتے آئے ہیں لیکن اب مزید نہیں..... تم جیسے سرکشوں کو اگر زیادہ چھوٹ دی جائے تو وہ پونہمی سرکشی کرتے رہتے ہیں۔“ یہ آواز سردار جنات کی تھی۔

پھر اچانک ہر طرف دھواں پھیل گیا، بالکل سیاہ رنگ کا وہ کافی دیر چھایا اس دوران نہایت دل دہلا دینے والی آوازیں آتی رہیں پھر اس کے بعد سب کچھ پہلی حالت میں آ گیا۔

زرباش زنجیروں سے آزاد ہو چکا تھا اس کی حالت نہایت مخدوش تھی اور وہ زنجیروں سے آزاد ہوتے ہی گڑبڑاہٹ سے جنات جلدی سے آگے بڑھے اور اسے اٹھالیا اور اسے لیکر اپنے قہقہے میں واپس آ گئے۔

سردار جنات بہت خوش تھا کہ اس مخلوق کے سرکش سردار کا خاتمہ ہو گیا تھا ورنہ پتہ نہیں وہ کب تک انہیں سکون سے جینے نہ دیتے۔

مکمل علاج سے زرباش دو دنوں میں بھلا چنگا ہو گیا تھا آج اس کی شادی تھی موٹی سے۔ یہ ایک بڑے پیارے پر تقریب تھی جس میں بہت سے جنات جوڑوں کی شادی بھی سب بہت خوش تھے خاص کر زرباش اور موٹی.....! پھر وہ کمرے میں پہنچا دیئے گئے۔

زرباش پیار سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا جو بہت خوبصورت لگ رہی تھی پھر وہ بولا ”بہت محبت ہے تم سے اگر کو تو اپنی جان وار دوں۔“

موٹی گھبرا گئی..... ”نہیں نہیں.....“ پھر شرارت سے بولی۔ ”اگر چاند تارے توڑ کر لاسکتے ہو تو ٹھیک ہے۔“

زرباش سر کھانے لگا۔ ”بھئی یہ سانس ہی دور ہے کوئی آسان کام کہو۔“ پھر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔





وہ واقعی پر اسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

### گزشتہ قسط کا خلاصہ

سردار کی غضبناک آواز پورے محفل میں گونج گئی اور روشاک بے حس و حرکت بت کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا اور کنبھڑے میں آکر کھڑا ہو گیا، مگر یہ کیا اچانک کنبھڑے میں دھواں سا اٹھا اور روشاک کنبھڑے سے غائب ہو چکا تھا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر محفل میں موجود سارے جنات اور سردار اچنبھے میں پڑ گئے، تو پھر سردار اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور جنات مجاہدوں سے مخاطب ہوا۔ فوراً جاؤ اور روشاک جہاں بھی ملے اور جس حال میں بھی ملے فوراً گرفتار کر کے لاؤ، اگر اس پر سختی کی ضرورت پیش آئے تو بالکل بھی ہچکچانا نہیں۔ یہ میرا حکم ہے۔ روشاک فرار ہونے کے بعد خوشبو کے کمرے میں پہنچا اور خوشبو کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا کہ اچانک اس جگہ رولوکا کے کارندے پہنچے اور روشاک کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ روشاک وہاں سے بھی بھاگا اور پھر کافر جنات کے ایک قبیلہ میں پہنچ گیا۔ کافر جنات کا سردار اس کی روداد سن کر بولا۔ تم کنبھڑا نہیں میں ہر ممکن تمہاری مدد کروں گا۔ اس صورت میں دونوں قبیلہ والوں میں گھسبان کا رن پڑا، لیکن خفیہ طور سے رولوکا روشاک کو نکال لایا، اس کے بعد روشاک کو اس قبیلہ میں تمام جنات اور رولوکا کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس طرح روشاک کے خاتمہ ہونے پر خوش ہو کر جان اس سے چھوٹ گئی۔ رولوکا اور حکیم وقار مطلب میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ حکیم وقار نے کہا، حکیم کامل یکھ دن پہلے ایک صاحب آئے تھے، جن کا نام پر تاب تھا اور انہوں نے ایک ڈائری بھی دی تھی وہ کل بھی آئے تھے مگر آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ سن کر رولوکا بولا۔ جی حکیم صاحب مجھے یاد آیا۔ میں آج ہی ان کی ڈائری پڑھوں گا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ رات میں رولوکا نے پر تاب کی کچھ ڈائری نکالی اور پڑھنے لگا لکھا تھا۔ حکیم صاحب میں کالج سے گاؤں آ گیا مگر کالج میں جس کے ساتھ کمرے میں رہتا تھا، وہ بھوت چڑیل کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتا بلکہ لکھتا بھی تھا۔ اس کی ڈائری میں عجیب و غریب دل دہلا دینے والے واقعات درج تھے کہ چڑیل، بھوت اور دیگر آتماں بہت ہی شقی شامی ہوتی ہیں، میں نے پوری ڈائری پڑھ لی تھی۔ خیر جب میں گاؤں پہنچا تو میں اندرونی طور پر بہت ہی ہلکا رہنے لگا۔ میرا دل پڑھائی سے بالکل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں اکیلا کھیت کھلیاؤں میں گھومنے لگا ایک روز میں ایک باغ میں اکیلا بیٹھا تھا کہ اچانک ایک اہرا جیسی سندری سندری میرے سامنے آ گئی اور میری آنکھیں جیسے اس کی سندری میں کھولیں۔ مجھے اپنا کوئی ہوش نہ رہا اور جب ہوش آیا تو.....

(اب آگے پڑھیں)

میں نے دیکھا کہ میں ایک عالی شان بچے بجائے کمرے میں موجود ہوں۔ کمرے میں موجود ہر چیز سے ظاہر تھا کہ وہ کمرہ کسی بہت ہی امیر کنبھڑا یا پھر کسی راجہ کا کمرہ تھا۔ میری آنکھیں ہر چیز کو ٹٹکنی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ اور سب سے کمال یہ تھا کہ میرے جسم پر اس وقت جو لباس تھا وہ کسی شہزادے جیسا تھا۔ اپنے جسم پر موجود اپنے لباس کو میں نے کھینچ کھینچ کر دیکھا۔ اور جب

اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو میں نے اپنی گردن پر زور کی چٹکی بھری کہ شاید میں ہوش دھواں میں ہوں کہ نہیں۔ چٹکی میں نے اتنی زور کی بھری تھی کہ دروازے ہلکا اٹھا۔ میں اچنبھے کی حالت میں بستر سے نیچے اتر اور کمرے میں موجود ساری چیزوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ دیواروں پر بڑی بڑی کئی تلواریں بھی لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک طرف زرہ بکتر بھی موجود تھا۔ ایک طرف تیر کمان بھی موجود تھی بلکہ مجموعی طور پر میدان جنگ میں استعمال



ہونے والے سارے ہتھیار موجود تھے۔

پھر میری نظر سہری یعنی چھپر کھٹ پر پڑی۔ ایسا عالی شان چھپر کھٹ تھا کہ میں کیا بتاؤں، بہت ہی بڑا اور لمبا چوڑا بستر تھا۔ ایسا جیسا کہ کسی راجہ مہاراجہ کا ہوتا ہے۔ کمرے کی لمبائی چوڑائی بھی ناقابل بیان ہے۔ پورے کمرے میں گھوم پھر کر میں نے ایک ایک چیز پر نظر ڈالی اور جب میری آنکھیں تھک گئیں تو اچانک میرے منہ سے نکلا۔ ”کوئی ہے؟“

”میرے منہ سے آواز کا ٹکنا تھا کہ اچانک ایک طرف موجود دروازہ کھلا اور ایک ملازم اندر آیا، وہ بہت ہی مودبانہ تھا اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، وہ بولا۔ ”جی چھوٹے سرکار! حکم کریں۔“ میں اچنبھے کی حالت میں اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ”تم کون ہو؟“

”حضور آپ کا خادم ہوں، آپ حکم کریں۔“ وہ بولا۔ ”اور میں کون ہوں؟“ میں جیسے چیخ کر بولا۔ ”حضور! آپ چھوٹے سرکار ہیں۔“ وہ بولا۔ ”خادم! چھوٹے سرکار! مہاراج! یہ تمام لفظ میرے لئے اجنبی تھے اور میرے ذہن پر جیسے ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ ”ارے بھائی! کون مہاراج، کون سرکار اور کون سا خادم۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں تو ایک عام آدمی ہوں، میرا نام پر تاب ہے۔“ میں نے کہا۔

”حضور! آپ کا نام تو امر سنگھ ہے، اور آپ یہ کیا بول رہے ہیں۔“ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور مجھ پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں، وہ بدستور مجھے گھورتا رہا تو میرے منہ سے نکلا۔ ”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو، فوراً مجھے پانی پلاؤ۔“ یہ سنتے ہی وہ اٹھ لپٹ گیا۔

چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دوسری طرف کا دروازہ کھلا اور ایک دلکش اور دل بھانے والی لڑکی ہاتھ میں چمکتا ہوا ایک گلاس لے کر میرے قریب آگئی اور جب میں نے اس پر نظر ڈالی تو جیسے اچھل گیا۔ کیونکہ وہ تو وہی تھی جو کہ آج کے باغ میں اچانک میرے سامنے آئی تھی۔

”تم اور یہاں! تم کون ہو اور مجھے یہاں پر کون لایا، یہ کون سی جگہ ہے؟ اور میرے جسم پر تو عام سال لباس تھا اور یہ راجہ مہاراجہ جیسا لباس اس وقت میرے جسم پر۔ کیا میں کسی جادوگر کی میں آ گیا ہوں۔ مجھے جلدی سے بتاؤ، تاکہ میں حقیقت جان سکوں، میرا دماغ درد کی وجہ سے پھنسا جا رہا ہے۔“ میں بولا۔

”تم اصرار ہو! اور تم اپنی راج دھانی میں ہو، تم مہاراج کے اکلوتے سپوت ہو اور میں تمہارے چاچا کی پتری لاج دہی ہوں۔“

یہ بول کر وہ مسکرانے لگی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بستر پر بیٹھا دیا، اور خود میرے پہلو سے لگ کر پیٹنے لگی، چمکدار جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ گلاس کا منہ سے لگنا تھا کہ میں غٹا غٹ پانی پینے لگا اور پھر پورا گلاس خالی ہو گیا۔ اس نے جگ اور گلاس چاندی کے ٹرے پر رکھا اور ایک میز پر رکھ دی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور میرے ہاتھوں کو اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے دبانے لگی۔ چند لمحوں بعد بولی۔ ”اس تم گھبراہٹوں سے رہے ہو، ارے یہ پوری راج دھانی تمہاری ہے، چاچا جی یعنی تمہارے پتا یہاں کے راجہ ہیں اور میں تمہاری لاج دہی ہوں۔ بس تمہیں میں یہ بتا دوں کہ ہم دونوں جنم جنم کے ساتھی ہیں۔“

میں نے دیوتا کے آگے زبردست پراعتنا کی ہے، دیوتا کو خوش کرنے کے لئے میں رات رات بھر ناجتنی رہی ہوں۔ دیوتا کی سیوا میں، میں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور یہ سب میں نے اس لئے کیا کہ خوش ہو کر دیوتا میرے من کی کامنائیں پوری کر دیں۔ تم یہ نہیں پوچھو گے کہ میرے من کی کامنائیں کیا ہیں؟“

”چلو یہ بھی بتا دو کہ وہ کامنائیں کیا ہیں؟“ میں نے کہا۔ وہ بولی۔ ”میری کامنائیں ہیں۔ ہر جنم میں تم میرے ہی رہو اور میں تمہاری سیوا کرتی رہوں۔“

”تم یہ سب باتیں جو کر رہی ہو، یہ میری سمجھ سے باہر ہیں، میں تمہاری کسی بات کو بھی نہیں سمجھ رہا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ میرا نام پر تاب ہے اور میں کالج میں پڑھتا تھا اور اب میں نے پڑھائی چھوڑ دی ہے۔“ یہ سنتے ہی اس کی نیلگوں آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔ جسے دیکھ کر میرا من چلنے لگا کہ اتنی سندر جس کی سندرنا ناقابل بیان ہے میں نے اس کا دل دکھایا، پھر میں نے سوچا۔ کیوں نہ میں اس کا دل رکھنے کے لئے ہاں کرتا ہوں۔“

میں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور پھر بہت قریب سے اس کی جمیل سے بھی گہری آنکھوں میں اپنی نظریں گاڑ دیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکان بکھر گئی اور پھر بے تابانہ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور سکے لگی۔ میں اس کے ریشمی بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ چند منٹ ایسا ہوتا رہا پھر اس نے اپنا چہرہ اوپر کیا اور بولی۔ ”اس میرا بس چلے تو میں تمہیں سارے سنسار سے اپنے من میں چھپا لوں اور کوشش کروں کہ میرے علاوہ یہ جتنی ہوئی ہو ابھی تمہیں نہ چھو پائے۔ مگر آدمی کی ہر اچھا کب پوری ہوتی ہے۔“

تمہاری خاطر میں سارے سنسار سے ٹکرا سکتی ہوں، میرے علاوہ اگر کسی نے تم پر پریم کی نظر ڈالی تو میں اس کا خون پی جاؤں گی۔ اس تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں تمہارے بنا ہر ایک پل بیا کل رہتی ہوں۔ تم پر میں اپنا جیون تیاگ دوں گی اور تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ اب تک کیا ہوتا آ رہا ہے، تمہاری جدائی میں شاید ہی میں کی پل سو پائی ہوں۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ تمام باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔“ ”تم چنتا نہ کرو میں تمہیں بتاتی ہوں۔“ یہ بول کر اس نے سیدھے ہاتھ کی سیدی انگلی سے دیوار کی طرف اشارہ کیا تو صاف شفاف دیوار پر جیسے فلم کا سین چلنے لگا۔ ایک بہت ہی خوب صورت گاؤں تھا۔ ہر طرف ہریالی اور بڑے کارج تھا۔ کھیتوں میں سرسوں کے پیلے

پیلے پھل لہلہا رہے تھے۔ گاؤں میں بڑی رونق تھی۔ بچے اپنے کندھوں پر جھولا (بستہ) لٹکائے ہوئے ایک طرف کو جا رہے تھے کہ اس جھولے (بستے) میں ان بچوں کی کتابیں تھیں۔

دو بچے ایسے بھی تھے جو دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ان تمام بچوں کے ساتھ چل رہے تھے، دونوں بچوں میں ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ان دونوں میں کچھ زیادہ ہی جاہت و خلوص ہے اور پھر اس طرح وہ پڑھنے جاتے اور آتے رہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پروان چڑھنے لگے اور پھر وہ دونوں جوانی کی دہلیز پر پہنچ گئے۔ یہ تمام واقعہ بالکل فلم کے سین کی طرح چل رہا تھا۔ اس لڑکی کی سندرنا کو دیکھ کر گاؤں بھر کے نوجوان بلکہ سارا گاؤں ہی عشق عیش کرتا تھا۔ خاص طور پر نوجوان اور مرد حضرات تنگنکی باندھ کر اس لڑکی کو دیکھتے اور ان کی نظروں سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ سب اس لڑکی کو اپنی آنکھوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھپا لیں گے۔

وہ نوجوان بھی بہت ہی کبر تھا۔ ہر جگہ وہ دونوں نظر آتے رہتے اور صرف رات میں سونے یا پھر دیگر ضروریات زندگی کے لئے الگ ہوتے تھے۔

وہ منظر ذرا واضح ہوا، اور پھر بہت ہی قریب آیا تو میں جیسے اچھل ہی گیا۔ ”ارے اس منظر میں تو میں خود تھا اور میرے ساتھ جو لڑکی تھی وہ..... وہ..... تو لاج دہی تھی۔ جو کہ اس وقت میرے پہلو میں میرے جسم سے لگے بیٹھی تھی اور نہ جانے کن خیالوں میں من گھڑی۔“

اچانک میرے دماغ میں جیسے آندھیاں چلنے لگیں، میں اندرونی طور پر سہم کر رہ گیا۔ خود کو اس منظر میں دیکھ کر۔ پھر منظر ابھرا۔ ایک گھنٹش نامی لڑکا لاج دہی میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ ہر روز بلا تاغلا لاج دہی کو نظر آنے لگا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے ہم دونوں کو آتے جاتے دیکھنے لگا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی لاج دہی میں بڑھنے لگی۔

پھر نظر آیا، وہ اپنے چند دوستوں میں بیٹھا تھا،



اس کے چہرے پر خاموشی اور دیرانی کا راج تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ایک لڑکا بولا۔ ”ارے گنش یہ کیسا منہ لٹکائے بیٹھا ہے، ارے وہ تیری پہنچ سے بہت دور ہے، وہ تو تجھے نظر بھر کر دیکھتی بھی نہیں اور تو ہے کہ اس کے لئے اپنے جیون کو تیا گئے پر بھی تیار ہے۔“

اور پھر تو کیا دو ٹن ایک جگہ پانچ لڑکے بیٹھے تھے سب نے اسے لٹن طعن کرنا شروع کر دیا۔

”ارے! بہت جنتا ہے پھنے خان، تو یہ سوچ لے! چاہے تو کچھ بھی کر لے، وہ تجھے گھاس بھی نہیں ڈالے گی۔“

”ارے وہ تو امر کے نام کا ملا جیتی ہے، اسے دیوتا سان سمجھتی ہے، اگر اس کا بس چلے تو وہ بھگوان کو چھوڑ کر امر کو ہی پوجنا شروع کر دے۔“

ایک اور بولا۔ ”گنش بچو! میں نے امر اور لاج وئی کا پریم دیکھ کر اندازہ کیا ہے کہ اگر سارے سنسار کے لوگ ایک طرف اور امر ایک طرف ہو تو لاج وئی سارے سنسار سے منہ موڑ کر امر کے چروں میں اپنا جیون بتا دیگی۔“

اور گنش تو اسے صرف دیکھتا ہی رہ جائے گا، تو ہر پل آپیں بھرے گا، تیرے جیون کا سکھ جین برباد ہو جائے گا، تو کسی کام کا نہیں رہے گا، اور پھر تو اپنے پتا کو جانتا ہے کہ وہ کس قدر سخت اور اصول کے کپے ہیں، اگر تو نے لاج وئی کو چھیڑا بھی تو سب سے پہلے تیرے پتا ہی تیری گردن پر چھری چلا دیں گے، اس سے تو اچھا ہے کہ تو لاج وئی کو اپنے من سے نکال دے۔

دو پریمیوں کو خوش رہنے دے، اگر کوئی دو پریم کرنے والوں کو دکھ پہنچاتا ہے تو اسے تو بھگوان بھی نہیں چھوڑتا، کیونکہ بھگوان پریم کرنے والوں سے خوش ہوتا ہے۔

گنش تو ہاتھ ملتا رہ جائے گا، اور لاج وئی کو امر ڈولی میں بیٹھا کر لے جائے گا۔ پھر تو سوچ تیرا اس سے کیا ہوگا۔ اس طرح رات دن سوچتے سوچتے تو کمزور اور بزدل بھی ہو جائے۔“

لفظ بزدل کا سن کر گنش پیش میں آ گیا اور پاؤں پٹختا ہوا بولا۔ ”میں امر کو برباد کر دوں گا، اس کا خون کر دوں گا اور پھر ساتھ ہی اپنا جیون بھی تیا گ دوں گا، اگر لاج وئی میری نہیں ہوئی تو۔“ اور پیش میں اس جگہ سے ایک طرف کوچلا گیا۔

وقت آہستہ آہستہ آگے کو بڑھتا رہا۔ امر اور لاج وئی دونوں اپنی اپنی مستیوں میں مگن تھے، سارے گاؤں والے ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے، ان دونوں کی محبت و چاہت خود غرضی پر مبنی نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے پاکیزہ محبت کرتے تھے۔

ایک دن صبح ہی سے گاؤں میں یوندا باندی ہو رہی تھی۔ وقفے وقفے سے تیز بارش ہو جاتی تھی، اس لئے سارا گاؤں اپنے اپنے گھروں میں دبا پڑا تھا۔

لیکن منظر میں نظر آیا کہ امر اور لاج وئی ایک کھیت کے کنارے دنیا و دنیا ہیا سے بے خبر بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دونوں آنے سامنے بیٹھے صرف یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے، لاج وئی سفید گھاکھ، سفید کرنی اور سفید ہی اور دھنی میں ملیں تھی، لیکن اور دھنی بھگک کر اس کے کندھے پر پڑی تھی۔

سنگ مرمر کا تراشا ہوا شفاف بدن کسی انجان مخلوق کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ بارش نے اس کی کرنی کو اس کے جسم سے جیسے پیوست کر دیا تھا۔ برسی بارش کا پانی اس کے سر پر پڑتا تو سر سے نیچے کو پھسلتے ہوئے اس کے جسم میں جیسے جذب ہو کر رہ جاتا۔ اس کے خوب صورت اور دلکش گلاب کی پٹھری جیسے گلابی ہونٹ ایسے لگ رہے تھے جیسے کہ وہ لاج وئی کے نہیں بلکہ کسی ایسے کے ہونٹ ہوں۔ دونوں بالکل مبہوت تھے اور دونوں کی نظر میں ایک دوسرے میں جیسے پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ دور سے ایسا لگتا تھا کہ پتھر کے دو بتوں کو اس جگہ لاکر رکھ دیا گیا ہے۔

لاج وئی کے انگ سے مستی ابل رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ بار بار سو بار بلکہ ہزاروں مرتبہ بنانا کر بھگوان نے مٹایا ہوگا۔ تب کہیں جا کر لاج وئی کا وہ حسین اور دلکش دل وہ لینے والا سراپا اس رنگ میں ڈھلا ہوگا۔ وہ کسی صورت بھی

زمین مخلوق نہیں نظر آتی تھی۔ بلکہ حقیقت میں حسن کا کوئی خوب صورت آسمانی مخلوق نظر آتی تھی۔

منظر میں اچانک گنش ایک طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا، وہ بہت ہی ناپ تول کر اپنا قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

قد آور سروس کے کھیت میں وہ چپتا چھپاتا آ رہا تھا۔ ارے یہ کیا! اس کے ہاتھ میں تو ایک بہت بڑا چٹکا ہوا چھرا موجود تھا۔ وہ ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ چند قدم ان سے دوری پر تھا۔ وہ دونوں ہر طرف سے بے خبر ایک دوسرے کو دیکھنے میں مہمک تھے۔ بارش جھم جھم برس رہی تھی۔ لیکن آنے والے وقت کا ان دونوں کو کچھ پتہ نہ تھا۔

گنش نے اپنے ہاتھ میں موجود چھرے کو نظر بھر کر دیکھا، اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر آنا فنا گنش نے پشت سے امر کی پائیں سمت پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ امر کی دلخراش چیخ مکتیوں میں گونج گئی۔

اور پھر اس سے ترنت ایک شیش ناگ نے گنش کے پاؤں پر اپنا ڈنک مار دیا اور اس طرح گنش کی چیخ سنائی دی یہی نہیں اسی ثانیہ لاج وئی نے بھی بجلی کے کوندے کی طرح چھرا گنش کے دل کی جگہ گھونپ چکی تھی۔ گنش تڑپ رہا تھا۔ امر شانت ہو چکا تھا۔ لاج وئی کی نظر میں امر پر مرکوز تھیں کہ پھر اچانک لاج وئی گنش کی طرف لپکی اور اس کے سینے سے پھر انکال کر پورے کا پورا چھرا اپنے دل میں اتار لیا۔

”ا.....م.....م..... امر۔“ لاج وئی کی دلخراش اور دل بھاڑ دینے والی چیخ چاروں اور کو ہلا گئی۔ دیوار پر نظر آنے والا منظر بیکر غائب ہو گیا۔

اور میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی لاج وئی کی حقیقت میں دلخراش چیخ ”امر.....امر۔“ پورے کمرے کو دھلا گئی۔ لاج وئی اب مجھ سے لپٹ چکی تھی۔ اس کی سانسیں دھونکی کی طرح چل رہی تھیں۔ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو میرے گلے میں

ڈال رکھے تھے۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کی ہانپی بے آب کی طرح حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی اسے پوری طاقت سے سمجھ لیا تھا۔ کئی منٹ تک ہم دونوں اسی کیفیت میں رہے اور پھر زور و شور سے پھرا ہوا طوفان آیا اور ہم دونوں کو تہہ و بالا کر کے گزر گیا۔

کافی دیر بعد جب ہمارے حواس بحال ہوئے تو میں لاج وئی کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ کئی منٹ گزرنے کے بعد اس نے اپنی محور نگاہیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں گہرے رنگ کی سرخی نظر آ رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے دیکھ کر میں گویا ہوا۔

”لاج وئی یہ سب کیا ہے؟ میرا تمہارا بچپنا، جوانی، اور پھر گنش نامی لڑکے کی دشمنی، اور پھر اس کا مجھے قتل کرنا، اسے سانپ کا ڈنسا، پھر تمہارا اس پر جھپٹ کر اسے قتل کر دینا، یہی نہیں بلکہ تم نے خود کو بھی مار لیا۔“

”امر یہی تو اصل حقیقت ہے کہ ہم دونوں کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ ہر جنم میں ہم دونوں کا ملاپ نہ ہوا کوئی نہ کوئی دشمن ہم دونوں کو الگ کرتا رہا۔

امر، میں جنم جنم سے تمہارے پیار کی پیاسی ہوں، میں ڈولی میں نہیں بیٹھی، ہم دونوں کا لگن نہیں ہوا، ہم دونوں منڈپ میں نہیں بیٹھے، امر تمہارے لئے میں جنم جنم سے بھگک رہی ہوں، پل پل تمہاری چاہ میں سرگرداں ہوں۔

ہر جنم میں، میں بھگوان سے پراختیا کرتی ہوں کہ بھگوان ہم دونوں کا کسی جنم میں تو ملاپ کرادے تاکہ میرے من کو شانتی ملے، میں نا امید نہیں ہوں، مجھے پکا یقین ہے کہ ہمارا ملاپ ضرور ہوگا۔ اب تم مجھے مل گئے ہو، میں کسی صورت بھی اب اپنے سے دور نہیں جانے دوں گی۔

میں ہر جنم میں تمہاری چاہت میں اکیلی رہی ہوں، اور یہی حالت تمہاری ہے، جس طرح میں تمہارے لئے تڑپتی ہوں اس طرح تم میرے لئے نہیں



ترتیب، وجہ یہ ہے کہ میں نے تم سے پیار کیا ہے، میں نے تمہیں چاہا ہے، میں نے تمہیں اپنے من مندر کا بھگوان جانا ہے، کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آیا کہ ہم دو پریمی جنم جنم سے ایک دوسرے کو پانے کے لئے ترس رہے ہیں۔

یہ بھی بھگوان کی کرپا ہے کہ ہم دونوں انسانی روپ میں جنم لے رہے ہیں، ہمیں تو ایک انسان ایک جنم کے بعد یا پھر بھگوان کی اچھا کے مطابق انسان سے کسی جانور کے روپ میں جنم لیتا ہے، دیوتا سے میرے پرارتھنا کا اور پوجا کا صلہ ہے کہ ہم دونوں انسان کے روپ میں جنم لے رہے ہیں۔

”لیکن لاج و نفی مجھے ابھی بھی یاد نہیں آ رہا ہے کہ حقیقت میں جو اس منظر میں نو جوان تھا۔ امر! وہ میں ہوں۔ چلو اگر تمہاری بات میں مان بھی لیتا ہوں کہ ہم دونوں کئی جنم سے ایک دوسرے کے لئے اس دنیا میں آ رہے ہیں۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ بقول تمہارے ہماری شادی کیوں نہیں ہو رہی ہے۔ اور شادی نہ ہونے کا اصل بھید کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”امر یہ بھگوان کی لیلیا ہے اور اسے بھگوان ہی جانتا ہے۔ تم چنانچہ کرو، میں تمہیں اس سے پچھلے جنم کے واقعات دکھلائی ہوں شاید کچھ تمہیں یاد آ جائے۔“

اسی دیوار کی طرف اس نے اپنی پھٹیلی کا رخ کیا تو اس کی پھٹیلی سے برقی لہریں نکل کر دیوار پر پڑیں اور مجھ پر یاروشن ہو گئی۔ چند لمحے بعد دیوار پر منظر نظر آیا۔

ایک بزم سبز و شاداب گاؤں ہے، رات کا سے ہے، پورن ماشی کا چاند اپنے جوبن پر ہے، چاندنی ہر طرف اپنا جوبن دکھا رہی ہے، اتنا سہانا اور خوب صورت سا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ وہ سماں اسی طرح قائم و دائم رہے۔

پھر ایک گھر نظر آیا۔ اس گھر کا آگن بہت بڑا ہے۔ آگن میں ایک طرف نیم کا ایک درخت ہے، اس گھر میں چند عورتیں جمع ہیں اور کئی مرد نیم کے درخت

کے نیچے چار پائی ڈالے بیٹھے ہیں، ان کے سامنے حقہ رکھا ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہر کوئی حقہ پی رہا ہے کہ اتنے میں ایک بوڑھی عورت کمرے سے نکلتی ہے اور قریب آ کر بولتی ہے۔ ”جگدیش خوش ہو جا، بھگوان نے تجھے لکھی دی ہے۔ بڑی خوب صورت چندر ما جیسی تیرے گھر لکھی آئی ہے۔“ اور یہ بول کر وہ عورت دوبارہ کمرے میں چلی جاتی ہے۔

چار پائی پر بیٹھے لوگوں میں سے ایک آدمی اٹھتا ہے، لگتا ہے وہی جگدیش ہے، ایک تھالی میں اس کے پاس ہی گڑ موز جو دھتا۔

وہ بولتا ہے۔ ”بھائیو! گڑ سے منہ میٹھا کرو، بھگوان کی کرپا ہے کہ اس نے پتری سے نوازا۔“ اور پھر تھوڑا تھوڑا گڑ سب کے منہ میں ڈالتا ہے۔

گڑ کھا کر سب بولتے ہیں۔ ”جگدیش تجھے بہت بہت بدھائی ہو۔ اب تو آرام کر اب ہم لوگ اپنے گھروں کو چلتے ہیں۔ اور یہ بھی بھگوان کی کرپا ہے کہ تیری گھر والی اور تیری پتری خیریت سے ہیں۔ کل صبح مندر چلے جانا اور چڑھاوا چڑھا دینا۔ دیوی دیوتا کو ایسے سے خوش کرنا بہت اچھا ہوتا ہے۔“

”تھیک ہے بھیا! آپ لوگوں کی بہت مہربانی کہ آپ لوگ میرے پاس بیٹھے رہے اور بھگوان سے میرے اور میری گھر والی کے لئے پرارتھنا کرتے رہے۔ صبح ہوتے ہی میں مندر ضرور جاؤں گا اور دیوی کے چروں میں دل کھول کر چڑھاوا چڑھا دوں گا۔ ٹھیک ہے آپ لوگ اپنے گھر جاؤ۔“ جگدیش نے کہا۔

منظر میں صبح ہوتی نظر آئی، کوئی نو بجے کے قریب ایک چھ سات سالہ بچہ گھر میں داخل ہوا اور بولا۔ ”راوہا موسیٰ! ماں نے یہ چوڑیاں بھیجی ہیں، اور بولی ہے کہ یہ چوڑیاں چند رکھی کو پہنا دو۔“ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لال چوڑیاں، جگدیش کی گھر والی راوہا کو دیں اور ترت واپس چلا گیا۔

پورے گاؤں میں بہت زیادہ چرچا تھا کہ جگدیش کی پتری کی خوب صورتی سے چاند بھی شرما

جائے۔ جسے دیکھ کر وہ اپنے تئیں اس بچی کی خوب صورتی کو لئے بیٹھا ہے، سب کی سنتا اور پھر جگدیش بولتا۔ ”یہ تو بھگوان کی کرپا ہے، بھگوان جو چاہے ہو سکتا ہے، بس بھائیو! تم سب دعا کرو کہ چند رکھی کا بھاگ اچھا ہو، ارے صورت میں کیا رکھا ہے، سیرت اور بھاگ میں سب کچھ پوشیدہ ہے۔ اگر کسی کے بھاگ ٹھیک نہیں تو کیا صورت کو لے کر وہ جائے گا۔“

بہر حال گاؤں کے سارے لوگ اس بچی کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ ہر کسی کی خواہش ہوتی کہ وہ اس بچی کو اپنے قریب رکھے، اس کی ماں جس کے گھر بھی اس بچی کو لے کر جاتی تو گھر کی عورتیں اس کی خوب صورتی کو بیان کرتے نہ سکتی تھیں۔

وقت پر لگا کر اڑنے لگا اور وہ بچی دھیرے دھیرے جوانی کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی جوانی نہیں آئی تھی کہ اس کی جوانی اور خوب صورتی کے چرچے ہر زبان پر تھے، ہاتھ پاؤں اس نے ایسے نکالے شروع کر دیئے تھے کہ وقت سے پہلے ہی وہ جوان لگنے لگی تھی، جب وہ چلتی تو نو جوانوں کے دل دھڑکنے لگتے، نو جوانوں بلکہ بڑوں کی نظر بھی اس پر ٹپک کر رہ جاتی تھیں، ہر وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چلتی رہتی تھی، ہر کسی کو اپنائیت اور بھرپور نظر سے دیکھتی تھی۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ جوانی کی بہاریں لوٹنے لگی۔ وہ جوان کیا ہوئی، گاؤں بھر کے جوانوں کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں۔ جو بھی اس کی نظر نظر اٹھاتا اور یہ سوچتا کہ کاش! چند رکھی مجھ پر مہربان ہو جائے۔ گاؤں میں موجود ہر اس گھر میں رہنے والوں کی خواہش تھی جس گھر میں کہ جوان لڑکے تھے ان کی خواہش ہو گئی تھی کہ چند رکھی ہماری بیوی بن کر ہمارے گھر میں آ جائے۔

گاؤں کا ٹھا کر بھی اسے بہت ہی پیار و محبت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ اکثر اس کے باپ جگدیش سے بولتا۔ ”ارے جگدیش! اپنی پتری کو گھر میں زیادہ رکھا کر، اسے زیادہ نہ نکلنے دیا کر، بلکہ یہ کوشش کیا کر کہ باہر کے سارے کام اس کی ماں یا پھر تو کر لیا کر، یا پھر اپنے

لڑکوں سے کر لیا کر، میں تجھے ہمدردی کر سمجھاتا ہوں، میری باتوں کا برانہ مان لیتا۔

جگدیش زمانہ خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا ہے۔ تیری پتری نے جو رنگ روپ نکالا ہے، وہ گاؤں بھر کے جوانوں کے لئے غضب کا ہے۔ میری بوڑھی اور تجربہ کار آنکھیں اسے دیکھ کر کبھی کبھی چٹکی کھانے لگی ہیں، بھگوان نہ کرے کوئی سر پھرا، اس پر بری نظر نہ ڈال بیٹھے، آگے تیری مرضی جگدیش۔“

جگدیش بولتا۔ ”ٹھا کر صاحب! آپ کی باتیں سر آنکھوں پر، آپ میری بھلائی کے لئے یہ باتیں کرتے ہیں، آپ اچھے آدمی ہیں اور آپ کے دل میں گاؤں بھر کے لئے ہمدردیاں ہیں۔ اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں۔ آپ کی باتوں کو میں نے من میں رکھ لیا ہے۔ اور اب سوچنے لگا ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔ اور ہو سکتا ہے کہ اگلی کٹائی کے بعد اس کا لگن کر دوں۔“

”جگدیش تو نے ٹھیک سوچا ہے۔ بھگوان کرے ایسا جلدی ہو جائے، تو گھبرانا نہیں، جہاں تک ہو سکا میں تیری مدد کروں گا۔“

ایک مرتبہ تو ٹھا کر نے یہاں تک کہہ دیا تھا۔ ”ارے جگدیش، میں تو ذات برادری سے مجبور ہوں، ورنہ میں ہی تیری پتری کو اپنی بہو بنا لیتا۔ یہ تو سب گاؤں والوں کو معلوم ہے کہ میں ذات برادری کے معاملے میں زیادہ کٹر نہیں، مگر پھر بھی پرکھوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

یہ سن کر جگدیش بولا۔ ”ٹھا کر صاحب! میں ہی کیا بلکہ سارا گاؤں جانتا ہے کہ آپ جیسا ہمدرد اور دیا لو کبھی کوئی اس گاؤں میں گزرائی نہیں اور نہ ہی کبھی سننے میں آیا ہے کہ آپ جیسا رحم دل اور گاؤں والوں کا خیال رکھنے والا کوئی اور ہو۔ آپ کی بہت بہت مہربانی کہ آپ ہم سب کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔“

لیکن ٹھا کر کے یہ نسبت، ٹھا کر کا بیٹا پران بہت ہی ادب و شرافت، شرابی اور گھمنڈی تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو گاؤں بھر کی بہو بیٹیوں کو دن دھاڑے اٹھالیتا۔ مگر اپنے



با اصول اور سخت مزاج انصاف پسند باپ کی وجہ سے مجبور تھا۔ مگر پھر بھی موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔

باپ کی سختی کے باوجود چوری چھپے اب تک گاؤں کی کئی لڑکیوں کی عزت پامال کر چکا تھا۔ جس کے ساتھ زیادتی کرتا اس کا منہ زیادہ نوٹوں سے بھر دیتا اور ساتھ ہی کہتا کہ ”اگر شور شراب کیا تو پورے گاؤں میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی اور پھر جان سے الگ جائے گی۔“

لہذا غریب کی بیٹیاں رو دھو کر اپنی عزت کی خاطر اور سب سے بڑھ کر موت سے بچنے کے لئے خاموش ہو جاتی تھیں۔

اس کے اپنے گاؤں کے علاوہ دوسرے گاؤں کے کئی لوگوں سے دوستانہ تھا۔ وہ بھی اس مزاج کے یعنی شرابی کہانی تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ خود کسی کے سامنے نہیں آ سکتا تو دوسرے گاؤں والوں کو ان کے پیچھے لگا دیتا تھا اور گاؤں والے اس لئے بھی ڈرتے تھے کہ اس کا باپ گاؤں کا ٹھاکر، گاؤں بھر کے لوگوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کیا کرتا تھا اور خاص طور پر شادی بیاہ میں ٹھاکر زیادہ مدد کرتا تھا، اور وہ بھی اگر لڑکی کی شادی ہوئی تو زیادہ مدد کرتا تھا۔

لوگ یہی سوچ کر اور بھی اس کے بیٹے کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے کہ آخر اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔

جلدیش کے پڑوس میں دلپ رہتا تھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جب چندر مکھی پیدا ہوئی تھی تو صبح ہی صبح اس کی ماں نے اس کے ہاتھوں چندر مکھی کے لئے چوڑیاں بھجوائی تھیں۔ دلپ بہت ہی گہرو اور دیکھنے والا نوجوان تھا۔ بہت زیادہ سختی اور ہر کسی کے کام میں کام آنے والا، جس کا بھی کوئی کام ہوتا تو وہ بڑھ چڑھ کر کام کر دیتا تھا۔

اگر یہ کہا جائے کہ دلپ گاؤں بھر کے لئے آنکھوں کا تار تھا تو یہ جھوٹ نہیں۔

دلپ اکثر چندر مکھی کو چوری چوری اچھٹی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ مگر کبھی بھی اپنے دل کی بات کا اظہار

نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی اپنے دوست یاروں کے درمیان بیٹھ کر چندر مکھی کے متعلق کوئی بات کرتا تھا۔ مگر یہ بات چندر مکھی سے چھپی نہیں تھی کہ دلپ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے دیکھتا ضرور ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر عورت ہر مرد کی نظر میں کازو بہت بھانپ لیتی ہے کہ اس کے لئے اس کے دل میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ دونوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا اور ویسے بھی گاؤں دیہات میں زیادہ پردے وغیرہ کا رواج نہیں ہوتا، گاؤں کے سارے افراد آزادانہ طور پر ایک دوسرے کے سامنے آتے جاتے رہتے ہیں۔

اور پھر ایک دن دوپہر کے وقت چندر مکھی کی ماں نے دلپ کو بلایا اور بولی۔ ”دلپ پتر! دوپہر کا سہ سے ہے، گرمی بچھڑا ہے، ذرا چندر مکھی کے ساتھ جا کر اس کے باپ کو روٹی دے آؤ۔“

دلپ اس وقت خالی ہی بیٹھا تھا فوراً راضی ہو گیا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے چاچی! اگر آپ مجھے روٹی دے دیں تو میں خود اکیلا جا کر چاچا کو روٹی دے آتا ہوں۔“

”ارے نہیں پتر! چندر مکھی بھی تمہارے ساتھ چلی جائے گی، ایک اور بات بھی ہے جو یہ اپنے باپ کو بتا دے گی۔ میں نے روٹی باندھ دی ہے، چندر اٹھ اور دلپ کے ساتھ چلی جا۔“

”ٹھیک ہے ماں!“ چندر مکھی نے کہا اور روٹی کی گھڑی اٹھا کر دلپ کے ساتھ جانے کے لئے گھر سے نکل پڑی۔ ان کے گھر سے کھیت تھوڑا دوری پر تھا۔ اتنی گرمی تھی کہ ہٹو بٹو، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ پاؤں کا پسینہ سر کو چڑھ رہا تھا۔ آدھے راستے جاتے جاتے چندر مکھی کا تو برا حال ہو گیا۔ وہ بولی۔ ”دلپ اس گرمی نے تو مجھے ہلکان کر دیا، اب مجھ سے چلتا دو بھر ہوا ہے۔“

چندر مکھی کی بات سن کر بولا۔ ”اچھا ایسا کرتے ہیں، وہ سامنے جوڑ کا درخت ہے اس کے نیچے بیٹھ کر تھوڑی دیر سٹالتے ہیں، جب سانس بحال ہو جائے گی تو پھر چل پڑیں گے۔“

یہ سن کر چندر مکھی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تھوڑی دیر بیٹھ کر سٹالتے ہیں۔“ اور پھر دونوں اس بڑے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ درخت کے نیچے اچھا خاصا سایہ تھا۔ چند منٹ بعد چندر مکھی بولی۔ ”دلپ ایک بات پوچھوں! دیکھو جھوٹ بالکل نہیں بولنا اور اگر تم نے جھوٹ بولا تو پھر میں ناراض ہو جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے پوچھو! یہ میرا وعدہ ہے کہ میں جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا۔“ دلپ بولا۔ چندر مکھی بولی۔ ”یہ بتاؤ! میں کیسی ہوں؟ اور تمہیں کیسی لگتی ہوں۔“

”چندر مکھی تم اچھی ہو، سندر ہو، سارے گاؤں والوں کو اچھی لگتی ہو اور جہاں تک مجھے کسی لگتی ہو تو..... بہت سندر لگتی ہو، بلکہ میں تو کہوں گا کہ تم سے زیادہ سندر سارے سنسار میں کوئی اور نہ ہوگا، تمہاری سندر تباہی مثال ہے۔“ دلپ بولا۔

دلپ کی باتیں سن کر چندر مکھی مسکرانے لگی اور غور سے دلپ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”دلپ کیا یہ سچ ہے کہ تم مجھ سے پریم کرتے ہو؟ مگر تم نے اس کا اظہار بھی نہیں کیا۔ دلپ ویسے تم بہت کھور ہو، کاش! کہ تم اپنے دل کی بات اپنی زبان پر لے آتے، مگر تم بہت گہرے بھی ہو، میں تمہارے دل کی بات جانتی ہوں کہ تم گاؤں بھر کے تمام لوگوں سے بڑھ کر مجھے چاہتے ہو، اور یہ بھی آج بھگوان کی کرپا ہے کہ آج بھگوان نے یہ موقع دیا کہ میں تمہارے ساتھ آئی تاکہ تمہاری زبان سے تمہارے دل کی بات سن سکوں، دیکھو مجھے جھوٹ مت بولنا۔“

چندر مکھی کی یہ باتیں سن کر دلپ غور سے چندر مکھی کو دیکھنے لگا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سندر مکھی یہ بات درست ہے، میں تم سے پریم کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا، کبھی اس کا اظہار کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ تم کبھی ناراض نہ ہو جاؤں، اور پھر اس ناراضگی کی وجہ سے جو میرے سامنے آئی ہو، وہ سامنے آنا ہی بند کر دو، لہذا انہی باتوں کی وجہ سے میں نے اپنی زبان بند کر لی اور آج تمہارے پوچھنے پر میں نے سچ اگل دیا۔ اب

تمہاری مرضی لیکن تم سے میری بستی ہے کہ بھگوان کے لئے مجھ سے ناراض نہیں ہونا، اگر میری بات بری لگی ہے تو میرے منہ پر تھپڑ مار دو، لیکن ناراض نہیں ہو۔ اور اگر تم ناراض ہو گئی تو یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہاری ناراضگی کے پیش نظر، مجھ سے تمہاری ناراضگی برداشت نہیں ہوگی اور پھر میں اپنا بیٹا جیون تیاگ دوں گا، مگر تمہاری ناراضگی.....“ اور دلپ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

دلپ کی باتیں سن کر چندر مکھی مسکرانے لگی اور پھر بولی۔ ”دلپ میں اپنے دل کی بات کہہ دوں، کسی سے بولو گے تو نہیں اور ناراض تو نہیں ہو گے، تو اپنے اپنے دل کی بات ہے، جو جس کو چھالے، اور اچھا لگنے والا ہر سے دل میں رہتا ہے، دل تمام کر میری بات سنو! دلپ میں بھی تم سے پریم کرتی ہوں۔“ اور یہ بول کر چندر مکھی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

یہ سن کر دلپ لمبے لمبے سانس لینے لگا، اس کی آنکھیں کھلنے اور جھپکنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد دلپ نے چندر مکھی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اس کا چہرہ اوپر کو اٹھایا، اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”چندر مکھی تمہارا بہت بہت دھن دھن، تم نے اس قابل سمجھا، یہ میرا وعدہ ہے کہ میں پوری زندگی تمہاری سندر تکی حفاظت کروں گا۔ ہر پل میری کوشش ہوگی کہ تم ہر وقت مسکراتی رہو، میں تمہارے سارے دکھ اپنے سر لے لیا کروں گا، میں زندگی بھر تمہاری پوجا کروں گا۔“ اور پھر دلپ نے ایک لمبا سانس کھینچا۔

چندر مکھی بولی۔ ”اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرتا بلکہ خاص طور پر اپنے دوستوں میں۔“ ”ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا، میں ماں کو بہت جلد تمہارے گھر بھیجوں گا، تم اس کا خیال رکھنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ماں اور تمہارے باپ اس رشتہ سے انکار کر دیں، اس کے لئے میری بستی ہے تم سے، میری خوشیوں اور چاہت کا سارا دار و مدار اب تم پر ہے۔“ دلپ بولا۔



”تم گھبراؤ نہیں، وہی ہوگا جو میں چاہوں گی، اچھا اب اٹھو، باپو جی روٹی کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ تھوڑی دیر میں دونوں اس کھیت میں پہنچ گئے، جہاں چند مکھی کے باپو کام کر رہے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر بولے۔ ”اے دلیپ بیٹا! تم تمہیں میری وجہ سے کشت اٹھانا پڑا، آج ویسے بھی گرمی زیادہ ہے، چند مکھی تو نہ آتی اتنی گرمی میں۔“

دلیپ بولا۔ ”بچا چاچی کوئی بات نہیں، گرمی ہے تو کیا ہوا، آپ بھی اور پھر سارے لوگ گرمی میں کام کر رہے ہیں۔ چاچی نے مجھ سے کہا کہ تم چند مکھی کے ساتھ چلے جاؤ گرمی زیادہ ہے اور پھر دوپہر کا وقت بھی ہے، اور آج آپ اپنے ساتھ روٹی نہیں لائے تھے، خیر آپ باتوں کو چھوڑیں اور جلدی سے روٹی کھالیں۔“ اور وہ روٹی کھانے میں مصروف ہو گئے۔ جب وہ روٹی کھا چکے تو دونوں واپس آ گئے۔

ادھر ٹھا کر کا ادب اش اور شرابی بیٹا بران، ہاتھ دھو کر چند مکھی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ ”اب میرا چند مکھی سے دور رہنا ممکن نہیں۔ اب تو چند مکھی کی یادیں مجھے رات میں سونے بھی نہیں دیتیں اور پھر پورا دن بے چینی میں گزر جاتا ہے۔ بہر حال میں اپنی جان پر کھیل کر چند مکھی سے اپنی پیاس ضرور بجھاؤں گا۔“ اس کے دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ ”ہم ہر حال میں تیرے ساتھ ہیں۔ جس طرح تو نے کئی لڑکیوں کے ساتھ کھلواد کیا۔ اسی طرح اس کے ساتھی بھی کر گزر۔“

اور پھر ایک دن دوپہر میں چند مکھی دلیپ کے ساتھ اپنے باپو کے لئے روٹی لے کر جا رہی تھی۔ راستے میں بران اپنے تین دوستوں کے ہمراہ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ جب وہ دونوں اس درخت کے پاس سے گزرنے لگے تو بران بولا۔ ”چند مکھی اس طرح اٹھلا کر جانا ٹھیک نہیں، آخر میں بھی تو مرد ہوں، مجھ میں کیا کمی ہے، کبھی ہمارا دل بھی خوش کر دو۔“

یہ سن کر چند مکھی بچھری گئی اور بولی۔ ”بے شرم

مجھے شرم نہیں آتی، ایسی بات کرتے ہوئے، آج میں ٹھا کر کا کاکے پاس ضرور جاؤں گی اور تیری ان باتوں کے ان کے سامنے رکھوں گی۔“ چند مکھی کا یہ بولنا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ آگے بڑھا اور چھپٹ کر چند مکھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ دیکھتے ہوئے دلیپ پر تو جیسے جنون سوار ہو گیا اور وہ شیر کی مانند بران پر بھجنا اور اپنے سر کی ٹکر اس کی ناک پر ماری۔ جس سے بران کی ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ اور اس اثناء میں چند مکھی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔

بران دھاڑ کر بولا۔ اپنے دوستوں سے۔ ”سارے کو پکڑ لو، بیچ کر نہ جانے پائے، اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔“ اس کے تینوں دوست فوراً آگے بڑھے اور دلیپ کو دو بوج لیا۔

چند مکھی سکتے کے عالم میں ایک طرف کھڑی تھی، لیکن پھر اچانک چونک پڑی اور بران کی جانب جھپٹی لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی تھی، بران اپنے سینے میں اڑسا ہوا بڑا چاقو دلیپ کے سینے میں گھونپ چکا تھا۔ دلیپ نیچے گر کر ترپنے لگا تھا۔ دلیپ کا خون دیکھ کر چند مکھی پر جیسے جنون سوار ہو گیا اور اس نے دلیپ کے سینے سے جھٹ چاقو کھینچا اور شیرنی کی طرح بران پر چھٹی۔

لیکن اس سے پہلے کہ بران کے زرخے پر چاقو پڑتا۔ بران نے پھرتی سے چند مکھی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر نیچے کی طرف موڑ دینے لیکن ہاتھ زیادہ نیچے مڑنے کے بجائے ہاتھ والا چاقو چند مکھی کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اور پھر تیزی سے خون نکل کر چند مکھی کے کپڑوں کو رنگنے لگا۔ چند مکھی تیار کر کر گرمی لیکن پھر اچانک ہوا میں اڑتی ہوئی چاقو کا بھر پورا وار بران کے زرخے پر کیا۔ بران کا زرخہ کٹ چکا تھا اور بران اپنا زرخہ پکڑے ادھر لہرانے لگا تھا اور پھر لہراتے ہوئے زمین یوں ہو گیا۔ یہ تمام خونی معاملہ ایک جھپٹے میں ہوا تھا۔

ادھر چند مکھی بھی دلیپ کے سینے پر سر رکھے

ساکت ہو چکی تھی۔ یہ خونی معاملہ دیکھ کر بران کے تینوں دوست سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دیوار پر ابھرنے والا منظر اچانک بہت واضح ہو گیا اور ساتھ ہی قریب آ کر بڑا ہوا تو میں جیسے اچھل پڑا۔ نیچے گرا ہوا مردہ حالت میں، میں خود تھا اور میرے سینے پر سر رکھے مردہ حالت میں لاج وقتی تھی جو کہ اس وقت میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔

اور پھر مجھے اچانک لاج وقتی کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ لاج وقتی بری طرح سسک رہی تھی۔ میں نے لاج وقتی کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا، کافی دیر تک ہم دونوں بے حس و حرکت ساکت رہے، پھر میں نے کہا۔ ”لاج وقتی۔“

میرے منہ سے اپنا نام سن کر اس نے اپنا چہرہ اوپر کو اٹھایا اور بولی۔ ”اگر تم نے دیکھ لیا، دشمنوں نے ہمارا مال اپ اس جنم میں بھی نہیں ہونے دیا۔“

اس میں تمہیں پانے کے چکر میں ہر جنم میں دکھ جھیلنی ہوتی آ رہی ہوں اور میرے ساتھ ساتھ تم بھی اذیت کا شکار بن رہے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایک ناری جو کہ بہت کم ہمت اور کم حوصلہ ہوتی ہے، وہ کہاں تک دکھوں کو جھیلے اور اپنے پریمی کو حاصل کرنے کے لئے بار بار ہر جنم میں بھگوان سے پرارتھا کرے کہ اس کا پریمی اسے مل جائے۔

اس میں ہمت ہارتی جا رہی ہوں مگر صرف تمہارا پریم، تمہاری چاہت اور تمہارا قرب مجھے ہر جنم میں با حوصلہ بناتا ہے اور میں تمہیں پانے کے لئے تمہارا راستہ سکتے سکتے میری آنکھیں جیسے پتھر لگتی ہیں۔

اسم چاہے مجھے سات جنموں تک جنم لینا پڑے تو بھی میں ہمت نہیں ہاروں گی۔ میں نے کمر باندھ لی ہے، کہ ہر صورت میں، میں تمہیں حاصل کر کے رکھوں گی، بلوکم کیا کہتے ہو، کیا تمہارا دل میرے دکھوں اور چاہت کو دیکھ کر ذرا بھی نہیں ہلچتا، کیا تمہیں میری چاہت نہیں، کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہیں حاصل کر لوں، کیا تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں، کیا میں اس طرح جنم

لیتی رہوں گی اور ہر جنم میں تمہارے ساتھ منڈپ کے چکروں کو پورا نہیں کر پاؤں گی؟“ ”لاج وقتی، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ سب بھگوان کی اچھا سے ہور ہے، نہیں معلوم کہ بھگوان کیا چاہتا ہے، اور ابھی تک اپنے کسی جنم کا کوئی واقعہ بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔“

”اگر تمہیں جیتے سے کے واقعات ضرور یاد آئیں گے، میں تمہیں یاد کر کے رکھوں گی اور مجھے دشواں ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ضرور ہو جاؤں گی۔“

لاج وقتی کی آنکھوں سے آنسو اب رواں ہو چکے تھے، اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کا رخ دیوار کی طرف کیا تو ہاتھ کی تھیلی سے چنگاریاں نکلیں اور دیوار کے پاس جا کر دیوار میں پیوست ہو گئیں، اور دیوار سفید روشنی میں نہا گئی۔

پھر عجیب و غریب منظر ابھرا، اس مرتبہ میں نے خود کو جوان پایا، میری شکل واضح تھی، میں فوجیوں کے لباس میں ملبوس تھا، پھر کسی دربار کا منظر ابھرا، اس بار میں ایک عالی شان کرسی پر بیٹھا تھا، دربار کی بادشاہ کا تھا، اس دربار میں اوپر کی جانب زنان خانہ تھا، جہاں کہ شہزادی اور اس کی خادما میں موجود ہوتی ہیں۔ لاج وقتی اپنے منہ پر آدھا نقاب ڈالے بیٹھی میری طرف نظریں جمائے مسکرا رہی ہے۔ مہاراجہ میرا نام لے کر پکارتا ہے۔ میں اپنا نام سن کر اپنی جگہ کھڑا ہو جاتا ہوں۔ مہاراجہ کی آواز پھر سنائی دیتی ہے۔ ”رنجیت تم میرے پتر ہو، تم راج کمار ہو، میں ہی کیا دربار میں جتنے بھی لوگ موجود ہیں سب کے سب تمہاری بہادری کے قائل ہیں۔ تم نے بڑے بڑے دشمنوں کو شکست سے دو چار کیا ہے۔ میں نے بہت وچار کیا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کیوں نہ تمہیں سپہ سالار بنادیا جائے۔“

اور تمہارے اس عہدہ کے لئے سارے درباری متفق ہیں۔ سب کی رائے تمہارے حق میں ہے۔ لہذا آج سے تم سپہ سالار کی ذمہ داریوں کو سنبھالو اور ہر محاذ پر



دشمنوں کے دانت کھٹے کر دو، جو بھی میلی آنکھ سے ہماری سلطنت کو دیکھنے کی ہمت کرے اس کی گردن اس کے دھڑ سے الگ کر دو، مجھے بہت زیادہ امید ہے کہ تم اپنی ذمہ داریوں کو چاک و چوبند طریقے سے نبھائو گے، آج سے تم سینا پتی رنجیت ہو۔“

اور پھر مہاراجہ نے اپنے سامنے ایک میز پر پڑی ہوئی تلووار اٹھائی اور سینا پتی کو بلا کر اس کے ہاتھ میں تلووار پکڑا دی۔ پھر وہ بولا۔ ”وہجیت یہ تلووار ہمارے پرکھوں کی ہے۔ اس کی عزت، وقار، دبدبہ اور حفاظت اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ تلووار ہمیشہ بلند رکھنا، یہ تلووار کی صورت بھی کسی اور کے ہاتھ میں نہ جانے پائے، میرا آشریہ واد تمہارے ساتھ ہے۔“

یہ سننا تھا کہ دربار میں موجود تمام لوگ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور ”سینا پتی رنجیت..... سینا پتی رنجیت“ کے نعرے لگائے گئے۔

پھر مہاراجہ نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو نعرہ لگانے سے منع کیا اور بولا۔ ”رنجیت اب تم جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔“ یہ سنتے ہی میں پلٹا اور واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اوپر بالکونی میں بیٹھی لاج وئی کی مسکراتی ہوئی نظریں میرے اوپر مرکوز تھیں۔ میں نے بھی جب بھرپور نظریں اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنی گردن ہلکی سی خم کی اور مجھے بدھائی دی۔

تھوڑی دیر بعد مہاراجہ نے دربار پر درخواست کرنے کا اعلان کیا تو سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر چلے گئے، جاتے جاتے میری نظریں اچانک بالکونی کی طرف گئیں تو دیکھا کہ لاج وئی ہاتھ کے اشارے کر رہی تھی۔ میں نے بھی ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ پر پھیر لیا۔

مجھے سینا پتی کی ذمہ داری سنبھالے چند دن ہی گزرے تھے۔

وہ رات بہت اندھیری تھی۔ اماؤں کی راتیں شروع ہو چکی تھیں، اچانک ہمارے مخبروں نے خبر دی کہ فلال سلطنت کی فوجیں ہم پر حملہ کرنے والی ہیں اور کسی بھی رات میں ایسا ہو جائے گا۔

اس خبر کے ملتے ہی ہم نے زور و شور سے اپنی تیاری شروع کر دی۔ رات میں تمام سیناؤں کو چوکس کر دیا جاتا تھا۔ یہ کئی خبر تھی کہ دشمن رات میں ہی حملہ کرے گا۔ مہاراج کا میرے لئے حکم تھا کہ اگر حملہ زبردست ہو اور پھر بچاؤ کی کوئی تدبیر نظر نہیں آئی تو میں اپنی سیناؤں کو لے کر اس جگہ سے نکل جاؤں اور پھر بعد میں دشمن پر چڑھائی کروں کیونکہ اکثر فتح کے بعد لوگ جشن مناتے ہیں اور ہونے والے حملہ کو بھول جاتے ہیں۔ اس تدبیر پر مجھے عمل کرنا تھا۔

اور پھر ایک رات دشمن نے ہم پر واقعی حملہ کر دیا۔ میرے لوگوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ہمارے قدم اکھڑ گئے اور ہم مہاراجہ کے حکم کے مطابق فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پوری راج دھانی میں خون کی ندیاں بہا دی گئیں۔ لوگوں کو دشمنوں نے گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ گل میں موجود سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ قتل ہونے والوں میں لاج وئی بھی شامل تھی۔

میری دنیا اندھیر ہو گئی۔

لیکن میں نے دشمن سے بدلہ لینا تھا۔ اس حوصلے اور ہمت کی بدولت میں زندہ تھا۔ بھاگتے بھاگتے ہم ایک گھنے جنگل میں پہنچ گئے۔ جب ہم نے اطمینان کر لیا کہ ہم دشمن کی پہنچ سے کافی دور نکل آئے ہیں تو ہم نے جنگل میں پڑاؤ ڈال دیا۔

اس جنگل میں کئی دن بیت گئے۔ پھر سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اس جنگل سے نکلنا موت کو دعوت دینا ہے۔ بلکہ اس جنگل میں رہتے ہوئے ہم اپنی طاقتیں بڑھا سکتے ہیں اور پھر کسی بھی رات اچانک حملہ کر کے دشمن کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔

جہاں پر ہمارا پڑاؤ تھا وہاں سے تھوڑی سی دوری پر اپنی کنیاش میں ایک سادھو رہتا تھا۔ اس سادھو کے ساتھ اس کی ایک بہت ہی سندر پتری بھی تھی۔ سادھو نے کئی بکریاں پال رکھی تھیں۔ میں ہر روز بلا ناغہ سادھو کی کنیاش میں جاتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر سادھو سے باتیں کرتا اور پھر

اٹھ کر چلا آتا۔ یہ روز کا معمول بن گیا تھا کہ سادھو کی پتری سادھو کے حکم پر بکری کا تازہ دودھ ایک مٹی کے پیالے میں ڈال کر دیتی اور میں بلا جھجک وہ دودھ پی لیتا۔ میں نے اپنی ساری کٹھا سادھو کو سنا دی تھی۔ جسے سن کر سادھو بہت بے چین ہوا تھا۔ وہ سادھو بہت زیادہ مٹیانی تھا۔ جادو منتر میں اس کی پہنچ بہت اوپر تک تھی۔

روز روز کے آنے جانے سے سادھو کی پتری مجھ سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی۔ سادھو کا بھروسہ بھی مجھ پر زیادہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی میں دوپہر کے وقت بھی چلا جاتا تھا اور پھر ہم دونوں بکریوں کو لے کر کنیاش سے دور جنگل میں نکل جاتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم دونوں قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔

دیے بھی سادھو کی پتری اپنے باپ کے ساتھ جنگل میں رہتے رہتے جنگل کی زندگی سے اور وہ بھی بالکل ایکلی آگیا تھی۔ چونکہ انسان معاشرتی کڑا ہے لہذا ہر انسان جو کہ باشعور اور ہوش مند ہوتا ہے وہ انسان کے درمیان رہنا پسند کرتا ہے۔ جب میں کنیاش میں جاتا تو سادھو کی پتری مجھے دیکھتے ہی چپکے لگتی تھی۔ اس کی خوشیاں کئی گنا بڑھ جاتی تھیں۔ اس میں جیسے کئی بھر جاتی تھی۔

جب ہماری قربت زیادہ ہو گئی تو سادھو کی پتری جس کا نام گنگا تھا اس نے برملا اظہار کر دیا۔ ”بالو جی آپ مجھے اپنی دنیا میں لے چلیں، میں سارا جیون آپ کے چرن دھو دھو کر پیوؤں گی۔“ ہر روز راز و نیاز کی باتیں ہونے لگیں۔ سادھو ہم دونوں پر بھروسہ کرتے ہوئے جنگل سے دور نکل جایا کرتا تھا۔ مانگنے مانگنے و سودا سلف لانے کے لئے۔

اور پھر ایک دن ہم دونوں نے جذبات کے رو میں بہہ کر وہ کچھ کر لیا جو کہ ہمیں نہیں کرنا چاہئے تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ سادھو سامنے کھڑا تھا، اس کی غصہ برساتی سرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ترشول تھا۔ اس نے غصہ ناک حالت میں ترشول کا رخ اپنی پتری کی طرف کر دیا تو ترشول کی نوک

سے چنگاریاں نکل کر گنگا کے جسم میں گھسنے لگیں۔ گنگا کی چیخیں پورے جنگل کو دھلانے لگیں۔ اور پھر چند منٹ میں ہی اس کے پورے وجود میں شعلے بھڑکنے لگے۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تمام حالات کو آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر مجھ میں اتنی سکت نہیں بچی تھی کہ میں سادھو کو روک سکوں یا گنگا کے جسم پر بھڑکتے شعلوں کو بجھا دوں۔ چند منٹ نہ لگے اور گنگا اپنی جگہ جل کر راکھ میں تبدیل ہو گئی۔

اچانک سادھو کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”پانی! اب میری نظروں سے دور ہو جا، میں نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تو نے میرے بھروسے پر پانی پیھر دیا۔ میرا شراب ہے کہ تو بھی کبھی نہیں رہے گا۔ اور یہی نہیں بلکہ ہر پون ماشی کی رات میں ایک بچہ میرے پاس لائے گا اور اس بچے کی ملی میں دوں گا، اور یہ بھی کان کھول کر سن لے کہ تو وقتاً فوقتاً اپنے خاندان سے بھی بچہ میرے پاس لائے گا۔ اور تو اپنا پہلا سنان (بچہ) بھی میرے پاس لائے گا اور میں تیرے سامنے تیرے سنان کی بلی دوں گا۔

تو کئی جنموں سے جنم لے رہا ہے اور ہر جنم میں تو ایک ناری سے پھڑ جاتا ہے، وہ ناری تیرے پریم میں بار بار جنم لے رہی ہے۔ تیرے پریم میں وہ چلتی رہتی ہے تم دونوں کا دواہ نہیں ہوتا، تم دونوں اکیلے موت کا شکار ہو جاتے ہو، مگر اب تو دواہ کرے گا کسی اور ناری سے، اب تیرا اس جنم جنم والی ناری کی آتما سے چھٹکارا مل جائے گا، مگر مجھ سے تیرا چھٹکارا پانا ناممکن ہے، تو مرنا بھی چاہے تو مر نہیں سکے گا۔“ اور پھر اس سادھو نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میری گردن پکڑ لی۔ اس کے ہاتھ کے لمبے ناخن میری گردن میں پیوست ہو گئے اور میں درد سے بلبلہ کر تیج پڑا اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

اب میں ہوش و حواس میں تھا، اندھیری جگہ، ہر طرف ہو کا عالم، میں آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھنے لگا مگر لاکھ کوشش کے باوجود بھی مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ کے دے رہا تھا، خیر میں مایوس ہو کر نیچے ٹولا تو



پاؤں کے پاس مجھے ایک بڑا سا پتھر محسوس ہوا۔ لہذا مارتا کیانہ کرتا کے مصداق میں اس پتھر پر بیٹھ گیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک میں اس پتھر پر بیٹھا رہا۔ بہر حال اتنا ضرور ہوا تھا کہ میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئی تھیں۔

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک کھنڈر تھا۔ ہر طرف پتھر ہی پتھر بکھرے پڑے تھے، جب میرے حواس کچھ زیادہ بحال ہوئے تو میں نے سوچا۔ ”اب کسی طرح اس کھنڈر سے نکلتا چاہئے۔“

پھر اچانک میری گردن پر جھپٹ کا احساس ہوا اور پھر آہستہ آہستہ درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ میں نے جب گردن پر اپنی انگلیاں پھیریں تو انگلیوں پر عجیب سی چچچاہٹ محسوس ہوئی۔ اور ساتھ ہی محسوس ہوا کہ ”میری گردن پر چند زخم بھی ہیں اور شاید ان زخموں سے خون رس رہا تھا۔“

اب میرا اس کھنڈر میں بیٹھے رہنا دو بھر لگ رہا تھا، میں نے پکارا ارادہ کر لیا کہ اب مجھے اس کھنڈر سے نکلتا چاہئے۔ لہذا اس خیال کے آتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا، سامنے کی طرف آسمان کی ہلکی ہلکی روشنی نظر آرہی تھی، میں نے باہر جانے کی سمت کا اندازہ کرتے ہی باہر کی جانب اپنے قدم بڑھا دیئے۔

لیکن پھر اچانک ایک بڑے الو کی کرہہ چیخ سنائی دی، وہ الو چیخے ہوئے میرے سر پر سے گزر گیا تھا، الو کی چیخ کے ساتھ ہی میری بھی فلک شگاف چیخ نے پورے کھنڈرات کو دہلا کر رکھ دیا۔ میں بہم کتر کتر کانپنے لگا، میری ٹانگیں کپکپانے لگیں، مجھ سے کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا، میں دھپ سے اس جگہ بیٹھ گیا جہاں کہ کھڑا تھا۔

چونکہ انسان اندھیرے میں دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا مگر انسان کے علاوہ کئی جانور یا پرندے ایسے ہیں کہ جو واضح طور پر اندھیرے میں دیکھتے ہیں۔

وہ الودودارہ چیختا ہوا میری طرف آیا اور میرے سر پر سے ایک طرف کو گزر گیا۔ اب تو میری حالت ایسی تھی کہ ان کو تو بدن میں خون نہیں۔ میرا اب اس کھنڈر میں بیٹھنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا اور باہر نکلتا بھی مشکل

نظر آرہا تھا۔ میں شش و پنج میں مبتلا سوچنے لگا کہ ”اب میں کروں تو کیا کروں؟“

اچانک میرے دماغ میں آیا کہ اذیت کی گھڑی میں بھگوان کو یاد کیا جاتا ہے اور پھر میں پوری طاقت سے چیخ پڑا۔ ”بھگوان میری رکھشا کر، لکشی دیوی میری سہارا کر، کالی ماتا میری مدد کر۔“ یہ الفاظ میں نے کئی مرتبہ دہرائے، اور پھر میں نے اپنے جسم کی توانائی کو یکجا کر کے ایک مرتبہ پھر میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اور جس طرف میرا منہ تھا، اس طرف کو میں اپنے قدم آہستہ آہستہ بڑھانے لگا۔ ہر طرف گھٹاؤ پ اندھیرے کا راج تھا، کوئی بھی چیز بھائی نہیں دیتی تھی، بہر حال ٹھوکریں کھاتے اور گرتے پڑتے میں کھنڈرات سے باہر نکل آیا۔

کھنڈر سے باہر نکلنے ہی میں لمبے لمبے سانس لینے لگا، کیونکہ کھنڈر سے باہر فریش ہوا چل رہی تھی، میرے دم میں دم آیا اور پھر میں نے اپنا منہ اوپر آسمان کی طرف کر کے بولا۔ ”بھگوان بہت بہت دھن دھن واد کہ مجھے کھنڈر سے باہر نکالا۔“ اور پھر سے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اندر کھنڈر میں بہت زیادہ ٹھن تھی، کیونکہ کھنڈر کے اندر فریش ہوا کا گزرنہ ہونے کے برابر تھا۔

چند منٹ تک میں نے لمبے لمبے سانس لینے کے بعد بخور چاروں طرف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اب مجھے ہلکا ہلکا نظر آنے لگا تھا، میں نے دیکھ کہ میں جہاں کھڑا ہوں وہ بہت ہی ٹوٹی پھوٹی اور خستہ حال سڑک ہے جو کہ کافی دور سے کھنڈر کے پاس آئی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ ماضی میں یہ کھنڈرات نہیں بلکہ یہ کوئی عالیشان محل ہو گا یا پھر بہت زبردست حویلی ہوگی تو یہاں تک یقیناً سڑک بھی آتی ہوگی۔

بہر حال میں لڑکھڑاتے قدموں سے جس طرف سڑک کا رخ تھا اس طرف چلتا شروع کر دیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ میں اس کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ بس میرے دل میں یہ خیال بار بار آ رہا تھا کہ میں جلد از جلد کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جاؤں اور اسی خیال کے تحت میں اپنی طاقت اور جسمانی توانائی

سے بڑھ کر آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ کئی مرتبہ جب میں چلتے چلتے تھک جاتا تو چند منٹ کے لئے سڑک پر ہی آتی پانی مار کر بیٹھ جاتا۔ اور تھوڑی دیر سستانے کے بعد پھر بھگوان کا نام لے کر اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے قدم آگے ہی آگے بڑھانے لگتا۔

چلتے چلتے جب ہمت جواب دے گئی تو میں تھک کر سڑک کے کنارے غدا حال ہو کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی گردن کا کافی حد تک نیچے کو جھکا۔ کافی دیر کے بعد جب میں نے اپنی گردن اٹھا کر آنکھیں کھولیں تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ اب صبح کا سپیدہ آہستہ آہستہ سر اٹھارہا تھا۔

اور پھر چند منٹ بعد ہی برندے چچھاتے ہوئے اڑتے پھرتے نظر آنے لگے لیکن دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ میں پھر ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور جدھر سے سڑک آرہی تھی اسی سمت کو چل پڑا۔ اب پیاس کی وجہ سے میرے گلے میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے۔ گلا خشک ہو رہا تھا اور میں اپنی زبان بار بار ہونٹوں پر پیچھرنے لگا تھا۔

ان تمام حالات کے باوجود میں آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ کافی دور جانے کے بعد اچانک سڑک کے کنارے تھوڑی دوری پر ایک گڑھے میں جمع پانی نظر آیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میرے قدم تیز تیز آگے بڑھنے لگے۔

میں کافی تیز چلتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں کہ گڑھے میں پانی موجود تھا۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ پانی کب سے اس گڑھے میں موجود ہے، پینے کے قابل ہے بھی کہ نہیں۔ میں فوراً سڑک سے نشیب میں اترا اور گڑھے کے کنارے اکڑو بیٹھ کر چلو بھر بھر پانی پینے لگا۔ میں نے اتنا پانی پیا کہ میرا پیٹ بھر گیا۔ میں نے بھگوان کا شکر یہ ادا کیا اور پھر گڑھے کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اب کافی حد تک امید بندھ چکی تھی کہ آگے کوئی نہ کوئی آبادی نظر آجائے گی۔ یا پھر سڑک پر آتے جاتے لوگ تو مل ہی جائیں گے۔ یہ سوچ کر میرے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔

موسم گلابی تھا نہ زیادہ سردی اور نہ زیادہ گرمی۔ سورج اب آہستہ آہستہ اوپر کواٹھ رہا تھا۔

کافی دور چلنے کے بعد میں نے دیکھا۔ تاحد نظر تک سرسبز و شاداب جنگلات پھیلتے چلے گئے تھے اور ارد گرد سبز پوش پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ چند بے حد دور اور چند بے حد قریب جگہ جگہ ٹیکریاں تھیں جن پر مقامی لوگوں کی بھونٹیاں بہت ہی بھلی معلوم دیتی تھیں۔

بہر حال میں آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ آدھی ڈھلوان کی چوٹی پر دور تک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک دکھائی دیتی۔ سڑک چکی اور ناہمواری جس پر جگہ جگہ پتھر ابھرے پڑے تھے، کبھی کبھی کوئی گاڑی تیزی سے ان ڈھلوانوں سے نیچے کی جانب اترتی ہوئی نظر آتی، لیکن کوچوان اپنی گاڑی پر بیٹھے اپنے ٹھوڑوں کو کافی تیز رفتاری سے بھگاتے ہوئے ڈھلوان سے اترتے اور تیزی سے نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ اب سڑک کے دائیں بائیں سر بھلک درخت کھڑے تھے، یہ ٹیکسی جنگلات کا حصہ تھا۔ سرسبز پہاڑیاں دور تک چلی گئی تھیں اور دور جاتے ہوئے پہاڑوں سے مل گئی تھیں، ان اونچے اونچے پہاڑوں پر دور سے جمی ہوئی برف بھی صاف اور واضح نظر آرہی تھی۔ ان سبز پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے بہت سے چشمے ننھے ننھے آبشاروں کی صورت میں نیچے کو گر رہے تھے، سورج کی کریمیں آبشاروں کے پانی کو سیال سونے میں تبدیل کر رہی تھیں۔

اچانک ایک مسافر میرے سامنے آ گیا اور مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ دیکھو سامنے پہاڑ کو۔“ سڑک سنسان تھی مگر اب اکا دکا مسافر نظر آنے لگا۔ وہ بھی بہت تیزی میں ہوتا۔ اس کی تیزی کو دیکھتے ہوئے میری ہمت جواب دے جاتی کہ یہ تو خود بہت تیز بھاگا جا رہا ہے۔ میری ہمت اور مصیبت پر بالکل بھی کان نہیں دھرے گا۔

جب میں اور آگے بڑھا تو یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ سڑک کے دونوں طرف تھوڑے فاصلے پر ترشول گڑھے پڑے تھے۔



میں کافی حیران پریشان ان ترشولوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر بے شمار فاصلے پر ترشول کیوں بڑک کے کنارے زمین پر گاڑے گئے ہیں۔ میرے ذہن میں آیا کہ ترشول تو بہت زیادہ پورے ہوتے ہیں اور ہر سنیا سی، سادھو اور سنسار تیا گئے والے کے ہاتھ میں ترشول چاہے چھوٹا ہو یا بڑا موجود ضرور ہوتا ہے۔

اب کوئی بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کوئی دو گھنٹے تک ان ترشولوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا کہ اچانک مجھے ایک مندر کا گنبد نظر آیا۔ تو میری جان میں جان آئی۔

اور میں زیادہ تیز تیز چلتا ہوا مندر کے اور بڑھنے لگا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ بعد میں مندر کے سامنے پہنچ گیا۔ مندر کے باہر کئی لوگ موجود تھے۔ شاید وہ سب مندر میں دیوی کے چروں میں چڑھا دیا جانے آئے تھے، میں نے ان لوگوں پر ایک اچھٹی نظر ڈالی اور پھر مجھے زبردست چکر آیا، میں تورا کر نیچے زمین پر گر گیا اور میری آنکھوں میں تاریکی چھائی چلی گئی۔

کچھ بھی ہوش نہ رہا تھا اور جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کمرے میں پایا۔ میں ایک درمی پر لپٹا پڑا تھا۔ میں کسمسا کراٹھ بیٹھا اور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ مجھ میں اب اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوں۔

میں کافی دیر تک اسی حالت میں درمی پر بیٹھا رہا۔ اس کمرے میں سوائے اس درمی کے کوئی اور چیز بھی نہیں تھی یہاں تک کہ پانی کا گھڑا بھی نہیں تھا۔ اگر گھڑا ہوتا تو میں کھٹکتا ہوا ایک گلاس پانی پی لیتا۔

میرے دماغ میں سوچوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ میں کبھی اپنا سر نیچے جھکا لیتا اور کبھی سر اوپر کو اٹھا کر چھت کو گھورنے لگتا۔ تقریباً کوئی ایک گھنٹہ بعد ایک شخص اندر آیا، اس نے سفید دھوئی باندھ رکھی تھی، اوپری دھڑاس کا رنگ تھا اور گلے میں ایک جینو ڈال رکھا تھا۔

”بالک تم اٹھ گئے! یہ دیوی کی کرپا ہے کہ تم

مندر کے سامنے گر کر بے ہوش ہو گئے تھے، دیوی مایا بڑی دیا لو ہے، اپنے سیوکوں کا بہت خیال رکھتی ہے، تم بہت دھکی اور کش میں مبتلا لگتے ہو۔ خیر اب تم چھتا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ پنڈت نما شخص بولا۔ یہ تو مجھے پکا یقین ہو گیا تھا کہ وہ مندر کا پنڈت نہیں تھا کیونکہ اکثر مندر کے پنڈت بڑے گھمنڈی اور گردن اکڑ ہوتے ہیں۔

بولنے کی جگہ میں طاقت نہیں تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا کہ ”میں پانی پیتا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی کچھ کھانا بھی چاہتا ہوں کیونکہ میں بہت بھوکا ہوں۔“

میرے ہاتھ کے اشارے کو دیکھ کر وہ فوراً اٹھا اور اپنے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ظہر وہ، میں ترنت پچھنے کچھ لے کر آتا ہوں۔“

چند منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا، اس کے ہاتھ میں پیٹل کی ایک تھالی تھی۔ اس نے وہ تھالی میرے سامنے رکھ دی، تو میں نے دیکھا کہ اس تھالی میں کئی پوریاں اور آلو کی بھجیا تھیں۔ وہ بولا۔

”بالک تم کھانا شروع کر دو، میں پانی بھی لے کر آتا ہوں۔“ اور وہ واپس چلا گیا۔ پھر وہ بہت جلد آیا اس کے ہاتھ میں ایک بہت ہی چھوٹا سا مٹی کا گھڑا اور ایک مٹی کا ہی بیالہ تھا، اس نے گھڑا اور بیالہ دیوار کے پاس رکھا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ”بالک آرام سے کھاؤ، میں کشن کو بول آیا ہوں، وہ اور بھی پوریاں لے کر آتا ہی ہوگا۔“

ابھی میں نے ساری پوریاں کھائی بھی نہ تھیں کہ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں بھی پیٹل کی تھالی تھی اور تھالی میں گرم گرم پوریاں اور گرم بھجیا تھیں، اس نوجوان نے تھالی میرے سامنے رکھ دی اور اس پنڈت نما شخص کی طرف دیکھا تو اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ ”اب تو واپس چلا جا۔“ وہ نوجوان ترنت واپس چلا گیا۔ میرے پاس جو بیٹھا تھا۔ مجھے کھانا ہوا بغور دیکھتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں، میں ساری پوریاں بھی

کے ساتھ کھا گیا۔ اور پھر گھرے میں سے ایک کٹورہ پانی لیا۔ سچ کہتے ہیں کہ پیٹ میں روٹی جاتے ہی انسان میں اندرونی طور پر توانائی بھرنے لگتی ہے۔

پنڈت بولا۔ ”بالک واقعی تم بہت بھوکے تھے، نہ گھبراؤ نہیں، اس مندر میں تمہارے ساتھ بیٹے ہوئے سارے کش ختم ہو جائیں، دیوی مایا اپنے سیوکوں کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اب تم آرام کرو اور ویسے بھی کافی بھوک کے بعد جب منٹل کے پیٹ میں کھانا بڑتا ہے تو منٹل کو نیند آنے لگتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری آنکھوں میں نیند بھر رہی ہے اور تم پر غنودگی چھا رہی ہے۔

اب میں چلتا ہوں، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دینا، میں آ جاؤں گا، میرا نام رام لال ہے۔“ اور یہ بول کر پنڈت نے برتن اٹھائے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

بھوک کی وجہ سے میں نے کچھ زیادہ ہی کھالیا تھا۔ بھوک میں ہر چیز سوا دوا لگتی ہے۔ میں فوراً درمی پر لیٹ گیا اور اپنے گھر کو یاد کرنے لگا۔ کہاں میں لاڈ پیار میں پلا، اپنی پسند کا کھانے والا، نرم بستر پر سونے والا، کبھی کبھار نہیں اور جبکہ اگر بستر سخت ہوتا تو آنکھوں سے نیند غائب ہو جاتی۔

میرے دماغ میں آیا۔ ”بھنگوان میں کون سی انکی غلطی کر بیٹھا کہ میں ان حالات سے دوچار ہوا، پھر نہ جانے اور کتنے دن اور اذیت ناک حالات کو بھگلتا پڑے گا۔ میرے گھر والے مجھے نہ پا کر کس تکلیف دہ حالات سے گزر رہے ہوں گے۔ میں کیسے اور کیوں کر اچانک اس جادوگری میں پھنس گیا تھا۔“

اور میں اچانک کس طرح اس نکل میں پہنچا اور پھر جتنی کا ملنا اور اس کے بعد کئی جنموں کے حالات کو سامنے لا کر مجھے دکھاتا اور پھر اس جنگل میں پہنچنا اس کے بعد اس ناری کے پتا سادھو کا غضب ناک ہونا اور شراب کے ساتھ یہ کہنا کہ ہر پورن ماشی کی رات میں ایک منٹ کی پٹی..... یہ تمام باتیں ایسی تھیں جو کہ میری خبر تک نہیں۔

خبر تک نہیں اور بھوک کی وجہ سے میں بے حال تھا،

بھوک مٹ گئی مگر ابھی تک میں تھکن سے چور چور تھا۔ پھر میرے دماغ میں تاریکی چھائی چلی گئی اور میں نیند سے دوچار ہو گیا۔

اناس کی راتوں کا اندھیرا پورے علاقہ پر چھا چکا تھا۔ ارد گرد کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ میں بے یار و مددگار ایک طرف کو چلا جا رہا تھا۔ میں کہاں جا رہا تھا۔ یہ معلوم نہ تھا بس میں آگے ہی آگے چلتا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک جگہ ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل نیچے گر گیا۔ چوٹ کی درد سے میں بلبلاتا تھا، ابھی میں سنبھلنے اور اٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک عجیب کان بھاڑ دینے والی کرخت آواز سنائی دی۔ ”لوئے بھاگ..... اٹھ جلدی کر..... اوئے دیر نہ کر..... یہ راتھش تیرا خون پی لے گا..... جلدی اٹھ کر بھاگ۔“

اور پھر اس کے ساتھ کسی جانور کی زبردست غراہٹ سنائی دی۔ غراہٹ اتنی زبردست تھی کہ مجھ پر کچکی طاری ہو گئی، میں اندر سے ہم گیا مگر جان بچانی تھی اس راتھش سے، میں جلدی سے اٹھا اور سامنے کی سمت بھاگنے لگا، پھر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ واقعی کوئی عجیب الخفقت جانور تھا اور وہ مجھے بھی پکڑنے کے لئے میرے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنٹی ہوئی تھیں اور میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ وہ کوئی راستہ نہیں تھا جس پر میں بھاگ رہا تھا جبکہ میرے اندازے کے مطابق وہ کوئی چٹیل میدان تھا، میں آگے اور وہ جانور میرے پیچھے بھاگتے بھاگتے میری ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں، میرا برا حال تھا، میرا سانس اپنی رفتار سے کئی گنا زیادہ چل رہا تھا۔ میں اس قدر تیزی سے سانس لینے لگا تھا کہ اگر کوئی اور بھی میرے ساتھ دو تین فٹ کے فاصلے پر دوڑ رہا ہوتا تو اسے واضح طور پر دھوکئی کی طرح چلتے میرے سانسوں کی آواز سنائی دیتی۔

صرف اور صرف میرے دماغ میں ایک بات تھی کہ میرے پیچھے ایک راتھش لگا ہوا ہے اور یہ میرا



خون پی جائے گا۔ ہر انسان کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے اور اپنی جان سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ایسی چیز ہو جو انسان کو پیاری ہو۔ بھاگتے بھاگتے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا، بس صرف پیچھے لگے اس ہیبت ناک راہش کی غراہیں سنائی دے رہی تھیں۔

شروع میں تو میری آنکھیں کھلی تھیں مگر اب تو میری آنکھیں خود بخود بند ہو چکی تھیں اور میں سر پٹ بھاگ رہا تھا، شاید میں مٹی میل بھاگ چکا تھا۔

پھر اچانک میں نے محسوس کیا کہ اب میرے قدم زمین چھوڑ چکے ہیں اور میں جیسے آسمان سے نیچے زمین پر گر رہا ہوں۔ میں نیچے ہی نیچے اٹھا گہرائی میں گرنا جا رہا تھا۔ میرا سر اوپر اور ٹانگیں نیچے کی طرف تھیں۔ میں گرتا رہا، مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں کتنی گہرائی میں نیچے گر رہا ہوں۔

اور پھر میں اچانک چاروں شانے چت نرم مٹی پر دھپ سے گر پڑا۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا، میری آنکھیں تو بند تھیں اور بند آنکھوں میں مزید اندھیرا چھا گیا، درد کی ایک کرہناک ٹیس اٹھی اور میرے پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ میرا سانس سینے میں اٹکنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں سانس لینے لگا تھا کہ ایک لحظہ دل دھلانے اور کان پھاڑنے والی پھنکاریں سنائی دیں تو میں دہل اٹھا اور پٹپٹا کر آنکھیں کھول دیں۔

اوہ! بھگوان! میری اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی سانسیں نیچے سینے میں اٹک گئیں۔ اور جیسے مجھ پر اچانک سحر پھونک دیا گیا ہو کہ میری آنکھیں پتھر اکڑ کر گئیں اور جسم جیسے سن ہو کر رہ گیا۔ منظر ہی ایسا دلخراش اور ناقابل فراموش اور ناقابل یقین تھا، اگر میری جگہ کوئی پہلوان یا پھر بڑے سے بڑے دل گردہ والا اور موت کو سامنے دیکھ کر نہ گھبرانے والا بلکہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر موت کو بھی لرزادینے والا ہوتا تو وہ بھی کپکپا کر رہ جاتا کیونکہ میرے سامنے ہزاروں کی تعداد میں کالے اور سرخ رنگ کے زہریلے سانپ پھن کاڑھے اور پھنکارتے ہوئے میری طرف قہر برساتی آنکھوں سے گھور رہے

تھے۔ کئی تو ایسے تھے کہ جن کے منہ سے شعلے تک نکل رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان سانپوں میں ایک زبردست ناقابل بیان حد تک پلپل مچ گئی تھی۔

وہ ایک بہت ہی چوڑا گڑھا تھا جس میں، میں گرا تھا، میں ایک دو فٹ اونچے چوڑے پر گرا تھا اور سارے سانپ اس چوڑے کے چاروں طرف پھنکا رہے تھے۔ وہ سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑنا چاہتے تھے ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنا سارا زہر مجھ میں بھر دیں، ان کی بے چینی مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں قہر پھر گیا تھا اور میں چوڑے کے پتھوں کا سہا ہوا بیٹھا تھا۔ اچانک ایک سانپ اپنی جگہ سے اچھا اور تیری مانند تیزی سے آ کر میری گردن سے لپٹ گیا اور زبردست طریقے سے میرے ماتھے پر اپنا ڈنک مار دیا۔ درد کی ناقابل فراموش ٹیس اٹھی۔

”بچاؤ..... بچاؤ..... بچاؤ.....“ میری فلک شکن چیخیں قرب و جوار کو دھلانے لگیں۔

مجھے زبردست طریقے سے جھنجھوڑا جا رہا تھا کہ پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں مدھم روشنی موجود تھی۔ کئی لوگ میرے گرد جمع تھے۔ میں تھر تھرا کا پ رہا تھا۔ سینے میں میرے سارے کپڑے شرابور تھے۔ میری کپچی ایسی تھی کہ جیسے پورے جسم پر لرز طاری ہو گیا ہو۔ پھر مجھے کچھ زیادہ ہی طاقت سے جھنجھوڑا گیا۔

اور پھر میں شانت ہو کر وہاں پر موجود لوگوں کو ٹکڑ کر دیکھنے لگا۔ ”لگتا ہے بالک نے کوئی بھی نیک پندار کجا لیا ہے۔“ یہ پنڈت کی آواز تھی۔ رام لال تم تھوڑا سا اس کے پاس بیٹھو، میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔“ پھر رام لال کی آواز سنائی دی۔ ”تم لوگ اب جاؤ، میں اس کے پاس بیٹھا ہوں۔“ رام لال کی آواز سننے ہی وہاں پر موجود سب کے سب چلے گئے، پھر رام لال نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ایک ہاتھ سے پانی کا کٹورا میرے منہ سے لگا دیا۔

کٹورا منہ سے لگتے ہی میں غنا غٹ کٹورے کا سارا پانی پی گیا۔ مجھ پر ابھی بھی ہلکی کپچی طاری تھی

میرے منہ سے نکلا۔ ”پنڈت جی۔“..... اور مجھے ایسا لگا جیسے کہ کسی نے میرا منہ بند کر دیا ہو کہ میں منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکال سکوں۔

رام لال نے پانی کا ایک اور کٹورا میرے ہاتھ میں تھا دیا اور پھر میں کٹورے کا سارا پانی پی گیا۔ پانی پینے کے بعد میری طبیعت تھوڑی سنبھلی اور میں نے رام لال کو غور سے دیکھا۔ کمرے میں موجود، دیا اپنی روشنی پورے کمرے میں پھیلانے میں ناکام ہو رہا تھا۔

”بالک تم نے ایسا کون سا بھیا نک اور ڈراؤنا سہنا دیکھا کہ تمہاری چیخیں مندر کے ارد گرد کو دھلانے لگیں اتنی زور دار تھیں تھیں۔ بچاؤ..... بچاؤ کہ اپنے کمرے میں سوئے ہوئے سارے لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور دوڑتے ہوئے اس کمرے میں آ گئے۔“

میری نہیں بلکہ بڑے پنڈت مہاراج بھی بھاگے بھاگے یہاں آ گئے۔ تمہاری حالت پانی سے باہر ہوتی جھپٹی سے بھی بدتر تھی۔ پہلے تو ہم نے سمجھا کہ شاید یہ تم پر مرگی کا دورہ تو نہیں پڑ گیا، مگر پنڈت مہاراج نے کہا کہ ”ایسا کچھ نہیں، یہ مرگی کا دورہ نہیں بلکہ بالک کوئی بہت خوفناک اور ڈراؤنا پندار دیکھ کر حال سے بے حال ہو گیا ہے۔“

”بالک ابھی تک تم نے اپنا نام نہیں بتایا بلکہ ہم نے تم سے تمہارا نام پوچھا ہی نہیں۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”پنڈت جی میرا نام پر تاپ سنگھ ہے۔“

”اچھا تو تم تھاکر برادری سے تعلق رکھتے ہو، تم گھبراؤ نہیں، پنڈت مہاراج بہت گیانی ہیں، وہ بول رہے تھے کہ بالک کا نام معلوم ہو جائے تو میں اپنے گیان سے معلوم کرتا ہوں کہ اصل میں اس کے حالات اسے کس دھارے پر لے کر جا رہے ہیں۔“

اب تم آرام سے سو جاؤ، کل پوچا جسے میں تمہیں لینے آؤں گا، تیار رہنا، صبح ہوتے ہی تمہیں جل پانی مل جائے گا، میں نے تمہارے لئے کپڑے کا ایک جوڑا بھی وہ دیکھو سامنے رکھ دیا ہے، رامو کا کا تمہارے پاس آ جائیں گے اور باقی باتیں وہ تمہیں سمجھا دیں گے، اب میں چلتا ہوں، کسی قسم کی چٹانہ کرو، لوگ کہتے ہیں کہ اگر

منش اپنی بھوک سے زیادہ کھالے تو اس صورت میں بھی سینے نظر آتے ہیں، خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں، بھور سے میری تم سے ملاقات ہوگی۔“ اور پھر رام لال میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا، اور میں درمی پر لیٹ کر حال اور ماضی کے تانے بانے ملانے لگا۔ اب نیند تو میری آنکھوں سے کوسوں بلکہ ہزاروں میل دور جا چکی تھی۔

میں لیٹ کر کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا اور پھر اسی طرح صبح کی سپیدی ہر طرف پھیلنے لگی۔ میں اٹھ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا آدمی میرے کمرے میں آیا اور بولا۔ ”رام لال جی نے بتایا ہے کہ تمہارا نام پر تاپ ہے اور میرا نام رامو ہے۔ رام لال جی نے کہا ہے کہ میں تمہیں ضرورت کی ساری جگہیں دکھا دوں، اور پھر تم ضرورت سے فارغ ہو کر شان بھی کر لینا۔ چلو، میرے ساتھ آؤ۔“ رامو نے کہا۔

”جی رامو کا، چلیں۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے ساری جگہیں مجھ کو دکھا دیں۔ تھوڑی دیر میں، میں اشان سے بھی فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ گیا، پھر رامو کا کا ایک تھالی میں گرم گرم پوریاں اور مکس بھیجی لے کر آ گئے۔

میں نے ناشتہ کیا اور پھر ناشتہ کے بعد رامو کا کا مجھے لے کر اس احاطہ میں سے مندر میں لے گئے۔ میں نے جھک کر دیوی ماما کو پر نام کیا۔ مندر میں اس وقت بہت سارے لوگ موجود تھے۔ پنڈت مہاراج اپنے کام میں مصروف تھے، لوگوں کا چڑھاوا لینے اور دیوی ماما کے چنوں میں رکھ دیتے اور نقدی ایک بڑے بکس میں ڈال دیتے۔ ایک طرف رام لال موجود تھے انہوں نے اشارہ کیا تو میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

اگر تکی کی خوشبو پورے مندر کو مہکا رہی تھی۔ پھر بھجن گانے کا سے شروع ہوا، چار کنواری ناریاں بھجن گانے لگیں۔ میں نے ان نارویوں کو غور سے دیکھا۔ سب کی سب بہت صحت مند تھیں، ان کے نین نقش قابل تعریف تھے، سب کا لباس ایک جیسا تھا، گھگھار اور کسی ہوئی چولی میں وہ بہت ہی زیادہ جاذب اور دلکش نظر آ رہی



تھیں۔ ان سب کا کسا کسا اور گد ریا ہوا جسم، دل و دماغ کو مسوں رہا تھا۔ یہ سب وہ ناریاں تھیں جو کہ دیویوں کی سیوا کے لئے مندر کو وقف تھیں، ان کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا سب کچھ ہر سے مندر میں ہی ہوتا تھا۔

دن کے دس بجے تک لوگوں کا مندر میں آنا جانا لگا رہا، دیوی ماں کے چرنوں میں چڑھاوے چڑھائے جاتے رہے، وہ چاروں ناریاں لہک لہک کر سارے کام کر رہی تھیں، تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیوی کے چرنوں میں موجود چڑھاوے اٹھا کر اندر کہیں لے بھی جاتی رہیں۔ اچانک ان چاروں میں سے سامان اٹھاتے ہوئے ایک کے ہاتھ سے پیتل کی تھالی پھسل کر گر پڑی تو فوراً پنڈت مہاراج نے غضبناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا مگر فوراً اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے نرم لہجہ میں کہا۔ ”کامی سنبھل کر دیکھ بھال کر۔“ میں نے محسوس کیا کہ پنڈت کا لہجہ اچانک یوں نرم پڑا تھا کہ ”اس وقت کئی لوگ مندر میں موجود تھے اور ان لوگوں میں گاؤں کے گلیاٹھا کر صاحب بھی موجود تھے۔“

اور بڑے پنڈت کو لوگوں اور ٹھاکر کے سامنے یہ تو دکھانا مقصود تھا کہ مندر کے پنڈتوں کی زبان بہت نرم ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے ان کے دل میں بہت نرم گوشہ ہوتا ہے۔

کامی کے ہاتھ سے دراصل تھالی یوں پھسل چکی تھی کہ اس وقت اس نے اپنی نظریں اور دھیان مجھ پر مرکوز کر دی تھیں۔ لیکن یہ سب اتنی جلدی میں ہوا تھا کہ کوئی اور اس بات کو سمجھ نہ سکا تھا۔

خیر ساڑھے دس بجے تک لوگوں کا مندر میں آنا بند ہو گیا۔ پنڈت مہاراج نے میرے ہاتھ پر صندل کا تلک لگایا اور پرشاد دیا اور پھر کہا۔ ”پر تاب اب تم اپنے کمرے میں جاؤ، میں دوپہر میں تمہارے پاس آؤں گا۔ اور تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

مہاراج کی بات سن کر میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ جب میں اپنے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ درمی پر ایک چادر بھی ہوئی ہے اور ایک تکیہ بھی موجود تھا۔

ایک کونے میں ایک چھوٹا ٹکڑا اور اس گھر سے پر ایک مٹی کا پیالہ بھی موجود تھا۔ میں کمرے میں تھوڑی دیر بیٹھا اپنے کمرے کے بارے میں سوچتا رہا، پھر میں لیٹ گیا اور پھر آنکھیں بند کر کے سوچوں کی اٹھا کھرائی میں پہنچ گیا۔

ابھی مجھے لیٹے کوئی آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ کمرے میں آہٹ محسوس ہوئی، آنکھیں کھول کر دیکھا تو میرے سامنے رام لال جی کھڑے تھے اور ان کے سامنے وہی مندر والی لڑکی کامی بھی موجود تھی۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تو رام لال جی میرے سامنے بیٹھ گئے پھر انہوں نے اشارہ کیا تو کامی بھی ان کے برابر میں بیٹھ گئی اور اپنی گردن جھکا لی۔

رام لال بولے۔ ”پر تاب یہ کامی ہے۔ یہ مندر کے سیوکوں میں سے ہے۔ یہ مندر کی دان کنیا ہے، بہت ہی من کی سندھ اور کام ایسے کرتی ہے کہ جیسے اس کے پاؤں میں بجلی بھری رہتی ہے۔ بڑے مہاراج نے تمہارے کام کے لئے اسے بھیجا ہے، یہ تمہارے کھانے پینے کا پورا خیال رکھے گی۔“

مہاراج کا یہ بھی کہنا ہے کہ تم بہت دھبی اور کشت میں ہو، تم کوئی معمولی منشی نہیں ہو، تم کئی جنموں میں بڑے بھگوان رہے ہو، اور اس موجودہ جنم میں بھی تم بہت دیالو، دوسروں کا درد بانٹنے والے، اور منش پر رعب، دیدہ اور حکومت کرنے والے ہو، مگر پچھلے جنم میں تم سے کچھ کام ایسے ہو گئے ہیں کہ اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا ہے، اور کچھ عرصہ تک تمہیں اس مندر میں رہنے سے سکھ ملے گا، ایک آتما تمہارے پیچھے پڑ گئی ہے۔ وہ آتما تم سے بہت ناراض ہے اور اسی کارن ابھی تک تم گھر سے بے گھر ہو رہے ہو، دولت تمہارے گھر کی باندی رہے گی، مگر شاتی کے لئے تم..... ”اور رام لال نے بات ادھوری چھوڑ دی۔“ اب تم آرام کرو، اب میں تم سے کام ہوگا تو ملوں گا، اور یہ کامی تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھے گی۔ ویسے بڑے مہاراج خود تم سے ملنے آئیں گے۔

پر تاب سے سے گھبرانا بزدلی ہے اور جو لوگ ہمت نہیں ہارتے وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اور ہاں

مندھ سے کچھ دنوں تک باہر نکلتا تمہارے لئے ٹھیک نہیں، یہ بھی مہاراج کہہ رہے تھے۔ ٹھیک ہے میں چلتا ہوں، کامی اب تو بھی جا اور وقت پر پر تاب کا کام کر دیا کرنا، کوئی شکایت نہ ہو۔“

”جی پنڈت جی آپ کو یا پر تاب بابو کو میری ذات سے ذرہ بھر بھی شکایت نہیں ہوگی۔“ اور یہ بول کر کامی رام لال کے ساتھ ہی کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ اور میں لیٹ کر سوچوں کے گرداب میں پھیرے کھانے لگا۔ اور یہ سوچنے لگا کہ ”اب دیکھو سے کیا دکھلاتا ہے۔“ میں سوچوں میں گھر اٹھا میری آنکھیں بند تھیں کہ کمرے میں آہٹ ہوئی اور آہٹ پر میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور ترنت اٹھ بیٹھا کیونکہ میرے سامنے بڑے پنڈت جی کھڑے تھے اور ان کے ساتھ رام لال بھی تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا تو پنڈت جی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، اور بولے۔ ”پر تاب بیٹھو۔“

میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا، ساتھ ہی دونوں پنڈت مہاراج بھی بیٹھ گئے۔ پھر مہاراج نے کہا۔ ”پر تاب تمہارے حالات میرے سامنے آ گئے ہیں، میں نے اپنے گیان سے سب کچھ معلوم کر لیا ہے، تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں، تمہارا یہ رام لال کئی جنموں سے چل رہا ہے، یہ سب کرموں کا پھل ہے، جس کے کرم میں جو لکھا جائے، ایسا فوراً کرم لکھ دیتا ہے مگر اس میں منش کا اپنا اچھا بھی ہوتا ہے، منش اپنے من کے مطابق اپنے کو حالات کے حصار میں ڈھال لیتا ہے۔“

یہ بھی منش کا ہی کام ہے کہ وہ اپنے لئے نرک پتے یا پھر سورگ کے لئے کوشش کرے، ایسا فوراً کسی کو ظالم جابر، کرم کا کھوٹا، جنم جلا یا پھر پانی نہیں پیدا کرتا، اب اس کی کوئی وجہ برسات ہوتی ہے تو اس سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں اور جب دھوپ نکلتی ہے تو دھوپ سب پر پڑتی ہے اب یہ منش کا کام ہوتا ہے کہ وہ اس سے سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے۔

ایک آتما جو تمہارے ساتھ ساتھ جنم لیتی رہی۔ تم دونوں سنار میں آتے رہے، تم دونوں کا دیوانہ نہ ہو سکا، تم

دونوں ہر جنم میں کسی نہ کسی بہانے ختم ہوتے رہے مگر اس جنم میں تم دونوں پھنچ گئے۔ اس کا خاتمہ ہو گیا اور تم جیوت ہو، اور اب وہ تمہارے لئے بھٹک رہی ہے، تمہارے بنا اسے ایک جلی بھی چھین نہیں، وہ تمہیں ڈھونڈ رہی ہے اور دوسرا وہ ہے جس نے تمہیں جنگل میں چٹانوی دی ہے، تم نے اس کی پتھر کے ساتھ اپنا لئے کیا، وہ بہت غضبناک حالت میں ہے، اس نے جو بھی کہا ہے وہ کرا کے رہے گا، تمہارے حالات کو وہ ایسا کر دے گا کہ تم اس کی اچھا پوری کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکو گے، اب تم کچھ دنوں تک اس مندر میں رہو، اگر تم باہر گئے تو ہو سکتا ہے کہ تمہارا نقصان ہو جائے۔ میری باتوں پر دھیان دینا، میں بھی سوچتا ہوں کہ کوئی راستہ نکل آئے، ویسے بھی ہم گاؤں والے ان دنوں ایک خونی آتما سے پریشان ہیں۔ تم گھبرانا نہیں، آرام کرو، اب میں چلتا ہوں، یہاں پر تمہیں کوئی کشت نہیں ہوگا، کھاؤ پیو اور آرام سے رہو۔“ اور یہ بول کر پنڈت مہاراج کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

ساتھ ہی رام لال جی بھی اٹھے اور اپنے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ”اب مطمئن رہو، کسی بات کی چٹنا نہ کرو۔“ اور وہ بھی پنڈت مہاراج کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئے۔

”میں انہی سوچوں میں گم ہو گیا۔ اچانک میری سوچوں پر یلغار ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ میرے موجودہ جنم سے پچھلے جنم میں مجھ سے کون سی غلطی یا پھر میں نے کون سا پاپ کیا کہ اس کی سزا میں اس جنم میں بھگت رہا ہوں اور پھر آئندہ اس سے زیادہ اذیت ناک اور کٹھن سزا بھگتنا پڑے گا۔ بہر حال یہ میرے بس سے باہر تھا کہ میں اپنے پچھلے جنم کی غلطیوں اور پاپوں کے بارے میں جان سکوں، اور پھر یہ ایک انسان کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے پچھلے جنم کے حالات کو جان سکے، میں سوائے سوچ کے اندھیرے میں ٹانک ٹوٹیاں کرنے کے اور کچھ بھی کر سکتا تھا۔

پھر میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ آنے والے وقتوں میں میرا واسطہ کی اذیت ناک حالات سے پڑے گا اور وہ کیا واقعات ہوں گے جنہیں میں جھیل



پاؤں گا۔ صرف ایک بات میرے سامنے تھی اور جس کی نشاندہی ابھی ابھی پڈت مہاراج نے کی تھی اور اس سے پہلے جنگل میں سادھو نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ”مجھے ہر پورن ماسی کی رات میں ایک منٹ میرے حوالے کرنے ہیں تاکہ اس کی بلی دی جائے۔“ منٹ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ جوان ہو بلکہ وہ منٹ سن بلوغت کو نہ پہنچا ہو، چاہے وہ پرس ہو یا ناری۔ دونوں ہی قابل قبول تھے۔ یہ بھی کوئی قید نہ تھا کہ وہ غریبوں بلکہ میرے اپنے خونی رشتے دار یا قسبی لگاؤ والے بھی ہو سکتے ہیں۔

میں ان ہی تمام سوچوں میں منحوس تھا کہ کمرے میں کسی کی آمد پر آہٹ ہوئی اور میں نے آنکھیں کھول دیں دیکھا تو سامنے کا منی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ کا منی کے ہاتھ میں ایک بڑی پیتل کی تھالی تھی۔ اس نے وہ تھالی میرے سامنے رکھ دی اور پھر جھٹ کھڑے میں سے پیالے میں پانی بھرا اور وہ پیالہ بھی میرے سامنے رکھ دیا۔ ”بابو جی! آپ کھانا کھائیں، اس وقت کھانے کا سہ ہے، دن کے ڈیڑھ بج رہے ہیں۔“ میں اٹھا اور ہاتھ دھو کر کھانے کے لئے تیار ہو گیا۔ کا منی ابھی تک بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ تھالی میں چھوٹی چھوٹی دو روٹیاں، تھوڑے سے چاول اور دارل بھیجا تھی۔ ”کا منی تم بھی کھانا کھاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ بولی۔

”بابو جی! یہ آپ کا کھانا ہے، آپ کھائیں، میں بعد میں کھالوں گی۔“

بہر حال میں نے ضد نہیں کی اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ میں کھانا رہا اور وہ مجھے ایک ٹک دیکھتی رہی، جب میں کھا چکا تو اس نے برتن اٹھائے اور چپ چاپ مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ رات میں وہ پھر رات کا کھانے لے کر آئی اور میرے سامنے کھانا رکھ کر خود ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے پھر اسے کھانے کے لئے پوچھا تو اس نے وہی جواب دیا جو کہ دوپہر میں دے چکی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد میں بولا۔ ”کا منی اگر میں تم سے چند باتیں پوچھوں تو کیا تم جواب دو گی؟

تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

”نہیں بابو جی! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔“ وہ بولی۔

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم اس مندر میں کتنے سے ہو؟“

”بابو جی! میں اس مندر میں کوئی آٹھ سال سے ہوں۔“ وہ بولی۔

”کا منی اس وقت تمہاری عمر کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میری عمر سولہ سال ہے، آٹھ سال کی عمر میں میری ماما اور بہتا نے مجھے دیوی ماما کی سیوا کے لئے مندر میں دان کر دیا تھا۔ مجھے دان کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ میرے گھر والوں پر کوئی کشت نہ آئے، اور جو پریشانیاں تھیں وہ ختم ہو جائیں۔“ اس نے ایک ایک لفظ کو جیسے چبا چبا کر بتایا۔

”کا منی کیا تم مندر میں اور اپنے حالات سے خوش ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

وہ بولی۔ ”بابو جی! کیا آج آپ اپنے حالات سے خوش ہیں؟“

میں کا منی کی بات سن کر چکر کر رہ گیا، کیونکہ میں اپنی خوشی سے مندر میں موجود نہیں تھا بلکہ مجبور یوں اور پریشانیوں کا وہ ناقابل برداشت پہاڑ تھا جس کے نیچے دب کر میں مندر کے اذیت ناک کمرے میں پڑا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی انسان حالات کی چکی میں پئے لگتا ہے تو وہ اپنی مجبوریوں سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔

”اچھا تم یہ بتاؤ کیا تمہارا من چاہتا ہے کہ تم اس زندگی سے چھٹکارا پاؤ اور مندر سے باہر کی دنیا دیکھو اور آزاد فضا میں سانس لو؟ کیا اس کے متعلق بھی تم نے سوچا ہے؟“

”بابو جی! میں ہی کیا بلکہ ہر مجبور انسان گھٹ گھٹ کر جینے سے بھاگنا چاہتا ہے، جب ایک پرندے کو پنجرہ میں قید کر دیا جاتا ہے تو اس پرندے پر کیا گزرتی ہوگی کوئی اس سے پوچھے۔ پنجرے میں وہ قید پرندہ کھانا پیتا ضرور ہے مگر یاس و محرومی کی نظر سے ہر وقت تکتا رہتا ہے اور

سوچتا ہے کہ شاید کسی دن پنجرے کا دروازہ کھل جائے۔ دن بھر وہ آس لگائے پنجرے میں چکر کاٹتا رہتا ہے اور جب اندھیرا پھیل جاتا ہے تو اپنی آنکھیں موند کر اپنا سر اپنے پروں میں سوکر بے سدھ ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر اس آس میں آنے والا دن بھی کٹ جاتا ہے۔“ وہ بہت ہی غمگین لہجے میں بولی۔

میں بے سدھ ہو کر اس کی باتوں کو سوچنے لگا، کیونکہ اس نے واضح الفاظ میں خود کو پنجرے میں قید پرندے سے تشبیہ دی تھی، میں اس پر اپنی نظریں جمائے دیکھتا رہا اور وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اس کا اندازہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے سوال کر رہی ہے کہ ”بابو جی بولو، تمہارے پاس کیا جواب ہے؟“

پھر اس نے جھٹ کھانے کے برتن اٹھائے اور مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

کا منی کی معصومیت، بھولپن، درد میں ڈوبی باتیں، بے کسی کی زندگی اور پھر قید میں بے بلبل اور سیاد مسکرانے والی بچو کے لگائی لگا ہوں نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا، میں رات بھر سو نہیں سکا، پوری رات کروٹیں بدلتا رہا اور کب صبح کا اجالا پھیلا مجھے پتہ نہ چلا۔

لیکن پھر صبح ہونے کا پتہ اس وقت چلا جب کا منی میرے لئے صبح کا ناشتہ لے کر کمرے میں آئی، اور مجھ پر نظر پڑتے ہی تھک گئی اور بولی۔ ”بابو جی! میں آپ سے معافی مانگتی ہوں، آپ کو میری باتوں سے دکھ پہنچا، رات بھر آپ جاگتے رہے اس کا اندازہ مجھے ہے کیونکہ میں اپنی باتوں پر رات بھر پچھتاتی رہی ہوں اور آپ کی حالت اور آنکھیں بتا رہی ہیں کہ آپ بھی رات بھر سوئے نہیں۔ بابو جی! مجھے معاف کر دیں، دن میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گی کیونکہ میں نے آپ کے من کو کشت دیا، اور کا منی اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے آگے دوڑاؤں ہو کر بیٹھ گئی۔

میں نے جھٹ کا منی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”کا منی ایسی بات نہیں۔ تم نے کوئی غلط بات نہیں کی، تم نے تمام باتیں صبح کی ہیں اور میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ تم واقعی پنجرے میں قید پتھی جیسی ہو، اندرونی طور پر تمہارا من آزاد رہنے کو چاہتا ہے، لیکن تمہاری مجبوریوں نے تمہارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔

اب تم مجھے ہی دیکھ لو، میرے گھر میں نوکر چاکر، میں سوئے اور چاندی کے پیچھے سے دودھ پینے والا، میرے پتا گاؤں کے کھیا ہیں اور میں مجبوری کے تحت بھول بھلیوں میں بڑ کر آج یہ دردناک زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ میں بھگوان کی کرپا سے مایوس نہیں ہوں۔

تم گھبراؤ نہیں، جہاں تک ہو سکا میں تمہاری مدد کروں گا اور قید کی زندگی سے نکال کر آزادی دلاؤں گا، اپنے من کو دھکی نہ کرو، یہ میرا وعدہ ہے کہ ایک نہ ایک دن بلکہ بہت جلد آزاد فضاؤں میں تم سانس لو گی، بس مجھے اپنے گھر پہنچنے کی دیر ہے۔“

میری باتیں سن کر کا منی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو اسے دیکھ کر میرا من پھل اٹھا، میں نے اس کے آنسو صاف کئے اور اس کے گال تھپتھپ کر اسے دلا سہ دیا، اور بولا۔ ”چلو جلدی سے اچھے بچوں کی طرح مسکراؤ۔“ اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس کا مر جھایا ہوا گلہابی چہرہ کھل اٹھا۔ ”بابو جی! آپ ناشتہ کریں، آپ کی باتوں سے مجھے بہت ڈھارس ہوئی ہے، میں دیوی ماں کی چرنوں میں اپنا ہاتھ ایک کر پرارتھنا کروں گی کہ آپ کے سارے کشت دور ہو جائیں اور آپ کو اپنے مقصد میں بہت جلد کامیابی ملے تاکہ آپ بھی اپنی خوشی زندگی گزاریں۔“ کا منی بولی۔

خیر میں ناشتہ کرنے لگا، وہ میرے سامنے بیٹھی مجھے غور سے دیکھتی رہی کہ میں نے ایک نوالہ بنا کر اس کے منہ کی طرف بڑھا دیا تو مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے میرے ہاتھ کا نوالہ اپنے منہ میں رکھ کر بہت جذباتی انداز سے مسکرانے لگی۔ جب میں ناشتہ کر چکا تو اس نے برتن اٹھائے اور مسکراتی ہوئی کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ اور پھر میں خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔

اب مجھے مندر میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ روز کا معمول تھا کہ میں صبح ہی صبح اٹھتا اور





## خوبصورت

راشد نذیر طاہر - کراچی

شام کا دھندلا کایا گرمی کی تمازت ہوتی ہی وہ مہہ جیبیں اپنی چھت پر نظر آتی جسے دیکھ کر نوجوان اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آہیں بھرنے لگتا لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ وہ گھر تو برسوں سے بند پڑا ہے.....

ایک ماورائی مخلوق کی دلکش اور دلربا دیدہ دلیری جو کہ پڑھنے والوں کو اپنے جیب میں ڈال دیگی

یہ ایک قدرتی بات ہے کہ انسان جس جگہ رہتا ہے، جس علاقے میں رہتا ہے اور جن لوگوں میں رہتا ہے، ان سب چیزوں سے اسے انیسیت ہو جاتی ہے اور جب کسی موقع پر کسی مجبوری سے نقل مکانی کرنی پڑے تو بہت کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تو وہ چل اٹھا، اس کا موڈ چو پٹ ہو گیا۔ 20 سالہ اس نوجوان میں اکلوتے ہونے کی وجہ سے زمین کے کونے کھدروں میں اب بھی بچپن اٹھیلیاں مار رہا تھا۔

باپ پر تو اس کا بالکل بھی زور نہیں چلتا تھا، لیکن ابھی وہ تھی کہ مجید کو جب معلوم ہوا کہ اس کے والد کرم دین نے مکان چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے ہاتھ لیا۔

اندھیرا پھیلنے ہی تم کی کام سے باہر نہ نکلتا اور خاص طور پر مندر کی چار دیواری سے تو نکلتا بھی نہیں۔ میری باتوں کو خوب یاد رکھنا۔ اور یہ بول کر وہ چلے گئے۔ میں ان کی باتوں پر غور کرنے لگا کہ مہاراج نے ایسا کیوں کہا۔ ”کیا اماؤں کی راتوں میں یہاں کوئی خطرہ ہوتا ہے، ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے ورنہ بڑے مہاراج اس طرح جتناونی نہ دیتے۔“

رات میں جب کاٹنی کھانا لے کر آئی تو میں نے اس کا تذکرہ اس سے کیا اور پوچھا۔ ”کاٹنی آخر کیا بات ہے کہ بڑے مہاراج نے ایسا کہا ہے؟“

”بابو جی! آپ کھانا کھائیں میں آپ کو بعد میں بتا دوں گی، لیکن بڑے مہاراج نے جو کچھ بھی کہا ہے آپ اس پر عمل کیجئے گا۔ اگر رات میں کوئی آپ کا نام لے کر بھی پکارے تب بھی آپ اپنے کمرے سے مت نکلے گا، ایسا کیوں ہے میں آپ کو بتا دوں گی، آپ فی الحال کھانا کھائیں اور خاموشی سے سو جائیں، ویسے فکر کی کوئی بات نہیں۔“

میں نے کھانا کھایا اور جلدی سے کاٹنی نے برتن اٹھائے اور کمرے سے چل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لائٹیں بجھا دی اور لیٹ کر حالات کے متعلق سوچنے لگا کہ پھر مجھے نیند آگئی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، اچانک کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا، اچانک میری آنکھ کھل گئی تو میرے کانوں میں آواز سنائی دی، گھوڑوں کے ہنہانے کی اور ساتھ ہی ایسا لگا کہ کسی بھی سڑک پر گھوڑے دوڑ رہے ہوں، وقت کے ساتھ ساتھ آواز واضح اور قریب ہونے لگی۔

اچانک میرے کمرے میں کوئی آیا، اس سے پہلے میں اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھا تھا۔ آنے والا میرے بہت قریب بیٹھ گیا اور پھر اچانک وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں گھسیٹ لیا۔ پھر سرگوشی سنائی دی۔ ”بابو جی! میں کاٹنی ہوں، گھبراؤ نہیں۔ آج وہ پھر آ گیا.....“

(جاری ہے)

ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کرتا اور پھر مندر میں جا کر پوجا میں شامل ہوتا، بڑے مہاراج روزانہ میرے ماتھے پر تلک لگاتے اور پھر ایک مقررہ وقت پر میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ جاتا، دن میں دو پہر کے بعد دن میں ایک مرتبہ رام لال جی میرے کمرے میں ضرور آتے اور میری خیر حیرت دریافت کرتے اور چلے جاتے مگر جاتے جاتے یہ ضرور پوچھتے کہ ”کاٹنی تمہاری سیوا ٹھیک طرح کرتی ہے یا نہیں۔“

میں جواب دیتا۔ ”چنڈت جی، کاٹنی اپنی ڈیوٹی خوب اچھی طرح دے رہی ہے مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں، میں بہت خوش ہوں، آپ نے اور بڑے مہاراج نے مجھ پر جو کرپاکی ہے اس کی مثال نہیں ملتی اور میری ڈیوٹی ماں سے پرارتنا ہے کہ دیوی ماں آپ لوگوں پر کرپا کرے۔“

آٹھویں دن چنڈت رام لال جی! ایک لائٹیں لائے اور بولے۔ ”پرنا اب آج سے یہ لائٹیں تمہارے کمرے میں رہے گا اور شام میں اسے جلا لیتا، ویسے تمہیں کشت کرنے کی ضرورت نہیں، کاٹنی اسے جلا دیا کرے گی۔“ اور یہ بول کر وہ چلے گئے۔

اب روزانہ شام میں کاٹنی لائٹیں جلا دیا کرتی تھی، لائٹیں میں مٹی کا تیل بھی وہ خود ہی ڈالا کرتی تھی اور میرا روز کا معمول تھا کہ کھانے سے فارغ ہو کر جب سوئے لگتا تو لائٹیں بجھا دیا کرتا تھا۔ کیونکہ ویسے بھی مجھے اندھیرے میں سونے کی عادت ہے۔

اماؤں کی راتیں شروع ہو چکی تھیں، اب چاند کا آسمان پر نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جب یہ اماؤں کی راتیں شروع ہوئیں تو سرشام ہی پوری بستی پر سناٹا چھا جاتا، اندھیرا پھیلنے ہی گاؤں کے سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک پڑتے تھے۔ اب تو رات میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔

ایک دن بڑے چنڈت مہاراج میرے کمرے میں آئے اور بولے۔ ”بالک اماؤں کی راتیں شروع ہو چکی ہیں اور میں تمہیں چٹاونی دیتا ہوں کہ شام کا



”یہ کیا ہے ماں.....؟“ وہ جھلا کر بولا۔  
 ”ابو کو سمجھاؤ نا..... یہ گھر کیوں چھوڑ رہے ہیں.....؟“  
 ”میں انہیں سمجھاؤں.....؟“ اس کی ماں سعیدہ  
 نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔ ”وہ 2 منٹ میں مجھے  
 اور تجھے ہم دونوں کو سمجھا کر رکھ دیں گے.....“  
 ”لیکن ماں..... یہ تو کوئی بات نہ  
 ہوئی.....“ مجید کے لیے میں جھلاہٹ تھی۔ ”میں تو اس  
 محلے کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا..... اور ابو جان  
 بھی اتنی دور گھر رہے ہیں کہ.....“  
 ”وہاں کے بازار میں ان کا کاروبار بہت اچھا  
 جم گیا ہے.....“ سعیدہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”اور یہ  
 بات تجھے بھی معلوم ہے..... انہوں نے اپنی آسانی کے  
 لئے گھر بھی وہیں دیکھ لیا ہے..... ان کا کاروبار  
 ہے تو سب کچھ ہوگا نا بیٹا.....“  
 ”لیکن ماں..... میرا کیا ہوگا.....؟“  
 ”تیری آوارگیاں اور بے سرو پا دوستیاں ختم  
 ہو جائیں گی۔“ ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تیرے  
 اٹے سیدھے دوستوں کو دیکھنے سے میری بھی جان  
 چھوٹے گی.....“  
 ”ماں.....“ مجید نے منہ بسور لیا۔ ”میں کہاں  
 آوارہ پھرتا ہوں۔“  
 ”ہاں..... ہاں.....“ ماں نے سر ہلایا۔ ”دھوپ  
 میں پھر کر تو میرا رنگ مل رہا ہے..... تمہارا تھوڑی.....“  
 ”ماں مذاق مت کرو..... ابو کو سمجھاؤ نا کہ  
 اپنا ارادہ بدل دیں۔“  
 ”یہ میرے بس کی بات نہیں ہے.....“ ماں نے  
 نفی میں گردن ہلائی۔ ”وہ جو فیصلہ کرتے ہیں۔ سوچ سمجھ  
 کر کرتے ہیں وہ خود تو زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ لیکن  
 اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہاں رہتے ہوئے تمہاری  
 پڑھائی میں بھی حرج ہو رہا ہے۔ جن لڑکوں سے تم نے  
 دوستی کر رکھی ہے، وہ اچھے نہیں ہیں۔“  
 ”میرے دوست تو ہر دور میں برے ہی ہوتے  
 ہیں۔“ مجید ایک طویل سانس لئے بڑبڑایا۔ ”پتا نہیں

مجھے کب اچھے دوست نصیب ہوں گے.....!“  
 کرم دین فرما کر چھٹی کاٹھا لگا تھا، لیکن اس  
 بازار میں اس نے دکان بے کر ذرا اچھے پیمانے پر اپنا  
 کاروبار جمایا تھا۔  
 ویسے بھی وہ کئی مہینوں سے اسی چکر میں تھا کہ  
 رہنے کی جگہ بدل ڈالے، کیوں کہ اس علاقے کا ماحول  
 قطعی ٹھیک نہیں تھا۔  
 وہ خود تو زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، لیکن اپنی اولاد  
 کے لئے اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی قابل ضرورت رہے۔  
 لیکن مجید نے جن گھروں سے میٹرک کلیئر کیا  
 تھا، اس سے کرم دین قطعی مطمئن نہیں تھا۔  
 وہ جاہل ضرور تھا، لیکن اپنے کاروبار میں ہونے  
 والی ”پبلک ڈینگ“ سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔  
 یہی وجہ تھی کہ اس نے جوان اولاد کو مارنے پیٹنے  
 سے گریز کیا اور فساد کی بڑکوبی اکھاڑنے کا فیصلہ کر لیا۔  
 اور پھر یہ سب قدرتی ہوا تھا، چنانچہ موقع سے  
 فائدہ اٹھا کر کرم دین نے فوراً ہی اپنی نئی کاروباری جگہ  
 کے عقب میں واقع محلے میں کرائے کا مکان  
 ڈھونڈ نکالا۔  
 اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہاں کا کرایہ تھوڑا  
 گراں ضرور ہے۔ لیکن یہ علاقہ..... صاف ستھرا اور.....  
 اچھے لوگوں کا تھا۔  
 مجید کی اب آخری کوشش یہ تھی کہ وہ باپ کے  
 سامنے کھڑا ہو جائے۔  
 اسے ایسا کرنے پر اس کے دوستوں نے  
 اکسایا تھا۔ خاص طور پر سلیم تو کسی طرح تیار ہی نہ تھا کہ  
 مجید ان لوگوں سے جدا ہو۔  
 ”یار تمہارے ابو نے تو بہت ہی دور گھر لینے کا  
 سوچ لیا ہے۔ کہاں یہ علاقہ..... کہاں وہ جو تم بتا رہے  
 ہو۔“  
 ”جب تمہاری امی کچھ بولنے کی ہمت نہیں  
 کر رہی، تو تم خود ہی انہیں سمجھاؤ..... ہاں یار.....“  
 دوسرے دوستوں نے بھی تائید کی۔ نتیجہ یہ کہ

جب اس کا باپ صبح فٹری سے تازہ مچھلیوں کا مال لے  
 کر لوٹا، تو مجید اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔  
 کرم دین کی یہ روز کی ڈیوٹی تھی صبح پونچھنے سے  
 قبل ہی وہ فٹری جاتا تھا، وہاں سے مال لاکر 3 گھنٹے  
 آرام کرتا اور پھر اپنے شیے پر چلا جاتا، وہاں سے رات  
 محلے لوٹتا تھا۔  
 ”کیا ہوا.....؟“ کرم دین نے اسے غور سے  
 دیکھا۔  
 ”ابو..... وہ.....“ مجید کو الفاظ نہ ملے۔  
 ”کہو بیٹا مجید..... کیا بات ہے.....؟“  
 باپ کے نرم لہجے نے مجید کو ہمت دلائی  
 اور اسے الفاظ کا خزانہ مل گیا۔  
 ”ابو..... آپ کہیں اور مت جائیں..... میں یہ  
 محلہ نہیں چھوڑوں گا..... بس میں نے کہہ دیا ہے۔“  
 ”کیوں.....؟“ کرم دین نے آنکھیں  
 نکالیں۔ ”کیا ساری زندگی ایسے ہی گزارنی ہے۔“  
 ”ابو..... کیا برائی ہے اس زندگی میں.....  
 ؟ اچھے خاصے تو رہے ہیں ہم لوگ!“  
 ”تم نے اپنے امتحان کا نتیجہ دیکھا ہے نا.....  
 ؟ تمہارے استادوں نے تم پر رحم کھا کر پاس کیا ہے۔ کیا  
 میں تمہیں اسی دن کے لئے لکھا پڑھا رہا تھا.....؟“  
 ”لیکن ابو..... امتحان کا رہنے والی جگہ سے کیا  
 تعلق ہے.....؟“ اس نے اعتراض کیا۔  
 ”بہت تعلق ہے..... نہ یہ علاقہ ٹھیک ہے اور نہ  
 تمہاری دوستی یاریاں..... بس..... میرا فیصلہ مل ہے۔“  
 ”میرے دوست اتنے برے تو نہیں ہیں  
 ابو.....!“  
 ”دیکھو بیٹا.....!“ کرم دین کا لہجہ نرم ہو گیا۔  
 اس وقت تم جن لوگوں کی زبان بول رہے ہو۔ جن کے  
 لئے میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے ہو، وہ تمہیں  
 بربادی کے سوا کچھ نہیں دیں گے۔ تم نے اپنی زندگی خود  
 گزارنی ہے اپنا پوچھ خود اٹھانا ہے۔ میں پڑھا لکھا نہیں  
 ہوں لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تعلیم کے

بغیر زندگی پوری نہیں ہوتی اور پوری رہ جاتی ہے.....“  
 مجید اب سر جھکا کر خاموشی سے اپنے باپ کی  
 بات سن رہا تھا۔  
 اور پھر چند دن بعد کرم دین نے پرانے محلے  
 کو خیر باد کہہ دیا۔  
 نیا مکان..... نئی جگہ..... نئے لوگ..... لیکن یہ  
 فرق تو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ علاقہ کافی صاف  
 ستھرا اور اچھے رہائشی مکینوں سے آباد تھا۔  
 کچھ دنوں تک تو مجید کا موڈ شدید آف ہی  
 رہا تھا۔ پورا پورا دن گھر میں ہی گزارتا، کبھی چھت کا  
 رخ کر لیتا، جہاں ایک تیار شدہ کمرہ بھی موجود تھا۔  
 ماں سے بھی وہ منہ پھلائے ہوئے تھا۔ ظاہر  
 ہے کہ اس کے دل میں رہنے والے دوست اس سے جدا  
 ہو گئے تھے۔  
 آج دوپہر کو اس نے اپنی ماں سے بات بھی کی  
 تو ابی متعلق۔  
 ”امی..... میں آج پرانے محلے چلا جاؤں.....؟“  
 ”میں کیا بتاؤں.....؟“ ماں نے ہاتھ ہلائے۔  
 ”اپنے باپ سے ہی پوچھ لینا.....“  
 ”وہ تو منع کر دیں گے.....“  
 ”تو پھر..... بتاؤ..... میں کیا بول سکتی ہوں؟“ ماں  
 نے ٹکاسا جواب دے دیا۔  
 ”تم تو کچھ بھی نہیں کر سکتیں میرے  
 لئے.....!“ اس نے جھلا کر کہا اور جھکے سے اٹھ کھڑا  
 ہوا۔  
 ماں اس کی شکل ہی دیکھتی رہ گئی اور وہ دھپ  
 دھپ کرتا ہوا زینے چڑھ کر اوپر چلا آیا۔  
 آج اسے میل اور رضا بہت یاد آ رہے تھے۔ وہ  
 لوگ کیا سوچ رہے ہوں گے کہ مجید کس قدر بے وفا  
 ہے۔ چاروں گزر گئے اور شکل تک دکھانے نہیں  
 آیا.....!  
 اسے شدید احساس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اسے  
 بہت مس کر رہے ہوں گے۔



بھلا اچھو بھائی کے کیرم کلب میں سارے دوست ہوں، اور عید نہ ہو تو کسی کو مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ وہ تصور میں اپنے پرانے علاقے کی گلیوں میں گھوم رہا تھا، کھیل رہا تھا اور مون سستی میں مصروف تھا۔ کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر وہ ان ہی سوچوں میں تھا کہ اچانک ہی گلی کے سامنے والے مکان کی چھت پر اس کی نظر پڑی اور آنکھوں میں گویا بجلی سی کوند گئی۔

اف..... کتنی خوبصورت تھی وہ..... مجید نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ وہ مجید کی نظروں سے قطعی بے خبر ہو کر اپنے گیلے بالوں کو سکھار رہی تھی اس کے ہاتھ میں کبھی بھی تھی۔ شاید وہ نہا کر آئی تھی۔ اور ایسا لگتا تھا جیسے کسی کھلتے ہوئے گلاب پر اس کی بوندیں پڑ گئی ہوں۔ مجید دم بہ خود تھا۔ دفعتاً لڑکی کی نظر بھی اس پر پڑ گئی۔ اور مردانہ نگاہوں کا احساس ہوتے ہی اس نے اپنے آپ کو سٹایا اور پھر وہاں کی نہیں تھی۔ اس کا رخ فوراً ہی سیڑھیوں کی طرف ہو گیا۔ پھر وہ سیڑھیوں سے اتری اور مجید کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مجید کی نگاہیں..... شاید پتھر گئی تھیں۔ پہلی نظر میں جو محبت دل میں بیدار ہو جائے۔ وہ بہت پائیدار ہوتی ہے، اور اسے بھول جانا زندگی کا سب سے ٹھن مرتلہ ہو جاتا ہے۔ ابھی مجید کو یہ علم نہیں تھا کہ اسے اس پری وٹ سے محبت ہو چکی ہے، ابھی تو وہ اس حسینہ کے پیکر کو اپنی آنکھوں میں ہی لئے بیٹھا تھا۔ اس نے کافی انتظار کیا، لیکن وہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آئی تھی۔

پھر ایک طویل سانس لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، اور اسی چھت پر نظریں ڈالتا ہوا خود بھی نیچے اتر آیا۔ وہ کافی غصے میں اوپر آیا تھا، لیکن اب اس ”حادثے“ نے اس کا موڈ ہی بدل ڈالا تھا۔

ویسے اسے اتنا تو اندازہ تھا کہ لڑکی نے بھی اسے نظر بھر کر دیکھا ضرور ہے۔ لڑکی ذات تھی..... اس لئے فوراً ہی شرما کر بھاگ کھڑی ہوئی مجید کے چہرے پر بے ساختہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور پھر تیسرے دن..... مجید کی دعا اور کوشش کو کامیابی نصیب ہوئی۔

وہ حسینہ پھر چھت پہ آئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی سامان تھا۔ جسے وہ چھت پر رکھنے کے لئے آئی تھی۔ پچھلے دو دن تو سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا، لیکن آج محنت رنگ لائی تھی۔ آج وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی، مجید یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ گویا پلکیں جھپکنا ہی بھول گیا تھا۔ لڑکی نے ایک کونے میں لایا ہوا سامان رکھا اور وہ جیسے ہی پلٹنے لگی، تو اس کی نظریں مجید کی نظروں سے ٹکرائیں۔

مجید نے صاف دیکھا کہ وہ قتالہ عالم مسکرائی بھی تھی، ساتھ ہی اس نے اپنی نظر پھیری اور جلدی سے زینے کی طرف چل دی۔ مجید کے لئے فی الحال اس کی یہ نظر اور دل کش مسکراہٹ کسی قیمتی خزانے سے کم نہیں تھی۔ اس کا دل مسرت سے جھوم اٹھا، یہ پہلی کامیابی تھی جو اسے حاصل ہوئی تھی۔ پہلی محبت نے اس کی طرف پہلا قدم..... بڑھا دیا تھا۔

کرم دین اور اس کی بیوی ورطہ حیرت میں تھے کہ یہ کیا بالیٹ کیسے ہوئی.....؟ لیکن بہر حال یہ بہت خوش آئند بات تھی۔ مجید میں جو بدلاؤ آ رہا تھا وہ ان کے لئے کسی فن شدہ خزانے کے مل جانے سے کسی طور بھی کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے زیادہ کر دینا

اور خواہ مخواہ بال کی کھال اتارنا مناسب نہ سمجھا۔ مجید کا موڈ اب بے حد خوش گوار رہنے لگا تھا، اب وہ اپنے دوستوں کو یاد کر کے آنسوئیں بہاتا تھا، اور نہ اپنی ماں سے بات کرتے ہوئے اس کی زبان میں کڑواہٹ اترتی تھی۔

نہ صرف ماں سے..... بلکہ اب توہ اپنے باپ سے بھی لگ کر باتیں کرنے لگا تھا۔ آج بھی دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد..... وہ کافی دیر تک اپنی ماں سے باتیں کرتا رہا۔ اور پھر جب ماں تھوڑی دیر کرسی پر گھسی کرنے کے لئے لیٹی تو اس نے چھت کا رخ کیا۔ اسے امید تھی کہ وہ حسینہ ضرور چھت پر آئے گی مجید نے نوٹ کیا تھا کہ وہ زیادہ تر دوپہر کے وقت ہی اپنی چھت کا رخ کرتی تھی۔ دل میں امید کی کرن لئے..... وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا رخ کھڑکی کی جانب تھا۔

☆.....☆.....☆ کرم دین جب اپنا کام سمیٹ کر گھر لوٹا تھا تو مجید اور اس کی بیوی سو جایا کرتے تھے۔ لیکن کرم دین کے دروازہ کھٹکھٹانے پر بیوی کی آنکھ فوراً ہی کھل جایا کرتی تھی۔ آج بھی یہی ہوا، بیوی نے کھانا لگایا اور پھر دونوں بیٹھ کر دن کی باتیں کرنے لگے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ پھر باتوں باتوں میں مجید کا ذکر نکل آیا۔

”ارے ہاں.....“ بیوی چونک سی گئی۔ ”میں آپ کو بتانا تو بھول ہی گئی..... آپ سن کر بہت خوش ہو گئے۔“ ”اچھا..... بتاؤ پھر.....؟“ کرم دین نے بیوی کو مسکرا کر دیکھا۔ ”مجید کہہ رہا تھا کہ وہ میٹرک دوبارہ کرے گا۔“ اس نے بتایا۔ ”تاکہ محنت اور لگن سے اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے۔“

## زہر

جج (ملزم سے) ”تم نے مقتول کو پانی میں زہر کیوں ملا کر دیا تھا؟“ ملزم۔ ”جناب! انہوں نے خود یہ کہا تھا کہ ایسا پانی ہو کہ ٹھنڈا ہو جاؤں!“

## سودا

راگبیر! ”ٹیکسی والے! باغ جناح کا کیا لو گے؟“ ٹیکسی والا۔ ”باغ جناح کیا میرے باپ کا ہے جو تم سے سودا کر لوں!“ (محمد جاوید علی رملتان)

”واہ زریں واہ.....“ کرم دین خوشی سے اچھل پڑا۔ ”یہ تو واقعی خوش خبری ہے۔“ ”جی.....“ زریں نے سر ہلایا۔ ”وہ ٹیوشن کی بھی کہہ رہا تھا۔“ ”بالکل..... بالکل.....“ کرم دین جلدی سے بولا۔ ”خرچہ کتنا بھی ہو۔ اگر مجید کسی قابل بن گیا تو یہی میری محنت کا پھل ہوگا۔“ ”یہاں آ کر تو مجید بالکل ہی بدل گیا ہے۔“ زریں بولی۔ ”اب تو اپنے آوارہ دوستوں کا نام بھی نہیں لیتا۔“ ”شکر ہے خدا کا.....“ کرم دین نے چھت کی طرف دیکھا۔ ”جو میں نے سوچا تھا..... وہ پورا ہو رہا ہے..... اسی کو کہتے ہیں کہ نیت صاف اور منزل آسان.....“ ”امی..... مجھے کچھ کتابیں خرید کر لانی ہی.....!“ ”ہاں..... ہاں..... بولو بیٹا..... کتنے پیسے



دوں.....؟

”500 روپے.....“ مجید نے کہا اور پھر سر کھجا کر بولا۔ ”امی..... ایک بات کہوں.....؟“  
”ہاں ہاں..... کہو.....“ زرینہ جلدی سے بولی۔

”امی.....“ وہ بولتے بولتے رکا، پھر اس سے ذرا توقف کے بعد دوبارہ سلسلہ جوڑا۔ ”امی..... آپ ذرا محلے والوں سے بھی جان پہچان بڑھائیں..... اچھی بات ہے..... ذرا آپ کا دل بھی بھلے گا..... اس طرح ہم لوگ کب تک اجنبی بنے رہیں گے.....“

”تم نے میرے دل کی بات کی ہے.....“ زرینہ سر ہلا کر بولی۔ ”میں اس بارے میں سوچ ہی رہی تھی۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے.....“ مجید جلدی سے بولا۔ ”میرے خیال سے..... سامنے والا جو گھر ہے.....“ اس میں رہنے والے لوگ کافی اچھے ہیں..... آپ ان ہی سے اپنی جان پہچان کی ابتداء کرو۔“

اور پھر دوسری صبح مجید کی والدہ سامنے والے گھر کے لئے نکل کھڑی ہوئیں۔  
مجید بڑی بے چینی سے اپنی ماں کی واپسی کا منتظر تھا۔

زرینہ کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور مجید اپنے تصور میں سامنے والے گھر کا حال احوال دیکھ رہا تھا۔

وہ گھر کے اندر ہی ٹہل لگا رہا تھا، وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں کر پا رہا تھا کہ گیٹ سے باہر نکل کر تاک جھانک ہی کر لے۔

وہ اپنے خیالات سے اس وقت چوٹکا، جب دروازہ پر کھٹکا ہوا۔

وہ دوڑتا ہوا دروازے کی طرف لپکا، اسے کھولا تو ماں کی شکل دکھائی دی۔

اندر داخل ہو کر زرینہ نے برقعہ اتارا، اور ساتھ

ہی بولی۔

”واقعی..... بہت اچھے لوگ ہیں یہاں کے..... مجھے فوراً ہی چائے بسکٹ دیئے..... مجھ سے اچھی طرح ملیں۔ خوب باتیں کیں.....!“  
”جج..... امی.....؟“ مجید کے منہ سے نکلا۔

”ہاں بھئی.....“ زرینہ نے جلدی سے کہا۔ ”پھر چونک کر بولی۔ ”لیکن تم نے مجھے جس گھر میں بھیجا تھا اس میں تو تالہ لگا ہوا تھا۔ کہیں گئے ہوں گے وہ لوگ..... میں تو اپنے برابر والے گھر میں گئی تھی ان کی دو بیٹیاں ہیں..... 3 بیٹے ہیں.....“

یہ سن کر مجید کی مسرت پر اوس پڑ گئی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ اس کی ماں سامنے والے گھر والوں کی تعریف کر رہی ہے.....!

”تو..... سامنے والے گھر میں تالہ پڑا تھا.....؟“

”ہاں.....“ زرینہ نے جواب دیا۔  
پھر اس نے غور سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم سامنے والے گھر پر زیادہ زور دے رہے ہو.....؟“

مجید شائیا گیا، پھر جلدی سے بولا۔  
”ایسے ہی امی..... کوئی خاص بات نہیں ہے۔“  
”ہوں.....“ زرینہ نے سر ہلایا۔ ”مجھے تو برابر والے بہت پسند آئے۔ ان کی لڑکیاں بھی بہت خوب صورت اور ادب لحاظ والی ہیں۔ سب تربیت کی بات ہوتی ہے..... ہاں.....!“

وہ بولے جارہی تھیں اور مجید کا ذہن کہیں اور تھا۔

پھر دو دن بعد شام کے وقت وہ چمت پرا گئی۔  
آج تو اشارے سے اس نے سلام بھی کیا تھا، مسکرائی بھی تھی۔ مجید کا حال اس پیاسے کی طرح تھا، جس کو سمندر مل جاتا ہے۔

دل خوشی کے مارے پھولے نہیں سارہا تھا، مجید نے اشاروں ہی اشاروں میں حال احوال کہنے کے بعد

اسے بتایا کہ وہ اپنی امی کو بھیج رہا ہے۔  
قتالہ حسد اس کا مطلب سمجھ گئی، اور فوراً ہی شرما کر زینے کی طرف بھاگی۔

اس کے جاتے ہی مجید نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر فوراً ہی خود بھی نیچے کی طرف لپکا وہ چاہتا تھا کہ اس کی ماں ابھی اور اسی وقت سامنے والے گھر میں ہو کر آجائے۔

وہ لوگ ابھی گھر ہی میں تھے۔ موقع اچھا تھا۔ تقریباً 1 گھنٹے بعد اس کی ماں زرینہ کی واپسی ہوئی۔

مجید کو اس وقت کا لمحہ کٹھن لگ رہا تھا، پل پل بھاری ہو رہا تھا۔  
خدا خدا کر کے زرینہ واپس لوٹی، مجید نے دروازہ کھولا تو اس نے اپنی ماں کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے۔

”کیا ہوا امی.....؟ سب خبریت تو ہے نا.....؟“ بے ساختہ اس نے پوچھا تھا۔  
”ہاں.....“ زرینہ نے سر ہلایا، پھر اندر آ کر اس نے مجید کی طرف غور سے دیکھا اور بولی۔

”تم نے مجھے کس گھر میں جانے کو کہا تھا.....؟“  
”سامنے والے گھر میں..... کیوں کیا ہوا.....؟“  
مجید الجھن میں پڑ گیا زرینہ کا لہجہ ہی ایسا تھا۔

”وہ گھر..... جس میں نیلے رنگ کا گیٹ لگا ہے..... وہی.....؟“  
”جی..... جی..... ہاں.....“ مجید حیران تھا۔ ”آخر ہوا کیا ہے امی.....؟“

اس کی ماں تو جیسے پہیلیاں بھجوا رہی تھی۔  
”میرے بچے..... میرے لال.....“ زرینہ نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ ”تم مجھے بار بار وہاں کیوں بھیج رہے ہو..... وہ گھر تو سالوں سے بند پڑا ہے..... خالی ہے وہ گھر..... اور..... وہاں اثر بھی ہے..... ہاں.....!“

یہ سن کر مجید کا تو دماغ ہی گویا بھک سے اڑ گیا۔

یہ..... یہ..... اس کی ماں کیا کہہ رہی تھی.....؟  
یہ کیسے ہو سکتا ہے..... تو پھر..... تو پھر..... وہ..... خوب صورت.....!!

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹا.....“ زرینہ دوبارہ بولی۔  
مجید کے چہرے پہ بدلنے ہوئے تاثرات اس نے بھانپ لئے تھے۔

”میں..... میں..... کیسے یقین کروں امی.....؟“ مجید نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔  
”تم مجھے بتاؤ..... بات کیا ہے.....؟“ زرینہ بولی۔

”میں پہلے بھی وہیں گئی تھی، پھر وہاں تالا دیکھ کر میں پڑوس میں چلی گئی، وہاں باتوں باتوں میں میں نے سامنے والے گھر کا ذکر کر دیا۔“  
”پھر..... پھر انہوں نے کیا کہا..... امی.....؟“

”مجھے انہوں نے ہی بتایا ہے کہ سامنے والا گھر سالوں سے بے آباد ہے، اور اس میں اثرات ہیں..... اب..... اب..... تم اوپر نہیں جانا میرے بچے.....!“

زندگی میں جو بلاؤ آ رہا تھا، اس کی روشنی کا ایک ہی ماند پڑ گئی تھی۔  
مجید کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

اب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، اور غور سے مشاہدہ کیا تو یہ حقیقت اس پر کل گئی کہ سامنے والا گھر واقعی خالی تھا۔

اس کے جسم میں چیونٹیاں سی ریگنے لگیں۔ اس کا دل کتنی گہرائیوں میں جا کر..... ڈوب گیا تھا۔

یہ سب کچھ معلوم ہو جانے کے بعد بھی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے چمت کار رخ کیا۔  
لیکن..... اس دن کے بعد سے اسے حسد کا دیدار دوبارہ نصیب نہ ہو سکا۔  
سامنے والے مکان کی چمت..... اجاڑ پڑی





## انوکھا کیس

مدرسہ بخاری - شہر سلطان

اچانک مترنم اور دل و دماغ میں رس گھولتی کھنکھناتی ہوئی آواز سنائی دی، میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں، تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا کہ تم مجھ سے شادی کرو گے، اور نہ کی صورت میں اور پھر ایک تھلکہ خیز منظر رونما ہوا۔

عشق و محبت میں سرشار ایک ماورائی مخلوق کی عجیب و غریب اور دلکش روداد - ایک شاہکار کہانی

**سوموار** کا دن تھا۔ آفس کا پہلا اور خاصا مصروف دن، سُنڈے آف ہونے کی وجہ سے بہت سے کیرئیر آج میری ٹیبل پر موٹی فائلز کی صورت میں میرا منہ چڑا رہے تھے کہ اچانک فون کی ٹون بیل بج اُٹھی! ”ہیلو..... انیسٹر کا مران اسپیکنگ.....“ میں نے اپنے مخصوص انداز سے کہا.....! ”جناب..... میں رحم شاہ بوائز اینڈ ایکوا فینا“

کپٹی سے بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے خاصی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا گیا۔

”جی فرمائیے..... ہماری خدمات ہمہ وقت حاضر ہیں.....“

”جناب.....! ہم لوگ کافی پریشان ہیں۔ پریشانی کی وجہ میرا اکلوتا بیٹا فرحان شاہ ہے۔ جسے گھر سے غائب ہوئے دو دن ہو چکے ہیں.....! اور ابھی تک

ای.....جی.....“

”میں کہہ رہی ہوں یہ ہمارے پڑوسی ہیں۔“

”جی ہاں..... بہت اچھے ہیں ہمارے پڑوسی..... بہت اچھے ہیں۔ ایک بات کہوں امی.....؟“

”ہاں..... بولو.....“

”جس لڑکی نے..... آپ کوڑے دی ہے وہ ہو بہو..... اسی چھت والی لڑکی کی طرح ہے..... بالکل وہی ہے.....!“

زیرینہ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی انہوں نے پیار سے اس کی کمر پر ایک دھپ ماری اور بولیں۔

”بشری نام ہے اس کا..... تم پہلے اپنی پڑھائی پر اور اپنے مستقبل پر دھیان دو۔ میں تمہاری شادی بشری سے ہی کراؤں گی۔ میں تو خود بھی یہی سوچ کر بیٹھی ہو.....“

زندگی ایک بار پھر..... نئی ڈگر پر چل پڑی..... جو خواب چند لمحوں کے لئے ٹوٹا تھا اس کا سلسلہ پھر سے جڑ گیا۔

سامنے والے مکان کی چھت کا معرہ..... کبھی حل نہ ہو سکا..... عرصہ دراز سے خالی رہنے والا یہ مکان خالی ہی رہا۔

لیکن اس خالی مکان کی وجہ سے مجید کے دل میں بشری آکر بس گئی۔

کہتے ہیں کہ اچھی محبت اور اچھی صحبت انسان کو حقیقت میں انسان بنادیتی ہے۔

مجید کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اور ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہوا تھا، اس میں تقدیر کی شمولیت ہو۔

سامنے والے مکان کی نچھت پر دکھائی دینے والی لڑکی کے روپ میں اب بشری اس کے سامنے تھی۔ اور..... اس سے شادی کرنے کے لئے اب مجید کو اپنا مستقبل بہتر بنانا تھا۔



تھی۔

جس دن سے مجید پر حقیقت کھلی تھی، اسی دن سے حسینہ غائب تھی۔

اپنی ماں سے آنکھ بجا کر اور موقع دیکھ کر مجید نے کئی بار چھت کا رخ کیا تھا، لیکن سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔

اس دن اس کی ماں جانے نماز پر بیٹھی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

مجید ایک کتاب لئے بیٹھا تھا، اس نے کتاب رکھی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”کون ہے.....؟“ اس نے پوچھا۔

”آئی میں.....؟“ ایک زنانہ آواز آئی۔

اور پھر مجید نے جیسے ہی دروازہ کھولا، وہ حیرت کے مارے گرتے گرتے بھا۔

سامنے دو لڑکیاں کھڑی تھیں، اور ان میں سے ایک ہو بہو چھت والی حسینہ تھی۔

”میں پوچھ رہی ہوں آنٹی ہیں.....“ یہ حسینہ کی ہی آواز تھی۔

اس کے ہاتھ میں کپڑے سے ڈھکی ہوئی ٹرے تھی مجید ہونٹوں کی طرح اسے دیکھے جا رہا تھا۔

آئی دیر میں زیرینہ خود ہی جانے نماز سے اٹھ کر ان کی طرف آ گئیں۔

اور جیسے ہی ان کی نظر لڑکیوں پر پڑی، وہ کھل اُٹھیں۔

”ارے مجید..... یہ برابر والوں کی لڑکیاں ہیں۔ اسماء اور بشری!“

”یہ لیں آنٹی.....“ حسینہ نے ٹرے ان کی طرف بڑھادی۔ ”امی نے بریانی بھجوائی ہے۔“

زیرینہ نے مسکراتے ہوئے ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی اور وہ دونوں چلی گئیں۔

”یہ ہیں ان کی لڑکیاں..... سن رہے ہو..... کہاں گم ہو.....؟“

”جی.....“ مجید جیسے نیند سے جاگا ہو۔ ”جی



اس کا کوئی انتہہ نہیں.....!“

”محترم! دو دن سے آپ کا بیٹا گھر سے غائب ہے اور آپ نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کروائی! ہو سکتا ہے وہ کسی رشتہ دار یا کسی دوست کے پاس گیا ہو.....!“

”ہم تمام رشتہ داروں اور دوستوں سے کفرم کر چکے ہیں لیکن کچھ پتہ نہیں.....! دوسری طرف سے کہا گیا.....“

”جناب.....! آپ میرے آفس تشریف لے آئیں..... اور کھل کر بات بتائیں تاکہ جلد از جلد معاملے کی تہہ نیک پہنچا جاسکے.....“

”جناب.....! اگر میں آسکتا ہوتا تو آپ کو فون پر زحمت ہرگز نہ دیتا۔ پچھلے دو ہفتوں سے میری ٹانگیں فوج زدہ ہو گئی ہیں۔ معذوری کی حالت میں بولا بھی نہیں جاتا..... ہر طرف سے مکمل چھان بین کرنے کے بعد آپ سے رابطہ کیا.....!“

”اوکے.....! میں آپ کے پاس آ رہا ہوں.....! آپ مطمئن رہیں.....“ میں نے کہا.....!

”ویننگ سر.....!“ ایکوفا اپنی کپنی فلور نمبر 5، روم نمبر 4..... دوسری طرف سے کسٹم ایڈریس بتایا گیا.....

وہ ایک متاثر کن پرستانی کا مالک تھا۔ کمرہ خاصا کشادہ اور شاندار انداز میں سجا ہوا تھا۔ مجھے یہاں آنے میں کوئی دقت تو نہ ہوئی البتہ ایک الوکھا واقعہ ہوا جو مجھے یہاں بیان کرنا ہے۔

روم نمبر 4 ایک الگ انداز کا کمرہ تھا۔ جس کی ڈیکوریشن اور تزئین و آرائش پر خاصا خرچ اٹھا ہوگا۔ ایک چیز جس نے مجھے خاصا پریشان کیا وہ یہاں کے لوگوں کا پراسرار رویہ اور ایک سرانڈ قسم کی بو.....! ایک ایسی گندی بو جس نے میرے دماغ کی شریانیں تک ہلا دیں.....! اور میں نے اس سے بچنے کے لئے سائٹل جیب سے رومال نکالنا چاہا لیکن حیرت انگیز طور پر رومال موجود نہ تھا۔

اس کیس میں ایک اور بات بھی رونما ہوئی جو خاصی مبہم رہی۔ مطلوبہ ایڈریس پر پہنچنے سے پہلے ایک

بزرگ جن کی داڑھی برف کی مانند سفید اور آنکھوں میں گہرائی موجزن تھی۔ مجھے ڈسمنٹ پرلے.....!

”تم بہت فرض شناس آفیسر ہونو جوان۔ مگر ایک بات یاد رکھنا..... روحانی طاقتوں کا مقابلہ بدی کی اندھی سیاہ طاقت ہرگز نہیں کر سکتی۔ اگر کبھی بدی کی اندھی یلغار میں جکڑے جاؤ تو غریب خانے پر آ جانا.....!“ اس کے بعد وہ بزرگ اللہ اللہ کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ویسے وہ جگہ کہنی کا آفس کم اور پراسرار زیادہ محسوس ہو رہا تھا.....! میں جب سے اس آٹھ منزل عمارت میں داخل ہوا تھا میرا دماغ گھوم گیا تھا.....! میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ جس میں اتنی گندی بدبو کا سامنا کرنا پڑا تھا..... حیرت کی بات یہ کہ یہاں کے لوگ بھی خاصے پراسرار انداز میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے..... ایک عجیب سا ماحول تھا..... خیر میں روم نمبر 4 میں پہنچ گیا.....!

رحم شاہ کی متاثر کن پرستانی میں صرف ٹاگوں کی معذوری کا داغ تھا ورنہ وہ بڑھاپے میں بھی خاصا اسارٹ اور پرکشش تھا.....!

”آئیے انکپٹر صاحب.....! تشریف رکھیے.....!“

رسمی علیک سلیک اور صحت یابی کی دعا کے بعد وہ مدعا بیان کرنے لگا.....!

”میرا ایک ہی بیٹا ہے فرحان شاہ..... سافٹ ویئر انجینئر فرام ہارڈ ویئر ورکی آف امریکہ.....! ٹاپ کلاس پروگرامس ان آل کائنات آف سافٹ ویئر.....! لیکن پچھلے دو ماہ سے ایک ایسی بیماری کا شکار ہوا ہے کہ زندگی مروہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہر چیز سے اچاٹ اور ڈان میں خلفشار سایدا ہو گیا ہے۔ راتوں کو لیٹ آتا.....!“

”لیکن جناب.....! وہ تو دو ہفتے سے غائب ہے۔“ میں نے کہا.....!

”بالکل.....! میں اسی طرف آ رہا تھا.....!“

”جی.....! بتائیے.....!“

”اس کا ذہن ایک سوئی پر تک سا گیا تھا.....! وہ صرف ایک گناہ کا مرکب ہوا تھا۔ ایک ایسا گناہ جو عزت تار تار کر دیتا ہے۔ حساس ہونے کے ناطے اس نے یہ بات اپنے دماغ میں بیٹھائی اور پھر.....! اور پھر وہ سائیکسٹریفر قرار دے دیا گیا.....!“

مجھے بہت افسوس ہوا تھا اس باپ کی داستان غم سن کر..... لیکن وہ بھی تو بہت مبہم سی باتیں کر رہا تھا.....!

”میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں..... کہ یہ واقعہ کیسے ہوا.....!“ میں نے پوچھا.....!

”مجھے اس بارے میں قطعی علم نہیں.....! میں بار بار پوچھا رہا مگر وہ صرف ایک ہی بات دہراتا تھا.....“ ڈیڈی میرا گناہ بہت بڑا ہے اور جس کی مجھے سزا ملی ہے.....!“

”اور کوئی ایسی بات جو اس کیس کے کبھی وائس میں میری مدد کرے.....!“ میں نے پوچھا.....!

”ہاں..... ایک اہم بات.....! پھر اس نے نیبل تیل پریس کی.....!“

”نیل سر!“

”منظور.....! چھوٹے صاحب کے کمرے سے جو خط ہاتھ لے کر آؤ..... اور کنٹرول روم سے مسٹر ڈیوڈ کو اندر بھیج دو.....!“

اس خط میں بہت سی باتیں تھیں.....! لیکن خاص بات یہ کہ ایک لڑکی کا خون سے لکھا محبت نامہ تھا.....! لڑکی خاصی جذباتی قسم کی تھی جس نے فرحان شاہ کو مکمل طور پر اپنانے کا دعویٰ کیا تھا.....!

بہت سے تعریفی کلمات اور جھوٹی جی قسٹیں بھی مواد کا حصہ تھیں.....! ایک اہم بات یہ بھی کہ رائٹنگ خاصی Poor تھی.....! اتنی عام سی لکھائی والی لڑکی جس میں سادگی شامل تھی..... نہ کوئی بناوٹ نہ جدید دور کے مطابق کوئی اسٹائلش Look.....!

نام درج نہیں تھا مگر مخصوص اشار کا نشان واضح تھا.....!

جب میں نے وہ خط پڑھ لیا تو رحم شاہ کی طرف دیکھ کر گویا ہوا..... ”اس خط کو آپ کس معنی میں لیں

گے؟“ میں نے پوچھا.....!

”انکپٹر صاحب.....! یہ لڑکی فرحان کی ایسی دوست محسوس ہوتی ہے جو کم از کم امریکہ سے نہیں ہے..... وگرنہ اس کی رائٹنگ اتنی بری نہ ہوتی.....!“

انہوں نے کہا.....!

”یہ مکمل پاکستانی رائٹنگ ہے.....!“ میں نے ایک خیال کے تحت کہا.....!

”مجھے بھی یہی شک ہے.....!“

”شاہ صاحب.....! آپ کے بیٹے کی دوسری مصروفیات کیا تھیں.....؟“

27 سال کی عمر میں بہت بڑا کام یہ کہ اس نے ملٹی نیشنل کمپنیز کی تمام سافٹ ویئر انشالیشن ترتیب دی..... گاؤں میں ہمارا کچھ رقبہ بھی ہے.....! مجھے یاد پڑتا ہے ایک بار فرحان گاؤں گیا تھا.....! سال 2011ء تھا..... لیکن پھر کبھی اس طرف نہیں گیا.....!“

کنٹرول روم سے ڈیوڈ کی آمد نے چونکا دیا.....! اس کے ہاتھ میں ایک ویڈیو ٹیپ تھی.....!

”جناب.....! یہ سی سی وی فوٹیج ہے۔ جس میں فرحان کی زندگی کے بیسٹ اور برے دونوں طرح کے ریکارڈ موجود ہیں.....! فرحان کی موجودہ تصویر اور اضافی معلومات بھی.....! آپ اسے دیکھ لیجئے گا.....!“

اس نے ٹیپ مجھے تھماتے ہوئے کہا.....!

”میری آپ سے ایک گزارش ہے.....!“

”جی فرمائیے.....!“

”اگر مجھے فرحان کے کمرے کا Visit کرادیں تو ہو سکتا ہے ہمیں کچھ مزید ایسا پوائنٹ مل جائے جو کیس حل کرنے میں مددگار ثابت ہو.....!“

”وہاں ناٹ.....!“

پھر میں نے فرحان کے کمرے کا معائنہ کیا.....!

کچھ خاص نہ ملا مگر ایک سافٹ ویئر کی پروگرامس سی ڈی ہاتھ لگی جو وہ ان دنوں تیار کر رہا تھا.....!

فوج میں وہ ایک خوب و اسارٹ نوجوان نظر آیا۔



ہر غم سے آزاد اور فکر زندگی سے دور، وہ نوجوان شہزادہ نظر آیا۔ لیکن پھر منظر بدلا۔ وہی شہزادہ۔ گلی کا بھکاری نظر آنے لگا۔ یہ سب کیسے ہوا اس کا مجھے صرف ایک ہی سرا سمجھ میں آیا کہ لڑکی کی محبت..... لڑکی کون تھی؟ اس کا فرحان سے کیا تعلق تھا؟ سائیکو پیسٹ اور زندگی سے بیزار فرحان شاہ اس وقت کہاں تھا؟ کچھ سمجھ نہ آیا..... لیکن پھر جب میں نے سافٹ ویئر کی ڈی پلے کی تو کچھ الگ طرح کا نظارہ ملا.....

سافٹ ویئر کی ڈی میں انگلش میوزک وقفے وقفے سے پلے بیک میوزک کے طور پر اشارت ہو جاتا.....

پھر ڈبل ڈسپلے ہوتا اور ایک لڑکی کی شبیہ نظر آتی.....

آہستہ آہستہ اس لڑکی کی تصویر واضح ہو گئی..... وہ فرحان شاہ سافٹ ویئر پروڈکشن کی تیار کردہ سی ڈی تھی..... ہیلو اینڈ گریٹنگ کارپوریشن کی جانب روانہ ہونے والی اس سی ڈی میں لڑکی کی تصویر ہم صورت حال تھی..... میں نے ڈسک نکالی اور دوبارہ پلے کی.....

مگر اب کی بار وہ لڑکی دوبارہ نظر نہ آئی..... یہ خاصی عجیب صورت حال تھی.....

لڑکی خاصی خوب صورت اور گوش نین و نقش کی حامل تھی۔ ایک بات جو واضح نظر آئی کہ لڑکی کا تعلق گاؤں سے تھا۔ مخصوص قسم کا لباس اور چوڑیاں..... بندھے ہوئے بال اور گہری معصومیت کی حامل اس لڑکی کا تعلق قطعی شہر سے نہ تھا.....

میں نے رحم شاہ سے ہیلو اینڈ گریٹنگ کا نمبر لیا.....

چند منٹوں میں رابطہ قائم ہو گیا.....

”ہیلو.....! میں انسپکٹر کامران بول رہا ہوں.....!“

”ہی.....!“

”ہیلو گریٹنگ کے منیجر سے بات کرنی ہے.....“

”ہولڈ آن کریں سر.....! ابھی بات ہو جاتی ہے.....!“

”ہے.....!“

چند لمحوں بعد ایک بھاری آواز نے بات کی.....

رسی علیک سلک کے بعد میں نے فرحان شاہ کیس کے بارے میں بتایا.....

”نسیم صاحب! آپ کے سافٹ ویئر میں کی لڑکی کی تصویر بھی شامل ہے.....!“

”نو..... بالکل نہیں.....!“ فرحان شاہ کے پاس ہمارا Accountantry سافٹ ویئر تھا.....

اس نے بتایا.....

”اوکے نسیم صاحب..... بہت بہت شکریہ.....!“ میں نے فون رکھ دیا.....

حیرت انگیز بات تھی کہ سافٹ ویئر میں لڑکی کی تصویر کیوں شامل کی گئی..... اور جب دوبارہ چلائی گئی تو لڑکی کی تصویر غائب تھی..... آخر ایسا کس طرح ممکن ہے.....

پھر ایک دن ایک انجینی فون کال آئی.....

”ہیلو.....! انسپکٹر کامران اسپیکنگ.....!“

”آئی ایم مرتضیٰ حسین.....! سر! میں فرحان شاہ کیس کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں.....“

دوسری طرف سے کہا گیا.....

”ویلیکم.....! ضرور..... آپ آفس تشریف لے آئیے.....!“ میں نے جلدی سے کہا.....

30 سالہ مرتضیٰ حسین واجبی شکل و صورت کا حامل تھا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک واضح نظر آئی.....

وہ خاصا ذہین نوجوان تھا.....

”سر! فرحان میزا انکپور اڈو سے..... دوپٹے سے لاپتہ اور مجھوں صورت بخار بھی ہے.....! دوپٹے پہلے اس سے میری بات ہوئی تھی..... بہت مایوس اور اداں تھا..... وہ مارکیٹ میں ایک جدید سافٹ ویئر لانچ کر چاہتا تھا..... خاصا ذہین اور پر اعتماد تھا.....! کاش اگر وہ.....! اگر وہ گاؤں نہ گیا ہوتا تو آج ایسا نہ ہوتا.....“

”کیا مطلب..... گاؤں کا فرحان کیس سے کیا تعلق ہے؟“ میں چونکا.....

”یہ پچھلے سال کی بات ہے.....“ جب ہم چار دوست فرحان کے گاؤں پبلک منانے گئے تھے۔ وہاں ان کا ایک فارم ہاؤس بھی ہے۔ شاہ مراد ان کے ایک ملازم کا نام ہے جس کی بیٹی فائزہ..... فرحان کے عشق میں مبتلا ہو گئی.....

دونوں کی ملاقات ندی پر ہوئی تھی۔ جب فائزہ ندی میں جا گری تھی۔ ہم لوگ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ فرحان پال لینے گیا تو اسی وقت فائزہ ندی میں جا گری۔ تب فرحان نے اسے ندی سے بحفاظت نکالا.....

سر دیوں کی شام میں فائزہ تھر تھر کا پٹنے لگی۔ فرحان نے اپنا کوٹ اسے اوڑھا کر محبت کی ابتدا کی تھی.....

فائزہ خاصی خوب صورت اور باحیا تھی۔ لیکن فرحان کے عشق میں ایسی بڑی کہ برباد ہو کر رہ گئی.....

”کیا آپ فائزہ کو پہچان لیں گے.....؟“ میں نے پوچھا.....

”وائی ناٹ.....!“

پھر میں نے سافٹ ویئر کی ڈی کی فرسٹ کاپی پلے کی..... جس میں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا.....

میں نے کاپی کر لی تھی..... وگرنہ سیکنڈ ٹائم تو لڑکی نظر نہ آتی.....

فرحان چونک پڑا تھا کیونکہ اس نے فائزہ کو پہچان لیا تھا.....

”وہ لڑکی واقعی فائزہ ہی تھی۔ سافٹ ویئر میں اس کی تصویر کیونکر آئی تھی.....! کچھ سمجھ نہ آئی.....!“

”لیکن سر.....! فائزہ کی تصویر پرنس اکاؤنٹی کے سافٹ ویئر میں کیونکر.....؟“

”یہ بات غور طلب ہے..... خیر یہ مسئلہ تو حل ہو گیا..... کوہ لڑکی شاہ مراد نامی ملازم کی بیٹی تھی.....!“

ایک ہفتہ اور گزر گیا..... شاہ مراد کی بیٹی فائزہ بھی مرنے لگی.....

عام قیاس آرائی یہی تھی کہ فائزہ بھاگ گئی تھی۔

مراد کو اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک ہی اولاد تھی۔ جو تارمان نکلی تھی.....

اس دوران اسے ایس آئی شہت نواز اور ایک کانشیل میسرے ہمراہ تھے..... ہم نے فارم ہاؤس اور فرحان شاہ کا مکمل رقبہ راؤنڈ کیا.....

شاہ مراد ایک مختصر آدی تھا۔ بیٹی کا غم الگ تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھ جاتی تھی۔ میں نے اسے مکمل تسلی دی.....

ایک واضح سرائٹ مجھے اس کے گھر کے کمرے میں محسوس ہوئی، یہ رحم شاہ کے آفس میں بھی موجود تھی اور ادھر شاہ مراد کے گھر میں بھی.....

لیکن میں نے اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

”سر.....! یہ معاملہ سیدھا سادہ سا ہے۔ دو باغ مرد عورت پسند کی شادی کرنے کے لئے گھر سے بھاگ گئے..... کورٹ میرج کر لیں گے۔ ہم کیوں مفت میں مارے مارے پھرتے رہیں.....!“ حوالہ دینے پر خان بولا.....

”خان جی.....! فرحان ایک دماغی مریض ہے اور دماغی مریض کچھ بھی کر سکتا ہے اور فرحان کا باپ اربوں کا مالک ہے۔

ہمارے ملک کی ایک بڑی کمپنی کا مالک.....! وہ جس سے چاہے اپنے بیٹے کی شادی کر سکتا ہے۔!“

”سر.....! آپ کو مراد بو محسوس ہوئی تھی جب ہم شاہ مراد کے گھر میں داخل ہوئے تھے.....“ شہت نواز بولا۔

”ہاں.....! یہی بو مجھے رحم شاہ کے کمپنی آفس میں بھی محسوس ہوئی تھی۔ کیس کے ساتھ یہ بھی عجیب ہے.....!“

”اور سر.....! شاہ مراد کی بیوی بہت کالی تھی..... مجھے تو ڈر لگ گیا تھا.....! اور سرخ زبان.....! سوکھی..... کا ناظر آتی تھی.....!“

نذیر خان اپنے مخصوص انداز میں بولا اور میں ہنس پڑا.....

☆.....☆.....☆

ماہین رضا..... میڈیا ڈائریکٹ کی ہیڈ چیف تھی..... بہت ذہین اور تیز.....! کمرنگ میں ایم فل اور



ہر مسئلہ کو جڑ سے نکال پھینکنے والی.....!

میں نے سارا کیس ماہین رضا کو بتایا.....! چند لمحوں بعد اس کی آنکھوں میں چمک نظر آنے لگی.....! ”سر! آپ مجھے وہ خط دکھائیں گے جو فرحان شاہ کو لکھا گیا تھا.....“ اس نے کہا۔ میں نے خط دراز سے نکال کر ماہین کو دکھایا۔

وہ کافی دیر تک اس خط کو دیکھتی رہی۔

”سر یہ راننگ انسانی نہیں.....!“ وہ بولی۔

میں حیرت سے اچھلا.....! ”لیکن وہ کیسے؟“

”سر.....! میں نے راننگ میں ماسٹرز اور حتیٰ الوسع ریسرچ کی ہے۔

دنیا کی ہر زبان ایک خاص دائرے میں گھومتی ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، لاطینی، اردو، فارسی یہ ایسی زبانیں ہیں جو ایک خاص گولائی اور مخصوص انداز میں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔

الفاظ کی مخصوص گولائی انسانی ہاتھ سے اس طرح ممکن نہیں.....! راننگ خاص کمزور ہے جبکہ اگر لکھنے والا چاہتا تو اسے مزید برا کر سکتا تھا۔ اسی طرح وہ اسے بہت اچھا بھی لکھ سکتا تھا.....!“

”ماہین! آپ مکمل وثوق سے کہہ سکتی ہیں کہ انسانی ہاتھوں سے یہ خط نہیں لکھا گیا ہے۔“

”جی ہاں کل.....! مکمل اعتماد اور یقین کے ساتھ.....“ انگریزی رسم الخط انسانی ہاتھ سے اس طرح لکھنا ناممکن ترین ہے.....! ”وہ اعتماد دے بولی.....!“

”اوکے..... مان لیتے ہیں..... کہ یہ انسانی لکھا نہیں..... مگر پھر یہ خود بخود وجود میں نہیں آئی..... اور فرحان کا نام بھی واضح ہے۔“ میں نے کہا۔

”غیر مرئی مخلوق بھی اسی کائنات کا حصہ ہے، کامران صاحب! مجھے تو یہ جتنی کھیل معلوم ہوتا ہے.....“

فضول باتوں کا وقت نہیں ہے ماہین.....! ہمیں ان دونوں کا فزیکل ایریاٹوٹس میں لانا ہے.....!

یہ بات فضول نہیں ہے سر.....! خیر یہ تو وقت ہی

ثابت کر دے گا.....! آپ اس خون کا DNA

کروالیں.....!

مجھے تو یہ انسانی خون معلوم نہیں ہوتا..... اس میں سے خاصی بو اور سرائی آرہی ہے۔ ”وہ بولی۔

ماہین کی بات دل کو گتی تھی۔ واقعی کوئی انسانی لکھائی معلوم نہ ہوتی تھی جبکہ نزدیک سے اس خون سے سرائی بو تھی۔ خاصی عجیب اور مردہ سی.....!

”اوکے..... اسے ابھی بھجوا دیتے ہیں.....“

اور پھر دوسرے دن ٹیسٹ کا رزلٹ آ گیا۔ حیرت انگیز طور پر اس خون میں انسانی خون کی آمیزش شامل نہ تھی۔ وہ الگ قسم کا Blood تھا۔

ماہین کی ریسرچ جاری تھی۔ مس ماہین کا شک یقین میں بدل گیا تھا.....!

یہ ایک عجیب صورت حال تھی..... Blood کسی مردہ جانور کا بتایا گیا تھا.....! بٹ کفرم.....!

اور لکھائی بھی کسی غیر مرئی طاقت کی تھی..... تا قایل یقین.....! خیر جیسے تیسے یقین کرنا پڑا.....!

ماہین ایک بار پھر میرے سامنے تھی..... ”میرا اہناج ثابت ہو گیا..... وہ طاقت کون ہے.....؟ اس کا پتہ شاہ مراد اور اس کی بیوی سے ملے گا.....!“ وہ بولی۔

”وہ کیسے؟“

”مجھے یہ سارے کردار پراسرار اور جتنا ہی ناپ لگ رہے ہیں! ہمیں اس کیس میں کسی بزرگ کی خدشات میں جانیں.....“ وہ بولی۔

”مجھے نہیں آتی کہ آپ کس طرح کی بات کر رہی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ کائنات کا حصہ ہیں مگر انسان سب پر بھاری ہیں۔ وہ ہمیں نہ جان سے مار سکتے ہیں اور نہ ہی ہم سے زیادہ طاقتور ہیں۔“ میں بولا.....!

”انسان بھاری ہے۔ تبھی تو کسی ایسی ہستی کی بات کر رہی ہوں۔ جو اس مخلوق کو مخصوص انداز سے کرے.....! قرآنی آیات مخصوص وظائف اس مخلوق

زیر کرتے ہیں.....!“

”یقین.....! ابھی اس کا وقت نہیں آیا..... ہم ابھی اور اسی وقت شاہ مراد کے ہاں چلتے ہیں شاید کچھ کچھ مل جائے.....! میں نے کہا۔ اور ہم شاہ مراد کے پاس پہنچے۔

تا قایل یقین.....!

شاہ مراد اور اس کی بیوی کی قبریں ہمارا منہ چڑھا رہی تھیں۔ میں نے فاتحہ خوانی کی.....!

”سر.....! معاملہ سلجھ گیا.....! بچارے دونوں مارے گئے.....!“

ایک بیٹی تھی اس کا غم الگ تھا.....! جو مر گیا ہر غم سے آزاد.....! ”مذہب خان بولا.....!

”ایسا نہیں کہتے مذہب! کسی کے مرنے پر کوئی غم سے آزاد نہیں ہوتا.....!“

”ہمیں وہاں کچھ لوگ ملے.....! جن کے بیان حیرت انگیز تھے.....!“

”وہاں کے ایک رہائشی کا بیان تھا۔ ”صاحب! شاہ مراد نامی شخص کی وفات پانچ

برس پہلے ہوئی.....! اس کی بیوی دو سال بعد جل مری گئی۔ جبکہ اس کی بیٹی فائزہ اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی تھی.....!“

حیرت انگیز.....! پانچ سال پہلے.....! جبکہ ایک ہفتہ پہلے ہم لوگ ان سے ملے تھے۔ اچھی خاصی باتیں ہوئی تھیں۔ معاملہ خاصا گھمبیر تھا.....!

پھر رہتے رہتے مجھے رحم شاہ کا خیال آیا.....! میں نے ان کی زمینوں پر کام کرتے لوگوں سے پوچھا.....!

”رحم علی شاہ کے بارے میں کچھ بتاؤ.....!“

”وہ تو جی بہت سال پہلے فوج زدہ ناگوں کے ساتھ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے.....!“ ایک نے جواب دیا.....!

ماہین کی باتیں سچ معلوم ہونے لگیں۔ یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا..... سارے کردار

اللہ کو پیارے ہو گئے تھے.....! حشمت نواز خاصا سنجیدہ

اور مذہب خان خاصا پریشان تھا.....!

وہاں سے واپسی پر دوسرے دن ہم لوگ ایک فینا سکنی پینچے مگر حیرت انگیز.....! وہاں ایک ریسٹورنٹ تعمیر کیا جا رہا تھا.....!

لوگوں کے مطابق کبھی یہاں سینما ہوا کرتا تھا جبکہ آج کل ایک مکی کپنی ریسٹورنٹ تیار کر رہی تھی.....! ایکوفینا کے نام سے کوئی کپنی موجود ہی نہ تھی۔

ایک فل ٹائم مذاق ہوا تھا.....!

ہم لوگ بری طرح پھنس چکے تھے..... سارے لوگ ہماری نفی کر رہے تھے..... میرا دماغ شدید ترین ڈپریشن میں تھا جبکہ کیس کے سارے کردار مٹی ہو گئے تھے سوائے فائزہ اور فرحان کے.....!

نجانے وہ لوگ دنیا میں تھے بھی یا نہیں..... پانچ سال پرانا کیس.....! اس طرح دوبارہ کیوں اشارت ہوا؟..... یہ چند سوالات تھے جو ہمیں ہر صورت چاہئے تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک یادگار دن تھا۔ جب اس انوکھے کیس کو سلجھانے کا ایک سرا میرے ہاتھ لگا۔ اس دن خوب بارش ہوئی تھی۔ دھنک کے بعد آسمان گھبراہٹا تھا۔

میں آفس میں پہنچائی تھا کہ ایک دھان پان سا شخص ڈری سبھی آنکھوں کا مالک آدھکا.....!

دراستہ ہے اس شخص کی عمر 45 کے ارد گرد ہی ہوگی۔ ”جی فرمائیے.....! میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا.....!

”آپ کامران بخاری؟“ اس نے گویا سوالیہ انداز سے پوچھا۔ انداز خاصا دلکش اور پڑھا لکھا تھا.....!

”جی..... آپ نے ٹھیک کہا.....! میں نے چہرے پر مسکراہٹ سجا کر کہا۔

”سر..... میرا کیس آپ کی دید کا منتظر ہے.....! وہ پراسرار انداز میں بولا۔



”میرے پاس بہت سے کیس ہیں۔ آپ کس کیس کے متعلق بات کر رہے ہیں؟“ تعارف کرائیں۔ میں کسی نتیجے پر پہنچوں۔“

”فرحان علی اور فائزہ کا کیس۔“ وہ بولا۔

”میں زور دار انداز سے جیسے اچھل پڑا۔ یہ کیس آج کل واقعی پراسرار اور ہیبت ناک تھا۔ جس طریقے سے تمام کردار مٹی ہو گئے تھے اور کوئی واضح حل نہیں سوچ رہا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ سب دھوکہ تھا۔ ایک ایسا دھوکہ جو کسی غیر مری مخلوق کی طرف سے کھیلایا گیا ہو۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اس بار کیس کے تمام کردار دنیا میں موجود رہے تھے۔ وقت نے انہیں مٹی کر دیا لیکن ان میں سے دو کردار ابھی زندہ تھے۔ جس میں سے پہلا کردار جو زندہ تھا میرے سامنے تھا۔“

”فرحان شاہ۔“ واقعی آپ کا کیس میری کھڑی میں ہے۔ خاصا جاندار اور زبردست واقعات سے بھرپور۔“ پھر میں نے اسے تمام حالات و واقعات سنائے۔ جسے وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔“

پھر وہ سبک پڑا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے، کچھ دیر بعد وہ سنبھل گیا تو میں نے خند امانی پلایا۔ گوکہ یہ میری کہانی کی ڈیمائنڈ نہیں لیکن مقصد صرف اتنا ہے کہ محبت جو ان رہتی ہے۔ اس نے فائزہ سے محبت کی تھی۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے۔ سمندر کی نرم لہروں اور ریت کی نرمی جیسا پیار۔! وہ حساس شخص کئی سال پرانی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا سب کچھ فنا کر بیٹھا۔“

”فرحان۔! فائزہ کا بتاؤ؟ اس وقت کہاں ہے وہ۔؟“ میں نے پوچھا۔

”بابا چراغ علی شاہ کے مطابق فائزہ اس دنیا میں ہے۔ لیکن ہماری اس تک رسائی صرف ایک صورت میں ممکن ہے جب میری دونوں آنکھیں ضائع ہو جائیں۔“

”لیکن فرحان۔! آنکھوں کے ضائع ہونے سے بھلا فائزہ کا کیا تعلق ہے؟“

”میں آپ کو اپنی مکمل اسٹوری سناتا ہوں۔ وہ سن لیں۔ پھر بعد میں کوئی مکمل فیصلہ کیجئے گا۔“

”وہ ایک بہت پیارا دن تھا جب فائزہ مجھے ملنے پر ملی۔ ہم لوگ گاؤں کی حسین وادی میں کرکٹ کھیل رہے تھے جب فائزہ سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کی آنکھیں جمیل سے حسین اور چہرہ مانند حور تھا۔ مختصر یہ کہ وہ مجھے بہت اچھی لگی۔“

اس سے پہلے میں نے متحدہ ہائے امریکہ سے سافٹ ویئر انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ بہت سی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ساتھ سافٹ ویئر کنٹریکٹ سائن ہوئے تھے۔ ایک لحاظ سے مارکیٹ میں آنے والے تمام جدید سافٹ ویئر پروڈکٹ کا وہ پروڈیکٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں زبردست ایروڈ سے کامیابی کی جانب رواں دواں تھا کہ پھر فائزہ کا پیش مجھ پہ سوار ہوتا گیا۔ میری سوچ میں فائزہ ہی فائزہ تھا۔ میں اسے سیل فون دے آیا تھا۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے۔ یہ عشق دو طرفہ تھا۔ پھر میں ایک دن گاؤں گیا۔

فائزہ میری ہانہوں کی زینت بنی۔ میرا بہت قریب آئی۔ شعور کی تمام حدیں کراس ہو گئیں۔ میں اسے داغدار کر چکا تھا۔ پر اپنے اس گناہ پر نادم تھا۔ بہت شرمندہ بھی ہوا۔ بہت پشیمانی ہوئی۔ بہت سی معافیاں مانگیں۔ خدا کے حضور گڑ گڑایا۔ فائزہ کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔ میں گم سے غائب ہو گیا۔ پھر مجھے فائزہ کی نادرل حالت کے لئے انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔ میں نے اسے شہر میں ایک دوست کے پاس ٹھہرایا۔“

لیکن ایک پوائنٹ۔۔۔ فائزہ اس دور میں مکمل طور پر خاموش رہی۔ مدھوش اور بے ہوش وہ بیچارہ جس کرب سے گزر رہی تھی، اسے بہتر جانتا ہوں۔

وہ ایک خوفناک رات تھی، اماؤں کی گھٹاؤں رات کا سنا تھا۔ میں سادہ لباس میں ٹھٹھرتی رات سائے میں گلی سے گزر رہا تھا۔ میں اس گھٹاؤں پر

میں خاصا تیز چل رہا تھا۔ آج صبح ایک انجینی کی کال ریسو ہوئی۔“

”ہیلو۔!“ آواز میں مٹھاس اور شیرینی تھی۔

”ہیلو فرحان علی اسپیکنگ۔!“

میں مس شہلا بات کر رہی ہوں۔ ڈاک بنگلہ سے۔! آواز میں وہی حلاوت اور چاشنی۔“

”جی فرمائیے۔!“

”فرحان صاحب! فائزہ کی موت۔۔۔“ اور وہ خاموش ہو گئی۔

”میں کتنے میں آ گیا تھا۔ فائزہ کی موت۔۔۔“

کیا مطلب؟“ میں واقعی بے ہوش ہونے لگا تھا۔

”اگر آپ آج رات ڈاک بنگلہ میں نہ آئے تو فائزہ کی موت واقعی آپ کے لئے صدمے کا باعث ہوگی۔!“

”فائزہ اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے پاس ہے! آپ پلیز، میرے پاس آج رات تشریف لے آئیں۔!“

”اوکے! لیکن مجھے فائزہ کی زندگی کی مکمل ضمانت چاہئے۔“ میں نے کہا۔

”بے فکر رہو۔! اسے کچھ نہ ہوگا۔ آج رات میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

رات کی گہرائی کا اندازہ لگانا خاصا مشکل تھا۔ اس دھڑکتے دل کے ساتھ ڈاک بنگلے کی طرف رواں دواں تھا۔ وہ کون تھی؟ کیا جاہتی تھی؟ فائزہ گھر سے غائب تھی۔ خاصی عجیب سی پچویشن تھی۔

وہ ایک ویران جگہ تھی۔ ڈاک بنگلہ شہر کے مضائقہ سے کافی ہٹ کر تھا۔ رات کو اس طرف شاید ہی کوئی آتا ہو۔ اندھیرا اور الو کی آواز۔! میں خاصا چاک و بے ہوش تھا۔ ایک ریو اور بھی میرے ساتھ تھا۔ خطرے کی صورت میں ہتھیار کا ہونا لازمی تھا۔

کچھ سوال میرے ذہن میں ابھرتے تھے۔ کون

فائزہ کا انواء اور پھر ڈاک بنگلے میں ملنے کے لئے اصرار کرنا۔۔۔ ضرور کچھ ایسا تھا جو پراسرار تھا۔

پھر کچھ عجیب سا ہوا۔۔۔ ایک ہیولہ میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اس کی شکل واضح تھی نہ کوئی آواز۔۔۔ بس میرے وجود میں سنسنات سی تھی۔ وہ میرا دم تھا یا بچ میں کوئی ہیولہ۔!۔۔

میں بھوت چڑیل ٹائپ چیزوں پر یقین کرنے والا نہیں تھا۔ لیکن بہت مضبوط ہونے کے باوجود آج خوف میری رگوں میں سرایت کر گیا۔!۔۔

میں اپنی مخصوص رفتار سے ڈاک بنگلے کی جانب رواں دواں تھا۔ لیکن پھر میرے لائٹ بوٹ میرا ساتھ دینے سے انکار کرنے لگے۔ میرے پاؤں میں چوٹیاں سی جلنے لگیں، پاؤں منوں بھاری ہونے لگے۔ جسم پسینہ پسینہ ہو گیا اور سانس دھرا ہونے لگا۔!۔۔ ایک خوفناک ہیولہ میرے جسم کے اوپر گول دائرے میں گھومنے لگا۔ وہ خوفناک جسم کا ہیولہ میرے حواس پر چھانے لگا۔ قریب تھا کہ میں بے ہوش ہو جاتا لیکن پھر میرے دل میں ایمانی طاقت ابھرنے لگی۔ ایک نورانی سوچ ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں اٹھی۔ اسم الہی کا ورد موثر ثابت ہوا۔ ہیولہ جس طرح ظاہر ہوا تھا ویسے ہی غائب ہو گیا۔!۔۔

اچانک سیل فون کی گھنٹی پر انجینی نمبر ڈسپلے تھا۔ اس وقت میں ڈاک بنگلے کے باہر موجود تھا۔ ہو کا عالم اور ہر طرف خاموشی کا راج، تنہا آدمی اور ہیولہ جیسی خطرناک جسم کی مخلوق سے واسطہ پڑنے کے بعد میری حالت کافی پریشان تھی۔ لیکن میری محبت فائزہ ڈاک بنگلے کے اندر موجود تھی۔ اور میرے لئے یہ بات خاصی تشویشناک تھی۔ مجھے جلد از جلد فائزہ کو مس شہلا کے چنگل سے چھڑانا تھا۔ مس شہلا کون تھی؟ کیا جاہتی تھی؟ اس بارے میں میری معلومات صفر رہی تھی۔!۔۔

میں نے فون اٹینڈ کیا۔۔۔

”ہیلو۔“ ایک مہترم سی میٹھی دلکش آواز۔ جس کی لے بہاروں بھی اور سر میں کوئل کی آواز۔!۔۔



میں اس کی آواز میں ڈوب سا گیا۔ ایک حسن تھا اس شیریں آواز میں..... مس شہلا کی آواز میں جادو تھا۔ اس کی آواز میرے اندر کے خوف کو آہستہ آہستہ مندل کرنے لگی۔ کیا بتاؤں اس سریلی آواز کے بارے میں..... وہ تو بس دائرہ تعریف سے باہر تھی.....

”ہیلو..... مس شہلا..... میں ڈاک بنگلے کے باہر موجود ہوں!“ میں نے کہا.....

”اندرا آ جائیے.....!“ میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں.....! وہ انداز دلربائی سے بولی۔

”جی اچھا.....!“ میں نے فون جاری رکھنا چاہا لیکن ڈسکنٹ ہو گیا.....

وہ ایک وسیع و عریض ہال کمر تھا۔ جس میں اندھیروں کا راج تھا۔ صرف ایک زیرو بلب اپنی محدود روشنی کے ساتھ میرے سر کے عین اوپر موجود تھا..... میں نے جونہی ڈاک بنگلے میں داخل ہوا۔ وہی خوفناک ہولہ ایک بار پھر ظاہر ہوا۔ اب کی بار وہ خاصا خوفناک تھا۔ اس کی جارحانہ انداز میں میری طرف پیش قدمی میری بے ہوشی کا سبب بنی۔

جب جملوں سا میرے ذہن میں ابھرا تو میں نے اپنے آپ کو اسی ڈاک بنگلے کے ہال میں موجود پایا۔ اتنا تو مجھے یقین رہا تھا کہ یہ ڈاک بنگلہ ہی ہے کیونکہ زیرو بلب کی روشنی میں، میں نے اندازہ کیا تھا کہ میں ڈاک بنگلے میں ہی موجود تھا.....

وہ لمحہ بہت ہی خوفناک تھا جب ایک چھتا کے دار آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ہال کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ میں وہل گیا تھا۔ چاروں طرف ناقابل فراموش خوف پھیل گیا تھا۔

ہال روم کی تمام لائٹس آف ہو گئی تھیں۔ وہ ایک عام سا کمر..... چند ایک کرسیوں سے مزین..... میں بھی ایک کرسی پر موجود تھا لیکن لمبے جلنے سے قاصر..... حیرت انگیز بات یہ کہ میں بندھا ہوا نہ تھا لیکن کسی غیر مرئی طاقت نے مجھے اپنے شیشے میں جکڑ رکھا تھا۔ میں صرف بات کر سکتا تھا۔ وہ بھی لائن آن ہونے کے بعد..... ورنہ

ایک لمحہ کو تو مجھے اپنی زبان پر بھی دسترس نہ تھی.....! وہ خوب صورت ترین تھی۔ کالی گھٹا جیسی لہجہ زلفوں اور سرخ زدہ آنکھوں کی مالکہ وہ عورت دلکش اور حسین تر تھی۔

بلیک سوٹ میں ملبوس وہ دلکش نقوش والی حیرت قیامت تھی۔ میں اپنے حواس کو بیچا تھا۔ دنیا میں ایسی حسن شادیدی میں نے بھی دیکھا ہو.....

”کیسے ہو فرمان.....؟“ وہ بے تکلف سی ہو کر بولی۔

میں اس کی آواز کے سحر میں ایک بار پھر ڈوب سا گیا..... کوئل کی سندر سی آواز..... کیا جادو تھا۔ میری رگوں کے خون میں دوڑتی آواز.....!

”ٹھیک.....! تم شہلا ہو.....؟“ میں بولنے لگی

سکت نہ ہونے کے باوجود بھی بولتا گیا۔

”ٹھیک پہچانا.....!“

”تم فائزہ کو چھوڑ دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا.....!“

”جان.....! اتنا غصہ کیوں کرتے ہو۔ فائزہ کو چھوڑ دوں گی لیکن پہلے ایک معاہدہ کرنا ہوگا۔“

”کیسا معاہدہ؟“

”اگر تم مجھ سے شادی کی حامی بھرو.....!“

”Never..... یہ ناممکن ہے۔ تم خوب صورت ہو۔ دلکش ہو..... خوب صورت آواز کی حامل ہو۔ لیکن میری پہلی اور آخری محبت فائزہ ہی ہے۔“

”خاک محبت کرتے ہو فائزہ سے؟ ایک غریب لڑکی کی عزت تار تار کرنے کو محبت کا نام نہیں بلکہ ہول کہتے ہیں۔ تم نے اس کے ساتھ کس طرح کے سلوک کئے۔ اسے تم محبت نہیں نفرت کا نام دے سکتے ہو.....!“

”اس میں اس کی مرضی شامل تھی..... اور پھر ہمارا پرسنل معاملہ ہے۔ تمہیں ان معاملات میں ہونے کی ضرورت نہیں اور برائے کرم فائزہ کو اپنے چنگل سے آزادی دے دو.....!“ میں برس پڑا۔

”اوکے..... لیکن تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔ ہر حال میں بس.....!“

”لیکن..... تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ اور خاص طور پر مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو؟“ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”سنو پیر.....! میں شہنشاہ جنات کی اکلوتی بیٹی شہلا ہوں۔ جنات میں متفرق خوبی کی طرح میں بھی روپ بدل کر اپنی زندگی گزار سکتی ہوں۔ ہر قسم کا روپ بدلنا میری خاصیت ہے.....

دوسری بات یہ کہ تم مسلمان ہو..... اور مسلمان کو تنگ کرنا ہمارا ولیہ نہیں۔ لیکن اگر تم میں سے کوئی شخص ہمیں تنگ کرے تب ہم اسے نہیں چھوڑتے.....!

تمہارا فائزہ کے ساتھ کارشتہ ہے.....؟ یہ میں سب جانتی ہوں۔ وہ دوپہر خاصی کڑی اور دردناک تھی جب تم نے فائزہ کی عزت تار تار کی تھی۔ وہ سب میرے سامنے ہوا تھا۔ کیونکہ اس جگہ پر ہمارا خاص بسیرا تھا.....

ہم سب جنات عورتیں ایک دوسرے سے منہ چھپا رہی تھیں..... وہ ایک شرمناک عمل تھا۔ میں چاہتی تو فائزہ کو تمہارے چنگل سے آزاد کر دیتی لیکن میں شہنشاہ جنات کے حکم کے آگے بے بس تھی.....!

آگے سنو..... تم اس وقت تک میرے منتر سے آزاد تھے جب تک تم بے قصور اور معصوم تھے۔ لیکن فائزہ سے اس قسم کے تعلقات کے بعد مجھے درمیان میں آنا پڑا.....!

جنگ بتاؤں..... تو میں دلی طور پر تم سے محبت کرتی ہوں۔ فائزہ میری رقیب تھی..... اسے راستے سے ہٹانا میرا مقصد تھا اور تمہیں اپنا بنانا میری زندگی کا مقصد.....!

شہنشاہ جنات کی بیٹی ہونے کے ناطے مجھے اختیارات حاصل تھے کہ میں ایک انسان سے محبت کر سکتی ہوں۔

تم میری محبت ہو..... اگر تم مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو گئے تو فائزہ تمہارے حوالے ورنہ وہ موت تک بے ہوش رہے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے

ہوش میں نہیں لاسکتی اور میں ہر جگہ موت بن کر تمہارے سر پر منڈلاتی رہوں گی۔ تمہارے ہر کام میں رکاوٹیں پڑیں گی.....!“

وہ بولتی رہی اور میں لرزنا رہا۔ دل چاہتا تھا اس جہنمی کو جان سے مار دوں.....! لیکن میں بے بس تھا..... مجبور تھا۔

میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ کیونکہ اگر میں اس سے شادی نہ کرتا تو فائزہ ساری زندگی بے ہوش ہی رہتی.....!

انکسٹر صاحب.....! وہ بہت ظالم نکلی..... اس نے میرے تمام پروجیکٹ ناکام کر ڈالے۔ اس وقت کی تمام ہائی کوالیفائیڈ بزنس مارکیٹس میں میرا نام تھا۔

فرحان شاہ سافٹ ویئر کی تمام نیوروشن اپنے عروج پر تھی۔ بہت سے جدید سافٹ ویئر دنیا میں میرے ذریعے لاؤنچ ہوئے۔ مگر پھر شہلا درمیان میں آ چکی..... وہ میری کامیابی میں رکاوٹ بنی گئی.....!

پہلا اینڈرگریڈنگ کی سافٹ ویئر تیاری کے دوران شہلا آ پہنچی..... فائزہ میرے دماغ سے نکل گئی تھی نہ جانے ایسا کیا جادو ہوا تھا کہ میں فائزہ کو بھول کر اپنی جدید پروڈکشن کی طرف لوٹ آیا تھا۔ ڈاک بنگلے میں ملاقات کے بعد شہلا پہلی بار میرے روم میں آ دھکی تھی۔

کمپیوٹر لینگویج میں ماسٹرز اور جدید ترین آٹو فیشن کے باوجود میرا سسٹم جام ہو گیا..... میں ٹائپ کرتا لیکن ٹائپنگ کے دوران شہلا کی تصویر ڈپسے ہوتی..... میں چند منٹ تک ایسا کرتا رہا۔ لیکن شہلا نے میرا چھانہ چھوڑا.....!

وہ LCD سے بول پڑتی.....!

”فرحان شاہ..... مان جاؤ..... میں تمہیں دنیا کی ہر سہولت فراہم کروں گی۔ میری محبت کے آگے سر جھکا دو.....! اگر تم میری محبت نہ ہوتے تو زمین کے کپڑے مکڑیوں کی خوراک بن چکے ہوتے.....!“

اپنیلک سے اس کی آواز خوفناک لیکن کوئی سی آتی.....!



”تم مجھے غلط قدم اٹھانے پر مجبور نہ کرو۔ تم جنت سے ہو اور میں انسان۔ انسان اور جنت کا ہسٹری میں کہیں بھی ملاپ نہیں ہوا۔ اور نہ ایسا ہوگا۔“

”لیکن میں روپ بدل سکتی ہوں۔ میں ایک مکمل انسان بن کر تمہارے ساتھ زندگی بتاؤں گی۔“

”ایسا نامکن ہے۔ تم چاہے جو کچھ بھی کرو۔“ میں نے وہ ٹوک الفاظ میں کہا۔

پھر وہ غائب ہو گئی۔ لیکن پھر میرے تیار کردہ ہر سافٹ ویئر کی تیاری کے دوران فائزہ کی صورت ابھرنے لگی۔ وہ واقعی فائزہ ہی تھی۔ جس کی تصویر سافٹ ویئر میں نظر آئی۔

فائزہ کی تصویر نے میرا بزنس چوٹ کر دیا۔ میں جس کمپنی کا سافٹ ویئر تیار کرنے لگتا۔ فائزہ کی تصویر ہر ملک میں شامل ہو جاتی۔ اور میں سر پکڑ کر رہ جاتا۔

ان دنوں والد صاحب کو فوج ہوا اور کمپنی کی ہر ذمہ داری میرے اوپر آن پڑی۔ یہ ہماری کمپنی کا زوال کا وقت تھا۔ شہلا نے ہمارے مزدوروں کو ہراساں کرنا شروع کر دیا۔ بوائے میں آگ لگنے کی خبر بھی شائع ہوئی۔

ہمارے مزدور دن کی روشنی میں پریشان کئے جاتے۔ ایک مستقل ہیولہ فیکٹری میں دیکھا گیا۔ انہی دنوں ہمارے منیجر کی Death ہوئی۔ ان کی لاش کی بدبو پوری فیکٹری میں پھیل گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے بہت سی اموات ہوئیں لیکن اباجی کو اس کا قطعی علم نہ ہوا۔ میں نے لو اتھین کو خاموش کر دیا تھا۔

لیکن ہیولہ مستقل پریشان کرتا رہا۔ لوگ مرتے رہے۔ اس زمانے میں اس تھانے کے انچارج حیرت خان تھے۔ انہوں نے معاملات سدھارنے کی حتی الوسع کوشش کی لیکن کچھ بھی بہتر نہ ہوا۔

حالات سنگین ہوتے گئے۔ میرا بزنس برباد ہو گیا۔ ہر طرف سے لوگ طعنے کئے گئے۔ امریکن یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ سافٹ ویئر انجینئر اگر اپنے پیشے

میں ناکام ہو جائے تو معاشرہ جیسے ہی کہاں دھک ہے؟۔

اور اب اپنے بزنس کے ساتھ ساتھ اباجی کا بزنس ڈوبنے دیکھا تو دل خون کے آنسو روایا۔ میں ہر روز اپنے کسی کو لیک کی موت کا سنا تو دل پھٹ سا جاتا۔

اور پھر ایک دن کنیز آرڈی نینس کی شق نمبر 15 کے تحت ایکوفینا کمپنی انجام کو پہنچ گئی۔

والد صاحب کی وفات نے مجھے پاگل کر دیا۔ میرا ان کے سوا کوئی نہ تھا۔ فائزہ بھی بدستور لاپتہ تھی۔ میری زندگی میں شہلا کی آمد منحوس تھی۔ شہلا اگر میری زندگی میں نہ آتی تو یہ بربادی کا تماشا نہ دیکھا جاتا۔

پھر میں جاب کی غرض سے نکلا تو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

سافٹ ویئر اور فینچنگ پروجیکٹ میں ماسٹرز ڈگری کے باوجود میں سڑکوں پر بھیک مانگتا رہا۔

مجھے اللہ یاد آیا۔ میں اس دن بہت غمگین تھا جب میری ملاقات سید چراغ علی شاہ صاحب سے ہوئی۔

”بیٹا! دنیا میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ اگر اندھیرا نہ ہو تو روشنی کیسے ہوگی؟ گناہ کی لذت نہ ہو تو لوگ اچھے اور برے میں فرق کس طرح کریں گے؟ اچھائی اور برائی تو فرق کے لئے لازمی ہیں۔ تمہارے حالات بہت دردناک ہیں۔ لیکن اگر ہمت اور امید سے منزل کی جانب قدم بڑھاؤ تو حصول مقصد آسان رہتا ہے۔“

ان کی شفقت بھری باتوں میں روشنی اور امید کی اک دیار روشن تھا۔

”شاہ صاحب! میں نے آج تک بہت گناہ کئے۔ جن پر بہت شرمندہ ہوں۔ توبہ کا دروازہ موت سے پہلے تک کھلا رہتا ہے۔ میں آج سے خدا کے حضور گڑگڑ کر معافی مانگتا ہوں۔“ میں واقعی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے رورہا تھا۔

میں بہت دیر تک روتا رہا۔ جب میں رورو

کے تھک چکا تو انہوں نے میرے لئے کھانا منگوایا۔! اچھی طرح غسل کے بعد نماز ادا کی تو دل ایک روحانی خوشی سے جھوم اٹھا۔

پھر فائزہ کا ذکر چھڑا۔! ”فائزہ اسی دنیا میں موجود ہے لیکن شہلا کی ضد کی وجہ سے بے ہوش پڑی ہے۔ ڈاک بنگلہ میں فائزہ کا کوئی وجود نہ تھا۔“

میں اسے ہر جگہ تلاش کرتا رہا لیکن اس کا کہیں وجود نہ ملا۔

فائزہ کہاں تھی؟ اس کا جواب فرحان شاہ نے کچھ یوں دیا۔ ”فائزہ! بابا چراغ علی شاہ کے مطابق فائزہ زندہ تھی اور اس کا بے ہوش وجود ایک کنویں میں موجود ہے۔ وہ پچھلے پانچ سال سے بغیر کچھ کھائے پئے زندہ سلامت تھی۔ لیکن شہلا کی حفاظتی تدابیر انسانی حیات کو تکلیف کے لئے کافی تھی۔“

شاہ صاحب کے مطابق اگر فرحان اپنی دونوں آنکھیں اس کنویں میں موجود سانپ کے حوالے کر دے تو فائزہ خود بخود ہوش میں آجائے گی۔

”لیکن! میرا ایمان ان وقیفانوسی باتوں پر قطعی نہیں! میرے خیال میں قرآنی آیات اور اسم الہی ہی جنت کو قابو میں لانے کا واحد ذریعہ ہے۔“ میں بولا۔

”فرحان! یہ کیسے میری سمجھ سے کافی دور ہے۔ تم جس قسم کے حالات و واقعات بتا رہے ہو وہ کوئی بھی ذہنی شعور شخص قبول نہ کرے گا۔ ایکوفینا کمپنی کا وجود نہ تھا اور نہ ہے۔ پانچ سال پرانے لوگ دوبارہ کیسے زندہ ہو گئے؟“

”میں اس بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ جہاں تک تعلق ہے ہماری کمپنی کا تو وہ آج سے پانچ سال پہلے ڈوب گئی تھی۔ تمام شیئرز ہولڈرز کی پے منٹ مکمل ہو گئی تھی۔ بینک کا قرض سود سمیت لوٹا دیا گیا تھا۔ آپ بے شک ریکارڈ چیک کر لیں۔“

وہ یقین سے بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں

اعتماد اور سچ تھا۔ اس کی باتوں میں جھول ضرور تھا لیکن حالات و واقعات کے تناظر میں صرف ایسا ہی ممکن تھا۔ ”کیا آپ کا شہلا سے کوئی رابطہ ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ جب سے میں چراغ علی شاہ کے زیر سایہ آیا ہوں تب سے شہلا غائب ہے۔“ ”اور جس کنویں میں فائزہ بے ہوش ہے وہ کنواں کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے بارے میں صرف شاہ صاحب ہی جانتے ہیں۔ میری استدعا ہے کہ آپ میرا ساتھ دیں تاکہ بہت جلد اس کیس کو انجام تک پہنچایا جائے۔“ وہ بولا۔

دوسرے دن ہم شاہ صاحب کے آستانے پہنچ گئے۔ مریدین کا وسیع حلقہ اس برگد کے وسیع و عریض درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں موجود تھا۔ لوگ عقیدت مندوں کی طرح آتے۔ روحانی و جسمانی مسائل بتاتے۔ کلام الہی کے چند وظائف عطا کرنے کے بعد شاہ صاحب نے ہماری طرف گویا نظر کی۔

”کامران صاحب! اللہ آپ کو ترقی عطا کرے۔ اس ملک کو آپ جیسے نوجوان لوگوں کی ضرورت ہے۔ آپ کی پراگرس جاندار ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔

ان کو کسی جگہ میں نے دیکھا تھا۔ ذہن پر زور دینے کے بعد یاد آیا۔ ان کو ایکوفینا کمپنی کی پمپٹ میں دیکھا تھا۔ جب انہوں نے مجھے ملنے کی ہدایت اور ایک عمدہ نصیحت بھی کی تھی۔

”جی شاہ صاحب! جب تک آپ جیسے اللہ اولوں کی دعائیں ساتھ ہیں۔ اس وقت تک ہماری ذمہ داریاں بھی عروج پر ہیں گی۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔

”بیٹا! روحانی معاملات کا توڑ صرف کلام الہی میں موجود ہے۔ فرحان شاہ کا کیس خاصا پیچیدہ ہے۔ لیکن حل طلب بھی!۔“





## خونی عمل

ایس حبیب خان - کراچی

اچانک چلتی مشین سے کیمیکل باہر کو اچھلا اور قریب کھڑے نوجوان کو بری طرح جھلسادیا، سارے لوگ حیران تھے کہ یہ ہوا تو آخر ہوا کیسے، کسی کی عقل کام نہیں کر رہی تھی مگر جب ایک اللہ والے نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ جادو سرچڑھ کر بولتا ہے۔ اس حقیقت سے پردہ اٹھائی ایک انہونی کہانی

”وہ بس ذرا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

گہت نے بات بتائی۔

زمین نے ہنڈیا کو کپڑے سے پکڑ کر سائڈ میں

رکھ دیا۔ ”بھابی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو آپ

آرام کر لیں میں دیکھ لیتی ہوں کچن کا کام۔“

”نہیں میں کر لوں گی۔“ گہت نے کہا تو زمین

کچن سے چلی گئی۔ گہت دوبارہ نیا سان چڑھانے لگی۔

**ہنڈیا** کو بھول کر گہت کی سوچ میں گم تھی اور

مراٹھی سے سوال نکل کر کچن میں بھر رہا تھا۔ ”بھابی!

لو کونسی اثر نہ ہوا۔ زمین نے کھانے ہوئے چولہا بند کیا اور

گہت کو بلا کر کہا۔ ”بھابی سالن جل گیا! آپ کہاں گم

ہیں؟“ گہت نے چونک کر ہنڈیا کو دیکھا جو کالی ہو چکی تھی

سائینس کے کیمسٹری کے پورے کچن میں بھری تھی۔

میں اس میں شریک رہا۔ شہر کے مہنگے ترین ہوٹل کے بجائے یہ عام سی تقریب تھی۔ دو گواہ اور دو لہاؤں.....! گواہان میں میرا نام بھی شامل تھا.....!

لیکن پھر کچھ عرصہ بعد..... میرے ایک عزیز کا جنازہ اٹھا۔ میت کو آخری آرام گاہ کے لئے قبرستان لے جایا گیا۔ واپسی پر میری نظر ایک قبر کے کتبے پر پڑی..... فرحان علی شاہ ولد رحم علی شاہ..... سن وفات اکتوبر 1997ء.....!

میں غور سے اس کتبے کو دیکھتا رہا۔ حیرت کے اٹھاہ سمندر میں ڈوبتا میرا دماغ..... جسم میں روگئے کھڑے ہو گئے.....

ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند آ گیا۔ ”ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی دوسرا شخص ہو۔ فرحان علی شاہ دنیا میں بہت سے ہو سکتے ہیں.....“

وہ دل شکستہ آواز تھی۔ کرب میں ڈوبی ایک دلخراش آواز..... محبت اور رنج و الم میں ڈوبی فائزہ کی آواز زندگی ہوئی تھی.....

”اسپیکٹر صاحب! ہم سب کا تعلق عالم جنات سے تھا.....! آپ کے ساتھ کچھ کردار انسانی اور کچھ جناتی رہے۔ فرحان علی شاہ کی موت 1997ء میں ہوئی تھی..... میں بد نصیب اس کی محبوبہ..... آج بھی اس کے انتظار میں سرگرداں ہوں.....!

کیس اختتام کو پہنچا..... اپنی نوعیت کا انوکھا کیس مگر میرے اندر ایک زبردست قسم کا خوف چھوڑ گیا.....!

میں جنات کے ساتھ رہا اور محسوس تک نہ ہوا.....! قدر دان کہتے ہیں کہ یہ نوکری چھوڑ کر کوئی اچھا سا کاروبار کر لوں..... لیکن یقینن جاچے

آگے آنے والے کمبوس..... مزید حیران کن اور دلچسپ رہے کہ عقل حیران اور زندگی میں ان چیزوں کی عادت سی ہو گئی۔

لیکن ٹھہریے.....!

ایک سیکنڈ.....! پھر ان دونوں نے شادی کی اور

فائزہ اس وقت بھی زندہ سلامت ہے۔ اس کی بے ہوشی کا عرصہ پانچ سال پر محیط ہے۔ لیکن ایک کڑی شرط بھی ہے۔ ورنہ فرحان علی فائزہ کو حاصل نہ کر سکے گا۔ وہ بڑی محبت اور مشقت بھرے انداز میں بولے۔

”لیکن شاہ صاحب! آنکھوں کو خفاقی حصار کی جانب کسی زہریلے سانپ کو دینا۔ ایک ظلم ہے۔“ میں بولا.....!

”لیکن اس کے بنا کوئی دوسرا حل نہیں۔“ وہ بولے.....

”کیا فرحان راضی ہے؟“ میں نے پوچھا.....

”میں راضی ہوں..... اگر میری وجہ سے کسی کو زندگی نصیب ہوتی ہے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی.....“

”لیکن.....“ میں نے بولنا چاہا.....

☆.....☆.....☆

یہ اس انوکھی کہانی کا ٹرنک پوائنٹ تھا۔ فائزہ واقعی کنویں میں بے ہوش پڑی ملی تھی۔ شاہ صاحب نے چند مخصوص عمل کے ذریعے شہلا کو قید کر دیا تھا۔ شہلا کی قید کے بعد باقی مسائل خود بخود حل ہو گئے تھے۔

اتفاق سے فرحان کی آنکھیں بھی ضائع ہونے سے بچ گئیں۔ وہ شاہ صاحب کی کڑی محنت تھی کہ شہلا جیسی بد ذات بول میں قید ہو گئی.....!

فائزہ کو بہت زیادہ محنت کے بعد باہر نکالا گیا تھا۔ وہ زندہ تھی۔ لیکن سوکھ کر کاٹا۔ فائزہ کی خوب صورتی ماند پڑ گئی تھی.....

چند قرآنی آیات کے ورد اور پانی کے چھینٹوں سے فائزہ آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگی۔ نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے وہ بول نہ سکی..... البتہ پانچ سال بعد بھی وہ فرحان کو پہچان گئی تھی دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اسی دوران شاہ صاحب کہیں غائب ہو گئے تھے..... کہانی انجام کو پہنچ چکی تھی..... دو محبت کرنے والے ایک دوسرے کو مل گئے تھے.....!

لیکن ٹھہریے.....!

ایک سیکنڈ.....! پھر ان دونوں نے شادی کی اور



گھٹ کی شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے اس کا اس دنیا میں ماں کے علاوہ کوئی نہ تھا وہ اپنی ماں کی اکلوتی اولاد تھی۔ سسرال میں سسر کا انتقال ہو چکا تھا۔ ساس اور شوہر کے علاوہ دیور، دیورانی اور سب سے چھوٹی نند زمین تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ میں رہتی تھی اور سال میں دو مہینے کیلئے اپنے میکے آتی تھی۔

گھٹ اور امی کی ماں جیلہ انتہائی گندی فطرت کی عورتیں تھیں۔ جھوٹ کی تو دونوں ماں بیٹی جیتی جاگتی تصویر تھیں۔ حسد، کینا، بغض، لالچ غرض ایسی کوئی برائی تھی جو ماں بیٹی میں نہ تھی۔

جیلہ کے شوہر کا اس کے باپ کی زمین میں جو حصہ بنا تھا وہ جیلہ کے سسرال والے ہر ماہ ایماندار سے بھیج دیتے تھے باقی جیلہ محلے کے کپڑے سی کر گزارہ کر لیتی۔ محلے کی ایک عورت نے ایک بہت امیر خاتون کے کپڑے جیلہ کو سینے کیلئے لا کر دیئے تو جیلہ نے اس سے ان کے بارے میں کر دینا شروع کر دیا اور پھر مظلومیت اور بے چارگی کا اعلیٰ نقشہ کھینچ کر اس خاتون کو اپنے جال میں پھاس لیا۔ دراصل گھٹ اور اس کی ماں کی آنکھیں ان لوگوں کی حیثیت دیکھ کر پھٹ گئی تھیں۔ اس خاتون نے جیلہ کو بے سہارا غریب پوہ دیکھ کر بغیر چھان بین کئے گھٹ کی شادی اپنے بڑے بیٹے سے ملے کر دی۔

وہ لوگ امیر ہونے کے ساتھ ساتھ شریف اور نیک بھی تھے۔ اتنا سب اچھا ہونے کے باوجود بھی دونوں ماں بیٹی کو شرافت، سکون و چین کی زندگی راس نہ آئی۔ وہ کہتے ہیں ناں انسان اپنی اصل سے کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہے گھٹ اور اس کی ماں کو ان کے ساتھ کی گئی نیکی ہضم نہ ہوئی۔

سب سے پہلے سسرال پہنچتے ہی گھٹ نے آہستہ آہستہ اپنے شوہر کے پیسے اپنی ماں کو پہنچانے شروع کر دیئے۔ سسرال کی معمولی بات وہ اپنی ماں کے کان میں ڈالتی۔ اپنے سسرال کی کمزوریاں، ساس کی برائیاں اور شوہر کی باتیں ماں کو پہنچاتا گھٹ کا اولین

فرض تھا جو وہ بخوبی ادا کر رہی تھی۔ اس نے شرافت کے لبادے میں رہتے ہوئے اپنی دیورانی کو ہر جگہ ذلیل کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی دیورانی صبا کے سلیقے سے کئے ہوئے کام کو خاموشی سے بگاڑ دیتی اور باقی صبا کو سنسنی پڑتیں اور خود صبا کے پاس جا کر اس کی دلجوئی کرنے کے بہانے اسے ساس کے خلاف بھڑکاتی۔ منافقت سے گھر کے اندر گھناؤنا کھیل کھیل رہی تھی۔ جھوٹ کی تو وہ دیوی تھی، شوہر کے کہنے کے باوجود کام کو وہ اپنی ماں سے باتوں کے چکر میں لا پڑا کرتی۔ اڑا دیتی اور کامیابی سے جھوٹ بول کر بات بنادیتی۔ جھوٹ وہ اتنی کامیابی سے بولتی کہ شوہر بے چارہ اس کا یقین کر لیتا کیونکہ وہ بالکل صاف ستھرا، شریف اور بولنے والا تھا۔ اس کے وہم و گمان تک میں نہیں تھا کہ گھٹ کس قدر جھوٹی اور مکار عورت ہے۔

گھٹ کی ماں اسے مسلسل پٹیاں بڑھاتی کہ سب کا پتہ صاف کر کے ہر چیز پر اپنا قبضہ جماؤ مگر اس سے بھی پہلے تجھے اپنے قدم مضبوط کرنے ہونگے اور وہ ہونے ”اولاد“ سے اور یہی دونوں کی سب سے بڑی پریشانی تھی کیونکہ پانچ سال گزر جانے کے باوجود بھی گھٹ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ گھٹ اور اس کی ماں کو یہ دھڑک بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں اولاد کے لئے اس کا شوہر دوسری شادی نہ کر لے۔ گھٹ اپنی غلیظ حرکتوں میں لگی رہی اور دوسری طرف اللہ نے اس کی دیورانی صبا کو ایک بیٹے سے نوازا دیا۔

اب تو صبا کاٹنے کی طرح گھٹ کی آنکھوں میں کلکے لگی۔ گھٹ اور اس کی ماں نے سوچا چھوٹے موٹے ہتھکنڈوں سے کچھ نہ ہوگا کوئی بڑا دھماکا کرنا پڑے گا اور پھر دونوں بے شرم عورتوں نے انتہائی غلیظ حرکت کا فیصلہ کیا۔ ایک شام جب گھٹ کا شوہر خالد گھر واپس آیا تو گھٹ گھر پر نہ تھی۔ اس نے گھر میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنی ماں کے گھر گئی ہے۔ خالد نے خاص توجہ نہ دی کیونکہ ہفتے کے سات دنوں میں سے پانچ دن تو گھٹ اپنی ماں سے ملنے جاتی اور باقی کسرفوں پر نکال لیتی۔ پھر تھوڑی دیر بعد خالد کے پاس گھٹ کا فون آیا وہ اسے

آجائے۔ خالد اسے لینے چلا گیا۔ جب وہ اندر گیا تو اس نے دیکھا گھٹ صحن میں تخت پر بیٹھی رو رہی تھی۔ ”کیا ہوا گھٹ؟“ خالد نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ”نہیں وہ بس ایسے ہی“ گھٹ نے مکاری سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا ایسے ہی؟ تم رویوں رہی ہو، کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟“ خالد نے تنجیدگی سے کہا۔

”میں بتاتی ہوں“ جیلہ نے کہا اور بولی: ”دیکھو بھائی! ہم غریب ہیں مگر عزت دار ہیں، میری بیٹی کی عزت اس گھر میں محفوظ نہیں۔ تمہارے بھائی حامد نے میری بیٹی کو“۔

”بس چپ ہو جائیے!“ خالد یکدم غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ماں رہنے دیں یہ میرا یقین نہیں کریں گے۔“

خالد وہاں سے آندھی کی طرح باہر نکل گیا اور گھٹ کو لئے بغیر گھر چلا گیا۔ اگلے روز گھٹ کی ماں اسے لے کر خود اس کے سسرال پہنچ گئی اور اس نے کہرام برپا کر دیا۔ سب نے دونوں ماں بیٹی کی بات سن کر اندازتوں تلے انگیٹیاں داب لیں۔

حامد انتہائی شریف اور مذہبی انسان تھا اس کی بیوی صبا بھی بہت اچھی عورت تھی اور وہ اپنے شوہر کو بخوبی جانتی تھی۔ وہ غصہ سے کہہ رہی تھی۔ ”بھائی! اللہ کا خوف کرو! اتنا جھوٹا اور انتہائی غلیظ الزام تم میرے بے گناہ شوہر پر لگا رہی ہو۔ تمہیں مگر اللہ کو کیا منہ نہیں دکھانا؟“

گھٹ جواب دینے کے بجائے مظلومیت کی تصویر بنی اٹھا۔ اس نے گئی آنسو بہائے جاری تھی۔ خالد کی ماں نے گھٹ کی ساس نے صبا کو خاموش ہونے کیلئے کہا اور حامد کو مخاطب کیا جو کہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھا تھا۔

فرق نہیں۔ چاہے کسی کو یقین آئے یا نہیں۔ میں اپنے اللہ کو اپنے ہر عمل کا جواب دہ ہوں میرا دل اور ضمیر دونوں مطمئن ہیں۔

”باقی میں اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑتا ہوں۔“ حامد کے لہجے کی مضبوطی اس کے کردار کے بارے میں گواہی دے رہی تھی جس کو گھٹ اور اس کی ماں سمیت سب نے محسوس کر لیا تھا۔

”ٹھیک ہے، مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے حامد! مگر میں نہیں چاہتی کہ آگے جا کر کوئی مسئلہ بنے اس لئے اب تم اور صبا پیچھے نہیں رہو گے۔ جتنی جلدی ہو، تم دونوں اوپر کی منزل پر شغف سے جاؤ اور ہاں صبا تم اپنا کچن بھی الگ کرلو۔“ حامد کی ماں نے فیصلہ کر دیا اور سب وہاں سے چلے گئے۔

خالد خاموشی سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ گھٹ نے اپنی ماں کو رخصت کیا اور کمرے میں آ گئی۔ گھٹ کے کمرے میں آتے ہی خالد نے جان بوجھ کر آنکھیں موند لیں۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ خالد کو اپنے بھائی کے کردار پر ایک فیصد بھی شک نہ تھا کہ کیا گھٹ جھوٹ بول رہی ہے؟ یہ سب سوچ سوچ کر خالد کا دماغ چٹا جا رہا تھا۔ اگلے روز گھٹ نے اپنی ماں کو فون کیا اور دونوں ماں بیٹی نے خوب اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ ”کم بخت بڑھیا بھی بہت چالاک ہے۔ بجائے حامد کو گھر سے نکالنے کے اسے اوپر بھیج کر اور خود مختار کر دیا۔“ جیلہ بولی۔

”اور صبا آرام سے اپنی مرضی سے رہے گی اور یہ منحوس بڑھیا ہر وقت میرے سر پر سوار رہے گی۔“ ”چل کوئی بات نہیں، گھر میں دراڑ تو ڈال دی ناں ہم نے۔“ جیلہ بولی۔ ”اچھا چھوڑ کل تجھے میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے اور ہاں جوئی رقم ضرور ساتھ رکھ لیتا۔“ جیلہ نے گھٹ کو پٹی دی۔

پروگرام کے مطابق گھٹ اپنی ماں کے گھر اگلے روز پہنچ گئی۔ جیلہ اور گھٹ رکشے میں بیٹھ کر ایک سستان علاقے میں پہنچ گئیں۔ پھر ایک طرف رکشہ رکوا کر جیلہ آگے چلنے لگی اور ایک گھر کے سامنے آ کر اس پر دستک دی۔ ”چلی آ!“ اندر سے آواز آئی تو دونوں دروازہ کھول



کر اندر چلی گئیں مگر اندر قدم رکھتے ہی دونوں نے بے اختیار اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لئے۔ ان کی ناکوں سے انتہائی غلیظ بدبو کے پھپھکے جو کرائے تھے۔

”ہوں! اولاد چاہیے؟“ ایک کونے میں سے آواز آئی تو دونوں ماں بیٹی اچھل پڑیں۔ ایک طرف کونے میں ایک سوکھا سیاہ آدمی بیٹھا تھا دونوں زمین پر چبھی چٹائی پر بیٹھ گئیں۔

جیلہ بولی: ”پانچ سال ہو گئے ہیں جی اس کی شادی کو، کہاں نہیں علاج کروایا، مگر اس کی گود ابھی تک خالی ہے۔“

”ہم دیں گے۔“ اس آدمی نے کفر بکتے ہوئے کہا۔

اس کے علاوہ ایک کام یہ بھی ہے کہ ”سرال پتہ صرف اور صرف میری بیٹی کی حکمرانی ہو، اس کے راستے کے کانٹے بھی صاف کروانے ہیں۔“ جیلہ نے مزید کہا تو وہ آدمی اپنے پیلے گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا: ”کام ہو جائے گا مگر اس کام میں رقم.....“ اور جملہ چھوڑتے ہوئے وہ انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے رقم کا مطالبہ کرنے لگا۔

”اس کی آپ فکر مت کریں۔“ گھٹ جو خاموش تھی جلدی سے بولی اور پرس سے رقم نکال کر اس کے آگے رکھ دی۔

”تو پھر سرال والوں کے نام بتا“ اور دونوں اس آدمی کو مطلوبہ معلومات فراہم کر کے واپس آ گئیں۔

اس عامل نے انہیں دوبارہ جمعرات کو آنے کیلئے کہا۔ جیلہ اور گھٹ بجائے اپنے رب کی رضا میں راضی ہوئیں وہ اس راستے پر چلیں جس نے انہیں ایمان سے دور کر دیا۔ جس آدمی کے پاس وہ آئی تھیں وہ کالے جادو، سفلی اور ہر طرح کے گندے عمل کا ماہر تھا اس نے دو کام گھٹ کو بتائے تھے۔ ”ایک تو اسے چار کیلیں دیں تھیں جو گھٹ کو اپنی ساس کے بستر کے کوٹوں میں گاڑنی تھیں اور دوسرا اسے ایک عمل بتایا تھا جو گھٹ کو رات شوہر کے سو جانے کے بعد اس کے سر ہانے بیٹھ کر پڑھنا تھا اور

ساتویں روز سیاہ دھاگے میں سات گرہیں لگا کر عامل کے پاس لانا تھا۔

گھٹ نے دونوں کام نہایت چالاکی سے کر لئے۔ شوہر پر گھٹ کا کیا گیا عمل سر چڑھ کر بولنے لگا۔ خالہ آواز نہیں نکلتی تھی، گھٹ کے سامنے، گھٹ جو کبھی خالہ کا فیصلہ ہوتا۔ اور ساس؟ کیلیں گاڑتے ہی بستر لگ گئیں۔ ان کی گردن سے لے کر ریڑھ کی ہڈی تک آخری سرے تک ہڈی مڑنے لگی۔ ان کی ہڈی اس تک مڑ گئی جیسے کمان ہوتی ہے حالانکہ وہ کوئی اتنی عمر نہ تھیں اور نہ ہی پہلے انہیں کوئی اس طرح کی عمارت رہی۔ ڈاکٹر زویران تھے کہ اچانک انہیں کیا ہو گیا۔

ماں کی بیماری کا سن کر زمین پہلی فلائٹ سے آئی اور ساتھ ایک خوشگوار سربراہ بھی لائی اس کی گود میں ایک ننھی سی جلتی جاگتی گڑیا بھی تھی۔ زمین کی ماں اور باپ کی والوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ وہ سب پریشان کو عارضی طور پر بھول گئے۔

مگر گھٹ کے تو سر سے لے کر پیر تک شعلہ بھڑک اٹھے۔ اس نے زمین کی بیٹی کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور بہانے سے اپنے کمرے میں آکر اپنی ماں کا نمبر ڈاکر کے خوب روئی۔

”اب تو اس چیل زمین کے گھر بھی اولاد ہوئی اور میں ابھی.....“ اس کی ماں نے اسے تسلی دی اور کہا ”صبر کہ میری بیٹی، تجھے یاد نہیں عامل صاحب نے کہا کہ وہ تجھے اولاد دیں گے“ آنے والی جمعرات کو دونوں ماں بیٹی طے شدہ وقت یعنی سورج غروب ہونے کے بعد عامل کے پاس پہنچ گئیں عامل نے گھٹ کو چار تعویذ دیے جو اسے کسی بہت اونچے درخت پر باندھنے تھے۔

ہوا سے ہلنا لازمی تھا۔ دونوں ماں بیٹی نے بہت سے یہ کام ایک آدمی کو پیسے دے کر اس کی مدد سے کیا۔ اس عامل نے گھٹ سے کسی بچے کی اترن منگوئی اور اسے جمعرات کو لانے کو کہا گھٹ وہاں سے آکر اسی سوچ گیا کہ گھٹ کی بچہ کی اترن کہاں سے ملے گی اور اسے یہ بتایا کہ زمین نے اسے

دو پھر نیا سالن چڑھانے لگی۔

رات کو کام ختم کر کے گھٹ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ اسے سامنے زمین کا کمرہ دکھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا، زمین اپنی بیٹی کے کپڑے بدل رہی تھی۔ گھٹ کے چہرے پر ایلیم خاٹ بھری مسکراہٹ آئی اور وہ زمین کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی اور باتوں باتوں میں زمین کی بیٹی کے اتارے ہوئے کپڑے دوپٹے میں چھپا کر اپنے کمرے میں لے آئی اور اگلے صبح وہ پڑے اپنی ماں کے ذریعے عامل تک پہنچا دیئے۔

زمین کی بیٹی مسلسل روئے جا رہی تھی وہ بخار میں تپ رہی تھی اور اس کا رنگ سرخ انگارے کی طرح ہو رہا تھا جی اذیت ناک حد تک روئے جا رہی تھی اور چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ سب پریشان تھے ڈاکٹر کو بلوایا گیا مگر ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائی سے بھی بچی کا بخار نہ اترا تو ڈاکٹر کے کہنے پر بچی کو اسپتال میں ایڈمٹ کر دیا گیا مگر اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔ بیٹی نے کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ وہ وقفے وقفے سے روئی رہی وہ ایک رات اسپتال میں رہی اور ایک ہی دن میں وہ سوکھ کر ہڈیوں کا بچھر بن گئی۔ اسے جمعے کی رات اسپتال لائے گئے اور پچھلے کی شام زمین اسے گود میں اٹھائے بیٹھی تھی کہ بچی نے ایک بھکی بچی کی اور ساکت ہو گئی۔ زمین نے چیخ کر ڈاکٹر کو بلوایا اور ڈاکٹر نے آکر فسوس کے ساتھ کہا۔ ”سوری اشی از نومور“ ڈاکٹر نے آگے کیا کہا زمین یہ سننے کے لئے ہوش میں نہ رہی۔ اس نے اتنا صدمہ لیا کہ اسے ہوش نہ آیا وہ کومہ میں چلی گئی۔

زمین کا شوہر انگلینڈ سے آ گیا۔ زمین کو یہ بھی بتا دیا کہ اس کی لخت جگر مٹی کے بچے کو سونے چلی گئی، اب اس کا شوہر اسے انگلینڈ واپس لے گیا اور اسی لئے ہوش کے عالم میں وہ ایک روز اس دنیا سے بھی رخصت ہو گئی۔ زمین کی ماں اور بھائی اس حقیقت کو قبول نہیں کر پا رہے تھے آخر یہ سب اچانک کیا ہو گیا۔

ابھی تک صرف ایک کاٹنا نکلا ہے میری بیٹی کی

راہ سے باقی تو ایسے کے ایسے موجود ہیں۔“ جیلہ نے عامل سے کہا۔

”بڑی بے صبری عورت ہے تو، لے یہ دو تعویذ ہیں تجھے کسی تازہ قبر میں دبا نہ ہیں اور یہ کام جس کا ہے اسی کے ہاتھ سے ہونا چاہئے یعنی تیری بیٹی کے ہاتھوں اور تو بہت جلد اولاد بھی پالے گی۔“

گھٹ نے خوش ہو کر جلدی سے نوٹوں کی گڈی عامل کے آگے رکھ دی۔ جمعرات کی صبح گھٹ نے خالہ سے کہا کہ وہ اپنی ماں کے گھر جائے گی اور ایک دن رکے گی جمعہ کی شام وہ اسے لینے آ جائے۔ خالہ روبرو کی طرح سر ہلانے لگا رات بارہ بجے دونوں نڈر اور بے خوف عورتیں تیزی سے اندھیرے میں ٹارچ لئے تازہ قبریں تلاش کر رہی تھیں۔ دونوں اپنے مقصد میں اتنی اندھی اور بے حس ہو چکی تھیں کہ انہیں یہ احساس تک نہ تھا کہ وہ آخر کیا کر رہی ہیں؟ ”امی! یہ رہیں۔“

گھٹ نے کچھ دو قبریں ٹوٹی اپنی ماں کو آواز دی۔ جیلہ جلدی جلدی آئی۔ وہاں دو قبریں تھیں۔ جیلہ ٹارچ لے کر ایک اونچی قبر پر بیٹھ گئی، جبکہ گھٹ زمین پر آکر دوپٹے میں ایک نوکیلے پتھر سے قبر کا کونا کھودنے لگی جب سوراخ کافی گہرا ہو گیا تو اس نے تعویذ اس میں دبایا اور مٹی واپس قبر میں بھری دی پھر بیٹی عمل دوسرے تعویذ کیلئے کیا اور پھر کام ختم ہو جانے پر دونوں ماں بیٹی گھر آ گئیں اور نہادھو کر اطمینان سے کھانا کھانے لگیں۔

اگلی دفعہ جب دونوں اس عامل کے پاس گئیں تو وہ بولا: ”یہاں تک تو سب آسان تھا مگر اب اصل مرحلہ شروع ہو رہا ہے جو نہایت مشکل ہے اگر تو نے وہ مرحلہ پار کر لیا تو تجھے اولاد سے دنیا کی کوئی طاقت محروم نہیں کر سکتی۔ غور سے سن۔“ تجھے ہر ماہ اس رات جب چاند پورا ہو چکا ہو ایک نو مولود بچہ جس کی عمر سات روز سے زیادہ نہ ہو اس کے خون سے غسل کرنا ہوگا اور غسل کے ساتھ وہ عمل بھی پڑھنا ہوگا جو ابھی تجھے بتایا جائے گا اور سورج نکلنے سے پہلے ہر حال میں اپنے عمل کو ختم کرنا ہوگا۔ لیکن دھیان رہے ایک بار جو عمل شروع کر لیا تو ہر



حال میں اسے پورا کرنا ہوگا یعنی سات ماہ تک سات بچوں کے خون سے غسل کرنا ہوگا۔ ورنہ اس کا اتنا بھیا تک انجام ہو سکتا ہے جو تو سوچ بھی نہیں سکتی اگر ہمت ہے تو شروع کرنا ورنہ ابھی بھی موقع ہے۔“ عامل نے تفصیل سے بتایا۔

گھٹت بولی۔ ”مجھے ہر حال میں اولاد چاہئے جو اس تمام جائیداد کی وارث ہوگی۔ اس کے لئے میں مشکل سے مشکل عمل بھی کر لوں گی مگر ہم بچے لائیں گے کہاں سے؟“

”اس کا بندوبست ہو جائے گا مگر اس کے الگ سے پیسے ہونگے۔ کبھی جسم پھل سکتا ہے یا پھر کبھی بچے کا خون، دونوں صورتوں میں تیرا کام ہو جائے گا۔“

جس پر دونوں ماں بیٹی جھٹ سے راضی ہو گئیں۔ گھٹت اپنے شوہر کی حق حلال کی کمائی کس بے دردی سے ناپاک کاموں میں اڑا رہی تھی اس کا اندازہ خالد کو بالکل نہ تھا، ہوتا بھی کیسے وہ بے چارہ تو خود اس کے حصار میں تھا۔

قبر میں تعویذ دہانے کے اگلے روز سے ہی گھٹت کی ساس کی حالت بگڑنے لگی۔ انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا گیا جہاں ایک روز انہوں نے دونوں بیٹوں کو بلا کر ان کے باپ کی وصیت انہیں تھما دی۔ ”بیٹا یہ وصیت تمہارے باپ نے اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی اور اس کے مطابق اب صرف تم دونوں ہی تمام جائیداد کے برابر برابر کے مالک ہو، اگر تمہاری بہن نرمین زندہ.....“ اتنا کہہ کر وہ رونے لگیں۔ دونوں بیٹے ماں سے لپٹ گئے اور انہیں تسلی دینے لگے۔

گھٹت کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ ناگن کی طرح پھینکارنے لگی۔

”منحوس بڑھے تو نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ میں بھی ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ تیری بیوی کی غلامی میں کروں اور حصہ دوسروں کو ملے، نہیں ایک ڈھیلا نہیں دوں گی کسی کو، پوری جائیداد پر میرا اور میری ہونے والی اولاد کا حق ہے۔ جس طرح ایک کا پتہ کاٹا ہے ویسا

ہی دوسرے کے ساتھ ہوگا۔“

خالد اور حامد کے حصے میں ایک ایک فیکٹری آئی اور مکان میں دونوں اوپر نیچے رہ رہے تھے۔ گھٹت کی ساس کا اگلے روز ہی انتقال ہو گیا اور اس بے حس عورت نے اس موقع پر بھی صبا اور حامد کو نیچے قدم نہ رکھنے دیا۔ دونوں نے باہر جا کر ماں کو آخری بار دیکھا گھر میں کیا ہو رہا تھا اس سے گھٹت کو کوئی فرق نہیں پڑا وہ اپنی ماں کے گھر جا کر اپنا عمل اپنے وقت پر کر کے آئی۔

دوسرے دن حامد جیسے ہی اپنی فیکٹری پہنچا وہاں اسے لوگوں کا ہجوم دکھا جو اس کی اپنی فیکٹری کے ہی لوگ تھے گاڑی سے اتر کر وہ فیکٹری کے گیٹ پر آیا تو وہاں اسے ”خون میں تھڑی بکرے کی سری رہی ہوئی ملی، جس کا خون آس پاس پھیل چکا تھا۔“ یہ سب کیا ہے؟“ حامد نے سوال کیا۔

”سری ہم خود حیران ہیں، پتہ نہیں یہ کون لایا!“ اور کرز نے کہا۔

”ابنی ویز، جلدی سے صفائی کرواؤ،“ اور حامد ہدایت دیتا ہوا اندر چلا گیا۔ خون اس کے جوتوں میں بھی لگ چکا تھا۔

ادھر گھر میں صبا اپنے دھلے ہوئے کپڑے رکھ رہی تھی کہ اسے اپنی شلوار کے نیچے میں کچھ لال، لال سا لگا، اس نے غور سے دیکھا تو اچھل گئی وہ گاڑھا گاڑھا خون تھا۔ صبا نے شلوار دور پھینک دی، اس نے پھر دوسری شلوار اٹھا لی وہ بھی ایسی تھی۔ صبا پریشان ہو گئی۔ حامد جب گھر آیا تو اس نے صبا کو پریشان دیکھا۔ صبا نے اسے بتایا تو حامد نے اس کو بہلا یا یارے لگ گیا ہوگا کچھ شاید ریر گندی ہو؟“

”ہاں ہو سکتا ہے۔“ صبا نے کہا اور کھانا لگانے لگی۔ اگلے روز صبح آس جا رہا تھا تو صبا نے کہا کہ ”راشد کو میں نے بیڑ پر کھڑا کیا تو وہ زور سے رونے لگا۔“ راشد صبا کا تین سالہ بیٹا تھا۔

”اچھا تم اسے ڈاکٹر عاتشہ کو دکھا دینا، میں انہیں فون کر دوں گا۔“ اور چلا گیا۔

ڈاکٹر نے راشد کو چیک کیا وہ بالکل ٹھیک تھا وہ کھانے میں اب بھی رو رہا تھا۔ راشد کو ڈاکٹر نے دوا لیاں دیں مگر اس کی ٹانگیں سوکھ کر اتنی تپلی ہو گئیں کہ وہ بیٹھ بھی نہ پاتا۔ صبا اور حامد بہت پریشان تھے۔ کون سا ڈاکٹر تھا جسے انہوں نے نہ دکھایا ہو؟ فیکٹری میں حامد گھر کے بارے میں ہی سوچتا رہتا۔

انتساب کرنے پر بھی گھٹت کی بس نہ ہوئی۔

حامد اپنی فیکٹری میں کام کا معاوضہ کر رہا تھا کہ وہ ایک مشین میں ڈالا ہوا ٹیکسٹائل ایک دھماکے سے باہر آ گیا اور آس پاس کی چیزوں میں آگ لگ گئی حامد کا پورا ہاتھ جل گیا۔ ٹیکسٹائل اس پر بھی آیا تھا۔ تمام لوگوں کو فیکٹری سے باہر نکال دیا گیا۔ آگ تھی کہ پھلتی ہوئی پوری فیکٹری میں پھیل گئی۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آگ بجھانے لگیں۔ آگ پر تو قابو پایا گیا مگر حامد کا کروڑوں کا مال جل کر خاک ہو گیا۔ حامد کو تشویشناک حالت میں اسپتال لے جایا گیا، وہاں اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا گیا کیونکہ وہ بالکل ختم ہو گیا تھا ٹیکسٹائل کے گلنے سے۔

حامد گھر آ گیا وہ ابھی بستر پر تھا، بچہ الگ پیار تھا، ایسے میں صبا نے بہت ہمت کا مظاہرہ کیا، حامد بالکل خالی ہاتھ ہو گیا تھا کچھ دنوں بعد حامد نے اپنے بھائی خالد سے کہا کہ ”وہ اسے اس کے حصے کے مکان کے پیسے دے دے وہ مکان خالی کر رہا ہے۔“

خالد نے خاموشی سے پیسے دے کر مکان حامد سے خرید لیا۔ اگر وہ گھٹت کے زیر اثر نہ ہوتا تو انساں کچھ اپنے بھائی کو دے چکا ہوتا۔ صبا اور حامد ایک چھوٹے سے مکان میں آ گئے۔ کچھ دنوں بعد حامد نے نیک میں ڈال دیئے تھے۔

صبا کی ایک دوست نے اسے ایک عالم دین کا پتہ دیا کہ وہ ان سے ضرور ملے۔ صبا اپنے شوہر کے ساتھ اللہ کے اس نیک بندے کے پاس گئی۔ انہوں نے غور سے ان کی بات سنی اور دو روز بعد بلایا۔ انہوں نے پڑھائی کی اور ساری حقیقت معلوم کر لی۔ جب صبا اور حامد دوبارہ ان کے پاس آئے تو انہوں نے بتایا کہ ”کوئی قریبی ہے جس نے تم لوگوں کو بر باد کرنے کیلئے گندہ عمل کروایا

ہے تم کاروبار سے ہاتھ دھو بیٹھو گے، صحت سے جاؤ گے اور آخر میں زندگی.....“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

مگر حضرت میری تو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ جہاں تک بات ہے قریبی کی تو آپ مجھے اس کا نام تو بتائیں، میں اسے نہیں چھوڑوں گا، میرے مقصود بچے کے پاؤں بے کار کر دیئے، مجھے ایک ہاتھ سے معذور کر دیا اور میرے باپ کی اتنی محنت سے بنائی فیکٹری کو جلا کر رکھ دیا۔“ حامد نے غصے سے کہا۔

”دیکھو بیٹا! جو ہو گیا اسے بھول جاؤ اور آگے بڑھو، میں تمہاری پریشانی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں، رہا سوال نام کا تو اللہ تعالیٰ اسے خود سمجھ لے گا۔“ حضرت نے کہا پھر انہوں نے حامد کی فیکٹری جا کر وہاں کاٹ کی اور اس جگہ کو پاک کر دیا اور قرآن خوانی کروائی، حامد کو انہوں نے پڑھا ہوا پانی پینے کیلئے دیا، حامد اور صبا کو کئی دعائیں کیلئے بتائیں اور نماز کی پابندی کی تاکید کی۔ پھر کچھ دنوں بعد حامد نے حضرت کے کہنے پر بینک میں رکھے پیسوں سے دوبارہ اپنا کام شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حامد کا ہاتھ پکڑا اور اس نے دوبارہ اپنی فیکٹری اسٹارٹ کر لی۔ وہ دن رات محنت کر رہا تھا اور اس کے کاروباری لوگوں نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

بات اڑتے اڑتے گھٹت تک بھی پہنچ گئی کہ حامد نے نیا بنگلہ اور گاڑی لی ہے۔ گھٹت میں انکارے دیکھنے لگے وہ حامل کے پاس گئی اور بولی۔ ”میں نے منہ مانگی رقم دی پھر بھی میرے دُشمن عیش کر رہے ہیں کہاں گیا وہ عمل جو آپ نے انہیں تباہ کرنے کیلئے کیا تھا۔“

”عمل بالکل ٹھیک ہوا ہے کسی نے کاٹ کر دی ہے اس عمل کی۔“ حامل نے معلوم کر کے بتایا، ”خیر تو فکر نہ کری یہ مٹی لے اور اس جگہ بکھیر دے جہاں تیرے دُشمن کے قدم بڑتے ہوں، اس بار نہیں بچے گا وہ تباہ ہونے سے۔“ حامل نے گھٹت اور جیل کو مٹی دیتے ہوئے کہا۔

دو تین روز تک گھٹت نے حامد کا روٹین معلوم کیا اور ایک بندے کو پیسے دے کر مٹی بکھیرنے کا کام ملے کر لیا۔ وہ آدمی مٹی لے کر حامد کے آنے کا انتظار کرنے لگا



مگر کہتے ہیں ناں جب اللہ تعالیٰ ڈسٹری رسی کھینچتا ہے تو پھر کوئی مہلت نہیں ملتی۔ ایسا وقت گتھت کا بھی آگیا تھا اس نے اچھی صاف ستھری زندگی کے بجائے نگاہ کے راستے کا خود انتخاب کیا تھا۔ جب وہ آدی مٹی لے کر حامد کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اس روز اتفاق سے خالد کی گاڑی خراب ہو گئی تھی وہ ٹیکسی لینے روڈ پر آیا تو حامد نے اپنی گاڑی اسے دیکھ کر روک لی اور باہر نکل کر بھائی سے گلے ملا اور اسے اپنی گاڑی لے جانے کا کہا۔ خالد نے مسکراتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے مگر تم بھی ساتھ بیٹھو میں تمہیں چھوڑ کر گاڑی لے جاؤں گا۔ بعد میں ڈرائیور دے جائے گا۔“ اور یوں خالد اپنے بھائی کی جگہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ادھر وہ آدی انتظار میں تھا جب حامد کی گاڑی دور سے آتی نظر آئی تو اس نے گاڑی پارک کرنے کی جگہ مٹی بکھیر دی حامد گاڑی پارک کرنا، گیٹ کھولنا اور مٹی پر سے گزرتا مگر اس آدی کو کیا بیڑہ گاڑی خالد ڈرائیور کر رہا تھا خالد نے گاڑی پارک کی اور حامد کے کہنے پر فیکٹری میں نیا کام دیکھنے کیلئے گاڑی سے اترا اور مٹی پر سے گزرتا ہوا چلا گیا اور فیکٹری کا کام دیکھنے کے بعد دوبارہ اسی مٹی پر قدم رکھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور اپنی فیکٹری چلا گیا۔ خالد کو اس نے فوراً ہی ڈرائیور کے ہاتھ واپس بھجوا دی۔ خالد کو اپنے آفس میں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کو اچانک گھبراہٹ ہونے لگی اسے پسینہ آ رہا تھا اور طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا موبائل نکالنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی بے ہوش ہو گیا۔ خالد کا سیکر پیڑی اندر آیا تھا تو اس نے جلدی سے ایبویٹنس منگوائی۔ خالد اسپتال میں تھا اس کا بلڈ پریشر ایک دم انتہائی ہوا تھا کہ اس کے دماغ کی رگ پھٹنے کے قریب تھی وہ بہت تشویشناک حالت میں آئی۔ سی یو میں تھا۔

حامد کو بھی خبر ہوئی تو وہ بھاگا بھاگا چلا آیا۔ گتھت اور جیلہ بھی پہنچ چکی تھیں۔ حامد کو دیکھتے ہی دونوں نے دوسری طرف منہ پھیر لئے۔ صبح سے شام ہو گئی۔ جیلہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے گتھت کو بٹوکا مارا اور اسے یاد دلایا

کہ آج کی رات اسے عمل کرنا ہے۔ گتھت نے جلدی سے سر ہلایا اور اسپتال سے دونوں نکل گئیں وہ سیدھی عامل کے پاس گئیں اس سے بچ لیا اور گھر آ گئیں رات ہوئے ہی مقررہ وقت پر جیلہ نے سفاکی سے ننھے بچے کو زور کرنا اور گتھت نے بچے کا خون بالٹی میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ دونوں کے اس عمل پر آسمان تک لرز اٹھا ہوگا مگر ان دونوں ماں بیٹی کے دل سیاہ ہو چکے تھے۔ جیلہ تو اندر چلی گئی جبکہ گتھت سچ محسن میں پانکی مار کر بیٹھ گئی اور ڈوگل سے خون بھر بھر کر اسے اوپر اندھیلی اور ساتھ اس کے ہونٹ عامل کا بتایا ہوئے گل پڑھتے بل رہے تھے وہ بے خون سے اپنا عمل جاری رکھے ہوئے تھی اور سورج نکلنے سے پہلے اس نے اپنا عمل ختم کر لیا۔

گتھت اپنی جگہ سے اٹھی وہ سر سے پیر تک خون میں تھری ہوئی تھی، کافی خون سوکھ کر جم چکا تھا اس کے اندر سے انتہائی غلیظ بو آرہی تھی اور اس کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ رقصاں تھی۔ گتھت نے سارا صحن دھو یا بچے کی لاش شاپر میں ڈالی اور نہانے چلی گئی۔ نہا کر جب وہ اندر آئی تو اس کی ماں جیلہ خرائے لے کر مڑے سے سو رہی تھی۔ گتھت بھی بستر پر لیٹ کر سو گئی اسے اتنا بھی احساس نہ تھا کہ شوہر زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔

جب دن نکل آیا تو جیلہ ناشتہ کر کے اسپتال جانے لگی۔ اس نے گتھت کو بلایا اور کہا کہ وہ جارہی ہے گتھت اچھا کہہ کر چادر منہ تک تان کر دوبارہ سو گئی۔ خالد کی گاڑی تو خراب تھی کبھی تو وہ حامد کی گاڑی لے کر گیا تھا۔

دوسرے دن جیلہ نے اسپتال جانے کیلئے ٹیکسی روکی اور اس میں سوار ہوئی ٹیکسی ابھی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ پیچھے سے آتے ایک بے قابو ٹرانز نے ٹیکسی کو ہٹ کیا ٹیکسی پلٹتی ہوئی دور جا گری لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔ ڈرائیور موقع پر ہی دم توڑ گیا جبکہ جیلہ کو لوگوں نے اسپتال پہنچا دیا۔ دن چڑھے جب گتھت اسپتال خالد کے پاس جانے کیلئے تیار ہو رہی تھی تو اس کے موبائل کی بیل جی کوئی ان نوٹ نمبر تھا گتھت نے ریو کیا۔ دوسری طرف سے کوئی آدی تھا اس نے بتایا کہ وہ اسپتال سمیل

”جیلہ خاتون سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“  
”جی وہ میری والدہ ہیں۔“

”آپ کی والدہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے ان کے فون سے آپ کا نمبر ملا ہے۔ آپ جلدی آجائیں۔“ اور پھر اس نے اسپتال کا ایڈریس گتھت کو بتایا گتھت جلدی سے نکلی اور اپنی ماں کے پاس جانے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ خالد کے پاس حامد کو نہانا چاہیے خروہ کس مرض کی دوا ہے۔۔۔۔۔

جیلہ بہت بری طرح زخمی تھی اس کی دونوں ٹانگیں چور چور ہو گئی تھیں وہ اپنا بچ ہو چکی تھی۔ دوسری طرف حامد کا زور کر برا حال تھا اس پوری دنیا میں صرف ایک گاہ بھائی ہی تو بچا تھا۔ اس نے خود ہی نکت کو فون کیا تو گتھت بولی۔ ”میرے ی ماں کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے میں اسپتال میں ہوں۔“

”بھابھی آپ فکر نہ کریں ہم بھائی کا خیال رکھیں گے۔“ اور گتھت نے فون کی لائن ڈس کنیکٹ کر دی۔

حامد جب گھر پہنچا تو صبا نے حامد کو مشورہ دیا کہ ہمیں حضرت سے خالد بھائی کیلئے دعا کروانی چاہیے ڈاکٹر تو اپنا کام کرتے رہیں مگر شفاء دینے والی ذات تو اللہ کی ہے۔“  
صبا کی بات نے حامد میں نئی روح پھونک دی وہ دوڑا ہوا حضرت کے پاس گیا۔

حضرت نے کہا ”ہم خود چلیں گے“ اور حامد کے ساتھ اسپتال آ گئے، خالد کو دیکھ کر انہوں نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا پھر آنکھیں کھول کر بولے: ”وار کی اور کیلئے تھا، یہ بے چارہ بیچ میں آ گیا۔ لاڈ پانی دو ہمیں!“

اس نے بے اختیار حضرت کے ہاتھ چوم لئے وہ زور ہاتھا ”میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں!“

”نہیں بیٹا! میرا نہیں صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور ہاں تم لوگوں سے مجھے ضروری بات کرنی ہے کل عشاء کے بعد ملاقات ہوگی۔“

”جیسا آپ کہیں حضرت“ حامد نے ادب سے کہا۔ اگلے روز عشاء کے بعد حامد حضرت کو لے کر آگیا۔ انہوں نے خالد اور حامد سے مخاطب ہو کر کہا ”حامد جب میرے پاس علاج کیلئے آیا تھا تو میں نے اس کو بتایا تھا کہ تمہارا کوئی قریبی ہے جو تمہیں نقصان پہنچا رہا ہے اور اس بار بھی یہ وار حامد کیلئے تھا مگر بیچ میں خالد آ گیا۔“

”مگر حضرت ایسا کون ہے؟“ خالد نے آہستہ سے کہا۔  
”جمل سے سنو! اس سب کے پیچھے خالد کی بیوی ہے۔“ اور پھر انہوں نے ساری بات خالد اور حامد کو بتائی۔ ”بیٹا بات اگر صرف نقصان پہنچانے کی ہوتی تو اس کی سزا مل جائے گی مگر وہ جو شیطان عمل کر رہی ہے اسے روکنا بے حد ضروری ہے کیونکہ اس غلیظ ذریعے سے حاصل کی گئی اولاد مسلمان نہیں شیطان ہوگی۔ ایمان سے تو وہ عورت خارج ہو ہی چکی ہے۔ اب تمہاری نسل کو گندا کرنے پر تلی ہے۔ ابھی جب تک اس کے عمل کا دن نہ آئے اسے خبر نہ ہونے دینا کہ تم سب جان چکے ہو اور اسے اس عمل سے روکنا ہوگا۔“

خالد کا خون کھول رہا تھا۔ ”اس غلیظ عورت نے اس کی پوری زندگی خراب کر دی ماں کو مارا، بہن کی بیٹی کو بھیٹ چڑھایا، بہن صدے سے مر گئی، بھائی ہاتھ سے محروم ہو گیا اور اب میری نسل کو گندا کر رہی ہے۔“ حامد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

آج پورے چاند کی رات تھی گتھت اپنی ماں کے گھر آ گئی تھی، وہ عامل سے تنہا سا چلائی تھی جو اس نے اپنی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ آج وہ اکیلی ہی تھی کیوں کہ ماں تو اپنا بچ ہو کر بستر پر پڑی تھی۔ بارہ بج رہے تھے۔ گتھت نے گھر پہنچ کر بچے کو تخت پر لٹایا اور جلدی سے چھری اور بالٹی لے آئی





## خونی اسپتال

ثاقب بشیر-لاہور

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا، کلائونٹر پر بیٹھی خوبرو حسینہ اونگھ رہی تھی کہ اچانک ایک کھٹکا ہوا تو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پھر اس کا سانس سینے میں اٹک گیا کیونکہ.....

خوفناک دہشت ناک اور دل کو دہلا دینے والی رات کے اندھیرے میں جسم بیتی کہانی

ایک ہفتہ قبل ان دونوں کی شادی ہوئی تھی اور دونوں ہی اپنے اپنے گھر کی اکلوتی اولاد تھے۔ شادی گو کہ رنج تھی مگر ایک ہفتے میں اقبال نے عائشہ کو اتنا پیار دیا تھا کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ ایک ہفتہ پہلے تک انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں تھا کیونکہ اپنی اپنی جگہ دونوں کا موقف یہی تھا کہ ”شادی کی محبت ہی سچی محبت ہوتی ہے۔“

**طوفانی** بارش کی تپھڑوں سے بے نیاز

عائشہ اور اقبال کی کارروائی پر تیز رفتاری سے آگے بڑھتی جارہی تھی کیونکہ اقبال کو اپنی ذرا نیونگ پر پورا اعتماد تھا۔

”چلو جی ہو گیا پورا“ عائشہ ستانے والے انداز میں اقبال کی طرف دیکھ کر بولی۔

”کیا پورا ہو گیا؟“

اقبال حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

تھا اور وہ اس وقت اسپتال ہی جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر گھسنا منے سے نرس ایک وہیل چیئر لار ہی تھی خالد اس پر بیٹھی عورت کو دیکھ کر وہیں رک گیا وہ کوئی اور نہیں بلکہ نگہت تھی۔ خالد چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔ وہ خال آنکھوں سے خلاء میں دیکھ رہی تھی اس کا چہرہ بہت خوفناک ہو رہا تھا اس پر بڑے بڑے زخم تھے جن سے خون رس رہا تھا اور یہ زخم صرف چہرے پر نہیں پورے جسم پر تھے جن میں سے گندی بو آ رہی تھی، ہاتھ پاؤں کی انگلیاں مڑی ہوئیں تھیں اور اس کا دہانہ میڑھا تھا جس سے رال بہہ کر نیچے کر رہی تھی۔ اسے میں وہاں حامد بھی آ گیا۔ دونوں اپنی جگہ سن کھڑے تھے۔ حامد نے نرس سے سوال کیا۔ ”ان کو یہاں کون لایا؟“

”سزا“ یہ ایک لاوارث عورت ہے، اس کا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے، ایک معذور ماں تھی اسے بھی ملے کے لوگ یہاں علاج کے لئے لائے تھے۔ وہ بھی مر گئی۔ یہ عورت تقریباً ایک سال سے بیمار ہے۔ پہلے اسے کوڑھ کی بیماری ہوئی تب یہ چلتی تھی اب اسے فالج بھی ہو گیا ہے۔ آواز تک بند ہو گئی ہے، اسے محلے کے لوگوں نے اس کو یہاں جمع کر دیا کیونکہ نہ تو اس کے گھر میں کوئی ہے اور ناں اس کے پاس علاج کے پیسے ہیں۔“ اتنا کہہ کر نرس وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

دونوں بھائیوں کی آنکھیں نم تھیں۔ ”یا اللہ! جب بھائی نے مجھ پر الزام لگایا تھا تو میں نے کہا تھا میں اپنا معاملہ تجھ پر چھوڑتا ہوں۔ یا اللہ! میں نے بھائی کو معاف کر دیا تو بھی انہیں معاف کر دے، اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد خالد نے منہ آسمان کی طرف کر کے کہا: ”یا اللہ! تو سب معاف کرنے والوں سے بڑھ کر معاف کرنے والا ہے۔ اس عورت نے جو میرے ساتھ کیا میں اسے معاف کرتا ہوں۔ تو اس عورت کے گناہوں کو معاف کر دے اور اس کے ساتھ آسانی کر۔“ اور افسوس سے سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ بچے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ کسی نے دروازہ بجایا۔ اس نے سوچا اس وقت کون آ سکتا ہے۔ نگہت نے دروازہ کھولا تو اس کے بیروں تلے سے زمین نکل گئی سامنے خالد کھڑا تھا اور اس کے ساتھ حامد بھی تھا۔ تخت پر لیٹے بچے نے روننا شروع کر دیا۔ ”جی یہ پڑوں کا بچہ ہے اسے کہیں.....“ نگہت کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ خالد کا ایک ذوردار ٹپاچہ اس کے منہ پر پڑا تو نگہت کی قدم لڑکھڑا گئی۔ ”غلیظ عورت! اتنا گھناؤنا کھیل رچایا تو نے، میں نے کس دن تجھ سے کہا تھا کہ مجھے اولاد چاہیے، جب میرے رب کی رضا ہوتی تو مجھے اولاد مل جاتی مگر تو؟ اس حد تک گر گئی کہ میری ہی بہن کی بچی کی بھینٹ دے دی۔ ملعون تو ایمان سے خارج ہو چکی ہے۔ میں چاہوں تو تجھے ابھی پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں مگر میں تیرا حساب اللہ پر چھوڑتا ہوں۔ ہاں ایک چیز جو میرے کرنے کی ہے وہ میں ضرور کروں گا۔“ میں تجھے طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔“ دین سے خارج عورت کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔ حامد نے آگے بڑھ کر بچے کو اٹھایا اور دونوں باہر نکل گئے۔ نگہت اپنی جگہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔ عمل کا وقت آدھا گزر چکا تھا اس کا ہوش نگہت کو نہ رہا اور عمل بیچ میں رہ کر مکمل نہ ہوا۔ خالد نے اگلے روز ہی نگہت کو مہر کی رقم بھجوادی۔

نگہت کو عمل ادھورا چھوڑنے کی سزا ملی اگلے روز سے اس کے جسم پر آبلے پڑنے لگے جو پھول کر موٹے ہو جاتے اور پھٹ جاتے اگلے روز پھر نکتے پھول جاتے اور پھٹ جاتے نگہت اس عامل کے پاس گئی۔ اس نے مزید رقم مانگی۔ نگہت نے اپنے مہر کی رقم اس کے حوالے کر کے اپنی جان چھڑائی۔

وقت پر لگا کر اڑ گیا۔ خالد نے دوسری شادی کر لی اس کی بیوی بہت نیک اور پرہیزگار عورت تھی۔ خالد کے تین بچے تھے۔ وہ انخواہ کیا گیا بچہ جو نگہت کے پاس تھا خالد نے اسے پولیس کے ذریعے واپس کر دیا تھا اور بچے اپنے والدین کو پہنچ چکا تھا۔ اللہ نے اس کو دولت سے نوازا تھا۔ جس میں سے وہ دل کھول کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتا تھا۔

اس کے بھائی حامد نے ایک خیراتی اسپتال بنایا



”ارے جناب! ایک ہی تو خواب تھا میرا جو پورے کا پورا اکھاڑا ہو گیا۔“ عائشہ نے شرارتی انداز میں کہا۔

”ارے بھی خواب تو بتا دو۔“ اقبال اس کی شرارت سے انجان ہی تھا۔

”میں تو شادی سے پہلے سوچا کرتی تھی کہ ایک خوبصورت ہم سفر کے ساتھ مختلف شہروں کی رونقیں دیکھوں گی مگر میرے ہم سفر تو مجھے میرے چھوٹے سے شہر سے نکال کر مزید ویرانوں کی طرف لئے جا رہے ہیں۔“ عائشہ کی آنکھوں میں بدستور شرارت تھی۔

اب اقبال کے ہونٹوں پر ممتی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ”چلو جی آدھی خواہش تو پوری ہوگئی کہ خوبصورت ہم سفر کے ساتھ سفر جاری ہے اور یہی بات رونقوں کی تو لاہور کے دھومیں میں سانس لینے کے بجائے میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ شادی کے بعد ہی مون کسی خوبصورت گاؤں میں جا کر مناؤں گا۔“

”اللہ..... اللہ..... یہ خوش فہمیاں میرے پتی دیو کی۔“ عائشہ ایک جذباتی قہقہہ لگا کر بولی تو اقبال بھی اس کے چھیڑنے پر مسکرا دیا۔

زندگی اور خوشی سے بھرپور ان لمحوں میں کسی اور کو بھی ان پر مسکراہٹ آگئی تھی اور وہ بھی ان کی ”بدقسمتی“

انہیں گھر سے نکلے ہوئے چار گھنٹے ہو رہے تھے اور آبادی سے ہٹ کر ٹوٹی پھوٹی سڑک شاہ کوٹ کی طرف جا رہی تھی۔

”اچھا۔ اب میری طرف دیکھنے کی بجائے سامنے دیکھو گے تو پتہ چلے گا کہ آگے ایک پل بھی آ رہا ہے۔“ عائشہ اقبال کو اپنی طرف مسلسل دیکھتے رہنے پر شیشا کر بولی تو اقبال مسکرایا۔

اب ان کی کار پل پر سے گزر رہی تھی کہ اچانک پل پر کچھ ترخنے کی آواز سنائی دی اور ٹھیک ان کی کار کے نیچے سے کچھ اینٹیں کھسک کر گر گئیں اور اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ پاتے، اینٹوں اور سیمنٹ

سے بنایا گیا پل ٹوٹ گیا اور ان کی کار 50 فٹ کی بلندی سے نیچے کھائی میں گر گئی چلی گئی۔

اقبال کی آنکھوں میں جو آخری عکس ابھرا وہ عائشہ کا دشت زدہ چہرہ تھا۔

کچھ دیر پہلے جن آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی اب ان میں صرف زندگی کھودینے کا خوف تھا اور اس کے بعد کیا ہوا اقبال کو کچھ یاد نہیں رہا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر فیصل بھی عجیب ہی ہیں ایک تو اس ویرانے میں اسپتال کھلو کر بیٹھے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں اپنے گھر والوں سے دور رہنا پڑ رہا ہے۔“ سسر عمارہ خاصی بیزار آچکی تھی۔ دو سال ہو گئے تھے اسے اس خاموش اور ویرانے سے اسپتال میں کام کرتے ہوئے اسپتال شہر سے خاصا دور تھا مگر چونکہ تنخواہ اچھی تھی اور مہینے بعد گھر والوں سے ملانے کے لئے پک اپن ڈراپ کی سہولت بھی موجود تھی اس لئے وہ یہ سب برداشت کرنے پر مجبور تھی گھر کی مجبوری انسان کو اپنے گھر سے ہزاروں میل دور پر بھی لے جاتی ہے۔

اسپتال کے کل اسٹاف میں ایک وارڈ بوائے تیمور، دو نرسیں شہلا اور عمارہ تھیں اس کے علاوہ ٹیلی فون آپریٹر انیل تھی اور اسپتال کا مالک ڈاکٹر فیصل۔

”بھئی تم جانتی ہونا کہ، ڈاکٹر فیصل کے یہ اسپتال بنانے کے پیچھے دو وجوہات کارفرما ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ بہترین ٹیم تشکیل دینا مثلاً وہ ملک کے سب سے مایہ ناز ڈاکٹر ہیں اور ہم دونوں بھی اپنے اپنے اسپتال میں بہترین نرسوں کا ٹائٹل لے چکی ہیں۔ وارڈ بوائے اور ٹیلی فون آپریٹر پر بھی اپنے اپنے نہر میں لکھا ہیں وارڈ بوائے کو کیڈر اچھی ہے اور اینڈنٹ کی ذمہ داری بھی بخوبی نبھاتا ہے ٹیلی فون پر آپریٹر انیل کی لچھے دار باتوں سے یہاں فون کرنے والے ہر رکن کا پھنٹا لازی ہوتا ہے اور یہاں ایڈمٹ بھی انہی ارب پتی مرلیضوں کو کیا جاتا ہے جو لاکھوں کی فیس با آسانی ادا کر دیں دوسرے لفٹوں میں پیسہ لٹا سکیں۔“

دوسری وجہ دولت کی ہوس ہے، وہ دولت جو ڈاکٹر صاحب کو کہیں اور میسر نہیں آ سکتی یہاں سکون بھی اور مرضی کا لاکھوں روپیہ اور یہ بھی ڈاکٹر فیصل کا ہنر ہے کہ محدود اسٹاف کے ساتھ شاید ملک کا سب سے مہنگا اسپتال چلا رہے ہیں۔ اسٹاف نرس شہلا نے تفصیلاً بتایا تو عمارہ سر ہلا کر رہ گئی۔

دور ہنسی ٹیلی فون آپریٹر انیل بھی یہ سب کچھ سن رہی تھی مگر خاموش رہی ویسے بھی اسے صرف تب ہی بولنے کا حق تھا جب وہ فون اٹھاتی تھی۔

ڈاکٹر فیصل اپنے کمرے میں بیٹھا وارڈ بوائے کو آپریشن کے لئے ضروری ادویات لانے کی ہدایات دے رہا تھا۔ آج ایک اور وی آئی پی شخصیت کا بانی پاس ہونا تھا اور ڈاکٹر فیصل اسپتال کے منہ مانگی اخراجات سے مطمئن تھا۔

☆.....☆.....☆

برستی بارش بہت زیادہ عذاب ثابت ہوئی اور جس نے اچھے بھلے پل کو توڑ دیا تھا۔

مسلسل برستی بارش کی بوندیں اقبال کو ہوش میں لے آئیں تھی۔ اقبال کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے پھر بھی اس نے اپنی آنکھوں کو زیادہ زور سے ملا، اب اس کے سر سے بہتا ہوا اس کی آنکھوں سے ہوتا ہوا چہرے پر بھی آ رہا تھا، دروازہ بند تھا کہ وہ تو بھول ہی چکا تھا اس حادثے کو۔

لیکن پھر اچانک ایک جھماکے سے اسے سب کچھ یاد آ گیا وہ اس وقت اپنی پچکی ہوئی گاڑی میں زخمی پڑا تھا گاڑی کا سیرنگ اس کی ٹانگوں میں پھنسا ہوا تھا، سر پھٹ چکا تھا کراہ کی آواز سن کر اس نے سرگھما کر دوسری طرف دیکھا تو عائشہ ساکت سی پڑی دکھائی دی۔

”عائشہ“ اس نے چلاتا چاہا مگر بڑا کر رہ گیا عائشہ شدید زخمی تھی وینڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹ کر اس کی گردن اور پیٹ میں گھپ چکا تھا اور مسلسل خون بہہ جا رہا تھا۔

”عائشہ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا کچھ نہیں ہوگا تمہیں، ہمیں جینا ہے بہت سال تک ایک ساتھ۔“ بے اختیار بے بسی کے آنسوؤں نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔

”مجھے کچھ کرنا ہوگا۔“ اس نے خود سے کہا اور ہمت کر کے گاڑی سے نکلنے کی کوشش شروع کر دی، دروازہ بری طرح سے پچک چکا تھا وہ رینگتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے باہر نکلا اور زمین پر گر گیا پھر لڑکھاتا ہوا اٹھا ابھی تو بہت مسافت طے کرنا تھی اسے، اپنی عائشہ کو بچانا تھا۔

عائشہ کی طرف کا دروازہ بہتر حالت میں تھا اسے کھول کر عائشہ کو کھینٹ کر باہر نکالا اور زخموں سے چور چور ہوتے جسم کے ساتھ پل کے کناروں کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ پندرہ منٹ میں وہ پل کے دوسری طرف تھا اور پوری طاقت صرف کر کے سیدھا دوڑنے کی کوشش کرنے لگا جہاں شاید کہیں اسے عائشہ کے لئے مدد مل سکے۔

پھر اچانک امید کی کرن چمکی۔ ”فیصل اسپتال کا بورڈ لگا تھا اور دائیں طرف تیر کا نشان بنا ہوا تھا وہ اس عمارت کی طرف لپکا۔ صبح سے بارش ہو رہی تھی نرس عمارہ اسپتال کے مین ڈور کی طرف دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ ”اماں ٹھیک ہی کہتی ہے جمہرات کی بارش ہفتہ تک رہتی ہے۔“

اچانک وہ چونک بڑی سامنے منظر ہی کچھ ایسا تھا ایک زخمی جوان کسی زخمی جوان لڑکی کو اٹھائے لڑکھاتا ہوا اسپتال میں داخل ہو رہا تھا۔

یاس و آس میں گھرے اس جوڑے کا منظر اتنا دردناک تھا کہ کم گو اور حس فطرت کی عمارہ برداشت نہ کر سکی اور بھاگ کر انہیں سہارا دینے کے لئے پہنچی، عمارہ کو اس طرح باہر کی طرف بھاگتا ہوا دیکھ کر انیلا اور شہلا بھی باہر چلی گئیں۔

”ڈاکٹر، ڈاکٹر، کوبلا میں پلیز.....!“ اقبال ملتی لپکتی لپکتی میں بڑبڑانے لگا۔



## خوشخبری

طلمساتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورہ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یعنی، عمیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرہ، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلمساتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو نیکے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، بیچ یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردو عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورہ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

**رابطہ: صوفی علی مراد**

0333-3092826-021-2446647

IM-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

سے اٹھا اور اسی طرح عائشہ کو اٹھا کر اسپتال سے باہر نکل گیا جس طرح وہ لڑکھڑاتا ہوا دہان تک آیا ہوا تھا۔ عمارہ نے بھاگ کر زویر اور پیسے واپس اقبال کی جیب میں ڈال دیئے صرف ایک وزنگ کارڈ سنبھال لیا۔ عمارہ واپس آ کر کرسی پر ڈھے گی اس کے دماغ میں سوچوں کی آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

اقبال اسپتال سے باہر نکلا تو اچانک اسے اسپتال کی بیرونی دیوار کے ساتھ ایک بیلچہ پڑا ہوا دکھائی دیا اس نے عائشہ کو زمین پر لٹایا اور دیوار کے پاس موجود بیلچہ پکڑا اور اسپتال سے تھوڑا ہٹ کر زمین کو ہونٹنی شروع کر دی۔ وہ عائشہ کو وہیں دفن کرنا چاہتا تھا۔ عائشہ کو وہاں دفن کر دیا انجان راستوں کی طرف نکل گیا۔ ڈیڑے کے آپریشن کا میاب رہا، کپاؤنڈر کئی کام سے باہر نکلا تو اس جگہ تازہ کھدی ہوئی قبر دیکھ کر چونک گیا اور سارا ماجرہ سمجھ گیا اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر اقبال غائب تھا۔

اس نے اندر جا کر ڈاکٹر فیصل کو ساری بات بتائی تو ڈاکٹر نے یوں کندھے اچکا دیئے جیسے کوئی بات نہ ہو۔ قبریں اور مردے اب اس کے لئے نئے نہیں رہے تھے ہر شخص اپنی جگہ مطمئن اور خوش تھا مگر عمارہ کا دل ابھی بھی نہیں سنبھلا تھا۔ اس واقعہ کو وہ ہنسنے گزر چکے تھے ڈیرا تندرست ہو کر واپس چا چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس رات سارا الشاف اپنے اپنے کمرے میں تھا اسپتال کا شیشہ کا دروازہ بند تھا اور کھنڈی لگی ہوئی تھی لیکن فون آپریٹر انیلا کی ڈیوٹی تھی انیلا اوگھ رہی تھی کہ اچانک ہلکی سی دستک پر چونک گئی شیشہ کے دروازے پر اچانک جو منظر انیلا نے دیکھا اس نے اس کے ہوش اڑا دیئے، عائشہ ایک ہاتھ سے اپنے گلے کا شیشہ اڑا رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے پیٹ میں چھپا شیشہ لئے کھڑی تھی اور اسے گھور رہی تھی۔

بے انتہا سرد اور سپاٹ چہرہ لئے انیلا اپنی کرسی

لئے نہیں کھول رکھا ہے جو تمہاری بیوی کی حالت ہے، تم نا امید ہی ہو جاؤ۔“ پلیز!“ ڈاکٹر صاحب، میری بات سن لیں میں بعد میں سارا خرچ دے دوں گا فی الحال آپ یہ رکھ لیں۔“ پاگلوں کی طرح اس نے عائشہ کے کنگن اور جیمے اتارے اور اپنی جیبوں میں موجود پیسے لٹنے لگا صرف چند ہزار۔

عجب بے کسی کا عالم تھا یہ نہیں ڈاکٹر فیصل کے لبوں پر ایک طنزیسی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اتنی دیر میں کپاؤنڈر اور ڈیڑے دونوں ساتھ وہاں پہنچ گئے۔“میں اپنے کپاؤنڈر سے کہہ دیتا ہوں وہ تمہاری ڈریسنگ کر دے گا اس سے زیادہ فی الحال میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔“ ڈاکٹر نے ڈیڑے کو ساتھ لیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

عمارہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی۔ اقبال مایوس کھڑا سوچتا رہا کہ دولت کے بچاری آج پھر دولت کے لئے ایک انسان کی بلی دیں گے، اور بلک بلک کے روتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد عائشہ نے آخری پگھلی لی اور اس کی روح قصص غصری سے پرواز کر گئی۔ تقریباً سب ہی یقین تھے کہ چلو کام کا بوجھ ایک دن میں ڈیل نہیں ہوا اقبال کے علاوہ اگر وہاں کسی کا دل بلک رہا تھا تو وہ تھی سسر عمارہ، عمارہ ہی کے یاد دلانے پر کپاؤنڈر نے ساکت بیٹھے حامد کی مہم پٹی کر دی۔

”سر میں نے کپاؤنڈر سے پول کر شہر تک آپ دونوں کی واپسی کا انتظام کر دیا ہے۔“ اقبال نے پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ عمارہ کو دیکھا اتنا کرب چھپا تھا ان آنکھوں میں کہ عمارہ ڈر گئی ایسی آنکھیں کسی عاشق کی ہوسکتی ہیں یا پھر کسی قاتل کی اقبال اور عائشہ کی بے بسی عمارہ کی آنکھوں میں بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اچانک اقبال عائشہ کے پاس

عمارہ نے انیلا کی مدد سے عائشہ کو اسٹرچ پر لٹا دیا اور اقبال کو بیٹھنے کے لئے کرسی دی مگر وہ عائشہ کی طرف دیکھ کر بس بوڑھے جارہا تھا۔“ڈاکٹر کو بلاؤ۔ میری عائشہ کو بچالو۔“

انیلا ڈاکٹر کے کمرے کی طرف چلی گئی اور راستے میں سوچ رہی تھی کہ ”چلو جی۔ آج تو بڑے صاحب کا آپریشن بھی ہے اور اس کے ساتھ اب آئے مریض کی ڈیوٹیاں بھی بھگتانی پڑیں گی۔“ اس کی سفاک سوچ میں کسی کی زندگی یا موت کو لے کر کوئی ہمدردی کا ایک حرف نہیں تھا۔ دوسری طرف عمارہ جو کہ ڈاکٹر فیصل کی لاپچی طبیعت سے بخوبی واقف تھی یہ سوچ رہی تھی کہ ”کیا ایک خالی ہاتھ جوڑے کو ترجیح دی جائے گی اس اسپتال میں ایک بڑے امیر رئیس کے آپریشن پر۔“

عمارہ کا ذہن مسلسل جواب دیئے جارہا تھا کہ ”ہرگز نہیں۔“ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اسے شہلا کے ساتھ ڈاکٹر آتا ہوا دکھائی دیا۔

اقبال ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا۔“ پلیز! میری بیوی کو بچالیں ڈاکٹر صاحب زندگی بھر کے سفر میں ساتھ رہنے کا وعدہ کرنے والی مجھے تنہا چھوڑ کر جا رہی ہے۔ پلیز! ڈاکٹر صاحب۔“ عائشہ جان کئی کے عالم میں ہچکیاں لے رہی تھی۔

”دیکھو! خبردار! میں اس چھوٹے سے اسپتال کا اکوٹا ڈاکٹر ہوں اور میں سیدھی بات کرنا جانتا ہوں بات یہ ہے کہ آج بائی پاس کے آپریشن کے لئے ڈیڑے صاحب نے ٹائم لے رکھا ہے جو کہ بس پہنچنے والے ہیں اور تمہاری بیوی کی حالت ایسی ہے کہ فوری طور پر اسے میجر سرجری کی ضرورت ہے، پیٹ میں چھپنے والے شیشے نے گہرے اندرونی گھاؤ بنائے ہیں اور گردن میں شہ رگ کو بھی نقصان ہوا ہے جس کے لئے سرجری تو ہونی ہی ہے مگر میں ایک ساتھ دو کيس ہینڈل نہیں کرنا چاہتا ویسے بھی میں نے یہ اسپتال مفت کی سرجری کرنے کے



سے اٹھی اور اندر کی طرف بھاگے گی۔

ایک جھماکے سے دروازے کا شیشہ ٹوٹا اور آواز سن کر ایٹلا کی ہمت جواب دے گئی وہ زمین پر ڈھسے گئی۔

عائشہ کی روح اس کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور ایٹلا کا رنگ زرد ہو چکا تھا موت کی سفیدی اس کے چہرے پر قہقہہ تھی۔

عائشہ نے اچانک ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ میں موجود شیشہ اوپر کواٹھایا اور ایٹلا کے سر میں گھونپ دیا۔

اگلا دن اسپتال کے لئے بڑا ہی گمہ خیز تھا وارڈ بوائے نے ایٹلا کی لاش سب سے پہلے دیکھی تھی اور چیخ چیخ کر سب کو اکٹھا کر لیا تھا، سب ہی انگشت بدندان تھے اس وحشت ناک منظر پر، ہر ایک اپنی اپنی رائے دے رہا تھا۔

آخر میں ڈاکٹر فیصل بولا۔ ”مجھے یہ کسی چور کی واردات لگتی ہے۔ ایٹلا نے اسے پکڑنے کی کوشش کی ہوگی اور بے چاری اسی چکر میں اپنی جان سے گئی۔“

وارڈ بوائے اور دونوں نرسوں کو دل ہی دل میں اس بات سے اختلاف تھا کہ ”اتنی خاموشی سے یہ سب کیسے ہو گیا؟ کیا وہ سب بہرے ہو گئے تھے؟“ ڈاکٹر فیصل کے علاوہ بھی ڈر چکے تھے۔

سسر شہلا کا تو خوف سے برا حال تھا۔ ”تم ایسا کرو کہ ایٹلا کی لاش کو اس کے گھر پہنچاؤ اور سارا ماجرہ بھی بتا دینا، اب کسی اور اچھی ٹیلی فون آپریٹر کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔“ ڈاکٹر فیصل بولا۔

”بہتر سر۔“ وارڈ بوائے نے سر ہلایا جیسے وہ یہ ذمہ داری قبول کر رہا ہو۔

”کیا ہمیں کچھ دن کی چھٹی مل سکتی ہے؟“ عمارہ نے ڈرتے ڈرتے ڈاکٹر سے پوچھا۔ وہ سچ میں ڈر گئی تھی پہلی مرتبہ ایسا حادثہ اس کے سامنے ہوا تھا۔

”نہیں اب ہم اپنا اسپتال تو بند نہیں کر سکتے ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی سرجری تو کرنی ہوتی ہے مجھے۔“ ڈاکٹر بولا۔

”لیکن سسر! ایٹلا کی موت کوئی عام سی بات تو۔“ شہلا نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

”بس میں نے کہہ دیا ناں نہیں۔“ ڈاکٹر فیصل غرایا۔ ”اگر میں ٹیلی فون آپریٹر کا انتظام کر سکتا ہوں تو اسٹاف بھی نیا لاسکتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا اور باقی لوگ بھی اپنی اپنی ذمہ داریوں میں مصروف ہو گئے۔

نئی ٹیلی فون آپریٹر کا بندوبست ابھی تک نہیں ہو سکا تھا عمارہ اور شہلا کو باری باری ٹیلی فون کاؤنٹر پر بیٹھنا اور اڈگٹنا پڑ رہا تھا، کالز تو بہت کم آتی تھیں اسپتال میں مگر ڈاکٹر فیصل کا کہنا تھا کہ ”ایک فرد کولازمی ریسپنشن پر رہنا چاہئے۔“

ٹیلی فون ڈیک پر اس رات باری سسر شہلا کی تھی وہ اپنی ہی سوچوں میں مست اونگھ رہی تھی کہ اچانک اسے بند کٹ کے نیچے سے چابی والی ایک چھوٹی سی کھلونا کار چلتی ہوئی نظر آئی جو سیدھی اس کی طرف بڑھ رہی تھی یہ ضرور عمارہ کی شرارت ہوگی وہ بڑبڑائی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

اچانک اسے اپنے ہوش و حواس معطل ہوتے ہوئے نظر آئے کار کا سائز بڑھ رہا تھا، جوں جوں وہ کار اس کے قریب آتی جا رہی تھی اس کا سائز بڑھ رہا تھا جب وہ کار کاؤنٹر تک پہنچی تو وہ ایک پوری کار کا روپ دھار چکی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جو کچھ دن پہلے اسی اسپتال میں ٹرپ ٹرپ کر مری چکی تھی۔

”اور سسر شہلا کا خیال تھا کہ اسے مری جانا چاہئے۔“ ٹھیک اسی لمحے عمارہ بھی شہلا کی طرف آتی نظر آئی جب اس نے وہ خوف ناک منظر دیکھا جس میں اسپتال کے کاؤنٹر پر کھڑی کار نے شہلا کو چل دیا، کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر عائشہ تھی اس کے بعد عمارہ کو کوئی ہوش نہ رہا۔

اگلے دن صبح جب شہلا کی لاش ملی

دیکھا تو راسی وقت اسپتال چھوڑ کر بھاگ گیا اور عمارہ نے جی پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ اس اسپتال میں آج اس کی بھی آخری رات ہوگی پھر وہ اپنا سان پیک کرنے لگی۔

اس رات ڈاکٹر فیصل اپنے کمرے میں پریشان بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ۔ ”شاید اس کا اسپتال آسب زدہ ہو گیا ہے خیر میں کچھ دن بعد شہر میں ہی شفٹ ہو جاؤں گا اب تک اتنا تو جمع کر ہی چکا ہوں کہ میری سات نسلیں کھا سکتی ہیں مگر دولت پھر بھی ختم نہ ہوگی۔“

اچانک اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا ہار کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں درخت پر کوئی لڑکی بیٹھی تھی جس کی ٹانگیں اتنی لمبی تھیں کہ زمین کو چھو رہی تھیں اسے دیکھ کر ڈاکٹر فیصل بہت خوف زدہ ہو گیا۔

”کیا میں پاگل ہو رہا ہوں؟ نہیں بالکل نہیں۔“ اچانک وہ لڑکی اسے اپنے کمرے میں پکھے کے ساتھ جھولتا جھولتی نظر آئی یہ تو وہی لڑکی تھی جس کا علاج کرنے سے وہ انکار کر چکا تھا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم تو مری چکی ہو پھر تم۔“

اس کے پیٹ اور گلے میں سے خون کے قطرے بہہ کر پورے کمرے میں پھیل رہے تھے۔ ”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔“ ڈاکٹر دیوانوں کی طرح چلائے لگا۔

”تم زندہ نہیں ہو سکتی۔“

”ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ بول اپنی دولت کو کہ تیرے لئے زندگی خرید لے۔ بہت اتر رہا تھا ناں تو۔“ عائشہ کی روح کے گلے سے خرخراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

”مم۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو، میں نے بہت غلط کیا تمہارے ساتھ، دولت کی ہوس میں، میں اندھا ہو چکا تھا اور سوچو یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تم سرجری کے بعد بھی مری جاؤ، پلینز مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔“

”اگر سرجری کے بعد مری تو ایک منیسا کے ہاتھوں دم نکلتا، دولت وہوس کے اس چجاری کے ہاتھوں نہیں مری، ہونے کو تو ڈیرے کا آپریشن بھی ناکام ہو سکتا تھا ڈاکٹر تو نے تو میری عمر پر بھی ترس نہ کھایا میں اپنا وفا اور محبت اپنے شوہر کے لئے سنبھال سنبھال

کر رکھتی رہی اور جب اپنی خوشیوں کی ڈولی لے کر نکلی تو لالچوں نے ڈولی کو ماتم کدے میں بدل دیا تو بچ نہیں سکتا ڈاکٹر اب میں تیرے دولت کے اس ہوس کدے کو بھی ماتم کدہ بنا دوں گی۔“

چھوٹے چھوٹے تیز نوکیلے شیشے اڑتے ہوئے آئے اور ہزاروں کی تعداد میں ڈاکٹر فیصل کے جسم میں چبھ گئے، وہ تڑپا اور نیچے گر کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

اگلے صبح عمارہ بھی ڈاکٹر فیصل سے ملے بغیر اپنا سامان اٹھا کر واپس جا چکی تھی یہ جانے بغیر کہ ڈاکٹر کس حالت میں ہے۔

اسی دن رات کا آخری پہر تھا جب ڈاکٹر فیصل کی آنکھ کھلی درد کی ٹیسس جسم سے اٹھ رہی تھیں اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر دروازے کے پاس جاتا۔ لیٹے لیٹے ہی وہ اپنے جسم سے شیشوں کے ٹکڑے کھینچنے لگا۔

”آہ۔ میری مدد کرو پلینز!“ صرف ایک شیشہ کھینچنے پر کراہ کر رہ گیا۔ اذیت نے اس کے دماغ کی چوئیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ جسم میں اتنے شیشے پیوست تھے کہ وہ بل بھی نہ سکتا تھا، نہ جی رہا تھا اور نہ مری رہا تھا۔

”کاش مجھے موت ہی آجائے، کاش میں مرکز اس اذیت سے چھٹکارا پا سکوں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”اتنی بھی جلدی کیا ہے، اب تو ہر روز میں تجھے ایک نئی موت ماروں گی، روز ایک نئی اذیت دوں گی، تو ترسے گا اسی طرح مرنے کو مگر مرنے پائے گا۔“ عائشہ قہقہہ لگا کر کہتی اور غائب ہو گئی۔ باہر سے کمرے کی کنڈی خود بخود دگ گئی اور ڈاکٹر فیصل عقیدہ ہو کر رہ گیا۔

”ٹرن۔۔۔۔۔ ٹرن۔۔۔۔۔ ٹرن“ اسپتال کی فون کی گھنٹی مسلسل چلائے جا رہی تھی شاید کوئی تھا جو ڈاکٹر فیصل سے بات کرنا چاہتا تھا۔

اچانک فون اٹھایا گیا ایک نسوانی خرخراتی ہوائی آواز سنائی دی ”کون؟“



میں ہاشم خان بول رہا ہوں مجھے ڈاکٹر فیصل سے بات کرنی ہے۔۔۔۔۔ ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اچانک اس کا سانس رکنے لگا، ایسا لگ رہا تھا کوئی اس کا گلہ دار ہے۔ پھر وہ نیچے گرا اور وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

اسی طرح جو بھی وہاں فون کرتا اس کا سانس رک جاتا۔ دو انجانے ہاتھ اس کا گلہ بوجھ لیتے اور اسے تب ہی آزادی ملتی جب اس کی روح پرواز کر چکی ہوتی۔

اس طرح کے کئی حادثات ہوئے تو پورے شہر میں یہ بات پھیل گئی۔ ہر اخبار، ٹی وی پر اسی خطرناک فون نمبر کا چرچہ چل رہا تھا۔ پولیس ٹیم بھیجی گئی کہ جا کر اسپتال کا معائنہ کرے مگر انہیں کچھ بھی سراغ نہ مل سکا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر فیصل بھی انہیں اپنے کمرے میں نہ نظر آیا۔

اس سارے حادثے سے اگر کوئی ناخبر تھا تو وہ تھی نرس عمارہ۔ جس کے ضمیر کی آواز نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ وزینگ کارڈ پر موجود اس پتے پر پہنچ جائے جو اقبال کی جیب سے گرا تھا اور اس کے جانے کے بعد عمارہ نے اپنے پرس میں سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ ”تڑپ رہا ہے ناں درد سے، میں بھی تڑپی تھی مگر تو نے مجھے مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اچھا چل، ٹھہر میں مدد اور کرتی ہوں تیرے زخموں کا، میں نکالتی ہوں تیرے جسم سے شیشے۔“ عاتشہ کے لہو لہان وجود نے مگر وہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور ڈاکٹر فیصل کے جسم میں چبھے ہوئے شیشے نکالنے لگی ڈاکٹر کی جینیں پورے اسپتال میں گونج رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

عمارہ جانتی نہیں تھی کہ اقبال اسے گھر پر لے گا بھی یا نہیں مگر وہ چلتی رہی اور بالآخر اسے پتہ پہنچ گئی جو کارڈ پر لکھا ہوا تھا چھوٹا سا خوبصورت گھر، جو مکینوں کی نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھا، عمارہ نے دروازہ بجایا تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور اسے اقبال نظر آیا مگر یہ کیا

یہ شخص تو محض اس اقبال کی پرچھائی تھا جو اسے اسپتال میں نظر آیا تھا۔ بکھرے بال اور ابھی ہوئی داڑھی، پتہ نہیں کہ کب سے نہیں، بنوائی گئی تھی۔

”آجائیں محترمہ! میں جانتا تھا اسپتال کی وہ کہانی جس کا ایک ہمدرد کردار آپ بھی تھیں، اور لوگوں کی موت آپ کو مجھے ڈھونڈنے پر مجبور کر دے گی۔ مگر معاف کیجئے گا، مجترمہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“

”دیکھو اقبال معاملہ ان بے گناہوں کا ہے جو عاتشہ کے ناجائز انتقام کا حصہ بن رہے ہیں مجھے پتہ ہے تم کوئی عامل نہیں ہو مگر پھر بھی تمہارے پاس طاقت ہے، محبت کی طاقت۔“

مجھے یقین ہے عاتشہ تمہاری بات ضرور مانے گی؟“

”مگر میں کیوں جاؤں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیوں نہ عاتشہ کو انتقام لینے دوں۔ اس ظالم معاشرے سے، جہاں دولت کے انبار زندگی لے بھی سکتے ہیں اور زندگی دے بھی سکتے ہیں۔ معلوم نہیں اس طرح کے کتنے ڈاکٹر و معصوم زندہ گئے پر خدا بن بیٹھے ہیں، کتنی اموات کے ذمہ دار ہیں، ان کا مر جانا ہی بہتر ہے۔“

”اور تم کیا کہتے ہو ان لوگوں کے بارے میں جو مریض ہیں اور شفا کی غرض سے ڈاکٹر فیصل کے اسپتال فون کرتے ہیں، تم کیا سمجھتے ہو ان کی موت عاتشہ کی روح کو سکون دے رہی ہوگی۔ ہرگز نہیں! مگر وقت کے ساتھ اس کا سکون مزید غارت ہوگا، اس کی روح کرب میں مبتلا ہو چکی ہے۔“ عمارہ بولی۔

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو، ہمیں وہاں چلنا چاہیے جہاں عاتشہ دفن ہے۔“ اقبال بولا اور باہر کی جانب چل پڑا۔

”رکو! میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ عمارہ بولی۔

دن اور رات مل رہے تھے جب وہ وہاں پہنچے، عمارہ اقبال کو لے کر سیدھا ڈاکٹر کے روم کی

طرف بڑھی، وہ سوچ رہی تھی کہ کمرہ خالی ہوگا مگر شاید کوئی سراغ مل جائے۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں بھونچکا رہ گئے ایک زبردست بدبو کے بھسکے نے ان کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر فیصل اس حالت میں زمین پر پڑا تھا کہ اس کے پورے جسم پر زخم تھے اور دونوں ہاتھوں میں کیل بٹھے ہوئے تھے وہ حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا وہ زندہ تھا اگر سانس لینے کا نام زندگی ہے تو۔

”ڈاکٹر فیصل۔“ عمارہ بے اختیار آگے بڑھی۔ ”چلی جاؤ، خدا را چلی جاؤ، ورنہ وہ ظالم تمہیں بھی مار دے گی۔“ ڈاکٹر فیصل کراہا۔

”ظالم کون تھا؟ وہ جو اسی اسپتال میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی، مگر اس کا آپریشن اس وجہ سے نہیں ہو سکا کہ اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں تھے، تم نے ایک امیر کے آپریشن کے لئے پیسے لئے تھے جو کہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا۔“ اقبال بے ساختہ پھٹ پڑا۔

”جوان ان چند دنوں میں، میں اذیت کی حدود کو کچھ دیکھ کر کچھ گیا ہوں کہ درد میں تڑپنا کسے کہتے ہیں، ہم، مجھے، معاف کر دو۔“

”مجھے سے معافی مانگنے کا کیا فائدہ معافی مانگتی ہے تو اس معصوم سے مانگو جس کے دامن میں ہزاروں خوشیاں تھیں، جب وہ گھر سے نکلی زندگی نے دردناک موت کے علاوہ کچھ نہ دیا۔“ اقبال نے کہا۔

عمارہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ ”اقبال پلیز! اسے عاتشہ کی قبر پر لے چلو۔ شاید عاتشہ کی روح کو سکون مل سکے، اپنے مجرم کی معافی سے۔“

”پلیز! میں ایک بار معافی مانگتا چاہتا ہوں عاتشہ سے!“ ڈاکٹر بولا۔

دونوں نے اوزاروں میں سے پلاس ڈھونڈ کر نکالا اور ڈاکٹر کی ہتھیلیوں میں چبھے ہوئے کیل کھینچ کر نکال دیئے۔ پھر اقبال اور عمارہ نے اسے اٹھایا اور باہر کی طرف بڑھے وہ دروازے کے پاس پہنچے تھے

کہ کہیں سے ایک زبردست پھسکارتا ہوا سانپ نکلا اور ڈاکٹر فیصل کے سسکتے ہوئے وجود کو ڈس کر غائب ہو گیا۔

”شاید قدرت اسے اتنی بھی مہلت نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ عاتشہ کی قبر پر جا کر معافی مانگ سکتا۔“ اقبال بولا۔

اقبال عمارہ کے ساتھ عاتشہ کی قبر کے پاس گیا۔ قبر اتنی ہی تازہ لگ رہی تھی جیسے ابھی کھودی گئی ہو۔

وہ دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور اپنا سر قبر کے سرہانے اس طرح رکھ دیا جیسے عاتشہ کے سر کے ساتھ اپنا سر لگا دیا ہو اور دھیرے دھیرے کہنے لگا ”پیسے کی ہوس بہت بری بلا ہے کسی کو بھی لاچکی بنا سکتی ہے، عاتشہ میں جانتا ہوں تم مجھے سن رہی ہو! عاتشہ محبت کو نفرت پر غالب مت آنے دو اسی میں سکون ملے گا، تمہیں بھی اور شاید مجھے بھی۔“

”اقبال کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اٹھ آیا۔ اس کے آنسو گرے رہے اور قبر کی مٹی میں جذب ہوتے رہے اقبال بے سدھ ہو کر اپنا سر قبر پر رکھے ہوئے تھا اور قریب بیٹھی عمارہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

اچانک اقبال نے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا، وہ ہاتھ بہت ہی نرم و نازک تھا، اس ہاتھ نے کئی مرتبہ اقبال کے سر پر ٹھکی دی اور پھر جیسے اقبال کو ہوش آ گیا اب اس کا دل بہت مطمئن تھا۔

آج شہر کی آبادی پھلتے پھلتے وہاں تک پہنچ چکی ہے مگر اب وہاں کسی بھی روح کا وجود نہیں ہے۔ اسپتال کو اسکول میں تبدیل کر دیا گیا ہے مگر وہ قبر آج بھی وہیں موجود ہے۔ بچے پوچھتے ہیں تو بتائیں ان کو مطمئن کرنے کے لئے طرح طرح کی کہانیاں اس قبر کے متعلق سنا دیتی ہیں۔





ایم اے راحت

قسط نمبر: 11

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کھانی۔

شاہکار کہانیوں کے مثلاًشی لوگوں کے لئے اچھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تیر انگیز کہانی

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے نہ جانے کیوں میرے ذہن سے ایک لہری گزر گئی، مجھے ایک لمحے کے لئے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ تلواروں کی کھنک، انسانوں کے شور کی آوازیں، ناقابل فہم نعرے، ناقابل فہم کام۔  
”جی صوفی کی آواز ابھری۔“ نشاء جان۔  
”جی.....“ میں چونک پڑی، اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دینی عسکری ہمارے پاس پہنچ گیا۔  
”ہیلو خواتین۔ آپ کو خوش دیکھ کر مجھے خوش ہو رہی ہے۔“  
”آپ کو خوش نہیں ہے؟“  
”مجھے.....“ عسکری نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور خاموش ہو گیا میرے دل میں نفرت کی ایک لہر اٹھی تھی اس کا انداز مجھے سخت ناگوار گزرا۔ پہلے یہ مشکل سے ہی اس سے گفتگو کرتا ہوگا ادا کار کہیں کا۔ صوفی نے صورت حال سنبھال لی شاید اسے میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔  
”کوئی خاص خبر مسٹر عسکری۔“  
”ابھی کوئی نہیں۔“  
”میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔“

میرے اچانک الفاظ اور بھیدگی نے نہ صرف عسکری بلکہ صوفی کو بھی چونکا دیا۔ اس نے مجھے دیکھا پھر جلدی سے بولی۔  
”اوہ تم بات کرو۔“ اس نے کہا اور وہاں سے دوڑ چلی گئی۔ عسکری کسی قدر تعجب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے طلق صاف کر کے کہا۔  
”جی مس نشاء۔“  
”مسٹر ویشاق نے آپ کو مجھ سے ملاقات کے بارے میں بتایا۔“

”ملاقات.....؟ یہاں..... جہاز پر؟“  
”اس کا مطلب ہے کہ نہیں۔“  
”خدا کی قسم بالکل نہیں۔ لیکن کب..... کہاں؟“  
میں نے اسے اس ملاقات کے بارے میں تفصیل بتائی۔ احر چندی اور عدنان ثنائی کے بارے میں سن کر وہ دنگ رہ گیا۔ کچھ دیر تک وہ حیرت میں ڈوبا رہا، پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر نڈھال سے لہجے میں بولا۔  
”تم مجھ پر یقین کر سکو گی نشاء۔“  
”ہولو۔“

”مجھے بالکل نہیں معلوم، لیکن کچھ نئے خیالات میرے ذہن میں آرہے ہیں یعنی احر چندی اتنا کمزور



نہیں ہے بس وہ اتفاق کا شکار ہو گیا تھا اگر روشاق نے بچ بولا ہے تو اس سے زیادہ خوفناک بات اور کوئی نہیں ہے۔

”کیا مطلب۔“

”اے کے ہمدانی کا جو حشر ہوا۔ میرے خدا۔“

”روشاق نے آپ کو کچھ بھی نہیں بتایا۔“

”اب میں تم سے جھوٹ نہیں بولتا نشاء۔“

”اب..... میرا اچھو خود بخود دھڑک رہا ہو گیا۔“

”ہاں۔ اچھ۔ عسکری تلخ لہجے میں بولا۔“

”پچھلی رات کے بعد سے ملے ہو اس سے۔“

”نہیں۔ لیکن اس نے بھی مجھ سے اصرار جینی کا تذکرہ نہیں کیا۔ ویسے نشاء۔ میرے ساتھ بہت برا ہوا ہے اسے کہتے ہیں کہ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔“

”مطلب؟“ میں نے طنز یہ کہا۔

”تمہاری نفرت بجا ہے لیکن ایک درخواست ضرور کروں گا۔ اس نفرت کے باوجود تم مجھے ہر کام کے لئے استعمال کر سکتی ہو۔“

میں گہری سانسیں لیتی رہی پھر میں نے خود کو سنبھال کر کہا ”پہلے بتاؤ..... اب میں کیا کرو۔“

”کس سلسلے میں؟“ وہ بولا۔

”کیا میں روشاق سے ملوں؟“

”مسٹر ڈیزل سے مشورہ کیا۔“

”نہیں۔ روشاق نے منع کیا تھا۔“

”تم نے مجھے اس بارے میں کیوں بتایا۔“

”خوش فہمی کا شکار نہ ہو۔ بتاؤ کیا کروں۔“

”میرا خیال ہے اس سے رابطہ رکھو۔ اتنا میں ماننا ہوں کہ وہ مجھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا۔

مارشل پرسکون تھا، شام پانچ بجے میں روشاق کے کیمین کی طرف چل پڑی، پہلی بار اس پر اسرار ترین شخصیت کے پاس خود چل کر جا رہی تھی۔ ہزاروں دوسوے، بیسے پشاور پریشان کن خیالات ہمسفر تھے لیکن کچھ امیدیں بھی تھیں۔ شاید کچھ اور انکشافات ہوں۔ شاید مجھے میرے تارک و وجود کا کچھ پتہ چلے۔

روشاق کا کیمین سامنے آیا تو دل کی دھڑکن ہو گئی۔ بمشکل تم کیمین کے دروازے پر دستک دی چھوٹی لٹھوں کے بعد دروازہ کھلا اور روشاق کا مکروہ چہرہ نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں پیدا ہوا اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”آؤ۔“ اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔

میں دروازے سے اندر داخل ہوئی تو اس نے کہا۔ ”دروازہ بند کر دو۔“ میں نے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔

وہ آگے بڑھ کر بستر پر جا بیٹھا۔ پھر ایک دم کوئی چیز بستر کے بڑے ٹیکے کے پیچھے سے نمودار ہوئی اور ایک چھلانگ مار کر اس کے کھلے ہوئے روشندان پر چڑھ کر گر گئی۔ میں نے اس خود غور قاتل بلی کو دیکھ لیا تھا۔ لیکن روشاق نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

”بیٹھو۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”شکریہ۔“ ایک دم میرا اچھو بھی خشک ہو گیا۔

”بہت غور کیا تم نے مجھ سے ملاقات کے سلسلے میں۔“

”ہاں۔ کیوں نہیں۔“

”مشورے بھی کئے ہوں گے کسی سے۔“

”یہ آپ کو بتانا ضروری ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ میں نے منع کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے بھی وعدہ کیا تھا۔

”یعنی۔“

”کسی کو نہ بتانے کا۔“

”اوہ۔ شکریہ۔“ میں نے یہ بھی کہا تھا تم سے کہ اگر تمہاری عقل میری سچائی قبول کرے تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

میں نے ایک گہری نگاہ روشاق پر ڈالی۔ اس شخصیت کی ایک تاریخ تھی میں نہیں جانتی تھی کہ مائیکل جون اور امیر الحسنات سے اس کا تعلق کہاں سے ہوا تھا، البتہ یہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ان کا تینوں کا سفر

کارچوک کی پہاڑیوں کی تلاش میں تھا جہاں ایک خزانہ مدفون تھا اور جس کا تعلق ایک پراسرار تہذیب سے بتایا جاتا تھا۔ بعد کے خواب بھی میرے ذہن میں تھے جن میں ایک انوکھی داستان پوشیدہ تھی، نزائندہ کی داستان اور نزائندہ..... یہاں آکر میں حیرت زدہ ہو جاتی تھی میرا ذہن ہواؤں میں اڑنے لگتا تھا۔

پھر ایک دم ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ روشاق پر نگاہ پڑی۔ وہ بڑے عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

میں تسخیر گئی۔ میری آنکھوں میں نفرت ابڑائی۔ میں نے بیزار سی سے کہا۔ ”اگر آپ کا خیال ہے مسٹر روشاق کہ میں آپ کو دنیا کا سچا انسان سمجھ کر آپ کے پاس آئی ہوں تو میں یہ جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”ہوں۔“ آگے بولا۔ اس نے سکون سے کہا۔

”میں جن حالات سے گزر رہی ہوں۔ ان میں نہ تو مجھے کسی پر اعتماد ہے نہ میں کسی سے مدد کی توقع رکھتی ہوں۔ لیکن میں ٹیکے کا سہارا تلاش کر رہی ہوں۔ جہاں سے بھی میری مشکل کا حل مل جائے۔“

”پاکل ٹھیک۔“ سلیجی ہوئی بات ہے۔ مجھے پسند آئی۔ ”روشاق بولا۔

”مسٹر وکسن ڈیزل بھی مجھ سے تعاون کر رہے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ انہوں نے بھی مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ سب کا ایک ہی رویہ ہے۔ کوئی میری مدد پر آمادہ نہیں ہے۔“ میری آواز رندھ گئی۔

”احمر جینی نے پلیس۔“

”نہیں۔“

”ڈیزل کو میرے بارے میں بتایا۔“

”نہیں۔“ میں نے بے اختیار کہا۔

”اپنی ساتھی لڑکی کو۔“

”کسی کو بھی نہیں..... اور اگر تم چاہو مسٹر روشاق اس کی بجائے پوچھ سکتے ہو۔“

”بتاؤ۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”بس ایک امید ہے ایک آس ہے اس خیال کی کہ شاید آپ میرے لئے کارآمد ثابت ہو سکیں، اگر میری

مشکل کا حل آپ کے پاس سے مل جائے تو آپ سے زیادہ عزیز مجھے اور کوئی نہیں ہو سکتا، ورنہ سب ایک ہی جیسے ہیں میرے لئے، سب ایک ہی جیسے ہیں۔“

روشاق پر خیال انداز میں میری آنکھوں میں دیکھتا رہا، لیکن اس وقت ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی تھی مجھ پر ان الفاظ کو یاد کرتے ہوئے، شاید ان میں سچائی بھی تھی وہ میری آنکھوں سے میرے ذہن کا جائزہ نہیں لے سکا اور بولا۔

”خیر میں تمہاری باتوں سے مطمئن ہوں اور اب تمہیں میرے چند سوالات کے جواب دینا ہوں گے۔“

”اور میرے سوالات کے جوابات؟“ میں نے ٹھیکے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں..... اس کے بعد میں تمہارے سوالات کے جواب دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”مجھے اپنے بچپن کی تفصیل بتاؤ۔“ وہ بولا

اور میرے ذہن کے خانے کھل گئے، میں نے کہا۔

”ایک خوبصورت کوشی میں زندگی گزاری جسے تم دیکھ چکے ہو مسٹر روشاق، مائیکل جون اور امیر الحسنات کے ساتھ وہاں صرف ملازم تھے جو مجھے ہاتھوں میں رکھتے تھے میری ہر بات کو پورا کیا جاتا تھا، انہی ملازموں میں سے ایک کو میری ماں کا درجہ دیا گیا کیونکہ ماں کی صحیح تفصیل میرے علم میں نہیں تھی۔ وہ مر گئی اور مجھے یہی علم ہوا کہ میری ماں مر گئی اور اس کے بعد مسٹر ہارون دانش نے میری پرورش کی اور جب مجھے ہوش آیا تو کوئی تصور بھی نہیں تھا میرے ذہن میں کہ ہارون دانش میرے باپ نہیں ہیں یا وہ عورت میری ماں نہیں تھی جس نے مجھے ماؤں کی طرح پرورش کیا، ہارون دانش مجھے اپنے ساتھ مصروف رکھتے تھے، وہ ماہر آثار قدیمہ تھے اور میں بھی ان کے قدم بہ قدم انہی راستوں پر آگے بڑھ رہی تھی کہ کارچوک کی پہاڑیوں میں ایک مردہ تہذیب کے آثار تلاش کرنے کے لئے آپ لوگوں نے ہارون دانش کو مجبور کیا اور اس کے بعد کے حالات آپ کو معلوم



ہیں کہ کیا ہوا۔“

”یہ بات تمہیں کس نے بتائی کہ ہارون دانش تمہارے باپ نہیں ہیں، چلو ماں کے بارے میں میں مان لیتا ہوں۔“ روشاق نے سوال کیا۔

”وقت نے، حالات نے، میں ہوش کی دنیا میں آئی تو مجھے احساس ہوا کہ نہ میری ماں ہے اور نہ باپ، باپ کے نوادر خانے میں نبھانے کیا کیا موجود تھا، میرے ذہن میں یہ تجسّس جاگا کہ آخر میرے ماں باپ ہیں کون؟ ملازموں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا، تینوں میں ہارون دانش غائب ہو گئے اور میں ان کی تلاش میں بھٹکتی رہی، مجھے جگہ جگہ سے یہ شواہد ملے کہ وہ زندہ ہیں، لیکن میں نے انہیں زندہ نہیں دیکھا۔“

میں بڑی ذہانت سے روشاق کو تفصیل بتا رہی تھی، میرے لہجے میں جذباتی کیفیت بھی تھی لیکن میں نے دانش مندی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا اور روشاق کو صرف اتنا بتا رہی تھی جتنا میرے لئے ممکن یا مناسب تھا۔ وہ خاموشی سے میری صورت دیکھتا رہا جیسے حالات کا اندازہ لگا رہا ہو، میں نے کہا۔

”ملازم مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکے، حالانکہ میں نے ان پر بے پناہ ختیاں کیں، لیکن کسی بد بخت نے مجھے کچھ نہیں بتایا، مہر روشاق بہت سے ایسے مرحلے آئے جب میں نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچا لیکن حقیقت یہی ہے کہ شاید موت بھی مجھے قبول نہ کرے، وہ عورت جس نے میری پرورش کی اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا بے شک یہ سب کچھ ہے لیکن مجھ پر چون طاری ہو گیا، میں اپنے ماں باپ کی تلاش میں ہوں اور وہ کوشش کر رہی ہوں جس سے مجھے اپنے ماں باپ کا پتہ چل سکے، میرا ماضی کیا ہے، میرا باپ کون ہے، میری ماں کون تھی؟ میں یہ سب جاننا چاہتی ہوں، مجھے کوئی ذریعہ حاصل نہیں ہوا اور اس کے بعد اصرار جیندی، عدنان ثنائی اور نجائے کون کون مجھے ملا، مجھے عسکری بھی ملا جس سے کچھ کھوں کے لئے میں متاثر ہوئی ایک عورت کی

حیثیت سے لیکن وہ ایک نمک حرام اور جھوٹا آدمی ہے، میں اب تک نہیں جانتی کہ سب کچھ کیا ہے مہر روشاق نے سب کچھ میرے لئے ناقابل فہم ہے۔ اصرار جیندی نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھے انوکھی تفصیلات بتائیں، آپ جانیں تو میں آپ کو اس کے بارے میں بھی بتا سکتی ہوں لیکن اس سے بھی مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا اور میں مسلسل تاریکی میں رہی، سمجھ رہے ہیں، نا، آپ، ایک بار مجھے معلوم ہوا کہ میری جائیداد وغیرہ کی گہرائی ایک ایڈووکیٹ اے کے ہمدانی کرتے ہیں، میں نے ضد کر کے ان سے ملاقات کی، اے کے ہمدانی نے مجھے بتایا کہ میرے لئے میرے والد کا وصیت نامہ موجود ہے، لیکن پھر اے کے ہمدانی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بھی یقینی طور پر آپ کے علم میں ہوگا، انتہائی بری حالت میں ہونے کے باوجود انہوں نے ایک نام کا غنڈ پر لکھا یہ ایک عمارت کا نام تھا اور جب میں اس عمارت میں اے کے ہمدانی کی سیکرٹری کے ساتھ داخل ہوئی تو وہاں مجھے تابوت نظر آئے جن میں دو میاں موجود تھیں۔ جن کے چہرے تک کپڑے کی بیٹیوں میں لپٹے ہوئے تھے، میں کچھ نہیں سمجھ پائی تھی آج تک میں کچھ نہیں سمجھ پائی۔ میرے ایک ملازم نے مجھے بتایا کہ میرے والد نے میرے لئے ہدایت کی ہے کہ میں اپنیں چلی جاؤں اور وہاں جا کر مہر و سکون ڈیزل سے ملوں، میں نہیں جانتی کہ وہ اس بارے میں کیا جانتے ہیں، خیر میں یہاں آ گئی اور انہوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا، جب میں نے ان سے ضد کر کے یہ کہا کہ آخر میرے والد کون ہیں، کہاں ہیں اور یہ ساری کہانی کیا ہے؟ تو انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو مجھے دوسروں سے ملتا رہا تھا، انہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں کام کریں گے اور جو معلومات حاصل ہوں گی وہ مجھے ضرور بتائیں گے کہ ہمیں اس کے لئے الجھناڑ چلنا ہوگا، میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھی، لیکن کیا کرتی میرے پاس کرنے کے لئے اور کچھ تھا ہی نہیں، میں ہزار ہوں تھی زندگی سے، سمندری جہاز بیکار ہو گیا تھا، آپ یقینی کیجئے مہر روشاق مجھے نہ موت سے دلچسپی ہے نہ زندگی

سے جس شخص کو اپنے بارے میں کچھ نہ معلوم ہوا ہے زندگی کا کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے، میں اپنے بارے میں ناقص رہنے کے بجائے مرجانا پسند کرتی ہوں، اور اگر آپ میں سے کوئی مجھے موت سے خوف زدہ کرنا چاہے تو آپ کو انتہائی مایوسی ہوگی، بس میری زندگی کی ایک خواہش ہے کہ مجھے صرف ایک بات یہ بتادی جائے کہ میں کون ہوں، میں کون ہوں اور میرا قصہ کیا ہے؟ اس کے بعد اگر وہ مجھے قتل کرنا چاہیں تو میں ہر شے کرنے کو تیار ہوں، سنئے مہر روشاق! آپ لوگ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، میں اسی طرح کا جنون اپنے ذہن میں رکھتی ہوں، نہ مجھے اپنی جوانی کا احساس ہے اور نہ مجھے عشق و محبت سے دلچسپی ہے، میں تو اپنی ذات میں بھٹکتی ہوئی ایک آوارہ روح ہوں، میری روح ویران ہے مہر روشاق! میں آپ سے صرف اس شکل میں تعاون کر سکتی ہوں کہ آپ مجھے میرے بارے میں بتادیں، آپ کی جگہ کوئی بھی شخص ہو میں اسے اپنی زندگی خوشی سے سوچ سکتی ہوں، بس میری موت سے پہلے مجھ پر یہ انکشاف کر دے کہ آخر میں ہوں کیا؟ اگر ہارون دانش زندہ ہیں تو کہاں ہیں؟ میں ہر چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ ہارون دانش کس معیشت کا شکار ہیں، سمجھ رہے ہیں آپ یہ ہے پوری تفصیل اور میں نے آپ کو جو کچھ بتا دیا ہے، اب مجھ سے اس کے بارے میں ایک بھی سوال نہیں کریں گے آپ، بس صرف آپ فیصلہ یہ کریں کہ کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟“

”نہیں بے بی ابھی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مجھ سے کچھ سوال مت کرو، ابھی میرے سوالات پورے نہیں ہوئے، کچھ اور سوالوں کے جواب چاہئے مجھے۔“ روشاق بڑی بے رحمی سے بولا۔

”جی فرمائیے۔“

”اس گھر میں جہاں تم گئی تھیں میرا مطلب ہے اچھا چھوڑو اس سے پہلے کی بات کرو جب میں نے تمہیں

پہلی ملاقات میں اس مکان میں بھیجا تھا وہاں کیا واقعات پیش آئے۔“

میں نے جواب میں پورا واقعہ دہرایا جو جگہ تھا، روشاق نے گردن ہلائی پھر بولا ”اور تمہیں یہ کس نے بتایا کہ اس عمارت میں جو تابوت رکھے ہوئے ہیں ان کا تعلق تمہارے باپ سے تھا۔“

میں پوری ذہانت سے سب کچھ بتا رہی تھی میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہاں میں نے مہر و سکون دانش کی آواز سنی تھی اور انہیں کس عالم میں دیکھا تھا بلکہ میں نے کہا۔

”میرے ملازم نے مجھے یہ بات بتائی تھی جب اس نے مجھے اے کے ہمدانی کی بے ہدایت بتائی جس کے تحت اس نے مجھے اپنیں بھیجا تھا تو اس نے کہا کہ وہ تابوت میرے ماں باپ کے تھے۔“

”اور تم نے اسے مان لیا؟“

”میں نہیں جانتی کہ وہ سب کچھ کیا تھا، آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیا ماننا تھا اور کیا نہیں ماننا تھا۔“

”اچھا ایک بات اور بتاؤ، تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ وہ تابوت اس جہاز کے تہہ خانے میں ہیں، کیا تمہیں اس شخص نے بتایا تھا جس کا نام البر وٹوس تھا؟“

”نہیں میں نہیں جانتی کہ وہ کون تھا۔ یہ بات مجھے وٹوس ڈیزل نے ہی بتائی تھی کہ جہاز کے مال خانے میں وہ تابوت موجود ہیں۔ میں نے جب پہلی بار ان تابوتوں کو دیکھا تو فوراً پہچان لیا یہ وہی تابوت تھے جو اس عمارت میں مجھے ملے تھے۔“

”تم البر وٹوس کو نہیں جانتی؟“

”نہیں۔“

”پہلے ہی اسے دیکھا۔“

”میں نے کہا نا کہ میں نے اسے بعد میں بھی نہیں دیکھا بلکہ جب جہاز کا حادثہ ہوا تو مجھے علم ہوا کہ ان تابوتوں پر البر وٹوس کی لاش بڑی ہوئی پائی گئی ہے۔“

”اور یہ بات بھی تمہیں وٹوس ڈیزل ہی نے



بتائی ہوگی۔“  
”ہاں۔“

”اس کے علاوہ کوئی بات جو میری رہنمائی تمہاری مشکل کی سمت کر سکے، اب میں پورے خلوص سے تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں فی الوقت یہ صرف الفاظ ہیں لیکن آنے والا وقت تمہیں اس حقیقت سے روشناس کرائے گا کہ ان الفاظ میں سچائی ہے، میں تمہاری بھرپور مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، ہم ڈیزل سے رابطہ رکھو یا دنیا کے کسی بھی فرد سے بھی، میں تمہارا ہمدرد تمہارا غمگسار رہوں گا اور تمہارے لئے سب کچھ کروں گا، لیکن تم اپنے ذہن میں چھپی ہوئی ہر وہ بات مجھے بتا دو جو میری سچ سمت رہنمائی کر سکے۔“

”میرے علم میں جو کچھ تھا میں نے آپ کو بتا دیا مسٹر روشاق، اور اب میں آپ کے ان الفاظ کا ثبوت چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں میرے لئے کیا سوالات ابھرتے ہیں؟“  
”آپ کون ہیں مسٹر روشاق؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایک محقق، مصر کی قدیم تاریخ سے جنون کی حد تک عشق رکھنے والا، میں نے تاریخ مصر کے ایسے پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جن تک کسی اور کی نگاہ نہیں پہنچ سکی، یوں سمجھ لو کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ شاید میں فرعون کے دور کی کوئی روح ہوں جسے دوبارہ انسانی شکل میں زندگی دے دی گئی ہے تو غلط نہیں ہوگا، مصر کی قدیم تاریخ کا اگر تم نے مطالعہ کیا ہے میرا مطلب ہے ہارون دانش کے حوالے سے تو یہ سمجھ لو میں بھی وہ ”کا“ ہوں جس کی تشکیل دوبارہ اس کائنات میں کی گئی ہے اور میری روح واپس ایک انسانی جسم میں آگئی ہے، مجھے تاریخ مصر سے دیوانگی کی حد تک عشق ہے، مسٹر ہارون دانش وہ دوسرے انسان تھے جنہوں نے مصر کی تاریخ کے ایسے ایسے برسرِ ارباب دریافت کئے جو بڑے بڑے محققوں کے علم میں نہیں ہیں، لیکن

میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہوا، یہ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے، لیکن اس پرانی بات کو اپنی عمر سے منسلک نہ کرو، تمہاری عمر، تمہاری عمر.....“ اس نے جملہ احوال چھوڑ دیا۔ پھر بولا۔

”ہارون دانش نے تاریخ مصر پر ایسی ایسی انوکھی تحقیقات کا انکشاف کیا ہے جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، ان کی کچھ کتابیں اور مسودے پراسرار طریقے سے غائب ہو گئے وہ کتابیں شائع نہیں ہوئی تھیں، ان مسودوں میں مصر کی چھ ہزار سالہ تحقیق کے ایسے ایسے انوکھے باب تھے کہ اگر وہ دنیا کے سامنے آجاتے تو مصر کے اہل رہنما کے بارے میں ہزاروں محققین نے جو اپنی اپنی داستانیں لکھی ہیں لیکن اگر کوئی یہ انکشاف کرے کہ قدیم مصری دور کے کچھ مدفن اجسام زندگی پا کر، ایک محقق کے ساتھ تاریخ مصر پر تحقیقات کر رہے ہیں اور اس سے بحث کر رہے ہیں تو کیا اس حقیقت کی سچائی پر غور کیا جاسکتا ہے، یا تو اس شخص کو چھوٹا سمجھا جائے یا پھر اس داستان کو دنیا کی سب سے زیادہ پراسرار داستان، لیکن جو شاسا ہیں جو ان حوالوں کو جانتے ہیں جو ہارون دانش نے دیئے اور یہ حوالے دورِ فرعون کا کوئی شخص ہی دے سکتا ہے اس کے بعد وہ تیونس میں گم ہو گیا، نجانے کس کے اس کی تلاش تھی، نجانے کون کون اس کے لئے سرگرداں ہے میں بھی انہی میں سے ایک ہوں اور گمشدہ ہارون دانش کے وجود کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلتا کہ وہ تاریخ کا کوئی ایسا ہی فرد ہے جو ہزاروں سال پرانی تاریخ سے گزر کر اس دنیا تک آچکا ہے، یا پھر کوئی اور لیکن ہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا میں اس کی اولاد زندہ ہے، اور کون کون ہے جو اس تاریخ کو جاننے کے لئے دیوانہ نہیں ہو جائے گا اور لڑکی تم نے مجھ سے میرے بارے میں سوال پوچھا میں نے تمہیں بتا دیا کہ میں کون ہوں، لیکن تم کائنات کی اس تاریخ کا سب سے انوکھا باب ہو، تمہیں اگر پڑھ لیا جائے تو جانے کیسے کیسے انکشافات ہوں، سمجھیں تم.....“ وہ خاموش ہو گیا، اس کی گردن کی رگیں چھوٹی رہی تھیں، خون سے عاری چہرہ اس وقت کچھ عجیب ہی

سینٹوں کا شکار ہو رہا تھا جنہیں کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا، بس یوں لگ رہا تھا کہ وہ بے حد پر جوش ہے وہ پھر بولا۔

”اور سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ہارون دانش زندہ ہے، وہ فنا نہیں ہوا روپوش ہے، اگر وہ کسی مشکل کا شکار ہے تو تم یقین کرو اس نے بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے وہ اس مشکل میں کسی کا بھی ساتھ حاصل کر سکتا تھا اور جو شخص اس کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہوتا وہ میں ہوں، میں.....“

”آپ.....“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں۔ وہ مجھے ایک بار مل جائے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو بے بی میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ تعاون کرے، اگر وہ چاہے تو مجھے اپنی تحویل میں لے لے اور تاریخ کے سربستہ راز کی نقاب کشائی کرے، میری ساری کہانی انہی واقعات کے گرد گھومتی ہے، میں خود ہی اپنے آپ کو تاریخ میں تلاش کرنا چاہتا ہوں، سمجھ رہی ہوں نا، میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا اور میں بھی خاموشی سے اسے دیکھنے لگی، نجانے کیوں مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ سچ بول رہا ہو اور اس وقت میں خود بھی جذباتی ہو گئی تھی۔ کوئی خاص جھوٹ نہیں بولا تھا میں نے اس سے، بس کچھ باتیں چھپا رکھی تھیں، تو وہی دیرینک خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا۔

”آپ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں مسٹر روشاق؟“

”کچھ بھی نہیں، ہاں ایک پیشکش کر سکتا ہوں جنہیں.....“

”کیا؟“

”کسی بھی طور پر تمہیں کسی بھی شکل میں ہارون دانش کا کوئی نشان مل جائے تو میرا ایک پیغام اسے ضرور لے سکتا ہے۔“

”کیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”اس سے کہنا کہ صبح کو ڈوبنے والے آخری ستارے کی قسم روشاق تجھ سے غیر مخلص نہیں ہے، بس وہ بھی تیرے ساتھ اس دور کی تلاش میں جانا چاہتا ہے، جہاں خود اس کا بھی وجود ملتا ہے، وہ خود بھی شاید اپنی تاریخ میں کوئی بھٹکا ہوا، کردار ہے۔“

”تمہارے خیال میں مسٹر ہارون دانش مجھ سے ملیں گے؟“ میرے لہجے میں خود بخود ایک حسرت بیدار ہو گئی۔

”یقیناً..... شاید کوئی ایسا لمحہ آجائے جب اس کا تم سے ملنا ضروری ہو جائے، ایک بار ایک بار وہ مجھ سے مل لے، صرف ایک بار میری بات سن لے آج تک اسی کوشش میں مصروف ہوں، اور لڑکی تیرا موجودہ نام یہی ہے نا..... یہی ہے نا.....“

”کیا مطلب؟“

”میں تجھ سے ایک سوال کر رہا ہوں، اس کا مجھے جواب دے۔ تیرا نام نشاء ہی ہے نا۔“

”ہاں..... لیکن اب تم مجھے یہ بھی بتاؤ گے کہ کیا میرا کوئی اور نام بھی تھا۔“

”نہیں، ابھی اس سلسلے میں مجھ سے کچھ مت پوچھ۔“

”تو پھر۔“

”بس میں تجھ سے یہی کہتا ہوں نشاء کہ مجھ سے پوشیدہ ہونے کی کوشش نہ کرنا اور اگر کسی نے تجھے مجھ سے چھپانے کی کوشش کی تو سڑنے والی چھ ہزار لاشوں کی قسم اس کی فنا کا ذمہ دار میں ہوں گا صرف میں۔“

”مجھ سے آپ کی کیا دلچسپی ہے مسٹر روشاق؟“

”ارے میں نے تجھے بتا دیا کہ تو تاریخ کے ہزاروں سالوں کے پیچھے چھپی ہوئی ایک انوکھی حقیقت ہے، ایک انوکھا راز، میں چاہتا ہوں کہ جب تو منکشف ہو تو سب سے پہلے تجھے میرا قلم تحریر کرے۔“ روشاق کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اور تم نے جو قسمیں کھائی ہیں ان کا کیا مطلب



ہے، صبح کا آخری ستارہ اور نجانے کون کون سے نام، یہ سب کیا ہے مسٹر روشاق، آپ کا مسلک آپ کا مذہب کیا ہے؟

”رک جا ایک لمحے کے لئے رک جا، ایک لمحہ ٹھہر۔“ روشاق نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا، اس نے اپنے سامنے رکھے سامان سے ایک کاغذ نکالا اور اسے میرے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

”لے دیکھ اسے، دیکھ کی شکل میں اسے پہچانتی ہے۔“

میری نگاہ کاغذ پر پڑی ہوئی تصویر پر پڑی اور میں نے اسے ایک لمحے میں پہچان لیا، یہ وہی عورت تھی جو روشاق کی ہم شکل تھی اور جس نے مجھے انتہائی نفرت کے ساتھ اس مکان سے باہر نکال دیا تھا، ایک بار پھر میرے ذہن سے ایک لہری گزر گئی اور میں نے بے اختیار کہا۔

”یہ..... یہ..... سلاوویہ ہے۔ سلاوویہ عشیانہ.....“ یہ الفاظ میرے منہ سے بے اختیار نکلے تھے اور میں ان کا مفہوم نہیں جانتی تھی، لیکن روشاق بے اختیار اچھل پڑا۔ اس کے پورے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا، وہ بچٹی بچٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا اور اس کے بعد آہستہ سے بولا۔

”مگر تو اسے کیسے جانتی ہے؟“

”ایں..... میں حیرانی سے اسے دیکھتی ہوئی ہوں۔“

”تو اسے کیسے جانتی ہے؟“

”کسے؟“ میں نے سوال کیا اور وہ میری صورت دیکھنے لگا، پھر آہستہ سے بولا۔

”یقیناً تجھے احمر جندی نے بتایا ہوگا۔“

”میں نہیں جانتی مجھے یاد نہیں ہے۔“

”آہ..... تو میرا خیال ٹھیک ہے، میرے راستے بالکل صحیح ہیں۔“ روشاق نے بھی پراسرار لہجے میں کہا۔ اچانک ہی میں چونک پڑی، میں نے آہستہ سے کہا۔

”ایک بات بتائیے مسٹر روشاق، کیا یہ عورت میری ماں ہے؟“ یہ سوال بھی بے اختیار ہی میرے منہ سے نکلا تھا۔

”تیری ماں۔“ روشاق چونک کر بولا پھر جلدی سے بولا۔ ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، ایسی کوئی فضول بات اپنے دل میں نہ لانا یہ تو ایک قدیم تاریخ ہے زمانہ قبل کا ایک انوکھا دور۔“

”جو اس مکان میں زندہ تھا۔“ میں نے طرہ بہ طرہ کہا۔

”وہ فریب تھا تیرے لئے نہیں ہمارے لئے۔“

”اپنے مذہب کے بارے میں آپ نے نہیں بتایا مسٹر روشاق۔“

”بس انسان ہوں میں اس سے آگے پیچھے کچھ نہیں، جن ناموں سے عقیدت ہے ان کی کہیں کھا لیتا ہوں۔“ روشاق نے مدہم لہجے میں کہا۔

”آپ اس سلسلے میں میری کچھ میں مدد کر سکتے ہیں مسٹر روشاق۔“

”میں.....! یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں میں اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ سو گیا ہو۔

”مسٹر روشاق۔ آخر کار میں نے اسے پکارا لیکن وہ پھر بھی نہ چونکا اس وقت ایک اور پراسرار واقعہ ہوا اچانک اسی روشندان میں وہی منحوس بلی نظر آئی، اس نے اپنے حلق سے ایک مکروہ آواز نکالی اور روشاق اچھل کر پھر اس کی آواز ابھری۔

”ہاں۔ میں جاگ رہا ہوں، تیور ہماری جاگ رہا ہے سورج زادی، جاگ رہا ہے۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

”آپ سو گئے تھے مسٹر روشاق۔“

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ پھر بولا۔

”نہیں، میری روح مجھ سے دور چلی گئی تھی۔“ میری نگاہ روشندان کی طرف اٹھ گئی مگر بلی وہاں موجود نہیں تھی ابھی ایک گہری سانس لے کر رہ گئی پھر میں نے خود کو سنبھال

کر لیا۔

”آپ سے ایک آخری سوال کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں۔ بس آخری سوال، اور پھر واپس چلی جاؤ۔ سورج ڈوبنے کو ہے۔ میری عبادت کا وقت قریب آ رہا ہے۔“

”وہ دونوں تابوت خالی کیسے ہو گئے؟“

”آہ، میں سچ کہہ رہا ہوں، بس نہیں جانتا بس مجھے تو بڑی ویرانگی تھی ورنہ ایک بہت بڑا عقدہ حل ہو جاتا جا۔ بس اب جا براہ کرم جا۔“ وہ مضطرب نظر آنے لگا اور میں اسے گھورتی ہوئی باہر چل پڑی لیکن جاتے ہوئے میری نگاہ روشندان کی طرف گئی۔ وہاں دو انگارہ آنکھیں دکھ رہی تھیں خونخوار اور بھیسا تک آنکھیں۔

”کیوں کے باہر سب کچھ وہی تھا۔ روشاق آخر کیا ہے؟ کچھ نئے نئے نقوش مجھے ایک نئے جہاں کی سیر کراتے تھے آشفانی مندر۔ اس کے اندر عبادت کرنے والے انسان۔ قدیم مصری لباس میں ملبوس، اور مندر کی نقوش گاہ میں چہرہ چھپائے ٹھس کرتی رقاصائیں۔

دور سے عسکری نظر آیا۔ جس نے مجھے نہیں دیکھا اس سے اس وقت ملنے کو دل نہیں چاہا ویسے میں نے اسے روشاق کے بارے میں بتا دیا تھا تب میں جانے کو دل نہیں چاہا۔ میں نے عرش کا رخ کیا اور خاص طور سے ایک پرسکون گوشہ پسند کیا۔ پھر کہ جانے کتنا وقت سمندر کو پیٹتے ہوئے گزارا۔ ذہن میں نہ جانے کیا کیا خیالات آ رہے تھے۔ وہ بھیسا تک طوفان یاد آیا جس نے جہاز کو زیر و زیرہ کر دیا تھا لیکن بحری قزاق بہترین انجینئرز تھے انہوں نے مارشل کوئی زندگی دیدی تھی اور اب وہ پرسکون سفر کر رہا تھا۔ پھر اس وقت چونکی جب کسی کو اپنے قریب دیکھا۔

”نشا..... صوفی کی آواز میں بیار تھا۔“

”اوہ..... سٹر۔“

”میں تمہیں بہت دیر سے دیکھ رہی تھی۔“

”ارے ہاں ایک دم رات ہو گئی۔“ میں نے

چونک کر چاروں طرف دیکھا۔

”کھانا کھائیں۔“

”ہاں۔ مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔“

”آؤ.....“ صوفیہ نے کہا۔ ہم نے جہاز کے ریٹورن میں بیٹھ کر کھانا کھایا کھانے کے دوران سسٹر نے کہا۔ ”سسٹر ڈیزل سے ملاقات ہوئی تمہاری۔“

”کب۔“

”تھوڑی بہت دیر پہلے۔“

”کوئی خاص بات۔“

”نہیں۔ بس میرے پاس آئے تھے۔ یہ بتانے کے لئے کہ تم روشاق کے پاس گئی ہو۔“

”..... مجھے دیکھا ہوگا۔“

”شاید.....“

”کیا بات ہوئی؟“

”وہ ایک پراسرار انسان ہے۔ بے حد پراسرار۔ آپ یقین کریں سسٹر جب تک میں اس کے پاس رہی مجھے یوں لگتا رہا جیسے میں کسی زندہ انسان کے ساتھ نہ ہوں۔ وہ مجھے زمانہ قدیم کی کوئی بھیسا تک روح معلوم لگا ہے۔ ایک مافوق الفطرت انسان۔“

”تم سے کیا کہتا ہے۔“

”وہ مجھ سے صرف اس لئے دلچسپی لے رہا ہے کہ میرے ذریعے بارون دانش سے مل لے۔“

”ارے۔ تم اپنے پاپا کا نام کیسے لے رہی ہو۔“

”پاپا.....“ میں نے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

اس کے بعد ہم نے مزید کوئی گفتگو نہیں کی۔ اور بیٹھے ریٹورن کے ماحول کا جائزہ لیتے رہے۔ انسان بھی کیا چیز ہے۔ یہ سب کتنے بڑے حادثے سے دوچار ہوتے ہیں۔ کون کون کیا کیا کھو بیٹھا ہے لیکن اس وقت وہ بالکل خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔

”چلیں.....“ صوفیہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”ہاں..... اٹھیں۔“ میں نے کہا اور کرسی کھسکا کر اٹھ گئی۔ پھر ہم دونوں کیمین میں آ گئے۔ وسکن ڈیزل اپنے کیمین میں موجود نہیں تھے۔



بیڈ پر لیٹ کر صوفیہ نے کہا۔ ”میرے ذہن میں تو بس ایک ہی خیال آتا ہے اگر مسٹر ہارون دانش روشاق کو قابل بھروسہ سمجھتے تو ہمیں اسٹین نہ بھیجتے۔ آخر کوئی بات تو ہوگی جس کی وجہ سے انہوں نے روشاق سے گریز کیا۔

”ہاں..... شاید۔ میں نے نیند بھری آواز میں کہا۔

”تمہیں نیند آ رہی ہے سو جاؤ۔“ صوفیہ نے کہا۔ میں نے کروٹ بدل لی۔

دوسری صبح انکل ڈیزل نے ہمیں جگایا تھا۔ ”ہیلو گزرو۔“

”ہیلو انکل..... ہم دونوں نے بیک وقت کیا۔

”ہیلو.....“ انکل ڈیزل نے کیا۔ پھر بولے۔

سمندر کی آخری لکیر سے سورج طلوع ہوتا ہے تو ایک سحر انگیز منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے تم نے یہ منظر دیکھا ہے کبھی۔

”نہیں انکل۔“

”دیکھا کرو۔ جب یہ مکمل ہو جائے گا تو ہم اس حسین منظر کی تمنا ہی کرتے رہیں گے۔ کیا خیال ہے۔“

”واقعی..... حسین لگتا ہوگا۔“ صوفیہ نے کہا۔

”میں نے ایک مہربان نوجوان سے کہا ہے کہ وہ تین افراد کے ناشتے کا انتظام کر دے۔ چنانچہ تم نہا کر عرشہ پر آ جاؤ۔“

”ہم آ رہے ہیں۔“ میں نے لاشعوری سے کہا۔

اور کچھ دیر کے بعد عرشہ پر پہنچ گئے جہاں انکل ڈیزل ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ناشتے کے دوران باتیں شروع ہو گئیں انکل ڈیزل نے چائے کے بڑے بڑے سپلے کر اپنا کپ خالی کر دیا پھر بولے۔

”یہ سچ ہے کہ روشاق کو شدت سے ہارون دانش کی تلاش ہے۔ اور وہ صرف اس وجہ سے نشاء کو نگاہ میں رکھنا چاہتا ہے لیکن دوسرا سچ یہ بھی ہے کہ اگر ہارون دانش اسے حاصل ہو جائے تو ہارون اپنا مشن کبھی پورا نہ کر سکے گا۔

”پاپاشن.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”صوفیہ۔“

”کیا آپ اس مشن کے بارے میں جاننے میں انکل۔“

”چکا نہ سوال ہے۔ ویسے یا تو تم مجھے بتانا بھول گئیں۔ یا پھر روشاق سے غلطی ہو گئی۔“

”کیا انکل۔“

ڈیزل سوچ میں ڈوب گیا پھر اچانک بولا۔

”روشنق نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم لوگ ایجنز انکریوں جا رہے ہیں؟“

”..... نہیں..... نہیں پوچھا۔“

”شاید بھول گیا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے وہ دوسری ملاقات پر تم سے یہ سوال کرے۔“

”مجھے کیا جواب دینا ہے انکل۔“

”یہ کہ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“

”انکل کچھ سوالات میرے ذہن میں ہیں۔“

”مجھ سے پوچھنا چاہتی ہو۔“

”جی.....“

”اس گفتگو سے متعلق ہیں۔“

”ہاں۔“

”سوری بے بی۔ شاید میں اس کا جواب نہ دے سکوں۔“ ڈیزل کے انداز میں ایک بے رخی سی پیدا ہو گئی جو مجھے ناگوار گزری۔ اس نے اس ناگواری کو کچھیں

کیا اور وہ مسکرا دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تمہیں میرا جواب ناگوار گزرا ہے۔ لیکن بے بی۔ یقین کرو بہت سے سوالات کے جواب ابھی میرے پاس بھی نہیں ہیں۔“

”اگر ہوں بھی انکل۔ تو میرے پاس کیا حق ہے کہ میں کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کچھ بولنے پر مجبور کروں۔“ میں نے خمیدگی سے کہا۔

”نہیں نشاء یہ بات نہیں ہے۔ یوں بھی سمجھو کہ جو ہدایات مجھے تمہارے ڈیڈی نے دی ہیں میں انہیں کے مطابق ہر قدم اٹھا رہا ہوں۔ لفظ بہ لفظ سوائے ایک معمولی سی غلطی کے اور اس کا مجھے جو غمناک ہو سکتا ہے

میرا دل جانتا ہے۔“

”غمناک.....؟“

”ہاں اس جہاز پر۔“ مسٹر صوفیہ نے چوک کر پوچھا۔

”ہاں۔“

”اس بارے میں بھی نہیں بتائیں گے۔“

”میں اپنے ایک پر خلوص دوست سے محروم ہو گیا۔ مجھ سے ایک چھوٹی سی حماقت ہو گئی تھی۔“

”محروم ہو گئے۔“

”ہاں۔ وہ میری وجہ سے مارا گیا۔“

”کون انکل۔“

”البر ونوس۔ میرا چودہ سال پرانا دوست۔ جو اس سفر میں میرا ساتھ دے رہا تھا۔“

”ادمانی گاؤ..... البر ونوس۔ آپ کا ساتھی تھا۔ لیکن انکل۔“

”انہیں مجبوریوں کا ذکر تم سے کرتا ہوں۔ ورنہ میں اپنی زندگی بھی تم پر قربان کر سکتا ہوں۔“

”سوری انکل۔ وری سوری۔“

”میں نے اپنی زندگی تمہارے لئے وقف کر دی ہے۔ میرا کوئی قدم تمہارے خلاف نہیں اٹھے گا۔ بس مجھ پر اعتماد ضروری ہے۔ ویسے اگر جنیدی اور عدنان ثانی کی موجودگی کی تصدیق ہو گئی ہے۔“

”آپ نے خود دیکھا۔“

”ہاں۔ تقریباً..... میں ایک پلاننگ کر رہا ہوں۔ لیکن اس شکل میں تم مجھ سے مطمئن ہو۔“

”میں سوری کر چکی ہوں انکل۔ آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“

”اوکے نشاء بٹی۔ تمہارا تعاون ہماری مشکلوں کا حل ہو گا۔ اور میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ آرام سے وقت گزارو۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”لیکن انکل آپ کو اپنی حفاظت ضرور کرنی پڑے۔“

”میری بالکل فکر مت کرو۔! اوکے۔“ ولسن

ڈیزل نے کیا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ میں نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی پھر اس نے سرسراہٹ آواز میں کہا۔

”البر ونوس انکل ڈیزل کا ساتھی تھا۔“

”ہاں سسٹر۔ یہ نہیں کون کیا تھا اور کیا ہے لیکن ایک اور بات سمجھ میں آئی ہے۔“

”کیا.....“

”اسٹین میں ہمیں طویل قیام کرنا پڑا تھا۔ اس دوران وہ تابوت وہاں منگوائے گئے تھے اور یقیناً وہ ولسن ڈیزل کے کہنے پر وہاں لائے گئے تھے اور یہ کام البر ونوس نے کیا ہو گا۔“

”صوفیہ۔“

”آہ، دماغ کے پرچے اڑ گئے ہیں کوئی بات جو سمجھ میں آئی ہو۔“

”اب تو تمہیں..... بھی خوف محسوس ہونے لگا ہے نشاء..... روشاق کیا کہہ رہا تھا تم مصر کی چھ ہزار سالہ تاریخ کا یہ اسرار باب ہو۔“ صوفیہ نے کہا اور میں ہنس پڑی۔

”ہاں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب یہی رہ گیا ہے کہ لوگ مجھ سے خوف کھائیں۔“

مارشل بدستور سفر کر رہا تھا۔ لوگ بحری قزاق کو اپنا دیوتا مان چکے تھے۔ اس کا بے احدا احترام کیا جا رہا تھا اس نے اصول بھی ایسے اپنائے تھے کہ جونہ ہوتی تھی جہاز کے پرانے خلاصوں کو کچر بے کار ہونے کی حقیقت سے اقدام دیا جاتا تھا۔ وہ دوسروں کو ہدایت دیتے تھے اور دوسرے ان پر عمل کرتے تھے لیکن سب اصول پسندی زندگی کے حصول کے لئے تھی۔ گارساں کے بارے میں اب کوئی بدلے انداز میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس دن جہاز کے معمولات بدستور جاری تھے کہ اچانک جہاز پر سب لاؤڈ اسپیکر چیخ اٹھے اور سب متوجہ ہو گئے۔

”متوجہ ہوں۔ میں آپ کا کپتان گارساں آپ

دار Digest [133] April 2013

دار Digest [132] April 2013



سے مخاطب ہوں مارشل کے تمام مسافروں سے درخواست کرتا ہوں کہ سب عرشے پر جمع ہو جائیں کیبن خالی کر دیئے جائیں۔ ایک ایک فرد باہر آ جائے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“

جہاز پر موجود ہر شخص کے چہرے پر سنسنی پھیل گئی مختلف کام کرتے لوگوں کے ہاتھ رک گئے لوگ ایک دوسرے کو خبر کرنے لگے۔ میں اور صوفیہ بھی اس طرف چل پڑے جہاں دوسرے لوگ جمع ہو رہے تھے۔

”خدا خیر کرے کہ جانے وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔“  
”ایک بات پر آپ نے غور نہیں کیا سسر۔“  
”کیا؟“

”اصولی طور پر تو اب احرار حیدری اور عدنان ثنائی کو بھی باہر آنا پڑے گا۔“  
”شاید۔“

میں خاموش ہو گئی۔ بڑی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر عرشے پر جمع ہو رہے تھے عرشے پر رش ہو گیا تھا روشتاق کی جھلک بھی نظر آتی تھی لیکن ابھی تک احرار حیدری اور عدنان ثنائی نہیں نظر آئے تھے۔ میری نگاہیں ان دونوں کو تلاش کر رہی تھیں کچھ لمحوں کے بعد گارساں بھی سامنے آ گیا اس نے ہاتھ میں میگا فون پکڑا ہوا تھا۔ ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر اس نے مجمع پر نگاہ ڈالی پھر بولا۔

”سب آگئے دوستو! ایک اہم بات کہنا چاہتا ہوں آپ سے۔ مارشل بالکل نا کارہ ہو چکا تھا لیکن اب وہ ایک بہترین جہاز ہے اور خوش اسلوبی سے اپنی منزل پر جا رہا ہے میرا بدنامی فرانس کے سپاہی کے کہنے کے مطابق شیطان کا دوسرا روپ تھا اور اس کا کہنا ٹھیک ہی تھا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ٹھیک کہہ رہا ہوں میری خواہش تھی کہ آپ لوگوں کو آپ کی منزل تک پہنچا دوں۔ آج کا سفر الجہاز اور اس سے آگے کے راستوں پر تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ الجہاز تو نہیں جاؤں گا کیونکہ حکومت الجہاز میرے اور میرے ساتھیوں کے

لئے موت کے پھندے تیار کئے بیٹھی ہے اس لئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں مارشل کو کسمروں، یا نا بھروسہ جاؤں گا۔ ان دونوں ممالک میں مجھے خطرہ نہیں تھا۔ وہاں مجھے عزت دی جاتی لیکن۔“

وہ رکا تو بہت سے مسافر بیک وقت چیخ اٹھے۔  
”لیکن کیا مسٹر گارسا۔“  
”لیکن کیا کیپٹن؟“

”ٹیم نے جہاز کے انجن ٹھیک کر لئے۔ لیکن اس کے کپاس ٹھیک نہیں کر سکے وہ میری طرح ٹوٹ پھوٹ گئے۔ اور دوبارہ قابل استعمال نہیں ہو سکے۔ ہمارے پاس سمتوں کے تعین کے لئے آلات نہیں ہیں۔ میں نے اس کے لئے ستاروں کا سہارا لینے کی کوشش کی کیونکہ یہ علم بھی مجھے آتا ہے لیکن مجھے کچھ پراسرار مشاہدے ہوئے ہیں۔ سمندری طوفان نے جہاز کو کسی ایسے روٹ پر ڈال دیا ہے جو عام سمندری راستوں سے ہٹا ہوا ہے آپ لوگوں کو خود بھی اندازہ ہوا ہو گا ممکن ہے آپ نے اس بارے میں بھی نہ سوچا ہو کہ اس طویل سفر کے دوران ہمیں نگاہ کی آخری حد تک کوئی جہاز سفر کرتا ہوا نظر نہیں آیا اس سے میرے خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارا سفر نامعلوم سمندروں میں جاری ہے، ایک کپتان ایک جہاز راں ہونے کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہئے اور وہی میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔“  
لوگوں کے منہ سے بے معنی آوازیں نکلی تھیں۔ ان کے چہروں سے خوف نمودار ہو گیا تھا، گارسا نے کہا۔  
”میرے پاس اس بارے میں بھی ایک تفصیل موجود ہے اور آپ لوگوں کا تعاون بھی مجھے حاصل ہے۔ اگر الیکٹرانک کپاس ٹوٹ نہ گئے ہوتے اور انجن کی طرح دوبارہ قابل استعمال بنایا جاسکتا تو میں یقیناً ایسا کرتا اور اس وقت ہمارے لئے یہ مشکل نہ رہتی لیکن ایسا ہو چکا ہے تاہم میرے لئے ایک بہتر پہلو یہ ہے کہ آپ لوگوں کا تعاون مجھے حاصل ہے۔ مارشل غیر محتاط طریقے سے سفر کر کے ایک ماہ سمندر میں گزار سکتا ہے اور اگر ہم خصوصی احتیاط شروع کر دیں تو یہ عرصہ ڈبل یعنی دو

ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کیوں نہ ابھی سے احتیاط شروع کر دی جائے۔ ہذا میں دو ایجنڈے ہر چیز میں احتیاط کی جائے، جیسا عرصے میں ہم زمین تلاش کر لیں گے، میں اس بارے میں آپ کی رائے چاہتا ہوں۔“

اور میں ستاروں کے ماہروں کو دعوت دیتا ہوں کہ اگر وہ راستوں کے تعین میں میری مدد کریں تو میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔“

اس بار نہیں سے کوئی آواز نہیں ابھری تو گارسا نے پھر کہا۔ ”گویا کوئی ستارہ شناس موجود نہیں ہے۔“  
”جیسے اگر چچاؤں کو فراموش کر دیں تو ظاہر ہے مشکلات میں تو رہیں گے۔“ ایک سمت سے روشتاق کی آواز ابھری اور تمام گردنیں اس طرف گھوم گئیں، خود گارساں بھی اوجھڑے ہوئے لگا تھا۔ روشتاق اپنے مخصوص ڈھیلے ڈھالے لباس میں ایک طرف کھڑا مسکرا رہا تھا اور پچھلے بات یہ تھی کہ اس وقت اس کی خوف ناک بلی اس کے کاندھے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گارساں نے چپکٹی ہوئی آواز میں کہا۔

”معزز چچا! کیا تم دوسری بار بھی میری مدد کر سکتے ہو ویسے میں تمہیں بھولا نہیں ہوں، بس دوسرے مسافروں کو یہ احساس میں دلانا چاہتا تھا کہ تم نے مجھے آزادی دلائی ہے اس لئے میں تمہیں خصوصی اہمیت دے رہا ہوں۔“  
”حالانکہ میں اس کا حقدار ہوں۔“ روشتاق نے کہا۔

”اور میں اس حق کا مقروض ہوں چچا، لیکن اگر تم اس مسئلے میں کچھ کر سکو تو پھر جہاز کے تمام مسافر مقروض ہو جائیں گے۔“  
”ہمیں زمین کی تلاش ہے نا؟“  
”بالکل۔“

”تو پھر میں اس ذہین سراغ رساں سے مدد لیتا ہوں جو میرے کاندھے پر موجود ہے اور جو بہت ہی مشکل کا حل اور یہ یقیناً سب کی مشکل حل کر دے گا۔“ اسی وقت روشتاق کے کاندھے پر بیٹھی ہوئی بلی اپنی

جگہ سے کھڑی ہو گئی اس نے حلق سے انتہائی خوف ناک آوازیں نکالیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ لوگ ساکت کھڑے ہوئے تھے، یہ سب کچھ شہدہ گری ہی محسوس ہو رہی تھی لیکن اس شہدہ گری نے پہلے بھی حالات کا رخ بدلا تھا اور اس وقت بھی لوگ اس سے متاثر ہوئے تھے، روشتاق نے آہستہ آہستہ بلی کے کان میں کچھ کہا اور وہ روشتاق کے چہرے کو چاٹنے لگی، پھر اس نے روشتاق کے سر پر اگلے پاؤں رکھے اور اچھل کر اس کے سر پر چڑھ گئی، اس کی گردن حیرت انگیز طور پر چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ روشتاق اور دوسرے لوگ خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ سب پر ایک عجیب سی ہیبت طاری تھی، پھر بلی کا رخ ایک سمت ہو گیا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ سامنے کی سمت اٹھا دیا، روشتاق نے کہا۔

”تم دیکھ رہے ہو کیپٹن گارساں۔“ گارساں کے منہ سے کوئی آواز نکلی، البتہ اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک تھی اور وہ روشتاق کے سر کی جانب دیکھ رہا تھا۔  
”کیا بلی نے کسی طرف اشارہ کیا ہے؟“

”ہاں معزز چچا اس نے ایک ہاتھ دائیں سمت اٹھایا ہے۔“  
”اور تمہیں جہاز کا رخ اسی سمت کرنا ہوگا، سمجھے، تمہیں جہاز کا سمت اسی رخ کرنا ہوگا۔“  
”چچا معاف کرنا جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا یہ سچ ہے؟“

”سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے جیسے کہ انسان عقل سے کام لے۔ میں کوئی شہدہ گری یا تماشہ نہیں کر رہا، میں نے ایک دعویٰ کیا ہے اور تم کوشش کرو۔“  
”ہوں، گویا جہاز کا رخ تبدیل کر لیا جائے۔“  
”یہ تم پر منحصر ہے، اگر تم ان باتوں پر یقین کرو۔“  
”نہیں چچا، اس وقت تو ہم تنہا کاسہارا بھی تلاش کریں گے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر رخ تبدیل کر لو۔“ روشتاق نے پراعتاد لیجھ میں کہا۔ یقیناً شاید گارساں کو بھی نہیں تھا، لیکن وہی ڈوبتے اور نکلنے والی مثال تھی وہ دہریات نشر



کرنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد جہاز کے انجن بند ہو گئے اسے کسی خاص طریقے سے رخ بدلنے کی کارروائی کی جارہی تھی۔ بہر طور وقت گزرتا رہا اور جہاز کا رخ تبدیل کیا جانے لگا۔ سب لوگ منتشر ہو گئے تھے۔ میں بھی صوفیہ کے ساتھ کینن میں واپس آ گئی تھی۔ صوفیہ کے چہرے پر عجیب سے آخار تھے، تھوڑی سی مایوسی کا اظہار ہونے لگا تھا اس کے چہرے سے، اس نے مدہم لہجے میں کہا۔

”کیا ہماری کہانی سمندر میں ہی ختم ہو جائے گی نشاء؟“

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ”میری کہانی کا تو شاید آغاز اور انجام ہی نہیں ہے سسٹر، لیکن آپ یقین کریں میں آپ کے لئے افسردہ ہوں۔“

”اور جب تم بار بار یہ الفاظ کہتی ہو تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے اس خیال کے تحت کہ اپنی زندگی تمہارے نام کرنے کے باوجود میں وہ مقام نہیں حاصل کر سکی جو مجھے ملنا چاہئے تھا تمہاری نگاہ میں۔“

”ارے نہیں نہیں سسٹر..... آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“

”تو پھر جو ہوتا ہے ہم دونوں کے ساتھ بھی ہوگا بلکہ جہاز کے تمام مسافروں کے ساتھ، پھر تم میرے لئے کیوں افسردگی کا اظہار کرتی ہو؟“

نجانے کتنا وقت ہمیں یہاں گزرا تھا کہ یکا یک کینن کے دروازے پر دستک ہوئی اور صوفیہ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا، ایک ادیب و عمر کا شخص کھڑا ہوا تھا اس نے کہا۔

”آپ مس نشاء ہیں؟“

”ہاں بولو کیا بات ہے؟“ صوفیہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”مسٹر ولسن ڈیزل آپ کو ڈیک پر بلا رہے ہیں، براہ کرم میرے ساتھ آئیے۔“

صوفیہ نے میری شکل دیکھی اور میں نے گردن ہلا دی۔

”چلتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے پر آ گئی۔ ”کیا کہا ہے مسٹر ڈیزل نے؟“

”آپ میں سے جو بھی نشاء ہو، وہ مرے ساتھ چلے۔“ وہ شخص بولا۔

”صرف نشاء؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں انہوں نے یہی تاکید کی ہے۔“

”گویا ہم دونوں نہیں جاسکتے؟“

”جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ میں نے آپ سے عرض کر دیا، آگے آپ کی مرضی ہے۔“ وہ شخص بولا اور میں ایک لمحہ کے لئے سوچنے لگی، پھر میں نے صوفیہ سے کہا۔

”نجانے کیا بات ہے سسٹر میں جاتی ہوں، آپ آرام کریں۔“

میں نے لباس وغیرہ درست کیا اور باہر نکل آئی، برابر میں انکل ڈیزل کا کینن تار یک تھا، ماحول پر گھبراہٹ کی گھبراہٹ سی محسوس کر رہی تھی جیسے کچھ ہونے والا ہو لیکن کیا ہو سکتا ہے آخر، ولسن ڈیزل کا پیغام لانے والا میرے آگے آگے چلتا ہوا عرشے پر آ گیا، اس نے تھوڑے فاصلے پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ مسٹر ڈیزل موجود ہیں۔“

جس سمت اس نے اشارہ کیا تھا وہاں نیم تاریکی تھی اور کپتان گارساں نے بہت کم روشنیاں جلائی تھیں۔ تاہم وہند لائٹوں میں انکل ڈیزل کا ہیولہ نظر آرہا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی یہ فاصلہ بھر کر کے ان کے قریب پہنچ گئی۔ پیغام دینے والا شخص اب میرے پیچھے ہو گیا تھا۔ ادھر انکل ڈیزل ریٹنگ پر ہاتھ جمائے سمندر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”کیا بات ہے انکل خیریت؟“ میں نے جبران لہجے میں پوچھا اور ولسن ڈیزل نے رخ بدل کر مجھے دیکھا، لیکن تاریکی اتنی بھی نہیں تھی کہ میں انہیں نہ پہچان سکتی، وہ انکل ڈیزل نہیں تھے، میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، یہ شخص احمد جینی تھا، احمد جینی نے چند لمحات

ناسی اختیار کی پھر بولا۔

”تم سے بہت اہم گفتگو کرنا چاہتا ہوں نشاء۔“ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے، آپ نے مجھے دھوکے سے بلایا ہے مسٹر احمد جینی، یہ شخص مجھے ولسن ڈیزل کے محلے سے یہاں بلا کر لایا ہے۔“

”مجھوڑی تھی، ورنہ شاید تم آنے سے گریز کرتیں۔“

”لیکن اس دھوکہ دہی کی ضرورت کیوں پیش آئی آپ کو؟“

”ایک بات کا جواب دو، کیا مجھے اس جہاز پر دیکھ کر تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟“

”آپ جیسے جرائم پیشہ لوگ کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ سمجھ رہے ہیں آپ مسٹر احمد جینی، مگر میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”بات کرو یا نہ کرو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ سن لو، ہمیں، ہم سب بہت خطرناک جال میں گرفتار ہونے والے ہیں، یہ آخری موقع ہے بالکل آخری، میں نے زندگی کی بازی لگا کر مارشل سے فرار کا انتظام کیا ہے، نیچے ایک اسٹیمر موجود ہے، یہ سیر بھی رکھی ہوئی ہے جو ہمیں نیچے پہنچانے گی، ہم مارشل چھوڑ کر زندگی بچا سکتے ہیں، ورنہ جہاز کا ایک ایک مسافر گارساں کے ہاتھوں فنا ہونے والا ہے، میں اس کا منصوبہ بن چکا ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مارشل کو کوئی ساحل ہی نہ ملے اور ہم لوگ اس کے ہاتھوں فنا ہو جائیں، لیکن میں تمہیں یہ پیش کر رہا ہوں کہ میرے ساتھ چلو ہم خوشی تلاش کر لیں گے، اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ نشاء وقت بالکل ٹھیک ہے۔“

”میرا خیال ہے آپ پاگل ہو گئے ہیں احمد جینی، دماغ خراب ہو چکا ہے آپ کا، میں تھوکتی ہوں آپ کی صورت پر، میرا آپ سے واسطہ نہیں ہے۔“ میں نے غرا کر کہا۔

”بہت گہرا واسطہ ہے نشاء، بہت ہی گہرا واسطہ

ہے۔“ احمد جینی نے کہا اور پھر جو کچھ ہوا میرے لئے غیر متوقع تھا، اچانک ہی عقب میں موجود قوی ہیکل شخص نے جو مجھے بلا کر لایا تھا مجھے دبوچ لیا اور دوسرے لمحے میں اس کے ہاتھوں میں بلند ہوتی گئی، میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکلی تو احمد جینی نے کہا۔

”اوگدھے کے بچے اور احمق تو نے اس کا منہ کھلا چھوڑ دیا ہے، منہ بند کر۔“

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی، دیو ہیکل شخص مجھے اسی طرح اٹھائے ہوئے کنارے پر آیا اور پھر یلنگ پر چڑھ کر اس نے گہرائی میں چھلانگ لگادی، میرے حلق سے نجانے کتنی چیخیں نکل گئی تھیں، مجھے یوں لگا تھا جیسے آسمان سے گری ہوں، قوی ہیکل شخص گرتے ہوئے مجھے چھوڑ دیا اور دوسرے لمحے میں چھپا پک سے پانی میں جا گری۔

”نمکین اور مرچیں لگانے والا پانی میری آنکھوں میں لگا پھر حلق میں بھر گیا اور میرا سانس بند ہونے لگا، لیکن اس شخص نے بڑی ٹیکنیک سے کام لیا تھا وہ میرے ساتھ ساتھ نیچے آیا تھا اور یقینی طور پر وہ کوئی ماہر تیراک تھا چنانچہ اس نے مجھے گہرائی میں نہ جانے دیا اور ایک بار پھر مجھے ہاتھوں میں اٹھالیا۔

میرے ہوش و حواس بحال نہیں تھے اس کے باوجود میں نے اسٹیمر کے انجن کی آواز سننے کو قریب آیا تو مجھے اس میں اچھال دیا گیا، یہاں اور کوئی بھی موجود تھا جس نے مجھے سنبھال کر اوندھا لٹا دیا اور غالباً میرے پیٹ سے پانی نکالنے کا عمل شروع کر دیا گیا، لیکن پانی میرے پیٹ تک نہیں جاسکا تھا بس حلق اور ناک میں بھر گیا تھا، میں نے تڑپ کر اس شخص کو لات ماری اور وہ پیچھے لڑھک گیا اسی اثناء میں دوسرا شخص اوپر چڑھا آیا تھا۔

میں اچھل کر کھڑی ہوئی تو ان دونوں نے جھپٹ کر مجھے دبوچ لیا، سانس احمد جینی مجھے ری کی سیڑھی سے اترتا نظر آرہا تھا، مجھے دبوچنے والوں نے ایک بار پھر مجھے نیچے گرا دیا اور ان میں سے ایک نے میرے دونوں ہاتھ موڑ کر میری پشت پر کس دیئے، دوسرا اسٹیمر سنبھالنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ احمد جینی نے اسٹیمر میں چھلانگ



لگادی اور اس کے بعد اسٹیر آگے بڑھ گیا۔ ہاتھوں کے بعد میرے پاؤں بھی رسی میں جکڑ دیئے گئے پھر اس شخص نے مجھے کھینٹ کر ایک طرف بٹھایا، مجھ سے کچھ فاصلے پر کوئی اور بھی بیٹھا ہوا تھا جس کے خدوخال تاریکی میں نظر نہیں آ رہے تھے، اسٹیر نے ایک زبردست جھٹکے سے رخ تبدیل کیا تھا اور ایک سمت اختیار کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔

میری کیفیت عجیب و غریب ہو رہی تھی، شدید غصہ بھی تھا اور خوف بھی تھا، مجھے اصرار چندی نے مارشل سے اغوا کیا تھا اور موت کے سفر پر چل پڑا تھا اب کیا ہوگا۔ لیکن یہ سوچنے کا موقع نہیں ملا، اچانک مارشل کے برج پر سرچ لائٹ جل پڑی اور اس کی تیز شعاعی روشنی سمندر پر پڑی اور پھر وہ اسٹیر کا تعاقب کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی اور آن کی آن میں اس نے اسٹیر کو اپنی گرفت میں لے لیا، ہم سب تیز دودھیا روشنی میں نہا گئے۔ اصرار چندی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”اوہ! راز لہل گیا، انہیں پتہ چل گیا، رفتار تیز کر دو، رفتار تیز کر دو۔“

”اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے سر۔“ اسٹیرنگ پر کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔

اچانک روشنی بجھ گئی، خاموشی چھا گئی، بڑی سنسنی کا احساس ہو رہا تھا، سرچ لکڑا رہا تھا آنکھیں بند ہوئی جاری تھیں، اسٹیر پر موجود لوگ بھی سکتے کی سی کیفیت میں تھے، ایک ایک لمحہ چنچنہوا کر رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اسٹیر روشنی میں تو آ گیا ہے، پھر ادھر سے کوئی کارروائی کیوں نہیں ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق کوئی پندرہ منٹ گزر گئے پھر اچانک اسٹیرنگ پر کھڑا ہوا شخص دہشت بھرے لہجے میں بولا۔

”کارروائی شروع ہو گئی ہے۔“

”کیا کہا؟“ اصرار چندی کا لہجہ بھی خوف سے بھر پور تھا۔ اسٹیر چلانے والے کے جواب دینے کی ضرورت نہیں پیش آئی، تین سمت سے مدہم مدہم روشنیاں سفر کرتی ہوئی نظر آئی تھیں، یقیناً یہ بھی اسٹیر تھے

جو اس اسٹیر کے تعاقب میں چلے تھے، میرے دل کو کچھ ڈھارس ہوئی، یہ سخت خوف زدہ ہو گئے تھے، اچانک ٹھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا شخص بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”کھیل ختم ہو گیا چندی۔“

”میں آخری دم تک کوشش جاری رکھوں گا۔“ اصرار چندی نے جواب دیا پھر اسٹیر چلانے والے سے بولا۔

”رفتار تیز کر دو ان کے زرخے میں آئے سے بچو۔“

”عجیب بات کر رہے ہیں آپ سر، اس کی رفتار اس سے زیادہ نہیں ہے میں کیا کروں۔“

”اوہو..... وہ آخر، وہ دیکھو ان کا فاصلہ تو کم رہا جارہا ہے، آخراں کی رفتار اتنی تیز کیوں ہے؟“

”ان کی رفتار تیز نہیں ہے بس انہوں نے ہمیں گھیرنے کے لئے خاص طریقہ کار اختیار کیا ہے۔“

”مشکل ہے نکلتا مشکل ہے، وہ بحری قواں ہے، سمندروں کا کیرا۔“ سامنے والے آدی نے کہا اور میں نے آواز پہچان لی، یہ عدنان ثنائی تھا، اصرار چندی سے ہوئے انداز میں تین سمتوں سے آنے والی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے فرار ہونے والے اسٹیر کو گھیر لیا ہے۔ دفعہ ان پر سرچ لائٹیں روشن ہو گئیں، گوان روشنیوں نے بھی ہمارے اسٹیر کا احاطہ کیا

کیا تھا لیکن بس چند لمحات تھے جب وہ اسٹیر تک پہنچنے والی تھیں اور یہ لمحات بھی گزر گئے، سب کو آنکھوں پر ہاتھ رکھنے پڑے تھے، میں نے بھی گردن جھکا کر آنکھیں کا لیں، پھر میرا فون پر آواز ابھری جو پہلے تو واضح نہیں تھی لیکن پھر صاف سنائی دینے لگی۔

”تم لوگ مشین گنوں کی زد پر ہو، صرف ایک منٹ دیا جاتا ہے اسٹیر کا انجن بند کر دو اور ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔ کسی نے حرکت کی تو فائر کھول دیا جائے گا، یہ سمندر شراک پھیلے ہوئے سمندر پر ہے، پانی میں کودے تو بدترین موت مارے جاؤ گے، پانچ منٹ گزر گئے ہیں وارننگ پھر سن لو۔ وہی الفاظ پھر دہرائے

”تم اور اچانک اسٹیر کا انجن خاموش ہو گیا۔“

”یہ کیا کیا تم نے گدھے کے بچے۔“ اصرار چندی نے کہا۔

”آپ کا دماغ خراب ہے مسٹر چندی، ہم کتے کی موت مرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔“ اسٹیر چلانے والے کے دوسرے ساتھی نے کہا اور چندی اس کے بعد کچھ نہ بول سکا، تینوں اسٹیر ہمیں روشنی کی زد میں لائے ہوئے ہمارے قریب آ گئے، پھر ان پر سے رسی اور آنکڑے پھینک کر اسٹیر کے کناروں میں پھنسائے گئے اور اس کے بعد چند افراد اسٹیر پر آ گئے، انہوں نے پھرتی سے اسٹیر پر موجود چاروں افراد کو قبضے میں لے لیا، مجھے دیکھ کر ان میں سے ایک نے کہا۔

”اوہ مائی گاڈ یہ ایک لڑکی کو بھی اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔“

”کھولو اسے لڑکی ان کے علاوہ اور بھی کوئی اسٹیر میں موجود ہے۔“ دوسرے آدی نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی۔“

”کوئی اور ہے تمہارے ساتھ؟“ پہلے آدی نے سوال کیا۔

”نہیں اور کوئی نہیں ہے۔“ اس بار عدنان ثنائی نے کہا۔ چلو دوسرے اسٹیر پر چلو۔

”میں لنگڑا ہوں براہ کرم مجھے سہارا دو۔“

ان لوگوں کو دوسرے اسٹیر پر پہنچادیا گیا مجھے بھی ایک اور اسٹیر پر منتقل کر دیا گیا تھا جس اسٹیر پر چندی فرار ہو رہا تھا اسے بھی سنبھال لیا گیا اور پھر چاروں اسٹیر مارشل کی جانب چل پڑے۔ اوپر جانے کے لئے مجھے بھی رسی کی سیریشی استعمال کرنی پڑی تھی، مارشل پر زیادہ ہنگامہ نہیں ہو رہا تھا، لیکن ڈیک پر سسٹر صوفیہ، وسکن ڈیزل، عسکری اور دوسرے چند افراد کے ساتھ گارساں بھی موجود تھا، عسکری ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا اس نے مجھے سہارا دینا چاہا لیکن میں نے اس سہارے کو قبول نہیں کیا، البتہ سسٹر صوفیہ مجھ سے لپٹ گئی اور بری طرح

”تم ٹھیک ہونا ڈارلنگ تم ٹھیک ہونا۔“ اسی وقت گارساں بولا۔ ”کیا یہ لڑکی بھی فرار ہونے والوں میں شامل ہے؟“

”نہیں کیپٹن یہ لوگ اسے اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ اسٹیر میں یہ ہمیں رسی سے بندھی ہوئی ملی تھی، ہم نے اسے کھولا تھا۔“

”تمہارا کیمین نمبر کیا ہے بے بی؟“ گارساں نے پوچھا، لیکن میرے بجائے سسٹر صوفیہ نے انہیں کیمین کا نمبر بتایا اور بولی۔

”ہم دونوں ساتھ رہتے ہیں۔“

”اسے لے جاؤ اس وقت تک اپنے کیمین سے باہر مت نکلتا جب تک میں تمہیں طلب نہ کروں۔ کوئی اور کیمین میں نہ جائے ان پر پہرہ لگا دیا جائے۔“

”اوکے کیپٹن۔“

”ان لوگوں کو نیچے لے جاؤ اور سنو، ان کے لباس اتروالینا تاکہ.....“ یہ کہہ کر گارساں عجیب سے انداز میں ہنسا اصرار چندی کے منہ سے ایک آواز نکلی تھی، لیکن گارساں پلٹ کر واپس چل پڑا، سسٹر صوفیہ مجھے لے کر کیمین کی جانب چل پڑیں، کیمین میں داخل ہوتے ہی وہ بے اختیار ہو گئیں اور مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگیں۔

میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی، لیکن اس وقت مجھے صوفیہ کی محبت کا احساس ہو رہا تھا، یہ احساس کچھ عجیب سا تھا، جب ان کا دل ہلکا ہوا تو وہ میرے لئے دوسرا لباس نکال کر بولیں۔

”چلو کپڑے بدل لو۔“

”جی۔“ میں نے کہا، پھر جب میں کپڑے تبدیل کر کے باہر آئی تو صوفیہ کنگھے سے میرے بال سنوارنے لگیں، پھر بولیں۔

”کیا ہوا تھا نشاء..... کیا ہوا تھا میری جان؟“

”اصرار چندی نے مجھے اغوا کیا تھا۔“

”آخر کیسے..... یہ کیسے ہوا تھا؟“

”مجھے دھوکے سے بلایا گیا تھا انکل ڈیزل کے نام پر، لیکن مجھے بلانے والا اصرار چندی تھا، اور پھر میں نے



صوفی کو ساری تفصیل بتائی، وہ چند لمحاتے خاموش رہنے کے بعد بولیں۔

”تمہیں دیر ہوگئی تو میں پریشان ہو کر عرشے پر گئی، وہاں کچھ کارروائی ہو رہی تھی، مجھے شبہ بھی نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ کچھ ہوا ہے، میں اس کارروائی کو نظر انداز کر کے تمہیں تلاش کرتی پھری تب اچانک ہی مجھے مسٹر ڈیزل مل گئے، انہوں نے بتایا کہ کچھ لوگ ایک اسٹیر لے کر فرار ہوئے ہیں، میں نے بے قراری سے تمہارے بارے میں پوچھا تو وہ دنگ رہ گئے اور پھر کہیں دوڑے چلے گئے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا تمہاری تلاش میں ناکام ہو کر میں وہاں کھڑی ہو گئی اور پھر مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی واقعہ پیش آیا ہے، اب مجھے یقین ہو گیا انشاء خدا کی قسم اب مجھے یقین ہو گیا ہے۔“

”میرے باپ، میرے مالک، میرے رہنما، میرے دیوتا، اے کے ہمدانی کے ساتھ وہ وحشیانہ سلوک احمد جینیدی ہی نے کیا ہے وہ اور اب میں اس سے انتقام لوں گی۔ ہمدانی میرا باپ تھا، میرا باپ تھا وہ، میرا رہنما تھا، اس نے مجھے نئی زندگی سے روشناس کرایا تھا۔“ صوفیہ شہید جذبات کے عالم میں خاموش ہو گئی تھیں۔

”اور وہ کجبت، بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا، وہ لنگڑا پروفیسر وہ بھی یقیناً اس سے مختلف نہیں ہوگا۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ مسٹر صوفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر ہم دونوں بہت دیر تک خاموش رہے اس کے بعد مسٹر صوفیہ بولیں۔

”میرا خیال ہے اب نہ تو کسی کو ہمارے پاس آنے دیا جائے گا نہ ہم باہر جا سکیں گے گارساں سخت اور با اصول آدمی ہے۔“

رات گزر گئی، نیند تو بالکل نہیں آئی تھی ایک لمحے کے لئے پلک جھپکی تو خود کو پانی میں ڈوبتا محسوس کرتی، اور دہشت زدہ ہو کر جاگ اٹھتی، پھر آہستہ آہستہ روشنی نمودار ہو گئی، پھر صبح کو مسٹر صوفیہ نے تجربہ کر کے دیکھ لیا،

وسکن ڈیزل کی تلاش میں باہر نکلی تھیں لیکن انہیں دروازے پر روک دیا گیا۔

”آپ کا ناشتہ ابھی آ رہا ہے میڈم، براہ کرم آپ باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔“

”میں برابر اگلے کیمپن میں جانا چاہتی ہوں۔“

”آپ اپنے کیمپن کا دروازہ بھی اس وقت تک مت کھولیں جب تک کیمپن سے ملاقات نہ کر لیں۔“ جواب ملا۔

ناشتہ تھوڑی دیر کے بعد آ گیا کیمپن گارساں نے دن کے بارہ بجے مجھے طلب کیا تھا۔ کھلی عدالت لگائی تھی اس نے تمام مسافر عرشے پر جمع تھے، درمیان میں احمد جینیدی عدنان ثنائی اور وہ دونوں افراد موجود تھے جنہوں نے مجھے اغواء کیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈیاں پڑی ہوئی تھیں، اوپری بدن بے لباس تھے اور ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ ہمیں گارساں کے سامنے پیش کیا گیا، کچھ فاصلے پر رومشاق عسکری کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اس کے چہرے پر مسخرانہ انداز کے آثار تھے، کیمپن گارساں نے پرا حترام انداز میں مجھے مخاطب کیا اور بولا۔

”معزز خاتون! آپ سے چند سوالات کروں گا، براہ کرم سچ جواب دیجیے گا۔“

”جی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”فرار کے منصوبے میں آپ کا کتنا حصہ تھا؟“

”مسٹر گارساں، میں کسی فرار وغیرہ کے بارے میں نہیں جانتی، اس شخص نے دھوکہ دے کر مجھے عرشے پر بلوایا یہ شخص..... میں نے اس شخص کی طرف انگلی اٹھائی جو مجھے وسکن ڈیزل کے حوالے سے عرشے پر لے گیا تھا، میں نے گارساں کو پوری تفصیل بتائی اور گارساں نے عدنان ثنائی کی طرف رخ کر کے کہا۔

خاتون کی ضرورت تھی۔“ احمد جینیدی نے جواب دیا۔

”اسی کا انتخاب کیوں کیا گیا تھا؟“

”بس ہمیں یہ اطمینان تھا کہ یہ اس نام کا حوالہ دینے سے آجائے گی، اس کی اور کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔“

”کہاں جانا چاہتے تھے؟“

”کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا بس ہم زندگی کی جدوجہد کرنا چاہتے تھے، آزادی کے ساتھ تمہاری غلامی میں نہ رہ کر اور سنو، ہم بھی کوئی منزل نہیں پاسکو گے مائی ڈیئر گارساں مارشل اسی طرح سمندر میں ڈولتا رہے گا، اس کے تمام مسافر آہستہ آہستہ مرجائیں گے ہم زندگی کی جدوجہد کرنے کے لئے فرار ہو رہے تھے اور کوئی منصوبہ نہیں تھا ہمارا۔“ احمد جینیدی نے کہا۔

”یہ جرم ہے میرے دوست، سمندری اصولوں کے مطابق جرم ہے یہ اور اس کی سزا ہوتی ہے، تم نے ایک قیمتی اسٹیر لے کر فرار ہونے کی کوشش کی تھی، گرفتار ہو گئے اور اگر تمہارے پاس اسلحہ ہوتا تو تم اسلحہ استعمال کرتے، خیر تم نے جدوجہد نہیں کی اس لئے تمہاری سزا بہت معمولی ہے، تم چاروں جہاز کے فرش صاف کرو گے۔ تمام کیمپنوں کے ہاتھ روم دھوؤ گے، منتظمین تمہاری ڈیوٹیاں تمہیں بتاتے رہیں گے، اوکے، ان کی جھنڈیاں کھول دی جائیں اور ہاں سنو! آخری بات، قہر لے کر تم نے کوئی دس دس کوڑے مارے جائیں گے تین بار اور اس کے باوجود حکم عدولی ہوئی تو تمہیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا جائے گا بس منتشر.....“ گارساں نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے، پھر میری طرف رخ کر کے بولا۔

”کیا یہ سزا مناسب ہے ان کے لئے لڑکی تم اسے قبول کرتی ہو، اوکے اب جاؤ آرام کرو۔“

گارساں کے اندر ایک خاص بات محسوس کی تھی میں نے وہ جتنی فیصلہ کرنا تھا اس اعتماد کے ساتھ کہ یہ فیصلہ آخری فیصلہ ہے، غرض یہ کہ سب لوگ منتشر ہو گئے اور میں وسکن ڈیزل نے بتایا تھا کہ وہی شخص ان کے پاس بھی آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ احمد جینیدی اس سے

ایک خاص موضوع پر بات کرنا چاہتا ہے۔

”گلد..... پھر۔“ میں نے پوچھا۔

”انگل کہہ رہے تھے کہ یہ بدترین سازش تھی۔“

”لیکن میں۔۔۔ وہ مجھے کیوں ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔“

”تم.....! مسٹر صوفیہ مسکرا کر بولیں۔“ تم مصر کی چھ ہزار سالہ تاریخ کا ایک پراسرار ترین باب ہو۔“

”کبھی کبھی دل چاہتا ہے مسٹر کہ میں کسی وزنی ہتھوڑے سے اپنا سپر پاش پاش کر لوں۔“

”کیوں۔“

”تاکہ اس میں جتنے راز پوشیدہ ہیں، باہر آجائیں۔“

”وقت اپنے ہاتھوں سے اپنی تحریر لکھتا ہے ڈارلنگ۔“

”نہ جانے وہ کون تھے جو احمد جینیدی اور عدنان ثنائی کا ساتھ دے رہے تھے۔“

”کوئی بھی ہو سکتے تھے کرائے کے لوگ، یا پھر اس فرار کے ہموار۔“

اس شام جب فضا میں دھند لگے اتر رہے تھے ہم نے رومشاق کو برن پر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہاں نہ جانے کیا میٹنگ ہوئی ان دونوں میں گہری دوستی ہو گئی تھی ہم دونوں ایک طرف کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے کہ پیچھے سے عسکری کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو انشاء مجھے کچھ وقت دو گی۔“

”کیا مطلب۔“

”میں تمہاری باتوں سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“



کرتے ہیں عسکری۔ میں صوفیہ سے باتیں کر رہی ہوں  
 آپ بلاوجہ ہمارے درمیان۔“  
 ”اوہ..... وہ شرمندگی سے بولا اور پھر وہاں  
 سے آگے بڑھ گیا۔ میں نفرت بھری آنکھوں سے اسے  
 دیکھتی رہی تھی مارشل کا سفر بدستور جاری تھا اس وقت شام  
 کے پانچ بجے تھے کہ اچانک جہاز کے سارن بجنے لگا۔  
 بڑی ہولناک آواز تھی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر عرشہ  
 پر جانے لگے بہت سے لوگ عرشہ پر ہی تھے ہم بھی  
 اوپر پہنچ گئے تھی مائیکروفون پر گارساں کی آواز ابھری۔  
 ”مارشل کے مسافر۔ خوشخبری سنو! ہم نے زمین  
 دیکھ لی ہے۔ طاقتور دور بینوں سے زمین دیکھ لی گئی ہے۔  
 ابھی آپ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے ہم نے فاصلوں کا  
 تعین کر لیا ہے کل صبح تک ہم اس زمین کے قریب پہنچ  
 جائیں گے یہ خبر پورے دھوکے سے دی جا رہی ہے۔“  
 وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ زندگی کوتر سے ہوئے  
 لوگ پھر سے خوشیوں میں ڈوب گئے۔ اور طرح طرح  
 سے اس کا اظہار ہونے لگا۔  
 ہم تو صرف دیکھنے والے تھے۔ ویسے میں سوچ  
 رہی تھی کہ روشاق، احمد جیدی سے کہیں زیادہ چالاک  
 اور خطرناک تھا احمد جیدی اپنی حماقت سے عذاب میں  
 گرفتار ہو گیا تھا جبکہ روشاق نے گارساں جیسے خطرناک  
 آدمی کو اپنی نگاہ میں لے لیا تھا۔  
 جہاز کے مسافر نہ جانے کیا کیا کرتے پھر رہے  
 تھے بیشتر تو ساری رات نہیں سوئے تھے اور عرشہ پر ہی  
 رہے تھے صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ زمین کی  
 صورت نظر آ گئی۔ میں اور صوفیہ بھی زندگی سے اتنے  
 بیزار نہیں تھے کہ زمین کی خوشخبری کے باوجود گہری نیند  
 سو جاتے۔ ہم نے بھی عرشہ پر مسافروں کے جھوم میں  
 جگہ بنا کر ان ساحلی ٹیلوں کو دیکھا جو دریا اور بد نما شکل  
 رکھتے تھے ان کے دامن میں کالی چٹانیں بکھری نظر  
 آ رہی تھیں۔  
 مارشل کی رفتار سست ہو گئی تھی اور ساحل پر نگاہ  
 رکھتے ہوئے سفر کیا جا رہا تھا۔

صوفیہ بھی میرے ساتھ موجود تھی۔ اس نے  
 کہا۔ ”کیا خیال ہے نشاء اس جگہ کے بارے میں کیا  
 کہتی ہو۔“  
 ”شاید کوئی جزیرہ ہے۔“  
 ”شاید۔ غیر آباد سا لگتا ہے۔“  
 ”ابھی کافی دور ہے۔“  
 ”ایں۔ لگتا نہیں ہے۔ مجھے تو بے حد خوف محسوس  
 ہو رہا ہے۔“  
 ”کیوں.....“  
 ”میں نے سمندروں میں ایسے جزائر کے  
 بارے میں پڑھا ہے جو نامعلوم اسرار رکھتے ہیں اگر ایسا  
 ہوا تو۔“  
 ”تو ہم ایک نئے عذاب میں گرفتار ہو جائیں  
 گے۔“  
 ”یقیناً ایسے جزائر میں آبادی کا نام و نشان نہیں  
 دنیا کو ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔“  
 ”کیسی دل ہلا دینے والی باتیں نہ کریں سسٹر۔“  
 ”پلیز ڈراما مت کرو۔ لیکن میرے اندر جو خوف  
 ابھر رہا ہے میں اسے دبا نہیں پارہی ایک خوف ناک  
 خیال میرے دل میں آ رہا ہے پہلے سمندر کے قیدی تھے  
 اب ایک ویران اور غیر آباد جزیرے میں قید ہو جائیں  
 گے۔ اپنی دنیا سے دور اور۔ اور۔“ سسٹر صوفیہ ایک گہری  
 سانس لے کر خاموش ہو گئی۔  
 ”پلیز ایسی خوف ناک باتیں نہ کریں  
 سسٹر۔ ہو سکتا ہے آپ کا خیال غلط ہو۔“  
 ”تم دیکھ رہی ہو۔ مارشل ساحل کے ساتھ آگے  
 بڑھ رہا ہے۔ ابھی تک کوئی عمارت یا ایسی کوئی شے نہیں  
 نظر آئی جس سے یہاں انسانی وجود کا پتہ چل سکے۔  
 ”پتہ نہیں۔“ میں نے خوف زدہ لہجے  
 میں کہا۔ جہاز کے دوسرے مسافروں کے ذہنوں میں  
 کیا تھا اس کا اندازہ مشکل تھا ممکن ہے دوسرے لوگ بھی  
 ہماری طرح ہی سوچ رہے ہو۔ اب سورج خوب چمکنے  
 لگا تھا اور ہر شے صاف نظر آ رہی تھی مارشل پورے

جزیرے کا چکر لگا رہا تھا پھر اس کا یہ چکر پورا ہو گیا  
 اور روشن دن میں اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ کوئی  
 غیر آباد جزیرہ تھا۔  
 اس دوران تجربے کار کپتان نے مارشل  
 کو ہٹا کر انداز کرنے کے لئے مناسب جگہ کا انتخاب  
 کر لیا تھا۔ چنانچہ چکر مکمل کرنے کے بعد منتخب جگہ مارشل  
 کے آگے بند کر دیئے گئے جو جگہ منتخب کی گئی تھی وہاں دو بلند  
 پہاڑ اپنی وسعتوں کا آغاز کرتے تھے ان کے  
 درمیان ایک وسیع درہ بالکل اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے  
 جزیرے کا داخلی دروازہ ہو۔ مارشل کے لنگر ڈال دیئے  
 گئے۔ مسافروں میں جو بے چارے اور تجربے کار افراد تھے وہ  
 صورت حال کا اندازہ کر چکے تھے لیکن زیادہ تر ایسے تھے  
 جو زمین مل جانے سے خوش تھے اور انہوں نے بعد میں  
 جہنم آنے والی صورت حال پر غور ہی نہیں کیا تھا۔  
 گارساں بھی عرشہ پر آ گیا تھا۔ آخر اس  
 نے کہا۔  
 ”دوستو!..... زمین ہمارے سامنے ہے اور اس  
 کے اطراف کا چکر لگانے سے ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ  
 صرف ایک جزیرہ ہے۔ ہمیں اس کی نوعیت کا کوئی اندازہ  
 نہیں ہے۔ بظاہر یہ غیر آباد معلوم ہوتا ہے لیکن بہر حال  
 یہاں ہمیں سمندر کے بے مسمی سفر سے نجات حاصل ہوئی  
 ہے۔ اس بات کے امکانات اب بھی ہیں کہ جزیرے کے  
 اندرونی حصے میں ہمیں آبادی مل جائے ہو سکتا ہے کسی  
 جدید ملک نے یہاں اپنا کوئی ریسرچ کیمپ قائم کیا  
 ہوا ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ میں سے کسی شخص  
 جزیرے پر اترنے کے لئے بے چین ہیں۔ میں نے  
 آپ کی بحفاظت خشکی پر پہنچانے کی ذمہ داری قبول کی  
 ہے جسے میں نے پورا کر دیا ہے میں آپ کا حکمران نہیں  
 ہوں لیکن میں آپ کی اپنی زندگی اور بہتری چاہتا ہوں۔  
 اور اس کے لئے ایک بار پھر میں آپ کی اجازت  
 چاہتا ہوں۔“  
 جہاز کے تمام مسافر گارساں سے خوش تھے۔  
 انہوں نے اسے بخوشی اجازت دے دی کہ وہ رک کے

آئندہ کے راستے منتخب کرے تب گارساں نے کہا۔  
 ”میں آپ کے ساحل پر جانے کے انتظامات  
 کرتا ہوں۔ کوئی شخص بے اعتدال کی کوشش نہ کرے۔  
 اور میری اجازت کے بغیر ساحل سے آگے بڑھنے کی  
 کوشش نہ کرے۔ تمام مسافر زمین پر ایک جگہ جمع  
 ہو جائیں پھر آگے کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔“  
 آہستہ آہستہ لائچیں پانی میں اتاری جانے  
 لگیں اور مسافر پورے منظم کے ساتھ ساحل کی طرف  
 چل پڑے۔ گارساں بے وقوف نہیں تھا۔ عدنان  
 ثنائی، احمد جیدی، اور دونوں..... پر خاص نگاہ  
 رکھی گئی تھی میں اور سسٹر صوفیہ بھی ساحل پر پہنچ گئے اس  
 خوشی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا جو زمین پر قدم رکھ  
 کر حاصل ہوئی تھی۔  
 صوفیہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”خداوند عالم  
 تو نے انسان کو کیا بنایا ہے۔ کیسا عجیب لگ رہا ہے زمین  
 پر قدم رکھ کر۔ شاکر پھیلوں کی خوراک بننے سے۔  
 یا سمندر میں بھوک پیاس کے مرنے سے بچنے کے بعد یہ  
 زندگی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔ لیکن۔“  
 ”جی سسٹر۔“  
 ”آگے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“  
 ”گارساں نے ایک اور بات بھی تو کہی تھی۔“  
 ”ہاں کسی ملک کی تجربہ گاہ۔ یا ریسرچ کیمپ کے  
 بارے میں نا۔“  
 ”ہاں۔“  
 ”ممکن نہیں ہے۔ اتنا بڑا جہاز ساحل سے آگے  
 ہے۔ اور کسی نے اس طرف متوجہ ہونے کی کوشش نہیں کی  
 جبکہ یہ ایک فطری عمل تھا۔  
 سسٹر صوفیہ کی دلیل وزنی، لیکن خوف ناک تھی۔  
 میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر دوسروں کو دیکھنے لگی  
 عسکری، وسکن ڈیزل، روشاق وغیرہ بھی نظر آ رہے  
 تھے۔ پتہ نہیں ان کی سوچوں کیا تھیں۔ سب ہی اپنے  
 طور پر اس جزیرے کا جائزہ لے رہے تھے ایک  
 بار پھر صوفیہ کی آواز ابھری۔



”نشاء جان“ میں نے چونک کر صوفیہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے کے پیلاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ حد سے زیادہ خوف زدہ ہے۔ مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اس سے کہا۔ ”مجھے معاف کرنا میں تمہیں بہت پریشان کر رہی ہوں۔“

”آج ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔“ سسز میرے لئے یہ شرمندگی میں کافی ہے کہ آپ میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسی ہیں۔

”پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔ یہ جزیرہ مجھے اس ہولناک سمندری سفر سے زیادہ خوف ناک لگ رہا ہے تم نے ایک خاص بات نہیں محسوس کی۔“

”کیا۔“

”یہاں زندگی کا نام و نشان نہیں ہے۔ ورنہ ایسی جگہوں پر سمندری پرندے کی گل وغیرہ ضرور نظر آتے ہیں۔“

”لیکن یہاں تم دیکھ رہی ہو؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور گارساں واقعی انتظامی اور کا بادشاہ نظر آ رہا تھا اس نے دس دس آدمیوں کے گروپ بنائے اور انہیں اس راستے کی طرف روانہ کر دیا یہ گروپ کا ایک دوسرے سے سوگڑ کا فاصلہ رکھا گیا تاکہ باقاعدہ اور محتاط طریقے سے پیغام رسائی ہو سکے باقی لوگ ساحل پر اتر کر بیٹھ گئے۔ اور دوسرے امور سرانجام دیئے جانے لگے۔ مارشل پر گارساں کے ایسے ساتھی موجود تھے جو اسلحہ اور خوراک کی حفاظت کر رہے تھے۔

آخر کار روانہ ہونے والے گروپوں کی طرف سے خبریں موصول ہونے لگیں جن کا لب لباب یہ تھا جزیرے کے دوسری طرف مجھوروں کے جنگل میں فضا میں جوشی میٹھی کھجوروں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے وہ اسی وجہ سے ان کی چھانڈیوں میں پیلے پیلے سنگروں جیسے پھلوں کے جھاڑ بکھرے ہوئے ہیں اس طرف پرندے موجود ہیں بڑے جانور نہیں نظر آتے زیادہ تر بڑے سے طوری چٹانیں نظر آ رہی ہیں کہیں کوئی انسانی وجود یا عمارت نہیں نظر آئی۔

”جزیرہ غیر آباد ہے۔“ گارساں نے اعلان

کیا۔ ”ہمارا دوسرا عمل یہ ہوگا کہ ہم پہاڑ کے دوسری طرف منتقل ہو جائیں۔ جہاز کی اہم خوراک کو محفوظ رکھا جائے کھجور مکمل غذا ہونی ہے ان پھلوں کا عملی تجربہ کیا جائے گا۔ پہلے کچھ دیر آرام کیا جائے گا پھر دوسرے فیصلے کیے جائیں گے۔“

جزیرے کے مسافر چل پڑے۔ ہم بھی انہیں میں شامل تھے۔ صورت حال بڑی غم انگیز تھی۔ ہر چیز سے نفرت محسوس ہو رہی تھی صوفیہ یہاں آ کر حوصلہ ہار گئی تھی۔ رات کو وہ سسک سسک کر رو پڑی تھی میں اسے دلا سہ دینے لگی مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمارے پیچھے عسکری بھی موجود ہے۔

”خود کو بچھپائیے میڈم صوفیہ۔ آپ نے بہت بڑی ذمہ داری قبول کی ہے۔“ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا اور میرے دل میں شدید نفرت پیدا ہوئی۔

”تم ہمارے سر پر کیوں مسلط رہتے ہو۔ یہاں سے دور چلے جاؤ۔“

”یہاں آ کر تو ہم خود بخود ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ رہنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ تھوڑے دن گزر جانے دیں پھر دیکھیں لوگ کس طرح ایک دوسرے کے التفات کو تمہیں گے۔“

”اس کے باوجود میں تم سے رجوع نہیں کروں گی۔ دوسری بات اگر رشتاق نے تمہاری ڈیوٹی مجھ پر لگا رکھی ہے تو اسے بتا دینا کہ جو کچھ میں اسے بتا چکی ہوں اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم ہے ماہوی ہوگی۔“

”تمہارا شکر یہ نشاء تمہارے طرز عمل نے میرے احساس شرمندگی میں کمی کر دی ہے میں نے اپنی غربت مندی پریشانیوں دور کرنے کے لئے رشتاق سے رجوع کیا تھا۔ بعد میں تم سے محبت ہو گئی تو اسے عمل کو گناہ سمجھ کر اس کا کفارہ ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن اب میں مظلومیت کی منزل میں داخل ہو گیا ہوں تم اب زیادتی کرنے لگی ٹھیک ہے اب میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

گارساں اب بھی سارے انتظامات سنبھالے ہوئے تھا کھانے وغیرہ کا بندوبست اسی باقاعدگی سے کیا گیا تھا کہ درزی زمین پر بیٹھنے کا تجربہ بھی کیا تھا لیکن وقت سب کچھ کرا لیتا ہے جوں جوں رات بھیکتی جا رہی تھی فضا میں سردی اترتی جا رہی تھی ہوا مہم لیکن خشک تھی پھر یہ نہیں کہے نیند آگئی صبح جاگی تو جسم اکڑا ہوا تھا بدن میں درد ہو رہا تھا چائے پینے دی گئی جس کے ساتھ دو دو بسکٹ تھے۔ ناشتہ کے بعد لوگ ٹولیاں بنا کر جنگل میں نکلے تھے۔ گارساں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

جنگل میں دور تک نکل جانے والے جب واپس آئے تو کوئی اچھی خبر نہیں لائے تھے۔ انہوں نے تصدیق کی کہ جزیرے پر کوئی آبادی نہیں ہے۔ میں نے مہر و سکون سے یہ خبر سنی تھی گارساں نے خوراک پر سختی شروع کر دی پہلے پھل اور کھجوریں خوراک کا حصہ بنائی گئیں شام کے چھپنے میں دسکن ڈیزل ہمارے پاس آ بیٹھا۔ اس نے کہا۔

”وہ مشکل مرحلہ آ گیا ہے جس کے آگے میری توقع کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ میں تم لوگوں کو کوئی دلا سہ نہیں دے سکتا۔“

”ٹھیک ہے انکل ہم نے اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”مگر میری تقدیر کیوں کالی ہو گئی ہے میں کیا کروں۔“ اچانک صوفیہ پھٹ پڑی اور ہم دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے ڈیزل نے کہا۔

”مارشل پر جتنے مسافر ہیں ان میں سے کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ وہ ایسی کسی شکل کا شکار ہو جائیں گے جو کچھ ہوا ہے سب کی توقع کے خلاف ہوا ہے۔ جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے کے بجائے تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرو۔“

”ہاں۔ کالی تقدیر کے فیصلے کا انتظار۔“ صوفیہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا میں ششدر رہ بیٹھی تھی دسکن ڈیزل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اس کے باوجود۔ خود پر کنٹرول رکھیں میڈم صوفیہ۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے تیسری کوئی صورت نکل آئے۔“

”آپ نے زبان پر تالے کیوں لگا رکھے ہیں مسٹر ڈیزل، آپ ہمیں کیوں نہیں بتاتے کہ آپ کو آئندہ کیا کرنا تھا آپ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ ہارون دانش نے ہمیں آپ کے پاس کیوں بھیجا تھا؟ عجیب پر اسرار کھیل چل رہا ہے زندگی بار بار موت سے ہمتنار ہو رہی ہے اور اس راز کا انکشاف نہیں کیا جا رہا جس کے لئے یہ سب عذاب مول لیا گیا ہے۔“ صوفیہ نے کہا۔

”اس راز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے بے بی۔“ ڈیزل نے چل سے کہا۔

”وہ تو میں بھی جانتی ہوں مگر کیا کروں، پاگل پن سوار ہو گیا تھا دیوانی ہو گئی تھی لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے مجھے آگے کا حال معلوم ہونا چاہئے۔“ صوفیہ نے جنونی لہجے میں کہا۔

”تمہاری مختصر عقل کچھ نہیں سمجھ پائے گی۔ اوکے۔۔۔۔۔“ ڈیزل نے کہا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ صوفیہ کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”سسز۔“

”سوری نشاء۔ ویری سوری۔ بس بہت ہو گیا اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں ہے۔ سوری۔۔۔۔۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گئیں۔

”سسز۔ پلیز! میں نے رندھی ہوئی آواز میں کئی بار اسے پکارا لیکن صوفیہ تیز قدم اٹھاتی کافی دور چلی گئی اور پہلی بار میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ میں خوب روئی پھر خود ہی جب بھی ہو گئی۔ رونے والوں کو کوئی دلا سہ نہیں دیتا۔ میں ایسی ہی تھی مسافر عورتوں میں سے اکثر بے اختیار رو پڑی تھیں اور خود ہی خاموش بھی ہو جاتی تھیں ہر ایک کے رونے کی وجہ مختلف تھی میرے ساتھ جو کچھ تھا وہ میرے رونے کے لئے کافی تھا اب تو عسکری بھی ناراض ہو گیا تھا۔ صوفیہ بھی چھوڑ گئی تھی دسکن ڈیزل نے بھی بے بسی کا اظہار کر دیا تھا اب۔۔۔۔۔ اب کیا ہوگا کیا ہوگا؟“

(جاری ہے)



کمرہ اندیدہرا تھا کہ اچانک ایک دہشت ناک اور بھاری چیخ سنائی دی، پھر چند منٹ بعد ہی ایک بلے کی خوفناک آواز جس نے گھر کے مکینوں کو دھلا کر رکھ دیا۔ مگر پھر اللہ والے کی آواز سنتے ہی وہ.....

حدود سے تجاوز انسان کے لئے کبھی بکھار جان لیوا ثابت ہوتا ہے، کہانی پڑھ کر تو دیکھئے



کچھ بولیں گی لیکن جب خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے ہی خاموشی کو توڑا۔

”دادی جان جیج بتائیں ناں کیا بات ہے میں آپ سے ہمیشہ سے ہی یہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن ہمت نہیں ہوئی۔“

میں دادی سے دوستی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔ دادی نے نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور بولیں! ”میں تمہارے لئے فکر مند رہتی ہوں گڑیا۔“

مجھے سخت حیرانی نے گھیر لیا۔ ”میرے لئے.....؟ لیکن کیوں دادی جان مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے کیا.....؟“

”ارے نہیں تم تو میری جان تو میری غلطی میرا آنکھوں پر..... بس میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہ رہی تھی۔“ دادی نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو میری رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ ”ضرور دادی آپ کی ہر بات سر آنکھوں پر۔ بلکہ کوئی بات تھی تو آپ مجھے پہلے ہی کہہ دیتیں آپ کا سمجھانا مجھے اچھا لگتا ہے۔“ دادی نے پیار سے میری طرف دیکھا اور بولیں۔

”تمہاری یہی عادتیں تو مجھے بے حد پسند ہیں۔“

بھاگ کر دادی کے پاس پہنچی اور دادی کی طرف دیکھا تو وہ تھوڑی پریشان دکھائی دیں۔

”کیا ہوا دادی جان۔؟“ میں نے فکر مندی سے پوچھا تو بولیں ”کچھ نہیں بس خانساں چاٹ کی پلیٹ دے کر گیا ہے اس لئے میں نے سوچا تمہیں بالوں، چاٹ کھانے کا اصل مزہ تو بارش میں ہی ہے ناں پھر بارش ختم ہونے کے بعد مزہ نہیں آئے گا۔“

مجھے دادی پر پیارا آ گیا اور فوراً چاٹ کی پلیٹ اٹھائی۔ اور پھر خیال آیا تو دادی کی پلیٹ، میں ان کی طرف بڑھادی۔ دادی نے پلیٹ ہاتھ میں لے لی تھی لیکن ان کے چہرے سے پریشانی گئی نہیں تھی۔ وہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھیں اور مجھے چاٹ کھاتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھیں اور اس بار میں نے ہمت کر لی لی۔ ”کیا بات ہے دادی جان آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں؟“

میرے پوچھنے پر انہوں نے پھر ایک نظر مجھے دیکھا ایک سی سی سانس لے کر بولیں۔ ”نہیں میں پریشان نہیں ہوں لیکن تجھ پر فکر مند ہوں۔“

مجھے اندازہ ہو گیا کہ آج دادی بولنے کے موڈ ناں ہیں لہذا وجہ پوچھنے لگی۔ ”دادی جان کس بات کی فکر ہے آپ کو مجھے بتائیں ناں۔“ میرا خیال تھا کہ وہ فوراً

چل رہی ہوتیں 24 گھنٹوں میں سے جس وقت بارش ہو رہی ہوتی ہم اپنی جگہ سے نہیں ہٹتی تھیں اور اپنے آئینے میں گے بیٹ پر پٹی تیل کے ساتھ خود بھی لپٹی رہتیں۔ اماں ہزار منع کرتیں پر وہ ہم ہی کیا جو مان جائیں۔ ”دادی کے ایسا کہنے پر میں ٹھکلا کر ہنس پڑتی۔“

”اور کبھی دادی جان میں آپ پر ہی تو گئی ہوں۔“

میں محسوس کرتی دادی یہ سن کر خوش تو ہوتی ہیں لیکن ساتھ ہی چپ چپ سی ہوجایا کرتی ہیں اور یہ کہہ کر اٹھ جاتیں۔ ”ٹھیک ہے میں تیرے لئے پکڑے لاتی ہوں۔ پھر ہم دادی پوتی مل کر کھائیں گے۔“ اور میں ہزار بار کوشش کرنے کے باوجود بھی دادی کی اس خاموشی اور فکر کی وجہ پوچھ نہ پاتی۔

لیکن ایک بار جب مون سون کی بارشیں شروع ہوئیں تو مجھے موقع مل ہی گیا۔ اس بار بارش بھر پور انداز میں اپنا جلوہ دکھا رہی تھی ہر چیز دھلی دھلی گھری گھری نظر آ رہی تھی دادی لان میں بنی چھتری کے نیچے کرسی پر بیٹھی بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور میں ان کے سامنے ہی بارش میں کھڑی بارش کی بوندوں سے کھیل رہی تھی کہ دادی کی اچانک آواز سے چونک پڑی وہ مجھے آواز دے کر اپنے پاس بلا رہی تھیں میں جلدی سے

**ٹھنڈی** ٹھنڈی ہوا کے جھوکے، بارش کی بوندوں کو اپنے ساتھ لاتے اور جسم کو بھگو جاتے، مجھے بارش بہت پسند ہے اور مون سون کی بارشیں میں ایسے ہی چھوڑ دوں ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میرا کہنا تھا کہ بارش آئے اور ہم کمروں میں بند ہو کر بیٹھ جائیں یہ بارش کے ساتھ نا انصافی ہے اور اتنی بڑی نا انصافی میں نہیں کر سکتی۔ بارش کی ایک ایک بوند کو خود میں جذب کر لینا ہی بارش کا اصل حق ادا کرنا ہے۔ میری اس منطق پر ہر کوئی ہنستا تھا اور مجھے پاگل خطاب دے دیا جاتا۔ لیکن گھر میں ایک ہستی تھی جو میرے اس پاگل پن میں بھی میرا ساتھ دیتی تھی اور وہ تھیں میری دادی جان، عمر کے اس پڑاؤ پر اب تو وہ بارش کو بس دور بیٹھ کر دیکھ ہی پاتی تھیں لیکن بارش کے موسم کے شروع ہوتے ہی گھر میں انواع و اقسام کے کھانے ان ہی کی بدولت پکے شروع ہو جاتے اور میرے تو مزے آ جاتے۔

دادی کہا کرتی تھیں۔ ”زینی مجھے تجھ میں اپنی جوانی دکھتی ہے مجھے بھی بارش جنوں کی حد تک پسند تھی اور تیری ہی طرح بارش کی ہر بوند کے ساتھ انصاف کرنا جیسے میرا فرض تھا۔ اور اس فرض کو پورا کرنے میں میں اکیلی نہیں ہوتی تھی زینب بھی میرا پورا ساتھ دیتی ہم دونوں ہمیشہ جیسی بھی بارش ہو رہی ہوئی، ٹھنڈی ہوا میں



## ڈرڈا نجسٹ کی مشہور معروف کتابیں

75/-	پراسرار کہانیاں
75/-	دہشت ناک کہانیاں
75/-	حیرت انگیز کہانیاں
75/-	خوفناک کہانیاں
75/-	ڈراؤنی کہانیاں
75/-	آئینی کہانیاں
75/-	بھیا ناک کہانیاں
75/-	خوفزدہ کہانیاں
75/-	ناگ دیوتا (مکمل ناول)
75/-	پشاپاز دیوی (مکمل ناول)
75/-	پھندا (مکمل ناول)
75/-	قیدی روحیں (مکمل ناول)
75/-	غیبی آواز (مکمل ناول)
75/-	روح بیتی (مکمل ناول)
150/-	یوقاف (مکمل ناول) مجلد
150/-	مداری (مکمل ناول) مجلد
150/-	طلسم زاد (مکمل ناول) مجلد
150/-	ہنت فرعون (مکمل ناول) مجلد
150/-	ہمزاد کا شق (مکمل ناول) مجلد
150/-	بھنور (مکمل ناول) مجلد
450/-	نجا دوگر (مکمل ناول) مجلد
200/-	اوتار (مکمل ناول) مجلد
60/-	لے ہاتھ
60/-	بھگت روح
60/-	لاش کا ہنگامہ

شمع بک اینجنسی اردو بازار کراچی

فون: 32773302

کرنیب کی طرف بڑھیں ”کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو.....؟“ اماں پوچھ رہی تھیں اور میں بھی کرنیب کے سامنے موجود تھی اور اسے بھرپور لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کرنیب نے بائیں ہاتھ ایک بار پھر کہا۔

”اماں میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔“ اماں کی نظر اس کے ہیکے کپڑوں پر گئی تو بولیں۔ ”چلو اٹھو پہلے کپڑے بدل لو ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی سر میں درد بھی اسی لئے ہو رہا ہوگا۔“ فرش سے کرنیب اٹھنے کی کوشش کرتے کرتے نیچے گری اور بے ہوش ہو گئی۔

اور پھر جب کرنیب کو ہوش آیا تو وہ نارمل ہو چکی تھی لیکن اماں نے سختی سے کہا کہ کرنیب پابندی لگا دی کہ اب ہم بارش میں نہیں نکلیں گی یہ سن کر مجھے تو بہت افسوس ہو رہا تھا اور میں ابا کو اماں کو منانے کی ترکیب سوچنے لگی مگر لگتا تھا کہ کرنیب کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا پھر لاکھ بار پوچھنے پر بھی وہ صرف مجھے گھورتی رہتی تھی۔ لگتا تھا اسے اپنا ہی کوئی ہوش نہیں ہے۔ ہر وقت خلاؤں میں گھورتی رہتی، کوئی ضد نہ کرتی بارش آتی اور طلی جاتی لیکن وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ مجھ سے بھی باتیں کرنا بند کر دیا تھا۔

اماں اور میرا خیال تھا کہ وہ ناراض ہو گئی ہے لہذا اماں اسے منانے کے لئے اس کی پسند کی ساری چیزیں بنا تیں لیکن وہ ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگاتی تھی میں اس کیلئے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ اس کی اس پراسرار خاموشی سے مجھے بھی ڈر لگنے لگا تھا جب وہ رات کو کمرے میں اندھیرا کر کے سوئی تو میں لائٹ جلانے کو کئی کیونکہ ہمیں روشنی کر کے سونے کی عادت تھی اور کرنیب کو تو اندھیرے سے بہت ڈر لگتا تھا لیکن اندھیرے میں ہی وہ مجھ سے کہتی ”تم باہر جا کر سو جاؤ۔“ اور میری ہمت نہ ہوتی کہ میں کرنیب کو کچھ کہہ سکوں کبھی وہیں سو جاتی اور کبھی خاموشی سے اٹھ کر اماں کے پاس آ کر سو جاتی۔ کہاں تو کرنیب کی فرمائش ہی ختم نہ ہوتی تھی اور اب لگتا ہے وہ گھر میں ہی موجود نہیں ہے

بھی منع کرتی تھیں لیکن کاش کے کھل کے ایک بار سمجھا دیتیں، بتا دیتیں تو کرنیب اس کھڑے وقت سے بچ جاتی۔ یا کاش ہم خود ہی اماں کی آواز سن کر اندر آ جاتیں۔

خیر اس وقت عصر اور مغرب دونوں کا وقت مل رہا تھا اور کرنیب اپنی دھن میں بارش میں کھڑی اچھل کود کر رہی تھی کہ اچانک سامنے سے ایک بہت ہی خوبصورت بلی آتی نظر آئی، بلی سے بھی بھلا کوئی ڈرتا ہے لہذا ایک عجیب بات ہوئی کہ وہ کرنیب کے پیروں سے آ کر لیٹ گئی وہ کرنیب کے چاروں طرف چکر لگا رہی تھی کرنیب اپنی دھن میں مست تھی، لہذا بلی کا اتنا لگاؤ دیکھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور اسے گود میں بیٹھا کر پیار کرنے لگی۔

اب مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور میں کھڑکی سے کرنیب کو دیکھ رہی تھی کہ اماں نے مجھ سے کہا ”بہت دیر ہو گئی ہے اندھیرا بھی چھا رہا ہے کرنیب کو اندر لے آؤ؟“ اماں کی بات سن کر مجھے بھی خیال آیا اور فون رکھ کر آگن کی طرف بھاگی۔ کرنیب ابھی تک بلی کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ میں نے کرنیب کو پکارا تو وہ ایسے چوکی جیسے کہ سے خواب سے جاگی ہو۔ میری آواز پر بلی نے ایک نظر کرنیب کو دیکھا میاؤں میاؤں کی آواز نکالی اور دوسری طرف چھلانگ لگادی۔

اور کرنیب ایک خواب کے عالم میں اندر آ گئی۔ اماں ہمیں مسلسل ڈانٹ رہی تھیں لیکن کرنیب ایسے کھڑی تھی جیسے اسے کچھ سنائی ہی نہ دے رہا ہو۔ میں نے اسے بلایا۔ ”کیا ہوا کرنیب؟“

لیکن اس نے میری بات کا جواب نہ دیا اور وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور میری اور اماں کی صورت دیکھنے لگی ہم دونوں پوری ہنسی ہوئی تھیں اس لئے اماں کو اور غصہ آ گیا لیکن کرنیب کے منہ سے اچانک بہت درد بھری آواز نکلی۔ ”اماں میرا سر.....“ کرنیب کی آواز میں بہت غیر معمولی پن تھا۔

مجھی اماں ایک دم خاموش ہو گئیں اور لپک

کہنا شروع کیا ان کی کہانی ان ہی کی رہائی سنئے۔  
”یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اور کرنیب ابھی کالج کے آخری سال میں تھیں۔ وہ دن بھی کیسے دن تھے۔ ہماری ایک دوسرے میں جان بستی تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری ہر پسند، ناپسند ایک جیسی تھی۔ ہمیں بارشوں کے موسم سے عشق تھا۔ اماں لاکھ منع کرتیں۔ لیکن وہ ہم ہم کیا جو مان جاتیں۔ اور پھر جیسا کہ میں تمہیں بتاتی ہی رہتی ہوں کہ جب بھی بارش ہوتی ہم وقت نہیں دیکھا کرتیں تھیں اور کھلے آگن میں کھڑی گھنٹوں بارش سے لطف اندوز ہوتی رہتیں۔ یہ ایسا کوئی غلط فعل یا عمل بھی نہیں لیکن بہر حال احتیاط ہر چیز میں ہونا بہت لازمی ہے۔ اس بارگرمی نے سب کا برا حال کیا ہوا تھا۔ ہر چہرہ مر جھایا ہوا تھا۔ لوگ بارشوں کی دعائیں کر رہے تھے اور ہم دونوں تو بارشوں کے انتظار میں دن گن رہی تھیں لہذا اس بار جب بارشیں ہوئیں تو ہم نے سارے گھر کو سر پڑھا لیا۔ اماں، ابا کی ہم جان تھیں سو وہ منع کرتے کرتے بھی ہماری خوشی کے آگے چپ ہو جاتے تھے۔ اس بارگرمی بھی تو بہت سخت تھی لہذا گھٹائیں بھی اسی حساب سے بے حساب برس رہی تھیں اور ہم سن موٹی نہ دن دیکھتے نہ رات اور جب گھٹائیں چھائیں باہر آگن کی طرف رخ کرتیں۔

اس وقت بھی بارش زور و شور سے ہو رہی تھی اور ہم دونوں ایک دوسرے میں مگن خوب شور مچا رہی تھیں کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا کہ کب دن ڈھلا اب تو عصر سے مغرب ہونے کو آ رہی تھی اماں کی باز ہمیں ٹوک چکی تھیں اور آواز دے چکی تھیں لیکن ہم خود میں مگن تھیں کہ ایک بار پھر اماں کی آواز آئی وہ مجھے بلارہی تھیں کہ شاید میری کسی دوست کا فون آیا تھا لہذا میں زنیب کو وہی چھوڑ کر اندر بھاگ آئی۔

فون پر میری عزیز دوست تھی اور میں اس سے باتوں میں مگن ہو گئی کاش میں اس وقت کرنیب کو ساتھ ہی لے آتی یا ہم اماں کا کہنا مان لیتیں تو اس وقت وہ سب نہ ہوتا جس کا ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا شاید اماں اس لئے



ہمارے ساتھ ساتھ ابانے بھی اس کی خاموشی کو محسوس کیا اور نینب سے کئی بار بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف گھورتی رہتی جس سے ابا اور پریشان ہو جاتے۔

اماں، ابا کا خیال تھا کہ سر کے درد اور بے ہوشی کی وجہ سے نینب کے دماغ پر شاید کچھ اثر پڑا ہے لہذا کئی ڈاکٹرز کو دیکھا یا لیکن سب نے اسے صحت مند قرار دیا اور کہا۔ ”بچی نے شاید آپ کی باتیں دل پر لے لی ہیں کچھ دنوں میں خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“

لیکن نینب کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی میلے کپڑے کئی کئی دن تک پہنے رہتی، بال بھی بکھرے رہتے اماں مجھے سمجھاتیں بہن کو اکیلا مت چھوڑا کرو اپنے ساتھ کام میں لگائے رکھا کرتا کہ اس کا دل بیلے اور خود بھی کام کرتے وقت نینب کو اپنے ساتھ بیٹھا لیتی اماں کی عادت تھی کہ نماز کے بعد سورۃ یاسین ضرور پڑھتی تھیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی اماں نے سورۃ یاسین پڑھنا شروع کی نینب کی حالت بگڑنا شروع ہو گئی اور وہ چیخ کر کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

میں اور اماں اس کی حالت دیکھ کر سکتے میں آ گئی ابا کو بتایا تو ابا کچھ سوچ کر مولوی صاحب کو بلا لائے، مولوی صاحب نے نینب کو اسنے پاس بیٹھایا اور کچھ حساب لگانے لگے۔ نینب کی آنکھیں ویران پڑی تھیں۔ وہ حساب لگاتے لگاتے چوک پڑے اور قرآنی آیات پڑھتے پڑھتے نینب کی ہتھیلی گھول کر کچھ دیکھا۔ مولوی صاحب کے چہرے پر پریشانی دیکھی جاسکتی تھی۔

وہ بولے! ”بچی کا پچھلے دنوں کیا کہیں اکیلے جانا ہوا ہے یا پھر کوئی ایسی جگہ جہاں وہ کچھ وقت اکیلے رہتی ہو؟“

اماں ابا دونوں نے نفی میں سر ہلادیا۔

”ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ گھر میں کوئی پالتو جانور ہے جو بچی کے ساتھ رہتا ہو؟“ مولوی صاحب نے پھر پوچھا۔

اماں نے اس بار بھی نفی میں سر ہلادیا۔

”بچی آپ مجھے نہیں بتاؤ گی کہ کیا بات ہے، کیا کوئی چیز آپ کو پریشان کر رہی ہے؟“ مولوی صاحب اس بار نینب سے مخاطب ہوئے تو نینب ایک دم بے چین ہو کر اٹھی لگتا لگتا تھا، شاید وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

نینب کی حالت دیکھ کر مولوی صاحب نے اس سے اور کچھ نہیں پوچھا اور اٹھ کر باہر چلے آئے، مولوی صاحب نے ہماری طرف دیکھا اور فکر مند سی گویا ہوئے مجھے بچی پر کسی چیز کا سایہ محسوس ہو رہا ہے اور وہ بچی پر جانور کی شکل میں۔ آپ مجھے بتائیں کہ اس کی یہ حالت کب سے ہے۔

اماں نے اس دن کا سارا واقعہ کہہ سنایا لیکن اماں بارش والی بات کے بارے میں نہیں جانتی تھیں لہذا میں نے مولوی صاحب کو اس کے بارے میں مکمل رواداد سنا دی تو انہیں کوئی شک نہ رہا اور جاتے جاتے وہ واپس آنے کا کہہ کر چلے گئے اور ساتھ ہی پانی پر دم کر کے نینب کو بلایا اور ایک تعویذ بھی اس کے گلے میں ڈال گئے۔

تعویذ ڈالتے ہوئے نینب نے مولوی صاحب کا ہاتھ بہت سختی سے پکڑ لیا تھا جسے انہوں نے نظر انداز کر کے کچھ پڑھا اور نینب پر پھونک ماری تو اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور اس کے گلے میں تعویذ ڈال کر چلے گئے۔

نینب کی حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی وہ ہر وقت چیختی چلاتی رہتی کہتی۔ ”اس تعویذ کو میرے گلے سے ہٹا دو میرا دم گھٹ رہا ہے۔“ ”بھی کہتی۔“ ”کوئی میرا گلہ دار ہے میری سانس بند ہو رہی ہے۔“

اس دوران اماں مسلسل روٹی رکھیں اور میں بھی اماں اور کبھی نینب کو سنبھالتی۔ مولوی صاحب نے تعویذ کی صورت بھی گلے سے اتارنے سے منع کیا تھا مغرب تک نینب کی حالت ایسی ہی رہتی پھر وہ بے ہوش ہو جاتی اور جب ہوش آتا تو خلاء میں گھورتی رہتی۔

میں مولوی صاحب کا بے چینی سے انتظار

تھا۔ دوسرے دن وہ چلے آئے تو ہمیں روشنی کی کرن نظر آئی اور امید ایک بار پھر جاگ اٹھی، مولوی صاحب کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھے۔

مولوی صاحب میرے ابو سے بولے ”جشید صاحب آپ پریشان نہ ہوں آپ دیکھئے گا نینب بچی کو اس جن سے فوراً نجات مل جائے گی۔“ مولوی صاحب نے ایک عزم سے کہا۔!

”آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا مجھ پر مولوی صاحب۔“ ابا بولے۔ ”آپ اندازاً جائیں۔“ ابا نے ان کے لئے راستہ چھوڑا تو وہ بزرگ بولے۔ ”امد تو ہم آئی چکے ہیں۔ جنید صاحب آپ بس ذرا ہمیں بچی کا کر دیکھا دیجیے۔ اب ذرا اس جن کی بھی خبر لوں۔“

ابانے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو بزرگ نے اپنی آنکھیں بند کیں اور کچھ پڑھتے ہوئے آگے بڑھے، ساتھ ہی ان کے ہاتھ میں جو شیخ تھی اس کے دلے بھی گرائے گئے۔

کمرے کے قریب پہنچ کر مولوی صاحب نے کہا۔ ”ٹھیک ہے آپ دروازہ کھولنے۔“ ابا نے بہت کوشش کی لیکن دروازہ نہ کھلا ابا نے دروازہ بجایا لیکن اندر سے کوئی آواز نہ آئی تو بزرگ خود ہی آگے بڑھے اور اپنے دونوں ہاتھ دروازے پر رکھ کر کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ دروازہ پہلے تو بٹنے لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی کھل گیا۔ کمرے کی لائٹ آف تھی اور معمول سے زیادہ اندھیر اور خاموشی تھی۔

مولوی صاحب نے ہم سب کو باہر رکنے کا اشارہ کیا تو ابا جی سے رہنا نہ گیا تو وہ آگے بڑھے تو انہیں روکا۔

بزرگ نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا تو اندر سے نینب کی ایک بھیانک چیخ سنائی دی، ہم سب پر خوف طاری تھا۔ کسی بلے کی مسلسل آواز آنا شروع ہوئی تھی۔ وہ بہت زور زور سے غرار ہاتھ تھا۔ نینب بھی ا ب مسلسل چیخ رہی تھی۔ ”اماں مجھے بچاؤ مجھے مار ڈالے گا، ابا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے میری مدد کرو۔“

نینب کی آواز ایک دم بدل گئی۔ وہ بہت

## استاد

استاد شاگرد سے۔ بتاؤ 1876ء

کو کیا ہوا تھا۔

شاگرد۔ پتہ نہیں

استاد۔ قائد اعظم پیدا ہوئے تھے۔

استاد۔ اچھا 1881ء کو کیا ہوا تھا۔

شاگرد۔ جناب قائد اعظم 5 سال کے

ہو گئے تھے۔

(صغیر حسین رسوائے سدھو)

بھیا ک انداز میں چیختی۔

”چلا جا یہاں سے ورنہ بہت برا ہوگا۔“

اس بار بزرگ بولے۔ ”چلے جائیں گے لیکن

تو کیوں اندھیرے میں چھپتا ہے سامنے کیوں نہیں

آتا؟“

”شکر کر میں سامنے نہیں آ رہا اگر سامنے آ گیا

تو تیری خیر نہیں ہے چلا جا یہاں سے۔“ پھر آواز آئی

تو بزرگ ایک قدم اور آگے بڑھے اور بولے۔

”میں کیوں چلا جاؤں تو کیوں نہیں چلا جاتا۔

یہ تیرا مسکن نہیں ہے۔“

”ہم اپنا مسکن خود تلاش کرتے ہیں۔ تو مجھے

مت سیکھا۔ اب یہیں میرا میرا ہے۔“

”بزرگ کو غصہ آ گیا تھا اور اتنی دیر میں

انہوں نے کچھ پڑھ کر اندھیرے ہی میں پھونک مار دی

اور لائٹ جل اٹھی۔ نینب کمرے کے ایک کونے میں

کھڑی غرار ہی تھی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکل رہی

تھیں ابا اس کے قریب جانے لگے تو انہیں روک دیا

گیا۔ ”آپ قریب نہ جائیں۔“

”بزرگ بولے۔“ ”یہ تیرا میرا نہیں ہے۔ اس

بچی کو چھوڑ دے۔“

نینب بہت خوف ناک انداز میں ہنسی۔





## راج دلاری

ایس امتیاز احمد - کراچی

آسمان پر اچانک دودھیا روشنی پھیل گئی، پھر لوگوں نے دیکھا کہ وہ روشنی آہستہ آہستہ زمین کی طرف آنے لگی، جب روشنی بالکل نیچے آگئی تو لوگوں کی آنکھیں چندھیا گئیں اور پھر لوگوں کے سامنے اچانک.....

صدیوں پر محیط عجیب و غریب سوچ کی حامل ناقابل فراموش..... دل کو مسونی کہانی

کرے لیکن جب ”راج دلاری، راج دلاری“ کا نام بار بار سننے میں آیا تو پھر مجبور ہو گیا کہ معلوم کروں کہ راج دلاری ہے کون؟

گمراہات پھر بھی تشہ رہی۔ کوئی بھی تفصیل سے نہیں بتا سکا کہ راج دلاری کون ہے؟ البتہ اتنا معلوم ہو سکا کہ کسی زمانے میں راج دلاری نام کی لڑکی رام پور میں تھی۔ جس کے متعلق طرح طرح کے مافوق الفطرت

پہلی بار میں نے راج دلاری کا نام سنا تو کوئی توجہ نہیں دی۔ اس لئے کہ ہندوؤں میں عورتوں کے نام عام طور پر اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ ”راج دلاری“

لیکن جب دوسری بار یہی نام سنا تو سوچنے لگا کہ یہ راج دلاری ہے کون؟ لیکن پوچھنے کی پھر بھی اس بھت سے ہمت نہیں ہوئی کہ ماتحت عملہ نہ معلوم کیا خیال

بلے نے حصار کے چاروں طرف ایک چکر مارا اور ہوا میں غائب ہو گیا، ہم سب خوف کے مارے خرقہ کاغذ پر رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ جم کر رہ گئے تھے۔ ایسا منظر ہم نے اپنے خواب میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن بزرگ اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھے تھے اور ان کے چہرے پر اب مسکراہٹ تھی۔ وہ مولوی صاحب اور اباجی کی طرف متوجہ ہوئے۔

”اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے آپ بی بی کو اندر لے جائیں اور سلا دیجیے جب یہ سچ اٹھے گی تو سب ٹھیک ہوگا۔“

ابانہب کو اندر لے آئے تو اماں نے اپنے کمرے میں اسے سلا دیا۔

بزرگ اباجی سے مخاطب ہوئے۔ ”اس جن کا خاتمہ ہو چکا ہے اور جو باہر آپ نے دیکھا وہ اس کا ساتھی تھا لیکن اب وہ آپ کو تنگ نہیں کرے گا۔“

یہ سن کر اباجی اور ہماری جان میں جان آئی اور ہم نے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ کہ اگر وہ نہ ہوتے اور ہمارا ساتھ نہ دیتے تو نہ جانے نہب کا کیا ہوتا۔“

دادی نے اپنی کہانی ختم کی اور مجھے مخاطب کیا۔ ”زبانی میں تمہیں بس یہی سمجھانا چاہتی تھی کہ میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں کہ میں تمہارے ساتھ کب تک ہوں لیکن تم اپنا خیال خود رکھا کرو، ذرا سی احتیاط سے ہم بہت بڑی بڑی آزمائشوں سے بچ سکتے ہیں۔“

میں نے دادی کی یہ بات سنی تو دادی کے گلے لگ گئی اور وعدہ کیا ”دادی ایسا نہ بولیں، اللہ! آپ کی عمر دراز کرے، میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی ہر بات پر عمل کروں گی۔“

تمام بہنوں سے میری گزارش ہے کہ وہ بھی ذرا سی احتیاط سے خود کو محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے (آمین)۔



”کتنے نادان ہے تو، کیا تو نہیں جانتا ہم جہاں بیرا کرتے ہیں وہاں سے اتنی آسانی سے نہیں جاتے۔“ اور یہ کہہ کر وہ ہاگلوں کی طرح آگے بڑھی، اگر مولوی صاحب اور اباجی نے اسے نہ پکڑ لیا ہوتا تو وہ بزرگ کا منہ بوج چلی ہوتی۔ نہب بہت دھان پانی لڑکی تھی۔ لیکن اس وقت اسے سنبالنا مشکل ہو گیا تھا۔ بزرگ مسلسل کچھ پڑھ رہے تھے۔ نہب کے قریب آتے ہی انہوں نے اس پر چوک ماری اور اپنے ساتھ لائی ہوئی رسی سے اسے باندھ دیا۔ پھر انہوں نے اباجی اور مولوی صاحب کی مدد سے اسے اٹھایا اور باہر آگلیں میں لے آئے۔

نہب مسلسل چیخ رہی تھی بزرگ نے جلدی سے سب کے گرد ایک حصار کھینچا اور زمین پر بیٹھ گئے۔

بزرگ کی آواز سنائی دی ”جا چلا جائیہاں سے جہاں سے تو آیا ہے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ لیکن نہب مسلسل چیختی رہی اور مولوی صاحب اور بزرگ کو برا بھلا کہتی رہی اس کے بعد بزرگ نے ہم سے ایک بائلی پانی لانے کو کہا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد بزرگ نے اس جگہ ایک چھوٹا گڑھا کھودا اور پھر اس گڑھے میں بائلی سے پانی نکال نکال کر اس گڑھے میں ڈالنے لگے۔ ہم سب حیران تھے کہ آدھی بائلی پانی ڈالنے کے باوجود وہ گڑھا خشک تھا، پانی گڑھے میں پڑتے ہی غائب ہو جاتا تھا، یہ عمل بھی وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک کرتے رہے کہ نہب ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

ہم سب حیران تھے کہ اچانک کچھ فاصلے پر سے ایک بلا نمودار ہوا اور بزرگ کے حصار سے کچھ دور آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بزرگ کو گھور رہا تھا اور غرارہا تھا بزرگ نے آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھا۔ ”جا چلا جائیہاں سے ورنہ تیرا شر بھی تیرے اس ساتھی جیسا ہوگا۔“



کہانیاں منسوب تھیں۔ میں نے جو کچھ بھی اس کے بارے میں سنا اس پر یقین کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ یہ ایسی کئی کہانیاں تھیں جن کو انسانی عقل کی صورت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

میرا حال ہی میں رام پور میں تبادلہ ہوا تھا۔ یہ دو گاؤں کے مجموعہ کا نام ہے ان میں سے ایک رام ہے۔ یہاں بدھ مذہب کی بڑی بڑی یادگاریں۔ پہاڑ پر بہت بڑے بڑے اسٹوپ بنے ہوئے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے دو میل سے زائد رقبے میں چار دیواری تعمیر کر کے ان آثار کا حصار کر لیا ہے۔ جگہ جگہ گوتم بدھ کے بڑے بڑے بت رکھے ہوئے ہیں پتھروں کی سلوں پر تحریرات اور تصاویر کندہ ہیں۔ ان سب چیزوں کے علاوہ ایک عجائب گھر بھی پہاڑ پر بنا ہوا ہے۔ اس میں اس دور کی ہر چیز موجود ہے۔ یہاں موٹی موٹی کتابیں موجود ہیں جو بتوں اور متعلقہ چیزوں کی مکمل تاریخ ہیں۔

تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ دنیا کے ہر حصے سے یہاں آتے ہیں۔ جن کے قیام کے لئے پہاڑی سے نیچے سرکاری ڈاک بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ ان بنگلوں میں آسائش اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ اس کے علاوہ کھانے کے انتظام کے لئے باورچی اور ٹی وغیرہ بھی موجود رہتے ہیں۔ ڈاک بنگلوں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ آثار سے قریب پہاڑ پر ہی رام نام کا گاؤں آباد ہے۔ اسی پہاڑ سے نیچے پورنام کا گاؤں ہے۔ اس سے کچھ دواڑ چل کر سرٹک کے کنارے کا بھون نامی گاؤں ہے۔ یہ بھوپال کا سرحدی گاؤں ہے۔

یہ تمام علاقہ پہاڑی اور میدانی ہے۔ اونچے نیچے پہاڑوں اور میدانوں میں سرسبز تناور درخت کثرت کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔ بھون کے پہاڑی گھروں میں کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو ریلوے لائن کے اس پار موضع منڈوانی دکھائی دیتا ہے۔ دوسری جانب موضع بھون ہے جس کے نیچے ایک کشادہ مذہبی بستی ہے۔ ان

موضع جات میں کٹم کے ناکے ہیں جہاں ناکیدار اور سپاہی تعینات ہیں۔

تبادلہ پر آنے کے دو ہفتے بعد میں گشت پر نکلا۔ اریا چوڑہ اور بہار کا معائنہ کرتے ہوئے مجھے کئی دن صرف ہو گئے۔ یہ بارش کا موسم تھا اور ان دنوں موسلا دھار بارش ہونے کی وجہ سے ندی نالے طغیانی پر تھے جس کی وجہ سے مجھے کئی دن قیام کرنا پڑا۔ بہار سے جس وقت روانہ ہوا تو شام ہونے والی تھی۔ ناکے دار اور سپاہی نے مجھے روکا بھی لیکن میں نے کوئی خیال نہیں کیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ جس وقت پور اور رام پور کے درمیان پہنچا تو بارش میں تیزی آ گئی۔ اندھیری رات ہونے کی وجہ سے قد آدم گھاس میں راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندازے سے چلتا ہوا جب ایک جگہ پہنچا تو نالہ پورے شباب کے ساتھ طغیانی پر تھا۔ کچھ دیر تک کھڑا ہوا سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہئے؟ آخر یہی فیصلہ کیا کہ واپس ہو کر کسی طرح رام گاؤں پہنچا جائے۔ گھوڑے کو پھانسا کر اندازے سے روانہ ہوا لیکن اندازہ غلط ہی رہا۔ کافی دیر تک بھٹکنے کے بعد بھی پور تک پہنچنے کی کوئی سہیل نظر نہ آئی۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ شاید آج تمام رات یونہی پانی میں بھٹکتے ہوئے بھٹکنا پڑے گا۔

ایک ایک ایک بار زور سے بجلی چمکی جس کی روشنی میں کچھ دوری پر کسی سادھی پر بنی ہوئی چھتری دکھائی دی۔ میں نے اس وقت اس کو ہی غنیمت جانا۔ ویسے مرگھٹ میں اندھیری رات گزارنا کچھ خوش کن بات نہیں تھی لیکن مرتا کیانہ کرتا کے مصداق مرگھٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ کچھ دور چلے پر مجھے چھتری کے پاس ایک ٹھکانا ہونے چرخ کی روشنی دکھائی دی۔

”کیا یہاں کوئی رہتا ہے؟“ میں نے دل میں سوچا۔ ”دیکھا جائے گا۔ اس وقت اگر کوئی بھوت بھی ہوتا تو میں اس کے گھر میں بھی ٹھہر جاؤں گا۔ اس بارش میں بھٹکنے سے بہتر تو یہی ہوگا کہ تمام رات بھوت سے بچ کر دل لگی رہے۔“

یہی کچھ سوچتا ہوا میں مرگھٹ کی جانب بڑھتا رہا لیکن جب میں مرگھٹ کے حدود میں داخل ہوا تو دیکھا کہ سادھی کی چھتری کے قریب ایک کنبائی ہوئی ہے جس میں سے وہ روشنی آرہی تھی۔ ظاہر تھا کہ اس میں کوئی انسان ہی رہتا ہوگا ورنہ بھوت کو مرگانہ کر رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ روشنی اور گھر دیکھ کر گھوڑا زور سے ٹھہرایا۔ وہ غریب بھی مسلسل کئی گھنٹے سے بارش اور کچھ میں پھرتے ہوئے پریشان ہو رہا تھا۔ گھوڑے کے ٹھہرنے کی آواز سن کر کنبائی کا دروازہ کھلا اور گھروا (گہرے پیلے) رنگ کی کفنئی پہنے ایک سادھو باہر نکل کر آیا۔ یہ بہت ضعیف آدمی تھا مگر اسے اور سادھی کے بالوں کے علاوہ بھنوں تک سفید تھیں۔ اس نے پہلے مجھے بڑے تعجب کے ساتھ دیکھا پھر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”حضور اتنی رات کہاں؟“

میں نے سادھو کو بغور دیکھا اور پھر گھوڑے سے اترے ہوئے کہا ”مہاراج۔ بارش کی وجہ سے ندی نالے پورے طغیانی پر ہیں اس لئے آج رات شاید آپ کے پاس ٹھہرنا ہوگا۔“

”بڑی خوشی کی بات ہے حضور۔ مگر آپ کو شاید آپ کی شان کے مطابق آرام نہ مل سکے گا۔“

”کوئی بات نہیں۔“

”آپ اندر چلیں میں گھوڑا باندھ کر ابھی آتا ہوں۔“

گھوڑے کی لگام سادھو کو دے کر میں کنبائی میں داخل ہو گیا ایک کونے میں صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ درمیان میں آگ جل رہی تھی۔ پاس میں ہی مرگ چھلا بچھا ہوا تھا۔ سادھو کے دھونی لگانے کا حکم ملا تھا۔ میں نے برساتی اور ہیٹ اتار کر دروازے کے قریب لٹکا دیا۔ جوتے اور موزے اتار کر ایک طرف بٹیکے اور خود آگ کے پاس جا بیٹھا۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ سادھو بھی گھوڑا باندھ کر میرے قریب آ بیٹھا۔

”یہاں سے رام کتنی دور ہے؟“ میں نے سادھو

سے پوچھا۔ ”دوکوس (چار میل)“

اس کا مطلب یہ ہے کہ میں چار میل کے اندر ہی اب تک چکر لگا تا رہا۔ بہر حال اب تو پریشان ہو چکا تھا اور اس وقت دوبارہ روانہ ہونا بھی کچھ مناسب نہیں تھا اس لئے رات یہیں کاٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

”حضور کھانے کے لئے کچھ پیش کروں؟“ سادھو نے پوچھا ”نہیں مہاراج۔ اس کی ضرورت نہیں ہے تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ یہ تو بتاؤ کہ کس کی سادھی ہے؟“

”لنگا چمار اور اس کی بیوی کی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ چمار کی اور سادھی؟ یہ کیسی انوکھی بات تھی اور پھر اس پر سادھو استعائن یہ بات سمجھ میں آرہی تھی۔

”مطلب یہ ہے کہ جن کی یہ سادھی ہے وہ اتنی عظیم شخصیتیں تھیں کہ ان کا غائبی ابھی تک کوئی پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ اور آج سینکڑوں برس سے ہمارا خاندان اس سادھی کی خدمت کر رہا ہے۔ ہم برہمن لوگ اس سادھی کی خدمت کرتے ہیں یہ واقعی تعجب کی بات ہے لیکن اس سادھی کے باشی لاکھوں برہمنوں سے بہتر تھے۔“

”مہاراج بات سمجھ میں نہیں آئی ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“

”حضور یہ لمبی لیکن حقیقت پر مبنی کہانی ہے۔ کیا سنیں گے؟“

”ضرور سنوں گا۔“ میں نے کہا ویسے مجھے بھی رات گزاری کے لئے یہی صورت بہتر معلوم ہوئی کہ زیادہ سے زیادہ وقت باتوں میں گزارا جائے۔

”آج سے سینکڑوں برس پہلے کی بات ہے۔“

مہاراج نے کہانی شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”رام پور میں ایک لڑکی راج دلاری تھی۔“

”راج دلاری؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”تو یہ بھی راج دلاری کا قصہ ہے۔“

”ہاں بیٹا یہ راج دلاری کا ہی قصہ ہے۔ راج



دلاری گنگا چار کے یہاں پیدا ہوئی۔ لیکن پیدائش کے وقت ایسے عجیب و غریب اور پراسرار حالات رونما ہوئے جس کی بناء پر ماں باپ کے علاوہ گاؤں والے بھی پریشان ہو گئے۔

جس رات یہ لڑکی پیدا ہوئی وہ پورنماشی کی رات تھی۔ لیکن اس دن شام کے وقت سے ہی تیز ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں اور پھر جیسے جیسے رات زیادہ ہو رہی تھی اسی طرح سے ہوا بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دس گیارہ بجے رات کو ہوائے طوفانی صورت اختیار کر گئی تھی۔ ہوا کی وجہ سے اتنا گرد و غبار اٹھا کہ چاند چھپ گیا مگر ہلکی ہلکی روشنی پھر بھی باقی تھی۔ درختوں کے پتوں میں سے گزرتی ہوائیں سیٹیاں بجا رہی تھیں اور ان سیٹیوں کی آوازوں میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہزاروں بھوت تاج رہے ہیں۔ اور یہ غلط بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ بھوتوں کو ناپتے ہوئے تو نہیں دیکھا جا سکتا لیکن ہر شخص کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے انسان کی قسم کے کچھ لوگ آسمان سے اتر کر زمین پر آ جا رہے ہیں۔ ان آنے جانے والوں کو لوگ دیکھنے کے بجائے صرف محسوس کر رہے تھے۔

طوفانی ہواؤں کی وجہ سے عورتیں اپنے اپنے بچوں کو لے کر گھروں میں چھپ گئی تھیں لیکن مردوں کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی نئی بات ہونے والی ہے۔ طوفان سے انہیں کوئی ڈر نہیں تھا اس لئے کہ اس قسم کے طوفان تو آتے ہی آتے ہیں لیکن حیات کی بناء پر ان کے دل بے چینی محسوس کر رہے تھے اور ہر شخص یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھو آگیا ہونے والا ہے۔

رات کو کوئی گیارہ بجے یعنی لڑکی کی پیدائش سے ایک گھنٹہ قبل ہلکی ہلکی روشنی کے ہالے آسمان سے اترنا شروع ہوئے۔ ہر شخص ان کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ ان سب کا رخ گنگا چار کے گھر کی جانب تھا۔ گاؤں کے سب مرد ہی یہ کرشمہ دیکھ رہے تھے لیکن کسی کے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ان بادلوں میں ایک خاص صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ہالے جس طرح اتر رہے تھے

اسی طرح ان میں سے کچھ واپس بھی جا رہے تھے اور اب صرف آنے والوں کا ہی نہیں بلکہ جانے والوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ایک اور چیز رونما ہوئی یعنی اب بادلوں کے بجائے انسان اترتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے ان کے جسم تو اچھی طرح دکھائی دے رہے تھے لیکن ان جسموں کے متعلق سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کے جسم ہیں جو ہوا میں تحلیل ہونے کے بعد بھی جسم ہی معلوم ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے تو کچھ ایسے مرد اترے جو صرف ساڑھی نما دھونی باندھے ہوئے تھے اور اس دھونی کا ایک پلوان کے کاغذوں پر تھا۔ سر، داڑھی اور مونچھ کے بال بالکل صاف تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں عجیب طرز کا برتن تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں پانی ہے اور دوسرے ہاتھ میں پھولوں کی ڈالیاں تھیں۔ لیکن جس طرح سے ان لوگوں کی ہر چیز تجب خیر تھی اسی طرح یہ پھول بھی عجیب قسم کے تھے۔ کسی نے بھی ایسے پھول بھی نہیں دیکھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے پھول ہزاروں سال قبل بھی ہوتے ہوں لیکن اب ان کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ آنے والوں کی تعداد پندرہ بیس تھی لیکن علیے اور وض قطع سے یہ مذہبی آدمی معلوم ہوتے تھے یا پھر یہ اس زمانے کے وید ہوں کے لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ان لوگوں کے اترنے کے بعد عورتوں کے اترنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ عورتیں انتہائی حسین نوجوان اور نورانی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ بھی ساڑھیاں باندھے ہوئے تھیں مگر ان کے ہاتھوں میں کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ سب سے آگے جو عورت تھی اس کے ہاتھ میں عودوان تھا جس سے نورانی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس میں شاید عود و عذیر قسم کی کوئی چیز ڈال کر جلائی جا رہی تھی۔ عودوان سے نکلی ہوئی خوشبو کی لپیوں سے پوری فضا معطر ہو رہی تھی۔ چاروں طرف عطر بیز ہوا نہیں چل رہی تھی اور جو خوشبو بگ بگ سوگھ رہے تھے وہ ایک قسم کی نہیں تھی بلکہ کبھی ایک قسم کی

نہیں آتی اور کبھی دوسرے قسم کی۔

اس عورت کے پیچھے کثرت سے عورتیں تھیں جو نظم طریقے سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان کے لباس میں عجیب عجیب قسم کے سامان تھے لیکن ان کو سمجھنے کے بعد اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ یہ سب سامان زمین سے متعلق ہے۔ یہ عورتیں کورس کے انداز میں کوئی کت کا رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی قسم کی دعا ہو لیکن افلاکی اداسی سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

ابھی اس قسم کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک ایک آسمان پر روشنی کا ایک بہت بڑا گولہ نمودار ہوا۔ سب لوگ گہرا کر اس کی جانب دیکھنے لگے کہ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ جس وقت یہ گولہ زمین کی طرف آ رہا تھا۔ اس وقت آدمی رات کا وقت تھا۔

جب وہ نورانی گولہ زمین کے قریب پہنچا تو اس وقت لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ جس کو وہ گولہ سمجھ رہے تھے وہ ایک اتنا بڑا ہالہ تھا جس کی وسعت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس ہالے میں آگے آگے کا تعداد میں سائیں ٹھونڈوں پر سوار تھے۔ یہ ایک ہاتھ میں راس اور دوسرے میں نیزہ پکڑے ہوئے تھے۔ پہلو میں پکڑے چم کا خنجر لٹک رہا تھا۔ پیٹھ پر ڈھال اور کاندھے پر کمان تھی۔ ترش ایچھے قسم کے تیروں سے لگے ہوئے تھے۔ یہ فوجی بڑے منظم طریقے سے پیچھے اتر رہے تھے۔

گھر سواروں کے پیچھے رتھوں کی قطار تھی۔ ان میں بھی فوجی سوار تھے۔ ان رتھ سواروں کی بھی شان و شوکت تھی۔ ہر ایک فوجی اسلحہ سے لیس گھوڑوں کی باکیں باندھے ہوئے رتھ میں کھڑا تھا۔

رتھوں کی لائن ختم ہونے کے بعد پھر کچھ لوگ سامان لئے ہوئے نظر آئے۔ اس سامان کو اٹھانے والے شکل و صورت سے غلام دکھائی دے رہے تھے۔ تمام سامان قیمتی اور عجیب وضع کا تھا۔ اس کو دیکھنے والے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں لایا جا رہا ہے۔ اس سامان میں ایک بہت قیمتی

گہوارہ تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے گدے لٹکے گئے ہوئے تھے۔ تھالوں میں چھوٹے چھوٹے کھلونے اور گھنٹیاں تھیں۔ کچھ تھالوں میں بچے کے ننے جڑاؤ زیورات اور کپڑے تھے۔ ایک تھالی میں چھوٹا سا تاج بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ تمام لوازمات کسی بچے کے لئے ہی ہو سکتے تھے۔

ابھی لوگ یہ سب چیزیں دیکھ ہی رہے تھے کہ ہالے کی روشنی تیز ہونا شروع ہو گئی۔ پھر وہ روشنی اتنی زیادہ تیز ہوئی کہ آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ یکا یک کچھ اور ہی نقشہ نظر آیا۔ وہ تھا تخت شامی۔ اس کو چالیس آدمی اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ چھپر شامی پورا کا پورا سنہری تھا اور اس میں کثرت سے چھوٹے بڑے، رنگ رنگے، ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ان کی جگہ جگہ پٹ پٹ آنکھیں ٹپک رہی تھیں۔ اس تخت پر ایک دیوتا اور ایک دیوی بیٹھے ہوئے تھے دونوں کے سروں پر جڑاؤ تاج تھے دیوتا کے ہاتھ میں ایک جڑاؤ چھڑی بھی تھی۔

تخت شامی سیدھا گنگا چار کے گھر پر اترا۔ اس وقت ٹھیک آدمی رات تھی۔ یکا یک فضا میں ایک گولہ بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف نورانی، ہلکی، ٹھنڈی اور دودھیا سی روشنی پھیل گئی۔ روشنی کے پھیلنے ہی گنگا چار کے گھر سے سوپ بیٹے کی آواز سنائی دی۔

دیہات میں دستور ہے کہ گھر میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدائش کے بعد اگر لڑکا ہو تو تھالی اور لڑکی ہو تو دانی فوراً سوپ بجاتی ہے۔ اس سے آس پاس کے گھروں میں معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا پیدا ہوا ہے۔

سوپ کی آواز سن کر سب کو معلوم ہو گیا کہ گنگا کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن ابھی سوپ کی آواز بند ہی ہوئی تھی کہ یکا یک فضا میں سازوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ کس قسم کے ساز تھے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال جس قسم کے بھی ہوں، تھے کچھ عجیب سے جن کو شاید نہ تو کسی نے دیکھا ہوگا اور نہ سنا ہوگا۔ کوئی بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا بجایا جا رہا ہے لیکن جو کچھ بھی بجایا جا رہا تھا اس میں ایک قسم کی کشش



تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روح کھینچتی چلی جا رہی ہے۔ ابھی یہ ساز بج رہے تھے کہ گنگا چمار کے گھر میں سے کورس کی دھن میں آواز آنا شروع ہوئی۔ اس میں عورتوں اور مردوں دونوں کی آوازیں شامل تھیں۔ مگر اس کورس میں کیا تھا؟ اس کے ناواقفان سمجھ میں آ رہے تھے اور نہ معنی و مطلب کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ شاید یہ بچی کی پیدائش کے بعد کی دعا ہے۔

رات کے تین بجے کورس ختم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساز کی آوازیں بھی آنا بند ہو گئیں اور پھر گنگا چمار کے گھر سے اٹھتے ہوئے ہالے فضا میں بلند ہو گئے۔ چار بجے صبح دیوتا اور دیوی بھی اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے واپس ہو گئے لیکن اس وقت دونوں بہت زیادہ خوش نظر آ رہے تھے۔

دن نکلنے پر سب لوگ گنگا کے گھر پہنچے تاکہ معلوم ہو سکے کہ تمام رات کیا تماشا ہوا ہے۔ گنگا چمار کو دیکھا تو اس کی حالت بھی غیر تھی۔ بہت ہی گھبرایا اور پریشان تھا۔ لوگوں کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بچی کی پیدائش کے وقت اس کی بیوی کے پاس صرف آسمان سے اتری ہوئی عورتیں تھیں۔ ان کے ہاتھوں ہی بچی کی پیدائش ہوئی۔ پیدائش کے بعد بچی کو کسی خوشبودار پانی میں نہلایا گیا۔ آسمان سے لائے ہوئے کپڑے پہنائے گئے۔ دیوتا اور دیوی نے اتر کر خدوڑکی کے سر پر تاج رکھا۔ پھر عورتوں اور مردوں نے مل کر گنگا شروع کر دیا۔ فوجی اور دوسرے لوگوں نے لڑکی کو جگہ سے کئے۔

دیوتا نے کہا۔ ”میں دیوتا برہسپت (Jupiter) اور میری بیوی، دیوی جونو (Juno) جو بیکھو کی رانی ہے آج بہت خوش ہیں کہ ہماری بیٹی یورانیا (Urania) جو علم ہیئت کی دیوی ہے پانچ ہزار سال بعد پھر دنیا میں واپس آئی۔ جس گھر میں یہ پیدا ہوئی ہے ہم اسے وہاں سولہ سال تک رہنے دیں گے۔ پھر اسے ہم اپنے ساتھ لے جائیں

گے۔ آج میں اور میری بیوی بہت خوش ہیں۔“ اور پھر چار بجے سے پہلے پہلے دیوتا اور دیوی بچی کو پیار کرنے کے بعد اپنے تخت پر بیٹھ کر واپس ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد گنگا چمار تو کیا بلکہ نوزائیدہ بچی راج دلاری کی وجہ سے پورے گاؤں کی حالت بدل گئی۔ فصل اچھی ہونے لگی۔ لوگوں کے پاس روپے پیسے کی بہتات ہوئی۔ جتنے بیمار تھے سب اچھے ہو گئے۔ ہر شخص ہنسی خوشی کھا رہا تھا لیکن خود بچی کی یہ حالت تھی کہ ایک بار بھی اس نے ہال کا دودھ نہیں پیا۔ ماں نے جب بھی دودھ پلانے کی کوشش کی تو کسی نامعلوم طاقت نے اس کو اس کوشش کو ناکام بنادیا۔ بڑی ہونے پر اس نے بھی کوئی چیز نہیں کھائی جب بھی اسے کھانے کی خواہش ہوئی ٹہنی طاقتوں نے ہی اسے کھلایا بلایا۔ وہی اس کو نہلاتے کپڑے تبدیل کراتے پیدائش کے بعد سے ماں باپ یا کسی اور نے سوائے اس کے چہرے اور ہاتھ پیروں کے جسم کا ایک بال بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اختیار رات اور احکامات کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود بھی ایک عظیم طاقت کی مالک ہے۔ وہ جس وقت جو چاہتی وہی ہوتا۔ ویسے وہ کسی کو نقصان بھی پہنچاتی تھی۔ بڑی ہونے کے باوجود اسے بچوں سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ ان کے ساتھ کھاتی اور ان سے نامعلوم زبان میں باتیں کرتی۔

ایک روز صبح میں بیٹھی ہوئی ایک بچی کو کھلا رہی تھی کہ نامعلوم اس کے دل میں کیا آیا۔ اس نے کسی اجنبی زبان میں کسی کو کچھ حکم دیتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لمحہ بھر کے اندر ہی دوسرا آپ موجود ہوئے۔ یہ ایسے نایاب سانپ تھے جو صرف بھوپال کے علاقہ میں ہی ہوتے ہیں اور وہ بھی بہت کمی کے ساتھ ان میں سے ایک گھوڑا چھاڑ اور دوسری چار انگلی کی ناگن تھی۔ یہ دونوں اس قدر خطرناک سانپ ہیں کہ ان کا کاٹ پانی بھی نہیں مانگتا۔

ان دونوں سانپوں کو دیکھ کر سب لوگ گھبرائے

لیں کہ کچھ بھی نہ سکتے تھے۔ یہ سانپ پہلے تو تن کر سیدھے کھڑے ہوئے پھر انہوں نے اپنے چھن اس طرح زمین پر رکھے جیسے وہ راج دلاری کو جگہ کر رہے ہوں۔

لڑکی کے حکم پر دونوں سانپوں نے ناچنا شروع کر دیا۔ ان کے سامنے وہ اس طرح تاج رہے تھے کہ جیسے اس کے ازلی غلام ہوں۔ ویسے ان کا ناچ تھا بھی بہت دلچسپ ہے وہ خود اور پاس میں بیٹھے ہوئے بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔

ایک ہی واقعہ نہیں بلکہ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا نیا واقعہ پیش آتا جس کو گاؤں والے حیرت سے دیکھتے رہ جاتے اور یہ سب ہی ایسے ہوتے جن کے وجود کو عقل تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف لوگ اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں دیوانے ہو رہے تھے۔ ان کا یہ حال تھا کہ وہ بڑھا ہوا جوان، ناممکن تھا کہ اسے دیکھے اور نظر جھکا لے۔ وہ تو ایک ایسا حسن تھا جس کا ثانی اس دنیا میں نہیں مل سکتا۔ اس کا شاب ایسا ناقابل تخیل قلعہ تھا جس پر دنیا کی بڑی سے بڑی فوج بھی قابض نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود لوگوں کے دلوں میں اس کا گھٹانے کا ایک جذبہ تھا، ولولہ تھا۔ جوش تھا، آرزو تھی۔ دلوں میں جیسے ہوئے کانٹے کسی بل ان کو چین لینے نہیں دے رہے تھے۔ اسی بے چینی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کے گھر پھیرے لگاتے مگر درنیک کسی طرح رسائی نہیں ہوتی۔ گاؤں تو پھر گاؤں تھا لیکن آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی حسن ملکوتی کی ایک جھلک کے لئے اس کے گھر کا پرکھا (طواف) کرتے۔ لیکن راج دلاری کی بستی نہیں تھی جو کسی میں دلچسپی لیتی یا توجہ سے دیکھتی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی شخص کو بھی بات کرنے یا آنکھ لاسنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آس پاس کے مالدار لوگ راج دلاری کی پوشیدہ طاقتوں سے واقف نہیں تھے یا اگر اس کی طاقت کو اپنی طاقت کے آگے بچھتے تھے۔

شاید اسی لئے منڈوائی کے ٹیبل کے لڑکے رنجیت سنگھ نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش شروع کر دی۔ ویسے رنجیت سنگھ بذات خود بہت حسین جوان تھا۔ لیکن تھا آوارہ..... روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ جوانی کا نشہ چڑھا تو گاؤں میں ہاتھ پیر کا لٹنا شروع کر دیئے۔ پہلے تو اس نے بیچ ذات کنیاؤں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا جب یہاں کچھ مہارت حاصل ہو گئی تو اونچی پروازیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ اپنے گاؤں کے علاوہ آس پاس کے بھی اس کی پہنچ سے باہر نہیں رہے۔

راج دلاری کی پیدائش اور اس سے متعلق مافوق الفطرت حالات ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ دور دور تک ان کی شہرت پھیل چکی تھی۔ ان کی بناء پر سب ہی اسے دیوی مانتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس سے یہ دیوی خوش ہو جائے وہ نہال ہو سکتا ہے لیکن جس سے یہ ناراض ہو جائے اس پر بڑی سے بڑی مصیبت آ سکتی ہے لیکن نو جوان طبقے کو اس پر یقین نہیں تھا اور نہ وہ راج دلاری کی طاقت کو گردانتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ رنجیت سنگھ نے رام پور کی ہیرا پھیری شروع کر دی۔ اونپ سنگھ اپنے بیٹے کے کروت خوب جانتا تھا۔ اس کے علم میں جب یہ بات آئی تو بیوی کو پابند کیا کہ وہ بیٹے کو سمجھائے۔ لیکن رنجیت سنگھ کو تو اپنی جوانی اور طاقت پر گھمنڈ تھا۔ ماں کی بات ماننے کے بجائے اپنی جوانی کا زعم دکھانے لگا وہ تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ کوئی بھی اس کے مقابلہ میں نہیں آ سکتا۔

اونپ سنگھ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بیٹے نے ماں کی بات کی کوئی پرواہ نہیں کی تو اسے سخت افسوس ہوا۔ وہ پہلے ہی بیٹے کی پد کردار اور تکبر کی وجہ سے نالاں تھا مگر اسے یہ امید تھی کہ ممکن ہے کہ وہ راہ راست پر آجائے اور باپ دادا کو رسوا کرنے کے بجائے ان کا نام روشن کرے لیکن یہ امید موم بھی بظاہر اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ صاحبزادہ نے راج دلاری کے چکر میں رام پور کے پھیرے لگانا شروع کر دیئے ہیں تو اسے



مشہور و معروف رائٹر اسلام راہی کی مفید کتابیں

50/-	خالد بن ولید
40/-	عمر بن عبدالعزیز
40/-	حجاج بن یوسف
40/-	محمد بن قاسم
40/-	طارق بن زیاد
40/-	ہارون الرشید
40/-	مامون الرشید
40/-	رکن الدین بھرس
40/-	سلطان ملک شاہ سلجوقی
40/-	سلطان الپ ارسلان
40/-	سلطان عماد الدین زنگی
40/-	سلطان نور الدین زنگی
40/-	سلطان صلاح الدین ایوبی
40/-	سلطان محمود غزنوی
40/-	شہاب الدین غوری
40/-	قطب الدین ایبک
40/-	شمس الدین التمش
40/-	غیاث الدین بلبن
40/-	جلال الدین خلجی
40/-	علاؤ الدین خلجی
40/-	سلطان محمد تغلق
40/-	فیروز شاہ تغلق
40/-	تیمور لنگ
40/-	قبلائی خان
40/-	اسکندر لودھی

شیخ بک ایجنسی اردو بازار کراچی

فون: 32773302

”شریف ماں باپ کی کہیں اولاد کا یہی حشر ہوتا ہے۔“ پھیل نے حسرت اور افسوس کے ساتھ دوسرے لوگوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال یہ ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب چل کر اسے اٹھا کر انوپ سنگھ کے پاس روانہ کر دو۔“

لوگ ہمت کر کے آگے بڑھے لیکن گڑھے کے پاس پہنچ کر سب کے منہ سے یکا یک چیخیں نکلیں اور وہ فوراً تیزی سے پلٹ کر دوڑتے ہوئے بیٹھک میں آ گئے۔ ڈر کی وجہ سے سب کے چہرے سفید ہو رہے تھے۔ ان لوگوں کی چیخیں سن کر گاؤں کے اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے لیکن کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ کچھ لوگوں نے ان سے پوچھنے کی کوشش بھی کی لیکن خوف کی وجہ سے ان کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

ایک ایک رنجیت سنگھ کے جسم میں حرکت شروع ہوئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تمام لوگ اس کے پلٹے چلنے پر گڑھے کی جانب بھاگنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ کوشش کر کے کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہوتے ہی اس کا پورا لباس بدن سے ڈھلک کر نیچے گر گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بدن سے کپڑے اتار کر کسی نے نیچے ڈال دیئے ہوں۔

کپڑوں کے نیچے کرتے ہی سب دیکھنے والے چیخیں مارتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ نوجوان لاشیاں اور ہلے لے ہوئے ایک جگہ اٹھا کر مقابلہ کے لیے تیار کھڑے ہو گئے۔ لیکن یہ تمام سنگمہ صرف رنجیت سنگھ کی وجہ سے تھا۔ اس لئے کہ جب اس کے جسم سے کپڑے پھسل کر نیچے گرے تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کا سرمہ، ہاتھ، پیچھے غرض جسم کے ہر حصے میں بڑے بڑے پھوڑے پھوڑے ہیں۔ ہر جگہ ایک ناگ اپنی گردن باہر نکالنے کی زبان کو ہوا میں لہرا رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھنے کی وجہ سے ہمت نہیں بچی اور وہ چیخیں مارتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

نے آدمی بھیج کر بلایا ہے۔“ لنگا نے رنجیت سنگھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ بات سن کر رام پور کے پھیل کو بڑا توجہ ہوا۔ لیکن لنگا آہی گیا تھا اس لئے کچھ کہنا سننا نہ سکا تھا۔ یہی بہتر تھا کہ خاموشی کے ساتھ تماشا دیکھیں لیکن دل میں ضرور ڈر رہے تھے کہ دیکھو اب کیا تماشا ہوتا ہے۔

”کہو لنگا جی خیریت سے تو ہو؟“ رنجیت سنگھ نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ پوچھا۔

”بھگوان کی کرپا سے سب کچھ ٹھیک ہے۔“

”میں نے اس لئے تکلیف دی تھی کہ تم سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔“

”کہو چھوٹے بھیا جی؟“

”یہ تو تم جانتے ہی ہو لنگا جی کہ اپنے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔“

”ہاں جانتا ہوں بھیا جی۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تم راج دلاری کو میرے ساتھ بھیج دو۔ اس کو کسی بات کی تکلیف نہیں۔“

ابھی رنجیت سنگھ اپنی بات پوری کرنے نہیں پایا تھا کہ کسی پوشیدہ طاقت نے اس کے منہ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ اس کے تین چار دانت ٹوٹ کر باہر گر پڑے اور ابھی وہ سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ کسی نے اسے اٹھا کر بیٹھک سے باہر ہوا میں اچھال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پچاس ساٹھ گز دور ایک گڑھے میں جا گرا۔

یہ پورا اٹھیل زیادہ سے زیادہ ایک دو منٹ میں ختم ہو گیا۔ بیٹھک میں موجود آدمیوں کی سمجھ میں اب تک کچھ نہیں آیا تھا۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور جب ان کی سمجھ میں آیا تو رنجیت دور گڑھے میں پڑا ہوا تھا۔

لنگا نے تماشا دیکھ کر خاموشی سے اٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ راج دلاری کا غصہ کی وجہ سے منہ سرخ ہو رہا ہے۔ اور وہ پیش کے عالم میں آنگن میں ٹھہل رہی ہے۔ لنگا رام خاموش کھڑا ہوا بیٹی کو دیکھتا رہا پھر اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

خست فکر ہوئی۔ پھر اس کے سمجھانے پر بھی جب بیٹا نہیں مانا تو وہ سمجھ گیا کہ اب اس پر کوئی خست مصیبت آنے والی ہے۔ یہ اس کا تجربہ تھا کہ کہیں کو اگر سمجھایا جائے تو اکثر بات اس کی سمجھ میں آ جاتی ہے لیکن جب کوئی شریف زادہ بے لگام ہو جائے اور گری ہوئی حرکتیں کرنے لگے تو اس کی سمجھ میں پھر کوئی بات نہیں آتی ہے اور وہ سمجھانے والے کو بے وقوف اور کمزور سمجھتا ہے۔

پہلے تو رنجیت سنگھ کی دلوں تک رام پور کے پھیل کے گھر جاتا رہا پھر اس نے لنگا چار کے گھر کے پھر لنگا شروع کر دیئے۔ لیکن ان چکروں سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ راج دلاری یا اس کے گھر والوں نے اس کے پھر لنگا نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ آخر مجبور ہو کر ایک روز رنجیت سنگھ نے رام پور پہنچنے کے بعد لنگا چار کو پھیل کی بیٹھک میں بلوایا۔

پھیل اور اس کے لڑکوں کو رنجیت سنگھ کی یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی۔ اب تک صرف اس خیال سے کہ یہ بھی منڈوا کی کے پھیل کا لڑکا ہے اور اس کے باپ کے ساتھ بھی گھریلو تعلقات ہیں یہ لوگ اس کی آؤ بھگت کرتے رہے۔ لیکن اس کے بار بار آنے اور پھر لنگا چار کے گھر کے پھیرے لگانے سے یہ ناراض تھے۔ دوسرے دیہاتوں میں بہن یا بیٹی کی عزت و آبرو کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے خواہ وہ کسی قوم اور گھرانے کی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رنجیت سنگھ کی آمد کو اچھا خیال نہیں کرتے تھے اور ان باتوں کی اطلاع وہ انوپ سنگھ کو دینے والے تھے لیکن ان کے اطلاع دینے سے پہلے ہی رنجیت سنگھ نے آدمی بھیج کر لنگا کو بلوایا۔ رام پور کے پھیل نے جب لنگا کو بیٹھک میں آتے دیکھا تو انہیں بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ لنگا ہونے کو اب بھی چار ہی تھا لیکن راج دلاری کے جنم لینے کے بعد سے جو واقعات پیش آ رہے تھے ان کی بنا پر اس کو جو عزت و منزلت تھی اس کا لحاظ ہر چھوٹا بڑا کرتا تھا۔

”کہو لنگا کیسے آتا ہوا؟“ پھیل نے پوچھا۔

”سرکار، ان منڈوا کی والے چھوٹے بھیا جی



رجحیت سنگھ کھڑے ہونے کے بعد چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کے منہ سے دل ہلا دینے والی بھیا نک چیخیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ اور وہ پاگلوں کی طرح چیختا ہوا جنگل میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔ دوسرے دن جب اس کی لاش جنگل میں ملی تو پوری کی پوری ایسی کالی تھی جیسے کسی نے کالک مل دی ہو۔

رام پور میں مدینحیت سنگھ کی جودرگت بنی تھی اس کا چرچا گاؤں گاؤں ہو رہا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ان اوپاس نوجوانوں نے جو راج دلاری کو رام کرنے کی فکر میں تھے اپنے ارادے بدل دیئے اور اب کوئی بھی رام پور کے راستے سے گزرنے کو تیار نہیں تھا۔

کچھ دن کے بعد رام کے ایک برہمن کی لڑکی کی شادی تھی۔ بارات مرہٹے گاؤں سے آئی تھی۔ ایک تو گاؤں کی لڑکی کی شادی اور وہ بھی برہمنوں کے یہاں اسی لئے گاؤں کے سب ہی لوگ ہنسی خوشی شریک ہوئے تھے۔ بارات کے آنے پر بڑی چہل پہل تھی۔ شہنائیاں بج رہی تھیں۔ مہمانوں کا سواگت کیا جا رہا تھا۔ ہر شخص کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا تھا۔ بارانی کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد تفریح میں وقت گزارنے لگے۔ بڑے بوڑھے جگہ جگہ بیٹھے باتوں میں مصروف ہو گئے نوجوان لڑکے گاؤں کی گلیوں میں گھومنے پھرنے لگے۔ ان ہی لڑکوں میں ایک لڑکا جگدیش نامن انان بھی تھا۔ اس میں ویسے تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ عام لڑکوں کی طرح وہ بھی ایک لڑکا تھا۔ چھریرہ بدن، سانولارنگ معمولی خدوخال مگر تھا بہت مہذب اور شریلا عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی پندرہ سولہ سال کا ہوگا مزاج اور طبیعت عام لڑکوں سے ہٹ کر تھی۔ نہ کبھی شرارت کرتا نہ کھیل کود میں شریک ہوتا۔ اسے تنہائی بہت زیادہ پسند تھی۔ گھر پر بھی یا تو سب سے الگ اپنی کوشڑی میں رہتا یا پھر جنگلوں اور کھیتوں کی جانب ٹپٹنے نکل جاتا۔ اس کی اس عادت کو گھر کے لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر نوکٹے بھی رہتے لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ جگدیش کو انسانوں سے یا تو نفرت ہے یا پھر وہ ان سے خوف

کھاتا ہے۔ گھر میں بھی تنہا پڑا خلاء میں یوں گھبرا کر رہتا، جیسے کسی چیز کو تلاش کر رہا ہو۔ جب بھی اس سے اس بارے میں پوچھا گیا تو وہ ٹال گیا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ بارات کے ساتھ رام پور آنے کے بعد کچھ دیر تک لڑکوں کے ساتھ گاؤں کی گلیوں میں پھرا پھرا کر رہا۔ علیحدہ ہو کر ندی کے کنارے ٹپٹتا ہوا چلا گیا۔ اس کی یہ پرانی عادت ہونے کی وجہ سے کسی نے اس کی جانب توجہ بھی نہیں کی۔

جب وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کافی دور نکل گیا تو یکایک اسے احساس ہوا کہ وہ بہت دور آ گیا ہے۔ اس نے جائزہ لینے کے لئے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہ اس وقت ندی کے کنارے کھڑا ہوا تھا، ہر طرف کھیت تھیں لیکن فصل کٹ چکی تھی اس لئے دور دور تک کسی آدم کا وجود نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر رام پور کو دیکھا۔ گاؤں کافی فاصلہ پر نظر آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ٹپٹتا ہوا کئی میل دور نکل آیا تھا۔ دھوپ کافی تیز تھی اس لئے سوچا کہ کسی سایہ دار درخت کے نیچے ٹھوڑی دیر آرام کے بعد گاؤں واپس چلے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی سایہ دار درخت قریب میں نہ تھا۔ یکایک اس کی نظر ایک جانب پڑی چند قدم کے فاصلہ پر ایک شکستہ مندر تھا۔ اس کو بڑا تعجب ہوا کہ خیالوں میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے اس نے اس مندر کو ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔

یہ ایک چھوٹا سا مندر تھا جس کی عمارت پتھر کی بنی ہوئی تھی لیکن اب آدھے سے زیادہ منہدم ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ صدیوں سے یہاں کوئی آبادی نہیں۔ جگدیش نے سوچا کہ چلو اسے دیکھیں تو یہ کیا مندر ہے؟ یہیں تو کوشڑی دیر آرام کرنے کے بعد گاؤں واپس چلے چلیں گے۔ یہ سوچ کر وہ مندر کی جانب بڑھا۔ لیکن مندر کی بناوٹ دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ یہ کس قسم کا مندر ہے۔ اس طرح کا مندر تو اس نے آج تک دیکھا ہی نہیں تھا۔

یکایک اس کے خیالات نے پلٹا کھایا اور وہ

سوچنے لگا۔ ”یہ غلط ہے کہ میں نے اس بناوٹ کا مندر آج تک نہیں دیکھا ہے میرا خیال ہے کہ میں ایسے مندروں کو جانتا ہوں۔ میں ان کو مدتوں سے دیکھتا آ رہا ہوں۔ اپنے جنم لینے سے بھی ہزاروں سال پہلے میں ان میں جاتا تھا۔ لیکن ایسے مندر کہاں دیکھے ہیں، کب سے انہیں جانتا ہوں؟“ یہ بات اسے بالکل یاد نہیں آ رہی تھی اور جیسے جیسے وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا اس کا دماغ الجھتا جاتا۔ مگر دماغی کشمکش میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ مندر کی جانب اس طرح بڑھ رہا تھا جیسے کوئی نامعلوم طاقت اسے پیچ کر وہاں لے جا رہی ہو۔

”اوہو..... اب یاد آیا“ یکایک اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”اس قسم کے مندروں کی تصویریں اس نے اپنے باپ کی چنگ میں بنی ہوئی دیکھی ہیں۔ اور ان کے بارے میں بتا جی نے بتایا تھا کہ بیٹے یہ چنگ اپنے باپ دادا اور ان کے بھی باپ داداؤں سے ہمارے پاس چلی آ رہی ہے۔“ اس کو یاد آیا کہ یہ چنگ کاغذ کے بجائے کسی جانور کی کھال پر لکھی ہوئی تھی۔

وہ یہی سوچتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ جس طرح کی تصویریں اس نے چنگ میں بنی ہوئی دیکھی تھیں۔ یہ مندر بھی بالکل اسی طرح کا تھا۔ مندر کے بارے میں یاد آ جانے پر جو حیرانگی اور ایک نامعلوم سا خوف اس کے دل میں تھا اس کے بجائے اب ایک قسم کی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے جانے پہچانے مندر میں ہی جا رہا ہے۔ جگدیش جس وقت سیزھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو یکایک ایک تیز جھونکا اندر سے آیا اور پھر ایسا محسوس ہوا کہ فضا میں ایک عجیب قسم کی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ قسم کی خوشبو ہے۔

ایسی خوشبو اس نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ کتنی اچھا یہ خوشبو تھیں، مٹھنی، مٹھنی، مست کرنے والی خوشبو۔ ایسی خوشبو جس کے سونگھنے سے آنکھیں بوجھل

ہو کر بند ہونے لگیں اور پھر آدی سو جائے۔ اور واقعی وہ سونے لگا تھا۔ اس کو اتنا احساس تو ضرور تھا کہ خوشبو کے اثر سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں اور اب وہ دالان میں گھسے سے ٹیک لگا کر سو رہا ہے۔

مگر یہ اس کی بھول تھی۔ بظاہر وہ سو رہا تھا لیکن اس کے دل و دماغ برابر کام کر رہے تھے اور پھر چند لمحوں کے بعد اس کے کانوں میں سازوں کی عجیب قسم کی دھم سنائی دینے لگیں۔ ان دھنوں کو وہ سمجھ تو نہیں پار رہا تھا لیکن ان دھنوں پر اس کو اپنی روح کھینچتی اور بیدار ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

ابھی خوشبو اور سازوں کے بارے میں وہ کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ یکایک اسے پورے مندر میں نورانی روشنی پھیلی ہوئی معلوم ہوئی جس میں تیزی کے علاوہ ایک قسم کی خنکی اور لطافت بھی تھی۔ دودھیائی ہونے کے باوجود ہر چیز بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس نورانی روشنی میں شکستہ مندر اور دیوار پر بنی ہوئی کسی دیوتا کے شبیہ کو اپنی طرح دیکھ رہا تھا۔ مگر پلک جھپکتے ہی جب اس نے دوبارہ دیکھا تو منظر ہی دوسرا تھا۔

اب وہاں شکستہ مندر کے بجائے ایک بہت بڑے مندر کی عمارت تھی۔ سامنے کی دیوار ہٹ چکی تھی اور چند نرنگ مندر ہی مندر دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مندر کے ساتھ ساتھ کسی دیوتا کے رہنے کی جگہ بھی ہے۔ لوگ اس میں بڑی آزادی کے ساتھ چل پھر رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ یہ لوگ بڑے اچھے قسم کی ریشمی ساڑھیاں باندھے ہوئے تھے لیکن عورتوں اور مردوں کے باندھنے کا انداز جدا جدا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ آج یہاں یا تو کوئی تہوار ہو یا کسی بات کی خوشی ہے۔ سب ہی خوش خوش نظر آ رہے تھے۔ اور ہر ایک کے ہاتھ میں پھولوں کی ڈالیاں تھیں۔

جگدیش ابھی یہ سب کچھ دیکھ ہی رہا تھا کہ یکایک اس کی نظر اپنے جسم پر پڑی۔ حیرت کی وجہ سے



اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ تعجب کے ساتھ اپنے جسم کے لباس کو دیکھ رہا تھا۔ جو لباس وہ پہن کر آیا تھا اس کے بجائے وہ بھی اب ایسی ساڑھی باندھے ہوئے تھا جیسے اس وقت اور لوگ باندھے ہوئے چل پھر رہے تھے اور ساڑھی کا ایک پلو اس کے کاندھے پر پڑا ہوا تھا۔ پیروں میں سنہری کھٹ پٹیا تھیں۔ ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس میں ہیرے جو اہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سر پر ایک چھوٹا تاج بھی تھا اور وہ زمین کے بجائے پاکی نما کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے خود کو دیکھنے کے بعد جب آس پاس نظر دوڑائی تو اپنے چاروں طرف خادم کھڑے ہوئے نظر آئے۔ یہ لوگ بھی نفس ساڑھیاں باندھے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں بھی پھولوں کی ڈالیاں تھیں۔

ان سب لوگوں نے جگدیش کی جانب دیکھتے ہوئے خوشی کے تین نعرے بلند کر کے کرسی اپنے کا ندھوں پر اٹھالی اور پھر بچن گاتے ہوئے مندر کے اندر چلے گئے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جس سمت سے اس کی سواری گزرتی لوگ ادب کے ساتھ گردنیں جھکا کر کھڑے ہو جاتے اس وقت جگدیش کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور کس لئے ہو رہا ہے؟ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے لئے ہر شخص نیا تھا اس لئے کسی سے وہ کوئی بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یہ لوگ کافی دیر تک چلنے کے بعد اس کی سواری لئے ہوئے ایک بڑے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ بند تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو آگے جانے کی ممانعت ہے۔ خادموں نے اس کی سواری زمین پر رکھی اور پھر سب لوگ سینوں پر ہاتھ باندھ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔

یہ ایک دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوا اور پھر اسے سامنے ایک چبوترہ نظر آیا۔ جہاں ایک دیوتا بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدی اندر سے اس کے پاس پہنچا۔ ادب کے ساتھ کرسی سے کھڑا کرتے ہوئے اسے

اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔

دروازہ بند ہونے پر جگدیش نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا سامنے کے چبوترے پر تخت نما چار کرسیاں تھیں۔ ان میں سے بیچ کی کرسیوں پر ایک دیوتا اور ایک دیوی بیٹھے ہوئے تھے۔ دیوی کے پاس ہی کرسی پر ایک بارہ برس کی بہت خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی اور دیوتا کے پاس والی کرسی خالی تھی۔ اس کے قریب پہنچنے پر دیوتا نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا ”اگر میرے بیٹے میں تو ہزاروں سال سے تمہارے آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں دیوتا (JUPITER) اور دیوی سمیلے (SEMELE) کا بیٹا شراب کا دیوتا باکس (BACHUS) ہوں۔ تم میرے بیٹے، مسرت و شادمانی کے دیوتا کوس (COMUS) ہو۔ یہ تمہاری ماں دیوی سر سے (CIRCE) ہے اور یہ برہمپت کی لڑکی یورانیہ ہیبت کی دیوی ہے۔

بیٹا جو کچھ میں نے بتایا اس میں حیران ہونے کی بات نہیں ہے۔ ایک بات یاد رکھو کہ دیوتاؤں کی طاقت بھی ایک حد پر پہنچنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے پھر وہاں سے ایک عظیم طاقت شروع ہوتی ہے جو ہر طاقت پر حاوی ہے۔ اسی عظیم طاقت نے تمہیں بھی ہزاروں سال بعد پیدا کیا اور آج کا دن تم سے ملنے کے لئے مقرر کیا۔ آؤ یہاں میرے پاس بیٹھو یہ کرسی تمہارے لئے ہے۔“

دیوتا باکس کی بات ختم کرنے کے بعد ایک راہب جگدیش کو لئے ہوئے آگے بڑھا۔ راہب نے پہلے اسے باپ کے قدموں میں جھکا دیا۔ اس کے جھکنے ہی دیوتا نے اس کے سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ باپ کے ہاتھ پھیرتے ہی چاروں طرف سے سازوں کی آوازیں آنے لگیں اور نورانی اوپر سے پھول برساتا شروع ہو گئے۔ دیوتا باکس کے ہاتھ پھیرنے کے بعد راہب

لے اسے دیوی سمیلے کے قدموں میں جھکایا۔ دیوی نے بھی پہلے تو سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا پھر اسے اٹھا کر سینے سے لگا کر پیچ لیا۔ بیٹے کو سینے سے لگانے کے بعد ماں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ لیکن اس کے آنسو زمین پر نہیں گر رہے تھے بلکہ گالوں سے ڈھلک کے نیچے جاتے تو وہ بہت ہی خوبصورت چڑیاں آگے آگے کران کاپنی چونچوں میں لے لیتیں۔ بڑی دیر کے بعد جب ماں بیٹوں کا کئی سنبھلا تو دیوتا باکس نے کہا۔ ”بیٹے میری خواہش تو یہ تھی کہ تم دیوتاؤں کے گھر ہی پیدا ہو گے لیکن اس عظیم طاقت نے جس کے آگے دیوتا بھی مجبور ہیں جنہیں فانی انسان کے یہاں پیدا کیا۔ ویسے جہاں تمہیں پیدا کیا گیا ہے وہ بھی دیوتاؤں کی اولاد ہیں لیکن اب وہ فانی ہیں۔ تمہارے اصل ماں باپ ہم ہیں وہ لوگ نہیں۔ یورانیہ بھی ایک فانی انسان کے یہاں پیدا ہوئی اس کے اصلی ماں باپ دیوتا ہیں لیکن اب جس کے یہاں اس نے جنم لیا ہے وہ بھی دیوتاؤں کی اولاد ہیں گھر فانی ہیں۔

ہزاروں سال پہلے پھلے جنم میں تمہاری شادی یورانیہ کے ساتھ طے ہوئی تھی لیکن اس وقت یہ کام تکمیل تک پہنچنے میں اس عظیم طاقت کی مرضی نہیں تھی اس لئے دیوتاؤں کی کوشش کے باوجود تم دونوں مر گئے۔

اب پھر تم دونوں نے جنم لیا ہے لیکن دیوتا برہمپت تو یورانیہ کو آب حیات لا کر نسل دے چکا ہے اس لئے وہ نورانی ہو چکی ہے لیکن تمہیں اولیپیا پہاڑ پر جا کر آب حیات کا چشمہ تلاش کرنا ہے۔ اگر تم چشمہ تلاش کر کے نسل کر سکتے تو پھر تمہاری اور یورانیہ کی شادی ہو جائے ورنہ تم فانی ہونے کی وجہ سے دنیا میں زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکو گے اور یورانیہ کو تمہارے دوبارہ جنم لینے تک انتظار کرنا ہوگا۔ تمہارا آب حیات میں نسل کرنا ضروری ہے اس لئے کہ فانی اور غیر فانی کا امتزاج نہیں رہ سکتے۔“

دیوتا باکس کی بات ختم ہونے پر یورانیہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جگدیش کے قریب پہنچی۔ وہ بھی اسے آتا

دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ یورانیہ اپنے ہاتھ میں پھولوں کی ڈالیاں لئے ہوئے تھی۔ اس نے آدھی ڈالیاں جگدیش کو دیتے ہوئے کہا ”کوس“ میں ہزاروں سال سے تیری آمد کی منتظر تھی۔ تیرے دوبارہ جنم لینے پر میری دلی خواہش تو پوری ہو گئی لیکن انفس کے کہ تو ابھی تک فانی ہے اس لئے میں تجھے پیار نہیں کر سکتی کیونکہ میرے بوسے کی لمس سے تیری سانس ختم ہو جائے گی اور مجھے پھر ہزاروں سال تیرے دوبارہ جنم لینے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

بیٹے کو اس اب تم روانہ ہو کر اولیپیا جاؤ لیکن راستے میں بڑی مشکلات ہیں۔ جاؤ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

یہ ایک جگدیش کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے جھٹکادے کر نیند سے بیدار کر دیا ہو۔ اس نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو زور زور سے ملا اور پھر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دھوپ کی تیزی کی وجہ سے آنکھیں چند سیار ہی تھیں۔ کچھ لمحوں کے بعد جب وہ دیکھنے کے قابل ہوا تو یہ دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ جو کچھ وہ اب تک دیکھتا رہا تھا اس کے بجائے اب وہی شکستہ مندر تھا جہاں وہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے وقت کا اندازہ کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ابھی آ کر ہی بیٹھا ہے۔ وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ یہ ایک اس کی نظر اپنے پر پڑی جس میں نامعلوم قسم کے پھولوں کی بڑی خوبصورت ڈالیاں تھیں۔ جو کچھ دیکھا وہ سب صحیح تھا مجھے آب حیات کے لئے اولیپیا جانا ہی ہوگا۔ میری یورانیہ اور میرے ماں باپ میرا انتظار کر رہے ہونگے۔ ”جگدیش نے اپنے دل میں کہا اور پھر اس کے منہ سے نامعلوم زبان میں الفاظ نکلتا شروع ہو گئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ وہ جگدیش ہی نہیں جواب سے کچھ لمحوں پہلے یہاں آیا تھا۔

وہ پھولوں کی ڈالیاں ہاتھ میں لئے ہوئے رام پور روانہ ہو گیا۔ گاؤں میں جب وہ لگا چمار کے گھر کے قریب پہنچا تو چلتے چلتے یہاں ایک ٹھنک کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا



معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے آگے بڑھنے کے لئے اس کے قدموں میں جان ہی نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے محن میں راج دلاری کھڑی ہوئی تھی۔ وہی صورت، وہی قد، وہی رنگ روپ تھا جس کو ابھی مندر میں دیکھ کر آیا تھا۔ راج دلاری کے ہاتھ میں بھی وہی پھولوں کی ڈالیاں تھیں جو اس کے ہاتھ میں تھیں "یورائیا" یکا یک اس کے منہ سے نکلا۔

"کوس" اس کو جواب سنائی دیا۔ "آؤ تم اپنی یورائیا سے دور کیوں کھڑے ہو؟"

اور پھر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے مقناطیسی طاقت جگدیش کو مٹا رہی ہے۔ وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے راج دلاری کے پاس پہنچا اور پھر دونوں بے اختیار ہو کر ایک دوسرے سے ایسے لپٹ گئے جیسے ہزاروں برس کے پھڑے ہوئے مل رہے ہوں۔ یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ یکا یک محبت کے سیلاب میں بہتے ہوئے اور جذبات سے مغلوب ہو کر راج دلاری نے جگدیش کو پیار کر لیا..... لیکن یہی پیار جگدیش کے لئے پیام اجل تھا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی اور چند لمحوں کے بعد ہی وہ مردہ حالت میں اس کے ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔

راج دلاری نے جگدیش کو مردہ حالت میں دیکھ کر ایک زوردار چیخ ماری اس چیخ کو سن کر عورتیں اور مرد لنگا چمار کے گھر کی جانب دوڑے۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہر شخص دور کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا کہ جگدیش مردہ حالت میں راج دلاری کے ہاتھوں میں جھول رہا ہے۔ لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور وہ جگدیش کی لاش کو سینے سے لگائے ہوئے بڑبڑا رہی ہے "اوہ کوس یہ میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر کیا کیا مجھے تمہیں پیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تم تو فانی تھے اسی وجہ سے میں نے دیوتا باکس کے دربار میں بھی پیار نہیں کیا تھا۔ مگر محبت کے جوش میں مجھ سے کیسی بھول ہوئی۔ اب پھر مجھے تمہارا ہزاروں سال انتظار کرنا ہوگا۔ میرے کوس تم عظیم طاقت سے کہنا کہ تمہاری یورائیا تمہارا

انتظار کر رہی ہے۔ اس لئے وہ تم کو جلد ہی بھیج دیں۔ اپنی بات پوری کرنے کے بعد اس نے جگدیش کی لاش کو نیچے رکھا۔ جھک کر آخری بار پیار کیا۔ ہاتھ میں تھا سے ہوئے پھول سینے پر رکھے کھڑے ہو کر اسے بغور دیکھ کر ایک زوردار چیخ ماری اور روتی ہوئی اپنی کوشری میں چلی گئی۔

جگدیش کے ماں باپ اور عزیز واقارب کی حالت غیر تھی۔ گاؤں کا ہر فرد افسردہ اور پریشان تھا۔ راج دلاری کے کوشری میں چلے جانے کے بعد لوگ جگدیش کی لاش اٹھا کر لے گئے اور پھر اس کے کرپا کرم میں آس پاس کے تمام گاؤں کے لوگ شریک ہوئے۔ سب ہی طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے لیکن کسی کو بھی اصلیت کا پتہ نہیں تھا۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں نے بہت کم راج دلاری کو دیکھا۔ ماں باپ اس کی صورت کو ترس گئے۔ ہفتوں وہ کوشری سے باہر نہیں آتی۔ اور اگر آتی بھی تو کچھ دیر کے لئے اور پھر واپس کوشری میں چلی جاتی۔

غرض اسی طرح سولہ برس پورے ہونے کو آئے۔ کہ چاند کی چودہ تاریخ کی رات میں یکا یک آسمان سے پھر ہالے اترنا شروع ہوئے۔ ان ہالوں سے نورانی مخلوق کی آمد شروع ہوئی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی ان لوگوں کی وضع ایلیوں جیسی تھی۔ ان کے ساتھ فوجی سوار دستے بھی تھے۔ یہ سب کے سب لنگا چمار کے گھر میں اترے۔ ان لوگوں نے پہلے تو راج دلاری کو بچہ کیا دوبارہ کھڑے ہونے کے بعد ایک آدمی فرمان لئے ہوئے آگے بڑھا اور پھر دوڑا تو ہونے کے بعد اس نے یہ فرمان راج دلاری کو بڑھ کر سنایا۔ اس عرصہ میں راج دلاری خاموشی کے ساتھ کھڑی کھڑی رہی۔ فرمان ختم ہونے کے بعد وہ سب گردن جھکائے خاموشی کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ شاید وہ جواب کے منتظر تھے۔

راج دلاری خاموش کھڑی ہوئی کسی بات پر غور کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل

دماغ میں کوئی ایسی الجھن ہے جس کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ آخر کچھ دیر بعد اس نے نظر اٹھا کر سب کو دیکھا۔ چند قدم آگے بڑھی اور پیار کے سامنے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر گردن خم کر دی۔ اس کے گردن خم ہوتے ہی سب لوگوں نے ایک نعرہ بلند کیا۔ لیکن یہ نعرہ کیا تھا کوئی بھی سمجھ نہ سکا۔ جب یہ لوگ نعرہ لگا کر خاموش ہوئے تو راج دلاری نے اپنی گردن سیدھی کر کے ایک ہاتھ اور لایا اور ساتھ ہی نامعلوم زبان میں کچھ الفاظ کہے جن کو سن کر نورانی مخلوق نے پھر نعرہ بلند کیا اور راج دلاری کے سامنے سجدے میں جھک گئے۔ اور پھر سجدے سے اٹھنے کے بعد جس طرح آئے تھے اسی طرح واپس ہو گئے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد راج دلاری سونے کے بجائے تمام رات بیدار رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خاص بات اسے پریشان کئے ہوئے تھے۔ آخر دن نکلنے پر اس نے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماں"

"میری بیٹی۔ میری لاڈو" ماں نے بے قرار ہوتے ہوئے کہا "ماں" راج دلاری بے چین ہوتے ہوئے بولی اور پھر دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔

جب سے راج دلاری پیدا ہوئی تھی یہ پہلا اتفاق تھا کہ وہ اس طرح ماں سے لپٹی تھی۔ دونوں ماں بیٹی بڑی دیر تک ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی روتی رہیں۔ آخر جب کچھ آنسو تھکے تو ماں سے علیحدہ ہونے کے بعد راج دلاری نے باپ کے پیچھے پڑتے ہوئے کہا۔

"پتا جی"

"بیٹی" لنگا چمار نے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت خود اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"پتا جی..... میرے جانے کا وقت آ گیا ہے"

"کیسا وقت بیٹی؟" ماں باپ نے یک زبان

ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ماں" تمہیں معلوم ہے کہ میں دیوتا برہمپت کی بیٹی ہوں۔ البتہ دنیا میں دوبارہ آنے کے لئے میں تمہارے پیٹ میں رہی اور شہارے یہاں پیدا ہوئی اس لئے تم بھی میرے ماں باپ ہو سکتی ہو۔ وجہ ہے کہ تمہیں چھوڑتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے۔

رات کو دیوتا پتا اور دیوی ماتا کے پاس سے بلاوے کا سندیرہ آیا تھا۔ میں اگلے مہینے آج کی رات چلی جاؤں گی۔ لیکن وعدہ کرتی ہوں کہ ہر سال پورنماش کی رات تمہارے پاس آیا کروں گی۔ اس کے علاوہ جب بھی تم بلاؤ گی میں ہر حالت میں تمہارے پاس آؤں گی لیکن خواب میں۔ اور جب تم اس دنیا میں نہیں رہو گے تو بھی میں تمہاری ساوی برآؤں گی۔

میرے جانے کے بعد بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہاری حفاظت کے لئے میں ایک ایسی طاقت چھوڑ جاؤں گی جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری طاقت نہیں کر سکے گی۔

لیکن اس ایک مہینے میں راج دلاری کی عجیب حالت تھی۔ کبھی وہ خوش ہوتی اور کبھی روتی۔ ماں باپ کے ساتھ بھی وہ بہت زیادہ کھل مل گئی تھی۔ اب وہ اکثر ماں کے سینے پر سر رکھ کر سو جاتی۔

گھر کا کام بھی وہ بڑی محنت کے ساتھ کرنے لگی تھی۔ پورے مہینے اس نے کام میں ماں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ کھانا پکاتی، برتن صاف کرتی، جھاڑو دیتی، ماں کے کپڑے دھوتی۔ جس طرح اور گھر گرہست لڑکیاں گھروں میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی اور کام کاج کرتیں لیکن روتا اور ہنستا اب بھی اس کا بند نہیں ہوا تھا۔

آخر کار وہ رات آ ہی گئی جس کی آمد سے راج دلاری کے ماں باپ خوف زدہ اور پریشان تھے۔ کئی دن پہلے سے ماں باپ نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ راج دلاری بڑی محنت سے کھانا تیار کرتی اور پھر بڑی چاہت کے ساتھ ماں کے منہ میں نوالہ ڈالتی۔





## ناگ منی

سیمامیر - اماگڑھ

بین کی آواز سنتے ہی نوجوان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی، چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے اور پھر وہ زمین پر لیٹتے ہی ایک خوفناک ناگ میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن پھر ایک اور ناقابل یقین منظر رونما ہوا۔

خوف کے لبادے میں لپٹی خونی وادی کی طرف پورا ڈھن پر سکتہ طاری کرتی انوکھی کہانی

لیکن میں رشی بننا چاہتا ہوں، میں نے تین سال ویران غاروں مندروں اور ناگ دیوتا کی تپسیا کی ہے تب یہ تعویذ حاصل کیا ہے۔ اس نے اپنے گلے میں بندھے ایک ترشول نما تعویذ کی طرف اشارہ کیا۔ ”منی تو میں نے تجھ سے حاصل کر لی لیکن اس کو سیت کرنے کا منتر صرف تو جانتا ہے کیونکہ ناگیشور نے وہ منتر صرف تجھے بتایا تھا۔ اس ناگ منی کو حاصل کرنے کے لئے کتنے سادھو کتنے مہا پرش

”اے اب تو ناگ منی کو سیت کرنے کا منتر بتا دے۔“ پر تپ سہیں یہاں اس کھنڈرات میں قید کئے ہوئے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ کیوں اپنے آخری عمر میں اپنے آپ کو اور اپنی جتنی کوازیبت دے رہے ہو۔“ ”نہیں تری کال! کبھی نہیں، میں مہا جاؤں گا لیکن اس کو سیت کرنے کا منتر تجھے کبھی نہیں بتاؤں گا۔“ ”دیکھو پر تپ تمہیں اس منی سے کوئی فائدہ نہیں،

مگر گنگا چمار اور اس کی بیوی کو کسی حالت قرار نہیں تھا۔ پریشانی کی وجہ سے ان کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ جب دونوں یہ سوچتے کہ ان کی جوان بیٹی ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہونے والی ہے تو ان کے گلچے پھٹنے لگتے۔ وہ انتہائی بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں تھے لیکن کرکچہ بھی نہیں سکتے تھے۔

پورنماشی کی رات میں ایک بار پھر آسمان سے ہالے اترنا شروع ہوئے وہی سازوں کی آوازیں تھیں اور پہلے کی طرح آج بھی فضا معطر تھی۔

تخت اترنے کے بعد راج دلاری اپنی کوٹھری میں سے نکلی اس وقت وہ نور میں نہائی ہوئی حریری لباس میں بیوس اپسرا دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ نورانی لڑکیاں تھیں جو اس کے لباس کو تھامے ہوئے چل رہی تھیں۔

تخت کے قریب پہنچ کر وہ خاموشی سے نظر جھکائے ادب کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ دیوتا اور دیوی اپنے تخت سے اترے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بہت ہی خوبصورت تاج تھا جس کو انہوں نے راج دلاری کے سر پر رکھ دیا۔

تاج سر پر رکھتے ہی عورتوں مردوں کو ملا جلا کر کورس شروع ہوا۔ کورس کے خاتمہ پر راج دلاری دیوتا اور دیوی کے درمیان جا کھڑی ہوئی۔ چند منٹ خاموش کھڑے رہنے کے بعد تینوں آگے بڑھتے ہوئے اس جگہ پر پہنچے جہاں گنگا چمار اور اس کی بیوی بت بنے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ یہ لوگ پہلے تو ان کے پاس خاموش کھڑے رہے۔ اس کے بعد دیوتا اور دیوی نے اپنے اپنے سیدھے ہاتھ پھیلا کر ان سے کچھ کہنا شروع کیا۔ پھر بات ختم کرنے کے بعد گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

ایک ایک راج دلاری آگے بڑھی اور پھر زمین دوز ہوتے ہوئے اس نے ماں کے پیڑ پکڑ لئے۔ ماں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔





اور کتنے اچھا داری سانپ آئے لیکن وہ مٹی نہیں لے جا سکے کیونکہ جہاں یہ مٹی قید ہے اس کے آس پاس کی جگہ کو میں نے اپنے منتروں سے کنڈل میں کر دیا ہے اس لئے جو بھی اس مٹی کے قریب جائے گا وہ جل کر جسم ہو جائے گا میں تجھے تیرہ دن اور دینا ہوں سوچ لے، آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد ناگ پنجویں ہے، اس ناگ پنجویں کے دن ہی مجھے وہ ناگ مٹی سیت کرنی ہے۔“

چند گڑھ مین ناگ دیوتا کا ایک بہت قدیم اور پرانا مندر ہے یہ تو ابھی تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ مندر کب بنا اور کس نے تعمیر کیا؟ اپنے وقت میں یہ مندر بہت خوبصورت رہا ہوگا لیکن اب تو اس مندر کے صرف کھنڈرات ہی باقی ہیں، اور مندر کے اندرونی ہال میں ایک بہت بڑے ناگ کا مجسمہ بنا ہوا ہے جو آج بھی اپنی اصل حالت میں ہے، ایسا لگتا ہے کہ گزرے ہوئی سے نے اس پر کوئی اثر نہیں چھوڑا، ہر ناگ پنجویں کو اس مندر میں ہزاروں سانپ پوجا کرنے آتے ہیں جس اچھا داری سانپ کی تپسیا سے ناگ دیوتا خوش ہو جائے وہ اسے مٹی دان کر دیتا ہے۔

ایسے ہی خوش نصیبوں میں ایک اچھا داری ناگ ناگیشور تھا جس کی سو سال کی تپسیا سے ناگ دیوتا اتنا خوش ہوا کہ اسے ناگ مٹی دان کر دی۔

☆.....☆.....☆

ایک دن ٹھاکر پر تاب سنگھ اس کی پتی رملہ دیوی اور سات سال کا بیٹا شام چندر گڑھ میں اپنے ایک عزیز کو ملنے جا رہے تھے کہ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جب وہ گھر سے چلے تو گھر بے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی بارش کے ساتھ تیز ہوائیں بھی چلنا شروع ہو گئی تو ٹھاکر پر تاب کو گاڑی چلانا دشوار ہو گیا۔ موسم کے پھرے ہوئے تیور دیکھ کر ٹھاکر پر تاب نے اپنی پتی سے کہا۔ ”رملہ ایسا لگتا ہے کہ اس طوفانی بارش میں گاڑی آگے نہیں جا سکے گی۔ سامنے کسی عمارت کے آثار نظر آ رہے ہیں، وہاں کچھ دیر انتظار کر لیتے ہیں، جیسے ہی بارش میں کمی آئے گی تو ہم

آگے سفر کر لیں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ رملہ دیوی بولی۔

گاڑی مندر کے سامنے ایک جھکے سے رکی۔ وہی ناگ دیوتا کا مندر تھا جس میں سانپ پوجا کرنے آتے ہیں۔ وہ لوگ مندر کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ بھائی صاحب کی آواز پر ٹھاکر پر تاب چونک کر پلٹ ایک آدمی جس نے چمکدار لباس پہنا تھا۔ لباس ایسا تھا جیسے سانپ کی پتلی ہو، اس کے سر پر ایک بڑا سا سنہرا تاج چمک رہا تھا جو سانپ کی شکل کا تھا۔

”آپ کون ہیں؟“ ٹھاکر پر تاب نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”گھبرائیے نہیں، بھائی صاحب!“ اس آدمی نے کہا۔ ”میں ایک اچھا داری ناگ ہوں، میری سو سال کی تپسیا سے خوش ہو کر ناگ دیوتا نے مجھے یہ ناگ مٹی دان کر دی ہے، اس نے ٹھاکر پر تاب کو اپنی مٹی میں موجود مٹی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ جیسے ہی اس نے مٹی کو سامنے کیا اس مٹی سے اتنی تیز روشنی پھوٹ رہی تھی کہ ان کی آنکھیں چندھیا گئیں تو بے ساختہ ٹھاکر اور رملہ دیوی نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

”آپ میری بات سنئے؟“ اس آدمی کی آواز میں التجائی۔ ”آپ اس ناگ مٹی کو اپنے پاس رکھ لیں کیونکہ میرے پیچھے ایک سپر اتری کال لگا ہوا ہے وہ مجھ سے یہ

ناگ مٹی لینا چاہتا ہے تاکہ وہ تری کال رشی بن جائے اور اگر ایسا ہوا تو یہ انسانیات کے لئے ایک بڑا کشت ہوگا۔“ اس آدمی نے جو دراصل ناگیشور تھا، وہ مٹی ٹھاکر پر تاب کے ہاتھوں میں تھما دی۔

ٹھاکر پر تاب جو ابھی تک سکتے کی سی حالت میں تھے یک دم ہوش میں آ گئے۔

”بھائی صاحب یہ ناگ مٹی میری آپ کے پاس امانت ہے آج سے ٹھیک پندرہ سال بعد ناگ پنجویں کے دن، میں یہ آپ سے واپس لے لوں گا کیونکہ میرے پاس ابھی اتنی خشکی نہیں کہ میں تری کال کا مقابلہ کر سکوں میں دھرتی کے پاتال میں چھپنے جا رہا ہوں اگر ٹھیک پندرہ سال

بعد میں نہ آیا یا مجھے کچھ ہو گیا تو آپ اس مٹی کو اکھنڈ امرتا کے چرنوں میں رکھ دینا۔“ ناگیشور نے کہا۔ اچانک ہی تین کی آواز سنائی دی۔ ”اچھا اب میں چلا ہوں تری کال یہاں پہنچنے والا ہے۔“

ایک دم سے ٹھاکر پر تاب نے کہا۔ ”اس مٹی کو سیت کرنے کا منتر کیا ہے؟“

ناگیشور نے جلدی سے ٹھاکر کو مٹی سیت کرنے کا منتر بتایا۔ ”یہ منتر پڑھ کر مٹی پر پھونک مارو گے تو یہ سیت ہو جائے گی۔“ یہ کہتے ہوئے ناگیشور اچانک ایک سنہرے سانپ میں تبدیل ہو کر ریگلتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

مین کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی اور پھر تری کال تین سمیت مندر میں داخل ہوا، وہ ایک خوفناک شکل کا تاترک تھا۔ ایک ترشول سے مشابہہ تعویذ تھا، جو اس نے کالی ڈوری میں پرو کر اپنے گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ اس کے جیسے ہی نظر ٹھاکر پر تاب اور ان کی پتی رملہ پر پڑی تو اس نے تین بجانا بند کر دی۔ ”اچھا تو تیرے پاس ہے وہ مٹی، وہ مٹی میرے حوالے کر دو۔“ تری کال نے ٹھاکر پر تاب سے کہا۔

”نہیں میں ایسا نہیں کروں گا یہ میرے پاس ناگیشور کی امانت ہے وہ پندرہ سال بعد مجھ سے واپس لینے آئے گا۔“

”ہا..... ہا..... ہا“ تری کال نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”ارے تو پندرہ سال کی بات کرتا ہے، میں اسے پندرہ منٹ بھی زندہ نہیں رہنے دوں گا میں اسے مار دوں گا میں پھر بھی ناگ مٹی تیرے حوالے نہیں کروں گا تو منٹ نہیں شیطان ہے۔“ ٹھاکر پر تاب نے کہا۔

”اچھا نہیں دے گا بھولو جنتی۔“ اس نے ساتھ آئے اپنے دو چیلوں سے کہا۔ ”اس کے ہاتھ سے ناگ مٹی تحمین کر ہمارے حوالے کر دو۔“ چشمہ زون میں وہ دونوں ٹھاکر پر تاب پر پل پڑی۔

شام جوان سب باتوں سے خوفزدہ ہو کر ایک ستون کے پیچھے چھپا ہوا تھا ایک دم سے آکر باپ کو بچانے لگا، اس

نے جنگلی کے ہاتھ پر زور سے دانتوں سے کاٹا۔ ”ارے کتے کے پلے۔“ جنگلی نے غصے میں آ کر شام کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور گھبرا کر ایک دیوار پر دے مارا شام کا سرتائی زور سے دیوار سے ٹکرایا کہ اس کے سر سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

جنگلی اور بھولو نے مٹی تری کال کے حوالے کر دی تری کال مٹی کو پا کر خوشی سے ناچنے لگانا چتے ناچتے اچانک اس کو ایک خیال آیا، اس نے ٹھاکر پر تاب سے کہا۔ ”ناگ مٹی تو تم سے لے لی اب اس کو سیت کرنے کا منتر بھی بتا دو۔“

”نہیں تری کال نہیں! مٹی تو تم نے حاصل کر لی لیکن جب تک اس کو سیت کرنے کا منتر نہیں نہیں آتا یہ مٹی ایک پتھر کے موتی کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور وہ منتر صرف میں جانتا ہوں، تم مجھ سے وہ منتر بھی نہیں اگوا سکتے، میں مر جاؤں گا لیکن منتر نہیں نہیں بتاؤں گا۔“ ٹھاکر پر تاب کا ٹھاکر کر دلا خون جاگ اٹھا۔

”اچھا یہ بات ہے، بھولو اور جنگلی اسے لے جاؤ ان دونوں کو کھنڈرات کی کال کوٹھری میں بند کر دو جب تک یہ منتر نہیں بتا دیتا یہ میری قید میں رہیں گے۔“

اور اس طرح 15 سال سے ٹھاکر پر تاب اور اس کی پتی تری کال کی کال کوٹھری میں قید ہیں لیکن ٹھاکر نے وہ منتر تری کال کو نہیں بتایا ہے اور نہ ہی بتائے گا۔

☆.....☆.....☆

سادوشری رام اپنے بھگتوں کے ساتھ چندر گڑھ کے اس پرانے مندر میں ہر سال سانپوں کے لئے دو وہ لاتے تھے۔ سادو کے دوادہ 22 سال ہو چکے تھے مگر ابھی تک اس کی پتی راگنی کی گود سونی تھی، سادو نے اپنے اور اپنی پتی کے بہت علاج کرائے ہر مندر میں گئے، سادو خود بھی ایک بہت بڑا تاتری تھے، ہر کسی کے کام آتے تھے مگر بھگوان نے ان کو اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا، وہ ہر سال سانپوں کو دو وہ پلانے ناگ دیوتا کے اس مندر میں آتے تھے، تری کال کے جانے کے کچھ دیر بعد شری رام نے اپنے بھگتوں کے ساتھ وہاں آئے سب سے



پہلے انہوں نے ناگ دیوتا کے مجسمے کو دودھ سے نہلایا پھر  
چھوٹی چھوٹی کنوریوں میں دودھ بھر کر مندر کے ہر کونے  
کھوروں میں رکھ دیا جیسے ہی وہ مندر کی پچھلی دیوار کی  
طرف آئے انہیں زمین پر ایک بچہ بے ہوش پڑا ملا جس  
کے سر سے خون بہت تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ انہوں  
نے اپنے جگتوں کی مدد سے اسے جلدی سے اٹھایا اور وید  
کے پاس لے گئے اس کا علاج کرایا۔

شکل کا شہزادی تاج تھا وہ دراصل ناگیشور تھا۔

چھوٹی چھوٹی کنوریوں میں دودھ بھر کر مندر کے ہر کونے  
کھوروں میں رکھ دیا جیسے ہی وہ مندر کی پچھلی دیوار کی  
طرف آئے انہیں زمین پر ایک بچہ بے ہوش پڑا ملا جس  
کے سر سے خون بہت تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ انہوں  
نے اپنے جگتوں کی مدد سے اسے جلدی سے اٹھایا اور وید  
کے پاس لے گئے اس کا علاج کرایا۔

بہوش میں آنے کے بعد شری رام نے اس بچے  
سے بہت پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے اور اس ناگ  
دیوتا کے مندر میں کیسے پہنچا؟ مگر وہ بچہ صرف اتنا ہی بتا پایا  
کہ ”وہ بین والا میرے ماتا پتا کو لے گئے ہیں۔“

شری رام نے اپنے طور پر معلوم کر کے کوشش کی  
تو اس بچے کے باری میں کچھ معلوم نہ ہو سکا پھر انہوں  
نے یہ سوچ کر کہ ”شاید بھگوان اب ہمیں مزید بے اولاد  
نہیں رکھنا چاہتا۔“ انہوں نے اور ان کی پتی راگنی نے  
اس بچے کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ یوں شام کی پرورش سادھو شری  
رام کے گھر میں ہونے لگی۔

ایک دن کالی ماتا کے مندر میں پوجا ہو رہی تھی  
مندر کے بڑے ہال کے اندر سارے گاؤں کے لوگ جمع  
تھے۔ سادھو شری رام آنکھیں بند کر کے بھجن گارہے تھے  
کہ اتنے میں ایک منہرے رنگ کا سانپ مندر کے بیرونی  
دروازے سے اندر آیا اور آخر شری رام کے قدموں میں  
کنڈی مار کر بیٹھ گیا جیسے وہ سادھو شری رام سے آشر واد لینا  
چاہتا ہو، جیسے ہی لوگوں کی نظر اس سانپ پر پڑی لوگ  
سانپ سانپ کہہ کر ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے مندر  
سے باہر جانے لگے شور شرابے کی آواز سن کر شری رام نے  
آنکھیں کھول کر دیکھا تو اپنے قدموں کے ساتھ اتنے  
بڑے سانپ کو دیکھ کر گھبرا گئے، اور قریب ہی پڑا پتیل کا  
لوناٹھا کر سانپ پر دے مار لوناٹھا جیسے ہی سانپ پر پڑا تو  
انسانی چیخیں گونجنے لگیں سادھو کی نظر ایک دم زمین پر  
پڑے سانپ پر پڑی تو ان کے ہاتھ کپکپانے لگے کیونکہ  
جس سانپ کو انہوں نے لوناٹھا تھا۔ اب وہاں ایک آدمی  
جس نے چمکدار لباس پہنا تھا اور جس کے سر پر سانپ کی

شکل کا شہزادی تاج تھا وہ دراصل ناگیشور تھا۔  
ناگیشور نے اگلی ہوئی سانسوں کے درمیان شری  
رام کو مخاطب کر کے کہا۔  
”میں ایک اچھا داری ناگ ہوں، میں نے اپنی  
ناگ مٹی کی کوامانت کے طور پر دی تھی اس سے وہ مٹی تری  
کال نے چھین لی ہے، مجھ میں اتنی خفگیں نہیں تھا کہ میں  
تری کال کا سامنا کر سکتا اس لیے میں نے خود کو زمین کے  
پاتال میں چھپا لیا تھا۔ آج میں پہلی دفعہ 15 سال بعد  
دھرتی پر آیا تاکہ آپ سے آشر واد لے کر وہ ناگ مٹی  
حاصل کر لو، مگر آپ نے میری ہتھیا کر ڈالی۔“  
سادھو شری رام یہ سن کر ناگیشور کے پاؤں پر  
گر گئے۔ ”مجھے شمع کر دیں، مجھ سے بہت بڑی بھول ہو  
گئی، میں آپ کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا، مجھے شاکر دیتے ہیں، مجھ  
سے کیسا پاپ ہو گیا، مجھے شاکر دیں۔“ شری رام ہاتھ جوڑ  
کر گڑ گڑاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔  
”آپ کے شامناگنے سے میری جان واپس نہیں  
آ سکتی۔ آپ کو ایک ہی صورت میں ناگ ہتھیا سے کٹی  
مل سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اب آپ میرے شری کو اپنے  
پاس سنبھال کر رکھیں اور وہ ناگ مٹی لا کر میرے شری  
کے اوپر رکھ دیں گے تو مجھے جیون دان مل سکتا ہے۔“  
ناگیشور نے کہا۔  
”مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے۔“ شری رام  
نے کہا۔ مسلسل تین مہینے ہو گئے کہ سادھو شری رام مختلف  
گاؤں بستیوں میں جا کر تیری کال کا پتہ معلوم کرتے  
رہے مگر ناکام واپس آ جاتے اب تو وہ بھی مایوس ہو چکے  
تھے، کہ ایک دن شری رام ایک پسیروں کی بستی میں گئے  
وہاں جا کر انہوں نے ایک بوڑھے سپیرے سے تری کال  
کا پتہ پوچھا۔ اس نے کہا۔ جنوب کی سیدھ میں پہاڑوں  
کے اوپر تری کال کی بستی ہے۔ انہی سے چلنا شروع کرو  
گے تو شام سے پہلے وہاں پہنچ جاؤ گے۔“  
تری کال اپنے بھگت جنگلی کے ساتھ بیٹھا تھا کہ  
دور سے ایک سادھو آتے ہوئے نظر آئے جب شری رام  
قریب پہنچے تو انہوں نے تری کال کے حلیے سے پہچان لیا

کہ یہ ہی تری کال ہے۔ شری رام نے تری کال سے  
کہا۔ ”وہ جی مجھے دے دو میں اس سے ایک شب کام لینا  
چاہتا ہوں۔“  
ناگ مٹی کا نام بھی کوئی اپنی زبان پر لاتا ہے تو میں  
اس کی زبان کاٹ ڈالتا ہوں۔“ تری کال نے کرخت  
ہجے میں کہا۔ ”جنگلی اس کو مار ڈال۔“

شری رام یہ دیکھ کر وہاں سے بھاگے تلوار ہاتھ میں  
لے ہوئے جنگلی، ان کے پیچھے لپکا شری رام کھنی جاڑیوں  
میں الجھنے بھاگ رہے تھے کہ ایک دم سے ان کا تیرا ایک  
جھاڑی میں اٹک گیا اور وہ دھڑام سے زمین یوں ہو گئے،  
جیسے ہی جنگلی قریب پہنچا شری رام نے ایک دم کہا۔  
”اے بھولے ہاتھ میری رکھشا کریں۔“ آسان  
میں اچانک جنگلی جنگلی نے جیسے ہی جنگلی کی طرف دیکھا  
اسے دیکھا تو دینا بند ہو گیا اور وہاں سے بھاگ نکلے گھر  
پہنچے تو ان کا برا حال تھا۔  
شام نے جب اپنے پتا کی یہ حالت دیکھی تو اس  
نے کہا۔  
”آج سے میرا آپ کو یہ وچن ہے کہ وہ ناگ مٹی  
میں تلاش کروں گا۔“  
”نہیں بھیرا جیون تو ڈھلتی دھوپ ہے اور تو  
چڑھتا سورج شری رام نے کہا۔ ”ایسے سورج کا کیا  
فائدہ جو آکاش پر چمک نہ سکے میں وہ مٹی ضرور حاصل  
کروں گا بس آپ صرف اتنا بتادیں کہ یہ تری کال رہتا  
کہاں ہے؟“  
شام تری کال کے گاؤں کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہ  
انہی گاؤں سے تھوڑی دور تھا کہ راستے سے ہٹ کر  
جھاڑیوں میں زور کی نوانی چیخ سنائی دی۔ وہ آواز اس  
کے دائیں طرف سے آ رہی تھی وہ تیز قدم اٹھاتا کھنی  
جھاڑیوں کی طرف بڑھا شام نے جیسے ہی جھاڑیاں بٹائی  
تو ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی جس کی عمر 16، 17 سال  
ہوئی ایک آدمی نے دبوچ رکھا تھا اور اس کے ساتھ دست  
درازی کر رہا تھا۔  
شام نے اس آدمی کو پیچھے سے پکڑ کر تھپتا تو وہ

کہ یہ ہی تری کال ہے۔ شری رام نے تری کال سے  
کہا۔ ”وہ جی مجھے دے دو میں اس سے ایک شب کام لینا  
چاہتا ہوں۔“  
ناگ مٹی کا نام بھی کوئی اپنی زبان پر لاتا ہے تو میں  
اس کی زبان کاٹ ڈالتا ہوں۔“ تری کال نے کرخت  
ہجے میں کہا۔ ”جنگلی اس کو مار ڈال۔“

شری رام یہ دیکھ کر وہاں سے بھاگے تلوار ہاتھ میں  
لے ہوئے جنگلی، ان کے پیچھے لپکا شری رام کھنی جاڑیوں  
میں الجھنے بھاگ رہے تھے کہ ایک دم سے ان کا تیرا ایک  
جھاڑی میں اٹک گیا اور وہ دھڑام سے زمین یوں ہو گئے،  
جیسے ہی جنگلی قریب پہنچا شری رام نے ایک دم کہا۔  
”اے بھولے ہاتھ میری رکھشا کریں۔“ آسان  
میں اچانک جنگلی جنگلی نے جیسے ہی جنگلی کی طرف دیکھا  
اسے دیکھا تو دینا بند ہو گیا اور وہاں سے بھاگ نکلے گھر  
پہنچے تو ان کا برا حال تھا۔  
شام نے جب اپنے پتا کی یہ حالت دیکھی تو اس  
نے کہا۔  
”آج سے میرا آپ کو یہ وچن ہے کہ وہ ناگ مٹی  
میں تلاش کروں گا۔“  
”نہیں بھیرا جیون تو ڈھلتی دھوپ ہے اور تو  
چڑھتا سورج شری رام نے کہا۔ ”ایسے سورج کا کیا  
فائدہ جو آکاش پر چمک نہ سکے میں وہ مٹی ضرور حاصل  
کروں گا بس آپ صرف اتنا بتادیں کہ یہ تری کال رہتا  
کہاں ہے؟“  
شام تری کال کے گاؤں کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہ  
انہی گاؤں سے تھوڑی دور تھا کہ راستے سے ہٹ کر  
جھاڑیوں میں زور کی نوانی چیخ سنائی دی۔ وہ آواز اس  
کے دائیں طرف سے آ رہی تھی وہ تیز قدم اٹھاتا کھنی  
جھاڑیوں کی طرف بڑھا شام نے جیسے ہی جھاڑیاں بٹائی  
تو ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی جس کی عمر 16، 17 سال  
ہوئی ایک آدمی نے دبوچ رکھا تھا اور اس کے ساتھ دست  
درازی کر رہا تھا۔  
شام نے اس آدمی کو پیچھے سے پکڑ کر تھپتا تو وہ

کہ یہ ہی تری کال ہے۔ شری رام نے تری کال سے  
کہا۔ ”وہ جی مجھے دے دو میں اس سے ایک شب کام لینا  
چاہتا ہوں۔“  
ناگ مٹی کا نام بھی کوئی اپنی زبان پر لاتا ہے تو میں  
اس کی زبان کاٹ ڈالتا ہوں۔“ تری کال نے کرخت  
ہجے میں کہا۔ ”جنگلی اس کو مار ڈال۔“

بریں طرح بوکھلا گیا اور گھبرا گیا، شام نے اس پر خنجر اٹھالیا  
تو اس آدمی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سر پر پاؤں رکھ کر  
بھاگ گیا۔  
وہ لڑکی جو دراصل تری کال کی بیٹی میروتھی کپڑی  
جھاڑی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”اے اجنبی تم کون ہو؟ جو اس سے بھگوان بن کر  
میری عزت بچانے کے لئے آئے۔“  
شام جو بڑی خوبیت سے میرو کو تک رہا تھا ایک دم  
چونکا۔ ”جی میں پر دیسی ہوں ماتا پتا پر لوگ سدھار چکے  
ہے، میں کام کے سلسلے میں ادھر آ نکلا تھا کہ آپ کی چیخوں  
سے ادھر آیا۔“  
میرو بولی۔ ”آپ کا بہت بہت دھننے واہ، میں  
یہاں کے بڑے ناتری تری کال کی اکلوتی بیٹی میرو ہوں،  
میں یہاں لکڑیاں چنے آئی تھی کہ اس دشت نے مجھے اکیلا  
پاکر میری عزت لوٹی چاہی اگر تم نہ ہوتے تو آج یہ میری  
عزت لوٹ چکا ہوتا۔“

شام کا ذہن تو اس ایک بات میں اٹک گیا کہ یہ  
تری کال کی بیٹی ہے اس نے سوچا۔ ”اس لڑکی کو اپنے پریم  
جال میں پھنسا لو تو ناگ مٹی اسی کے ذریعے حاصل کر سکتا  
ہوں۔“ اس نے میرو سے کہا۔ ”آپ بہت سندھ ہیں، اس  
طرح اکیلی گھر سے نہ نکلا کریں، آپ ہیں ہی اتنی سندھ کہ  
جو دیکھے گھال ہو جائے۔“  
میرو اپنی اتنی تعریف سن کر شرمائی اور ویسے بھی  
میرو کو شام ایک ہی نظر میں اچھا لگنے لگا تھا۔  
”اجنبی میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں اپنے ہاپوسے  
ملائی ہوں، وہ تمہیں ضرور کوئی کام دے دیں گے۔“  
شام تو یہی چاہتا تھا فوراً میرو کے ساتھ چل پڑا۔  
”ہاپو“  
”ہاں بیٹی! مگر میرو یہ اجنبی کون ہے اور تم اسے  
کیوں یہاں لائی ہو؟“  
”ہاپو جب میں لکڑیاں چنے گئی تھی تو بھولو نے  
میری عزت لوٹی چاہی، یہ اجنبی کام کی تلاش میں ادھر آ رہا  
تھا کہ میری چیخیں سن کر میری مدد کی اور مجھے بھولو کے چنگل

بریں طرح بوکھلا گیا اور گھبرا گیا، شام نے اس پر خنجر اٹھالیا  
تو اس آدمی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سر پر پاؤں رکھ کر  
بھاگ گیا۔  
وہ لڑکی جو دراصل تری کال کی بیٹی میروتھی کپڑی  
جھاڑی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”اے اجنبی تم کون ہو؟ جو اس سے بھگوان بن کر  
میری عزت بچانے کے لئے آئے۔“  
شام جو بڑی خوبیت سے میرو کو تک رہا تھا ایک دم  
چونکا۔ ”جی میں پر دیسی ہوں ماتا پتا پر لوگ سدھار چکے  
ہے، میں کام کے سلسلے میں ادھر آ نکلا تھا کہ آپ کی چیخوں  
سے ادھر آیا۔“  
میرو بولی۔ ”آپ کا بہت بہت دھننے واہ، میں  
یہاں کے بڑے ناتری تری کال کی اکلوتی بیٹی میرو ہوں،  
میں یہاں لکڑیاں چنے آئی تھی کہ اس دشت نے مجھے اکیلا  
پاکر میری عزت لوٹی چاہی اگر تم نہ ہوتے تو آج یہ میری  
عزت لوٹ چکا ہوتا۔“

شام کا ذہن تو اس ایک بات میں اٹک گیا کہ یہ  
تری کال کی بیٹی ہے اس نے سوچا۔ ”اس لڑکی کو اپنے پریم  
جال میں پھنسا لو تو ناگ مٹی اسی کے ذریعے حاصل کر سکتا  
ہوں۔“ اس نے میرو سے کہا۔ ”آپ بہت سندھ ہیں، اس  
طرح اکیلی گھر سے نہ نکلا کریں، آپ ہیں ہی اتنی سندھ کہ  
جو دیکھے گھال ہو جائے۔“  
میرو اپنی اتنی تعریف سن کر شرمائی اور ویسے بھی  
میرو کو شام ایک ہی نظر میں اچھا لگنے لگا تھا۔  
”اجنبی میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں اپنے ہاپوسے  
ملائی ہوں، وہ تمہیں ضرور کوئی کام دے دیں گے۔“  
شام تو یہی چاہتا تھا فوراً میرو کے ساتھ چل پڑا۔  
”ہاپو“  
”ہاں بیٹی! مگر میرو یہ اجنبی کون ہے اور تم اسے  
کیوں یہاں لائی ہو؟“  
”ہاپو جب میں لکڑیاں چنے گئی تھی تو بھولو نے  
میری عزت لوٹی چاہی، یہ اجنبی کام کی تلاش میں ادھر آ رہا  
تھا کہ میری چیخیں سن کر میری مدد کی اور مجھے بھولو کے چنگل

بریں طرح بوکھلا گیا اور گھبرا گیا، شام نے اس پر خنجر اٹھالیا  
تو اس آدمی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سر پر پاؤں رکھ کر  
بھاگ گیا۔  
وہ لڑکی جو دراصل تری کال کی بیٹی میروتھی کپڑی  
جھاڑی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”اے اجنبی تم کون ہو؟ جو اس سے بھگوان بن کر  
میری عزت بچانے کے لئے آئے۔“  
شام جو بڑی خوبیت سے میرو کو تک رہا تھا ایک دم  
چونکا۔ ”جی میں پر دیسی ہوں ماتا پتا پر لوگ سدھار چکے  
ہے، میں کام کے سلسلے میں ادھر آ نکلا تھا کہ آپ کی چیخوں  
سے ادھر آیا۔“  
میرو بولی۔ ”آپ کا بہت بہت دھننے واہ، میں  
یہاں کے بڑے ناتری تری کال کی اکلوتی بیٹی میرو ہوں،  
میں یہاں لکڑیاں چنے آئی تھی کہ اس دشت نے مجھے اکیلا  
پاکر میری عزت لوٹی چاہی اگر تم نہ ہوتے تو آج یہ میری  
عزت لوٹ چکا ہوتا۔“



سے آزاد کیا۔“ اور میرا وسک پڑی۔

”بھولو کی یہ مجال کس اس نے تری کال کی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ جنگلی!“ تری کال نے جنگلی کو آواز دے کر بلایا۔ ”جنگلی بھولو کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمارے سامنے لے آؤ میں اسے ایسی سزا دوں گا کہ وہ جیون بھریاد رکھے گا۔“

”جی سرکار!“ بھولو نے کہا۔

”بیٹی تم اس ایچی کو پانی دانی پلاؤ میں اس سے بعد میں بات کروں گا۔“ تری کال نے کہا۔

باپ کی بات سن کر میرا وشام سے بولی۔ ”اجنبی میرے ساتھ چلو۔“ اور شام کو لے کر میرا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں پہنچ کر میرا بولی۔ ”اجنبی تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا نام شام ہے۔“ شام بولا۔

”بیٹی تم جاؤ۔“ تری کال نے شام کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

”اجنبی، تم نے ہم پر جو احسان کیا ہے ہم سو بار بھی جنم لیں تو تمہارا یہ احسان نہیں ادا کر سکتے آج سے تم ہماری بستی میں رہو گے اور میں کھنڈرات سے جنگلی کو ہٹا کر نہیں وہاں کا پہرہ دار بنانا ہوں۔“

”ویسے تمہارا نام کیا ہے؟“

”جی میرا نام شام ہے۔“ شام نے کہا۔

شام کی تو جیسے منی کی اگیا پوری ہوئی یہ وہی کھنڈرات تھے جن میں تری کال نے ناگ منی کو چھپا کر ایک خفیہ جگہ رکھا ہوا تھا۔

جنگلی بھی میرا دوسرا ہی دل میں پسند کرتا تھا۔ جنگلی کبھی چکا تھا کہ شام سے میرا پریم کرنے لگی ہے اور دوسری طرف تری کال نے کھنڈرات کی پہرہ داری بھی شام کے سپرد کر دی۔ جنگلی کے دل میں شام کے لئے نفرت پیدا ہوئی اور وہ اسکی ہتھیار کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔

ایک دن شام ایک درخت کے نیچے بیٹھا ناگ منی کو حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کر رہا تھا کہ جنگلی نے اپنے ایک خاص ناگ۔ پنی ناگ کو شام کو ڈنسنے کے لئے

بھیجا، پنی ناگ تیزی سے رینگتا ہوا شام کو ڈنسنے جا رہا تھا، ناگ جیسے ہی شام کے پاس پہنچا اور اسے ڈسنے کے لئے جیسے ہی اپنا چھن اٹھایا اچانک ایک سنہرے رنگ کے خوبصورت سانپ نے اس پر حملہ کر دیا دونوں سانپ زبردست چھنکاریں مارتے ہوئے ایک دوسرے پر پل پڑے، ان کی خوفناک چھنکاریں سن کر شام ایک دم اپنے خیالوں کی دنیا سے لوٹ آیا اس کے نظر جیسے ہی اپنے سامنے موجود لڑتے ہوئے دو سانپوں پر پڑی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ایک کالا خوفناک سانپ شام کی طرف بڑھتا اور جیسے اسے ڈسنا چاہتا ہو، دوسرا سنہرا خوبصورت سانپ اس کا راستہ روک لیتا جیسے وہ شام کی حفاظت کر رہا ہو، آخر کار سنہرا سانپ، کالے سانپ پر غالب آ گیا اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ سانپ کو مارنے کے بعد سنہرا سانپ تیزی سے شام کی طرف بڑھا تو شام ڈر کے مارے بھاگنے اور چپخنے لگا۔

”اجنبی ڈرو نہیں، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔“ اپنے چھپچھپانے والی آواز سن کر شام نے جیسے ہی پلٹ کر دیکھا اس کی آنکھیں جیسے پھٹ پڑی کیونکہ اب وہاں پر سنہری سانپ کے بجائے ایک بہت خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ وہ بولی ”اجنبی مجھ سے مت ڈرو، میں ایک اچھا داری ناگن ہوں، میں اکثر یہاں آتی ہوں تری کال کو ڈنسنے کے لئے۔“

”لیکن تم کیوں تری کال کو ڈنسا چاہتی ہونا گن بہن۔“ شام نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

”جب تم نے مجھے بہن کہہ دیا تو آج سے تم میرے بھائی ہو، میں تیری کال کو اس لئے ڈنسا چاہتی ہوں کہ اس نے میرے پتی ناگیشور سے ناگ منی چھین لی ہے، اور میرے پتی کے پاس اس وقت اتنی شکتی نہیں تھی کہ وہ تری کال سے مقابلہ کر کے اپنی منی حاصل کر سکے اس لئے وہ دھرتی کے اندر خود کو چھپا لیا ہے۔ جیسے ہی وہ باہر آئیں گے، تری کال کو ختم کر کے منی حاصل کر لیں گے میں نے وہ منی حاصل کرنے کے لئے بہت کوشش کی لیکن

یہاں وہ منی موجود ہے اس کے آس پاس کی زمین کو تری کال نے اپنے منتروں سے کنڈل قائم کر دیا ہے، جو بھی اس کنڈل کے قریب جاتا ہے جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔“ ناگن نے پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ یہ سب سن کر شام کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے، اس نے کہا۔ ”مجھے ابھی پتہ چلا ہے کہ ناگیشور تمہارا پتی تھا۔“

”بھیا تم ناگیشور کو کیسے جانتے ہو کیا وہ دھرتی سے باہر آ گئے ہے، بتاؤ بھیا وہ کہاں ہیں؟“ ناگن جس کا نام موٹی تھا نے خوشی سے منگور لہجے میں کہا۔

”موٹی بہن مجھے بہت افسوس ہے کہ میرے دھرم ہاتے انجانے میں ناگیشور کی ہتھیار ہو گئی ہے۔“

”کیا؟“ موٹی ایک دم سے زمین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں موٹی، بہن! میں اس لئے یہاں تری کال کی اس بستی میں آیا تھا تا کہ وہ ناگن منی لے کر ناگیشور کو جیون دان دے سکے۔ تب ہی میرے دھرم ہاتے کی انجانے میں ہوئے باپ سے چھکارا مل سکتا ہے۔“

موٹی ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”اگر میرے ناگیشور کو ناگ منی سے جیون دان مل سکتا ہے تو وہ ناگ منی اب ہی تمہیں ملے گی۔“

”لیکن وہاں تو تری کال نے ایشام نے کچھ کہنا چاہا لیکن موٹی ایک دم سے اپنی جگہ سے غائب ہو گئی۔ شام تیزی سے کھنڈرات کی طرف بھاگا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ موٹی منی حاصل کرنے کے لئے کھنڈرات کی طرف گئی ہوگی جب شام وہاں پہنچا تو ارد گرد آگ لگی ہوئی شام سمجھ چکا تھا کہ موٹی اس آگ کو بھلا لگ کر منی لینے گئی ہے۔

جیسے ہی شام کی نظر اوپر اٹھتی ہوئی آگ کے شعلوں میں گھری ہوئی موٹی پر پڑی، اس نے جلدی سے بھاگ کر اس کو ایک بھنگی بوری کے کٹڑے میں لپیٹ لیا، آگ کے شعلے بجھ گئے تو موٹی نے آگزی ہوئی سانپوں کے درمیان شام کو منی دے دی۔ ”موٹی بہن یہ تم نے کیا کیا؟“

”بھیا اگر ایک منٹ ناری اپنے پتی کے لئے ستی ہو سکتی ہے تو ایک ناگن کیوں نہیں۔ اپنے پتی کے جیون کے لئے اپنا جیون تیاگ سکتی ہے۔ جا کر یہ منی میرے ناگیشور کے پاس لے جا کر اسے جیون دان دے دو۔“ یہ کہتے ہوئے موٹی کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

یہ سب باتیں کھنڈرات کی کال کٹھری میں بند پر تاب تھا کر اور ان کی پتی نے بھی سنی۔ شام جیسے ہی اس کال کٹھری کے پاس سے گزرا تو انہوں نے کٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شام نے ادھر ادھر دیکھا تو اس کو کچھ آوازیں سنائی دی۔ اس نے غور کیا تو آوازیں کال کٹھری سے آ رہی تھیں۔ اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور کٹھری کے دروازے کا تالہ توڑ دیا جیسے ہی تالہ توڑ کر شام اندر داخل ہوا تو کھار پر تاب اور ملہ دیوی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ دونوں کے بال جھاڑ جھاڑ میں تبدیل ہو گئے تھے اور مسلسل تری کال کی اذیتوں نے ان کے حلیے بگاڑ دیے تھے۔

لیکن شام نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا کہ یہی میرے ماما پتا ہیں۔ اس کے ذہن میں وہ سب کچھ تازہ ہو گیا جب مندر میں ناگیشور سے ملاقات ہوئی تھی اور تری کال اس کے ماما پتا کو لے گیا تھا ان دونوں کو اس حال میں دیکھ کر شام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ ٹھاکر پر تاب نے جو اس کی یہ حالت دیکھی تو اس کو ٹھاکر پوچھا۔ ”نو جوان تم کون ہو اور تمہیں کیا ہوا؟“

”کتنا خوش نصیب ہوں میں کہ آپ لوگوں کے درشن ہوئے۔“

”میں ہی آپ کا چندہ سال سے بچھڑا ہوا بیٹا شام ہوں۔“

”ماما پتا دونوں شام سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگے۔ شام بیٹے! میں نے تمہاری اور موٹی کی تمام باتیں سن لی ہیں اس سے پہلے کہ تری کال یہاں آ جائے ہم لوگوں کو یہ ناگ منی ناگیشور کے پاس لے کر جانا چاہئے۔“

”جیسے ہی وہ کال کٹھری سے باہر نکلے تو





## مہمان

غیرہ فاطمہ - کراچی

موسلا دھار بارش نے اس علاقے کے لوگوں کو ہلکان کر کے رکھ دیا تھا، دو ہفتے ہوئے مسافر ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بوڑھے نے دروازہ کھول دیا، وہ رات بھر اس گھر میں آرام کرتے رہے، مگر پھر صبح کا اجالا پھیلنے ہی وہ دھشت زدہ ہو گئے آخر کیوں؟

کیا برسوں پہلے مرے ہوئے لوگوں کی رو میں اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے سرگرم رہتی ہیں

**شدید طوفانی بارش تھی، اور آگے راستہ بالکل ناگزیر تھا۔**  
ڈاکٹر واصف نے سوالیہ نظروں سے اپنے اسٹنٹ کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ اب کیا کریں!.....  
بارش کا سامنا ہوگا..... ڈاکٹر واصف بڑبڑایا۔  
حامد خاموش بی رہا تھا، بہر حال ڈاکٹر واصف نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور کار کو گھما کر تھوڑا راستہ

”میں کسی حد تک اس جگہ سے واقف ہوں۔“  
اسٹنٹ حامد نے اس کی نظریں بھانپ لیں۔ ”آپ

میرو کو کھڑے ہوئے پایا۔“ میرو وہ ”شام نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔  
”نہیں شام! کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے سب کچھ دیکھ اور سن لیا ہے، مجھے دشواری نہیں ہو رہی کہ میرا اپنا پتا اتنا پکھنڈی ہے میں اپنے پتا سے نفرت کرنے لگی ہوں، میں تم سے پریم کرتی ہوں اگر تم مجھے سو بیگار کرتے ہو تو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“  
ہاں میرو! پہلے تو میں نے تم سے پریم کا ناک کیا لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میں بھی تم سے سچ سچ پریم کرنے لگا ہوں، آؤ ہمارے ساتھ۔“

وہ لوگ وہاں سے سیدھے کالی ماتا کے مندر گئے کیونکہ سادھو شری رام نے ناگیسور کا شری کالی ماتا کے مندر کے تہ خانے میں چھپا ہوا تھا شری رام نے جیسے ہی ناگ مٹی ناگیسور کے سینے پر رکھی تو اس سے تیز روشنی کی صورت میں شعاعیں خارج ہو کر ناگیسور کے جسم پر پڑیں تو ناگیسور سکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اس نے شام اور پریتاب ٹھا کر کا شکر یہ ادا کیا۔

ادھر تری کال جب اپنے مخصوص وقت پر کھنڈرات میں پہنچا تو نہ تو ناگ مٹی بھی اور نہ ہی پریتاب اور اس کی بچی یہ دیکھ کر تری کال غصے سے پاگل ہو گیا۔  
جس بات کا ذکر تھا وہی ہوا۔ پھر اس نے اپنے منستروں کے ذریعے سارے معاملات کا پتا کر لیا۔

اس نے اپنی بین ابھائی اور اس راستے پر چلا جو کالی ماتا کے مندر کی طرف جاتا تھا۔ وہ بین بجاتا ہوا جارہا تھا جب وہ مندر کے قریب پہنچا تو بین کی آواز سننے ہی ناگیسور کی حالت غیر ہونے لگی اور وہ زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ٹھا کر پریتاب نے کہا۔ ”شام بیٹے تم کسی طرح تری کال کے گلے میں موجود تعویذ اتار لو تو اس کی ساری شکلیاں ختم ہو جائیں گی اور پھر ناگیسور اس کو ڈس سکتا ہے نہیں تو یہ ناگیسور کو مار کر اس سے دوبارہ یہ مٹی حاصل کر لے گا اور اگر ایسا ہوا تو یہ انسان سے دشت بن جائے گا۔“

شام دوڑ کر مندر کے بیرونی دروازے کے پیچھے





ملے کرنے کے بعد سیدھے ہاتھ پر دکھائی دینے والی سڑک پر ڈال دیا۔

اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اتنی رات گئے ہونے والی موسلا دھار بارش نے تو راستے مسدود کر دیئے تھے۔

وہ دونوں ایک دور دراز قصبے سے لوٹے تھے۔ انہیں وہاں ایک مریض کو دیکھنا تھا۔

موسم تو شام سے ہی امیر آلود تھا، لیکن کسی قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ہلکی بوند باندی سے شروع ہونے والی بارش آہستہ آہستہ طوفانی شکل اختیار کر لے گی۔

ویسے تو اس کا اسسٹنٹ حامد اچھی طرح جانتا تھا کہ بہت مقبول قسم کی فیس ڈاکٹر واصف کو جہنم میں بھی جانے کے لئے تیار کر سکتی تھی۔

دونوں اطراف میں اونچے اور گھنے درختوں کی قطاریں تھیں، کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے کا منظر دیکھنا کافی دشوار گزار ثابت ہو رہا تھا۔

کار ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

”ایک منٹ.....!“ دفعتاً حامد تیز آواز میں بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب..... وہ دیکھیں..... وہ..... سامنے کوئی عمارت ہے شاید.....“

اس کی بات سن کر ڈاکٹر واصف نے بھی ذرا گردن آگے کر کے غور کیا۔

”ہاں بھئی..... کوئی عمارت ہی ہے۔ میرے خیال سے..... میں کار کو ادھر ہی لے چلتا ہوں۔ بڑی اچھی بات ہے، اگر کوئی وقتی پناہ گاہ مل جائے۔“

عمارت کی وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ کوئی ریست ہاؤس ہے۔

اور وہ ریست ہاؤس ان کیلئے اندھیرے میں روشنی کی کرن ثابت ہوا تھا۔

ویسے حامد کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اس وقت ڈاکٹر واصف کی کوئی نیکی کام آگئی تھی۔ وہ لالچی ضرور تھا، لیکن حامد جانتا تھا کہ کسی انسانی

جان کو خطرے سے نکالنے کے لئے ڈاکٹر واصف اپنا خون پسینہ کیا کر دیتا تھا۔

اپنی کار کو درختوں کی آڑ میں کھڑی کرنے کے بعد دونوں جلدی جلدی قدم بڑھا کر ریست ہاؤس کے دروازے پر پہنچے۔

اتنی سی دیر میں ہی دونوں کے کپڑے پانی سے شرابور ہو چکے تھے۔

حامد نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا، پہلی دستک تو خالی ہی گئی، دوسری بار بھی ندرار۔

”اندر کوئی موجود تو ہے۔“ ڈاکٹر واصف بر بڑایا۔ ”وہ دیکھو..... اندر روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ ذرا زور سے پیٹو دروازے کو.....“

اب کی بار کوشش بار آور ہوئی اور اندر سے کھڑکی کی آوازیں آئیں۔

جلد ہی ایک بوڑھی سی مردانہ آواز ان کے کانوں سے نکل آئی۔

”کون ہے.....؟“ ابھی دروازہ کھولا نہیں گیا تھا۔

”ہم مسافر ہیں.....“ ڈاکٹر واصف نے بلند آواز سے کہا۔ ”بارش بہت تیز ہے..... ہمیں بارش رکنے تک پناہ چاہئے.....“

”چور ڈاکو تو نہیں ہوتا.....؟“ سوال کیا گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی، پھر حامد بولا۔

”جی نہیں.....“

”ٹھیک ہے.....“ آواز آئی۔ اور پھر دروازہ آہستہ سے کھل چلا گیا۔

ان کے سامنے سفید لباس میں ایک دبلا پتلا سا بوڑھا آدمی کھڑا تھا۔ وہ فوراً ہی بولا۔

”آؤ..... آؤ..... آؤ..... آؤ..... اندر آ جاؤ۔“

غضب کی بارش ہے۔ وہ دونوں اندر آ گئے۔ ”دروازہ بند کر دینا..... اور یہاں سے آگے

آ کر بائیں جانب والے کمرے میں چلے جانا..... تمہارے کپڑے گیلے ہیں۔ کمرے تو نہیں مل سکیں گے..... البتہ وہاں آتشزدہ موجود ہے۔ تمہارے گیلے کپڑے کھانے میں وہ تمہاری مدد کرے گا..... تم لوگ وہاں جاؤ..... میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

یہ ہدایات دے کر بوڑھا آگے بڑھ گیا، ڈاکٹر اور اس کے اسسٹنٹ نے دیکھا کہ یہاں کئی کیرسین لیپ لگے ہوئے تھے جن کی روشنی اندرونی ہے کو جگمگا رہی تھی۔

فی الحال تو اندھے کو دو آنکھیں دستیاب ہو چکی تھیں۔ ان دونوں نے اسی کمرے کا رخ کیا، جس کے بارے میں بوڑھے نے بتایا تھا۔

یہاں بھی کیرسین لیپ روشن تھا اور ایک کونے میں آتشزدہ میں آگ جل رہی تھی۔

”واہ..... حرا آ گیا.....“ ڈاکٹر واصف کے منہ سے نکلا۔ ”سردی بھی محسوس ہو رہی تھی.....“

”آؤ..... ادھر ہی بیٹھے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب.....“ حامد نے سر ہلایا۔

یہاں ایک بڑا سا پلنگ موجود تھا، قریب میں ایک میز بھی رکھی تھی۔

”یہ بڑے میاں کہاں غائب ہو گئے.....؟“ آگ کے قریب بیٹھنے کے بعد ڈاکٹر واصف بڑبڑایا۔

”کہہ تو گئے ہیں کہ تم لوگ بیٹھو..... میں آتا ہوں۔“ حامد نے یاد دلایا۔

ڈاکٹر واصف نے سر ہلادیا بارش اب بھی زور و شور سے جاری تھی۔

پھر کافی دیر بعد دروازے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

بوڑھا کمرے میں داخل ہوا، لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔

سفید ہی رنگ کے لباس میں ملبوس اس کی ہم عمر

ایک بوڑھی عورت بھی اس کے ساتھ تھی۔

دونوں کے ہاتھوں میں کھانے کے برتن تھے۔ ”چلو بھئی..... تم لوگ بھوکے ہو گے..... کھانا بھی کھا لو.....“ بوڑھے نے کہا۔

واصف اور حامد بے ساختہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”ارے..... آپ نے یہ تکلیف کیوں کی.....!“ ڈاکٹر واصف نے کہا۔

”تکلیف کیا بھئی.....؟“ بوڑھا مسکرایا۔ ”تم لوگ تو آج ہمارے مہمان ہو.....“

پھر ان دونوں نے برتن میز پر رکھ دیئے۔ بوڑھی عورت کھانا لگا کر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

”چلو بھئی شروع ہو جاؤ.....“ بوڑھے نے انہیں مخاطب کیا۔

کھانے کی بڑی اشتہا انگیز خوشبوئیں کمرے میں پھیل رہی تھیں۔

”آپ بھی آئیں ناں.....؟“ ڈاکٹر واصف نے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں.....“ بوڑھے نے طویل سانس لی۔ ”میرے نصیب میں جو کچھ تھا..... میں کھا چکا۔“

”کیا مطلب.....؟“ حامد چونکا۔

بوڑھے نے بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ پھر یکدم ہی مسکرا کر بولا۔

”میں پہلے کھا چکا ہوں۔ اور یہ کھانا تم لوگوں کے لئے ابھی تیار کیا گیا ہے۔“

”اوہ..... اچھا.....“ حامد نے سر ہلایا۔

”پھر بھی..... آپ تھوڑا بہت تو ہمارا ساتھ دیتے.....“ ڈاکٹر واصف نے کہا۔

”اجازت نہیں ملے گی.....“ بوڑھے نے مایوسی کے عالم میں سر ہلایا۔

”اجازت.....! کس سے نہیں ملے گی.....؟“

”پیٹ سے.....“ بوڑھا مسکرایا۔

”یہ سن کر وہ دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے



## مشہور و معروف راسٹر اسلم راہی کی مفید کتابیں

40/-	ایراہیم لودھی
40/-	بہلول لودھی
40/-	ظہیر الدین بابر
40/-	ہمایوں
40/-	شیر شاہ سوری
40/-	جلال الدین اکبر
40/-	چاند بی بی
40/-	نور الدین جہانگیر
40/-	نور جہاں
40/-	شاہ جہاں
40/-	اورنگ زیب عالمگیر
40/-	بہادر شاہ ظفر
40/-	سلطان حیدر علی
40/-	ٹپو سلطان
40/-	احمد شاہ ابدالی
40/-	حمورابی
40/-	سائرس اعظم
40/-	سکندر اعظم
40/-	بینی بال
40/-	قلو پطرحہ
40/-	چنگیز خان
40/-	ہلاکو خان
40/-	ہیلن آف ٹرائے
40/-	نپولین بوناپاٹ
40/-	ہٹلر اعظم

شیعہ بک اینجنسی اردو بازار کراچی

فون: 32773302

کچھ بے معنی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور ان کا تعلق لاشعور سے ہوتا ہے۔ جب اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں تو 24 گھنٹے جاگنے والا ذہن کمزور پڑ جاتا ہے۔ میں بھی ان کی باتیں سن رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ بے معنی سی بات ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے انہیں کمرہ انہیں درندہ کی قسم کی داستان لے کر بیٹھ جاتے۔

ہمیں یہاں صرف یہ رات گزارنی ہے۔ اور بس۔ اس لئے کوئی کھڑاک پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ شاید اس ماحول کا تم پر اثر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم خوف محسوس کر رہے ہو۔ ہر قسم کے حالات کو ذہن سے نکل کر دو۔ لیٹ جاؤ۔ اور سونے کی کوشش کرو۔ اوکے۔“

حامد نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا اور پلنگ پر دراز ہو گیا بارش۔ اب بھی جاری تھی۔ دونوں بے خبر ہو کر سوئے تھے۔ صبح سب سے پہلے حامد کی آنکھ کھلی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے 9 بج رہے تھے، ذہن صبح طرح بیدار ہوا تو اسے بیتی ہوئی رات کے مناظر یاد آئے۔ ساتھ ہی اس نے چاروں طرف دیکھا، اور پھر پوچھا کہ ڈاکٹر واصف کی طرف چھینا۔

وہ ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔  
”ڈاکٹر صاحب۔۔۔ ڈاکٹر صاحب۔۔۔!“  
”آں۔۔۔ آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

”ہم کہاں سوئے تھے“  
ڈاکٹر صاحب۔۔۔“ حامد نے فوراً ہی اس سے پوچھا۔  
ڈاکٹر واصف نے چندھیا کی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا، پھر سر ہلا کر بولا۔

”ہم۔۔۔ یہیں تو سوئے تھے۔۔۔!“  
”جی ہاں۔۔۔“ حامد نے سر ہلایا۔ ”لیکن وہ پلنگ کہاں ہے؟ ہم تو فرش پر پڑے ہیں۔۔۔!“

مری گیا ہے، تو اس کا علاج کیسے ہو سکتا ہے۔ موت کا تو کوئی علاج ہی نہیں ہے۔ کیونکہ موت کوئی مرض نہیں ہے بلکہ قدرت کا عمل ہے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔ حامد خاموشی سے دونوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

”اوہ۔۔۔“ بوڑھے کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ ”پھر تو تم سے بات کرنا بیکار ہے۔ میں جارہا ہوں۔۔۔ اب تم دونوں بھی سو جاؤ۔ ظاہر ہے کہ اب اتنی رات گئے تو تم لوگ جاؤ گے نہیں۔۔۔ اسی پلنگ پر لیٹ رہو۔۔۔ اب صبح ہی واپس جانا۔ ٹھیک ہے ناں۔۔۔؟“

”جی بالکل۔۔۔!“ ڈاکٹر واصف نے جلدی سے سر ہلایا۔ ”یہ بھی آپ کی مہربانی ہے۔“  
”مہربانی کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔ اچھا اب میں جارہا ہوں تم لوگ آرام کرو۔۔۔“

یہ کہہ کر بوڑھا کھانے کے خالی برتن اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

”ڈاکٹر صاحب۔۔۔!“ اس کے جاتے ہی حامد نے سر گھٹی کی۔ ”مجھے۔۔۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔!“  
اسی وقت ایک زوردار دھماکہ کی آواز سنائی دی بہت غضب کی بجلی چمکی تھی۔ یہ دھماکہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ کا تھا۔

ڈاکٹر واصف نے چونک کر حامد کی شکل دیکھی وہ واقعی خوف زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

”کیوں۔۔۔ ڈر کیوں لگ رہا ہے تمہیں۔۔۔؟“ اس نے پوچھا۔

”آپ نے بوڑھے کی باتوں پر غور کیا۔۔۔؟ اور پھر۔۔۔ کچھ عجیب سا ہی احساس ہو رہا ہے مجھے۔ میں اس احساس کو کوئی نام دینے سے قاصر ہوں۔“ حامد کے لہجے میں الجھن تھی۔

”اوہ۔۔۔“ ڈاکٹر واصف بے ساختہ ہنسا۔ ”تو تم اس لئے ڈر رہے ہو۔ دیکھو۔ اس عمر میں اکثر لوگ

انہیں خاموشی سے کھانا ہوا دیکھ رہا تھا۔  
”کھانا تو بہت زبردست تھا۔۔۔“ حامد نے تعریف کی۔

ڈاکٹر واصف نے بھی اس کا ساتھ دیا۔  
”واقعی۔۔۔ آئی کا ہاتھ بہت باکمال ہے۔“  
”ہاں۔۔۔ یہ بات تو میں بھی مانتا تھا۔“  
”بوڑھے نے جواب دیا۔

”مانتے تھے۔۔۔ کیا مطلب ہے؟“ ڈاکٹر واصف نے پوچھا۔

”بھی گھر کی مرثی وال برابر ہوتی ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ ”شادی سے پہلے جب میں اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے کھاتا تھا تو خوب تعریفیں کرتا تھا۔ شادی کے بعد پھر کبھی تعریف نہیں کی۔“  
دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

”یہ بتاؤ۔۔۔ تم دونوں کیا کرتے ہو۔۔۔؟“  
جواباً ڈاکٹر واصف نے اپنا اور حامد کا تعارف کر دیا۔ بوڑھے کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہو گئے۔

”واہ۔۔۔ بھئی واہ۔۔۔“ بوڑھے نے برسرِ تلخے میں کہا۔ ”ہمیں کسی ماہر ڈاکٹر کی ہی تلاش تھی۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ حکم کریں۔ ہم حاضر ہیں۔“ ڈاکٹر واصف نے خندہ پیشانی سے کہا۔

”اچھا۔۔۔ یہ بتاؤ۔۔۔ اگر کوئی کبی حادثے میں مر جائے۔ تو تم اس کا علاج کر سکتے ہو۔۔۔؟ اسے دوبارہ زندگی دلوا سکتے ہو۔۔۔؟“ بوڑھے نے عجیب سا سوال کیا۔

”جی۔۔۔!“ ڈاکٹر واصف نے حیرت سے کہا۔ ”میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔۔۔“

”لیکن میں نے تو بہت آسان اردو بولی ہے۔“ بوڑھے کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی حادثے میں



”ارے..... واقعی.....“ ڈاکٹر واصف چونک اٹھا۔

وہ دونوں ہی ننگے فرش پر پڑے ہوئے تھے دونوں نے جلدی سے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ نہ پلنگ تھا، نہ وہ کھانے کی ٹیبل اور..... آتشدان بھی اس طرح اجاڑ پڑا تھا جیسے اس میں برسوں سے آگ نہ جلی ہو۔

”کیا ہے.....؟“ ڈاکٹر واصف کے منہ سے نکلا۔  
”حامد کے چہرے پر تو ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔“  
”ہم نے رات کو خواب دیکھا تھا.....“ اس نے کہا۔  
”دو انسان ایک ساتھ ایک ہی خواب کیسے دیکھ سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر واصف نے اس کا خیال رو کر دیا۔ ”آؤ..... بڑے میاں اور ان کی بیگم کو دیکھتے ہیں۔“  
دونوں کمرے سے نکل آئے اور آواز دینے لگے۔  
”بڑے صاحب.....! بڑے صاحب.....!“

بڑے میاں.....  
لیکن سنتا کون.....؟ وہاں کون تھا.....؟ وہ عمارت تو اس طرح خالی پڑی تھی جیسے ان دونوں کے علاوہ کسی ذی روح نے برسوں سے یہاں قدم نہ رکھا ہو۔

رات کو جو کیروسین لیمپ جل رہے تھے، وہ تک غائب تھے۔ دونوں سر پھروں کی طرح عمارت میں چکر اکر رہ گئے۔  
آخر کار ان کے پاس ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے علاوہ کچھ نہ بچا تھا۔ بارش رات میں نہ جانے کس وقت ختم ہو چکی تھی۔

”وہ دونوں آخر کہاں گئے.....؟ اور سارا سامان.....؟“ ڈاکٹر واصف بڑبڑایا۔

”جو احساس مجھے رات میں ہو رہا تھا۔ وہی اس وقت بھی مجھ پر حاوی ہو رہا ہے۔“ حامد نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ ”یہاں سے نکلیں ڈاکٹر صاحب.....!“

ڈاکٹر واصف کچھ نہ بولا۔ اس کے ماتھے پر سوچ کی ٹکٹیں پڑ گئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔  
”یار..... کھانے کے برتن تک غائب ہیں.....“  
”تھیں یہاں سے.....“ حامد زور دے کر بولا۔ ”اب یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔“  
”ہاں..... چلو.....“ ڈاکٹر واصف نے اثبات میں سر ہلایا۔

انہوں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئے۔ ان کی کار اسی حالت میں کھڑی تھی، جیسے رات انہوں نے اسے چھوڑا تھا۔  
بارش کا پانی ابھی بھی ارد گرد موجود تھا، لیکن اب مطلع صاف تھا اور دھوپ میں بھی تیزی تھی۔  
دونوں کار میں بیٹھ گئے، ڈاکٹر واصف نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔

ڈاکٹر واصف نے وہی راستہ منتخب کیا، چنانچہ کار اب آگے بڑھ رہی تھی۔

”رات میں تم کہہ رہے تھے کہ اس جگہ سے واقف ہو.....“ ڈاکٹر واصف نے اسے یاد دلایا۔  
”جی ہاں.....“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ عمارت میرے ذہن میں ہرگز نہیں تھی..... اور ویسے بھی یہاں اکثر اسی ٹائپ کے روڈ ہیں.....“

”تو پھر..... کیا گاڑی بیک کر لوں.....؟“  
”نہیں..... اسی روڈ پر آگے بڑھتے رہیں.....“

ڈاکٹر واصف نے سر ہلادیا۔ انہوں نے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ روڈ کے کنارے 2 مزدور ٹائپ کے بندے سامنے سے آتے دکھائی دئے۔  
کچھ سوچ کر ڈاکٹر واصف نے کاری رفتار کم کر دی، اور پھر ان کے قریب جا کر کریک لگا دیئے۔  
دونوں چونک سے گئے۔

”کیا حال ہے آپ لوگوں کا.....؟ خیرت ہے.....؟“ ڈاکٹر واصف نے ہانک لگائی۔  
”جی..... بالکل..... شکر ہے مالک کا.....“

”انہوں نے جواب دیا۔“  
”آپ لوگ یہیں رہتے ہیں.....؟“  
”جی نیچے کے علاقے میں بستی ہے ہماری.....!“

”اوہ..... پھر تو آپ لوگوں کو معلوم ہوگا.....“  
”ڈاکٹر واصف کار سے باہر نکل آیا۔ حامد بھی دروازہ کھول چکا تھا۔  
”جی..... پوچھیں.....!“ ایک مزدور نے پوچھا۔  
”یہاں سے تھوڑی دور ایک عمارت ہے.....“ ڈاکٹر واصف نے بات شروع کی۔ ”وہاں ہمیں ایک بوڑھا آدمی اور ایک بوڑھی عورت.....“  
”اب وہ آپ کو کہاں ملیں گے جناب.....؟“ دوسرے مزدور نے اس کی بات ہی کاٹ دی۔ ”ان کا تو پانچ سال ہوئے..... انتقال ہو گیا..... وہ بے چارے اس دنیا میں کہاں رہے۔“

”بہت نیک میاں بیوی تھے صاحب.....“ پہلے مزدور نے بھی لقمہ دیا۔ ”خاندانی لوگ تھے..... بہت نیک سارا اور مہمان نواز تھے۔“  
”لیکن..... لیکن..... ہم تو.....!“ حامد بولتے بولتے رک گیا۔  
اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے۔

خود ڈاکٹر واصف کو بھی گویا چپ سی لگ گئی تھی۔  
رات کا منظر ان دونوں کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

اگر یہ سچ تھا..... تو پھر رات والا واقعہ کیا تھا.....؟  
اگر وہ خواب تھا تو وہ ہوش مند انسان ایک جیسا خواب تو دیکھ نہیں سکتے۔

”یوں صاحب..... کیا ہوا.....؟“ پہلے مزدور نے کنویشن سے پوچھا۔ ”آپ دونوں کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں.....؟ ان سے ملنے آئے تھے آپ لوگ.....؟“

”یہ بتاؤ کہ ان کا انتقال کیسے ہوا.....؟“ ڈاکٹر واصف نے کچھ سوچ کر اپنی زبان

کھولی۔ مزدور کا سوال اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔  
”ایک خوفناک ٹریفک حادثے میں دونوں ہی دم توڑ گئے تھے۔“ اس نے بتایا۔  
”اوہ..... ان دونوں کے منہ سے نکلا۔“

بڑے میاں نے رات ان سے جو کچھ کہا تھا۔ اس کا مطلب اب سمجھ میں آ رہا تھا۔  
ان دونوں کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور ماتھے سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔

”اور صاحب..... ہمارا پورا علاقہ ان کی عزت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر پر کسی نے قبضہ نہیں کیا۔ وہ گھر ان سے ہی آباد تھا، اور اب..... وہ نہیں رہے۔ تو ہم لوگ دیواروں کا کیا کریں گے۔“  
”کیوں..... صاحب.....؟“

”ہاں..... ہاں.....“ ڈاکٹر واصف نے چونک کر کہا۔ ”ان کی زندگی میں ہم ان سے نہیں مل سکے، لیکن ہم یہ بات قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ لوگ واقعی بہت نیک اور مہمان نواز تھے۔ کیوں حامد..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں.....؟“

”جی..... جی.....“  
”ہاں..... بالکل..... بالکل.....“ حامد بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

مزدوروں نے بڑی عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھا، جیسے انہیں ٹٹول کر اندازہ کر رہے ہوں کہ وہ پاگل تو نہیں ہیں۔

پھر ڈاکٹر واصف اور حامد نے جلدی سے مزدوروں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور گاڑی میں آ گئے۔  
چند کینڈے میں ہی کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔  
ڈاکٹر واصف نے شاید کبھی زندگی میں اتنی رفتار سے اپنی کار نہیں چلائی ہوگی۔

مزدور اب بھی وہیں کھڑے ہو کر بڑی حیرت سے دور ہوتی ہوئی کار کو دیکھ رہے تھے۔





دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لباب میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بھاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

تجسس اور سپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو درطنہ حیرت میں ڈال دیں گے

**دوسرے** صاحب نے ہمدردانہ لہجے میں اپنائیت کے انداز میں پوچھا۔

”تم دونوں نے کچھ کھایا یا بھی؟“ کہیں بھوکے تو نہیں؟“

”میں نے صرف چائے پی ہے۔ میرے شوہر نے چائے دو گھونٹ لے کر چھوڑ دی تھی۔“ عطیہ نے جواب دیا۔

ان صاحب نے اپنی بہو سے کہا جو ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ ”گتھ ان کے کھانے کے لئے کچھ لے آؤ۔ ان پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ دیکھو۔۔۔ ان کی کیا حالت ہو رہی ہے؟“

تھوڑی دیر میں ان کی بہو ڈیل روٹی کے سلاکس پر جام جیلی اور مکھن لگا کر۔۔۔ لے آئی اور تھرماں بھی جس میں چائے تھی۔۔۔ یوں تو رات کا کھانا بھی کچھ بچا ہوا تھا۔ چوں کہ موسم خوش گوار تھا اس لئے خراب نہیں ہوا تھا۔ جب ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو مسافروں نے نہ صرف ناشتا کرایا۔ چائے پلائی، دل جوئی کی۔۔۔ پھر اسے سمجھایا اور اس کا دکھ اس طرح بانٹتے رہے جیسے ان سے ان خونی رشتہ ہو۔۔۔ انہیں عطیہ پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کس قدر حوصلہ مند اور صابر و شاکر عورت ہے۔

جسے زبورات چلے جانے سے زیادہ اپنے شوہر کی دل جوئی کی فکر ہے۔

یہ تو ٹائیگر جانتا تھا کہ یہ پراسرار لڑکی کیا چیز ہے۔۔۔ وال میں کتنا کالا ہے۔

☆.....☆.....☆

بنگلور شہر سے دو تین گھنٹوں کی مسافت پر دیور شہر کے ریلوے اسٹیشن پر ان کے ہمدرد ساتھی اتر گئے۔ ان برتھوں پر صرف وہ رہ گئے تھے۔ کچھ دیر تک ان کے درمیان گہرا سکوت طاری رہا۔ جب گاڑی چل پڑی تو عطیہ نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”انکل۔۔۔ کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں؟“ ٹائیگر تذبذب میں پڑ گیا۔ اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کس قسم کی مدد دیتا ہے۔ وہ ان دونوں کی مالی مدد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حالاں کہ ان کی مالی مدد کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس لئے کہ عطیہ اسے نہ صرف پراسرار خطرناک اور فراڈ لگ رہی تھی بلکہ ایک زہریلی ناگن کی طرح ڈس نہ لے۔ ایک طرح سے اس نے سرفراز کو ڈس ہی تو لیا تھا۔ وہ عیار لڑکی جو کسی لومڑی سے کم نہ تھی۔ ٹائیگر جواب دینے میں پس و پیش کرنے لگا۔ کیوں کہ سفر کے دوران اس لڑکی نے اس کا بڑا خیال





کیا تھا۔

وہ ٹانگیر کو تذبذب میں دیکھ کر تہہ میں پہنچ گئی۔ اس نے ٹانگیر کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔ ”انکل..... ہمیں آپ کی مالی مدد کی ضرورت ہے۔“

پھر ٹانگیر نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ”فرمائیے میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”ہمیں فقط آپ کا سہارا اور تعاون چاہئے۔“

”کیسا سہارا.....“ ٹانگیر پھر بھی اس کی تہہ میں پہنچ نہیں سکا۔

”ہم بنگلور پہلی بار جا رہے ہیں..... بنگلور ہم دونوں کے لئے اجنبی شہر ہے۔“ عطیہ نے جواب دیا۔

”کھل کر کہو کہ تم دونوں مجھ سے کیا چاہتے ہو.....؟“

میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اتنے بڑے شہر میں ہمارا کوئی بھی واقف کار نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کچھ دنوں کے لئے آپ کے ساتھ رہیں۔ ہم جلد ہی کوئی کرائے کے مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کون سا محلہ اچھا ہے..... آپ کی رہنمائی میں مکان تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس ایڈوانس دینے کے لئے رقم موجود ہے۔“

ٹانگیر نے مشکوک ہو کر اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے پوچھا۔

آخر تم دونوں نے اس نئے شہر میں رہنے کا فیصلہ کس لئے کیا ہے جب کہ یہاں تمہارا نہ تو کوئی رشتہ دار اور واقف کار بھی نہیں ہے..... کسی سے مشورہ تو کیا ہوتا.....؟ اس لئے کہ کسی اجنبی شہر میں جا کر رہنا مذاق تو نہیں ہے.....؟ پہلے سرفراز کو کچا پتہ تھا کہ وہ یہاں آکر مکان تلاش کرنا..... پھر تمہیں بلا لیتا۔“

عطیہ نے جواب دینے سے پہلے سرفراز کی طرف دیکھا۔ اس کی فضا یہی تھی کہ سرفراز ٹانگیر کے اس سوال کا جواب..... ٹانگیر نے جان لیا تھا کہ وہ سوال کا جواب کیا دیتا..... اس پر ایک گہری خاموشی طاری تھی۔

وہ اپنے غم اور سوچوں میں گم آنسو بہا رہا تھا۔

پھر عطیہ سرفراز کو چپ پا کر بولی۔ ”یہ فیصلہ سرفراز نے کیا..... میں نے نہیں کیا انکل.....! میں پھر کیا کوئی؟“

”یہ فیصلہ سرفراز نے کیوں اور کس لئے کیا.....؟“ ٹانگیر نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس لئے کہ اسے اپنے شہر کے علاوہ میرے ماں باپ سے بھی سخت نفرت ہے۔“ عطیہ بولی۔

”کیا بڑے بوڑھوں سے بھی نفرت کی جاتی ہے.....؟ جب کہ وہ بزرگ کی حیثیت اور مقام رکھتے ہیں۔“ ٹانگیر نے کہا۔

”جو بڑوں کی عزت اور ان کا احترام کرتا ہے۔ دنیا میں بھی وہ عزت اور احترام پاتا ہے۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ عطیہ کہنے لگی۔ ”کوئی کسی سے نفرت کرتا ہے تو اسے سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں سرفراز سے کہتی رہتی تھی کہ دیکھو محبت بھی ایک جادو ہے۔ اس کے سامنے دنیا کا بڑے سے بڑا جادو بھی بچ ہے..... لیکن میری بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔“

”کیا عطیہ تمہارے بارے میں سچ کہہ رہی ہے.....؟“ ٹانگیر نے غم زدہ سرفراز سے پوچھا۔

”جی..... جی ہاں.....“ سرفراز نے ایک سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ”وہ سچ بول رہی ہے۔ اس نفرت کے سبب میں نے بنگلور منتقل ہونے کا فیصلہ کیا..... ورنہ میں ہرگز اپنا شہر نہیں چھوڑتا.....“

”یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔“ وہ بولا۔ ”کیا بنگلور شہر میں واقعی تمہارا کوئی واقف کار یا دوست نہیں ہے؟“

”دو ایک دوست اور کچھ دور کے رشتہ دار بھی موجود ہیں۔ لیکن وہ کیا کرتے ہیں کہاں رہتے ہیں۔ مجھے کچھ علم نہیں۔ وہاں سے چلتے وقت مجھے ان کے گھر والوں سے پتہ لیتا یا دیکھیں رہا۔ اتنے بڑے شہر میں انہیں کہاں ڈھونڈوں.....؟ کیسے تلاش کروں۔“ اس نے

جواب دیا۔ ”میں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔“

”تم نے بڑی غلطی کی جو چلتے وقت ان کا پتا نہ لیا۔“ ٹانگیر نے کہا۔ ”جب بھی کسی نئے شہر میں جان بڑی کے ساتھ جاؤ تو واقف کار کا پتا ہونا چاہئے۔“

”اے جاؤ تو فکر کی بات نہیں ہوتی ہے..... میاں بڑی کا کسی ہوٹل میں ٹھہرنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ لوگ مشکوک ہو جاتے ہیں۔ خیراب جو ہو سوا ہوا..... آئندہ ایسی غلطی نہیں دہرانا..... ورنہ بہت پریشانی اٹھاؤ گے۔“

ٹانگیر کو اس جوڑے کو اپنے ہمراہ لے جا کر کچھ دنوں تک ساتھ رکھنے میں کوئی قحاحیت اور خوف نہیں تھا۔ وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے..... البتہ وہ ان دونوں کے لئے کسی بھی خطرے کے باعث بن سکتا تھا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ان دونوں سے کسی بھی صورت سے رابطہ رکھے تاکہ قانونی حوالے پورے کرنے میں آسانی ہو..... وہ انہیں بغیر کسی ثبوت کے قتل نہیں کر سکتا تھا۔

آج کے کسی بھی اخبار میں ممبئی شہر میں ہونے والی ڈکیتی کی کوئی خبر نہیں چھپی تھی۔ جب کہ اس شہر میں روزی ڈکیتی کی وارداتیں ہوتی تھیں..... اور پھر سرفراز نے بڑی ڈکیتی کی واردات کی تھی وہ لاکھوں کی تھی۔ اس نے آج کا اخبار دیلور اسٹیشن پر خرید کر اس کا ایک ایک کونا دیکھا تھا۔ آئے دن جو چھوٹی بڑی وارداتیں ہو رہی تھیں اور اس قدر عام ہو گئی تھیں کہ اب اخبارات انہیں زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے..... جرائم اور سیاسی خبریں چھاپتے تھے۔ لیکن یہ واردات سراسر لاکھ کی مالیت تھی جو معمولی جرائم کی جیسے اخبارات نظر انداز کر دین۔ اس ڈکیتی کی خبر اخبار میں کیوں شائع نہ ہوئی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی۔ کیوں کہ بعض اوقات کسی مصلحت کی بنا پر بھی لکھن جرموں کو دبایا جاتا تھا۔

ایک ہی بات اس کے ذہن میں بار بار آ رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ اگر واردات ممبئی کی نہیں ہے تو پھر اس کی نے اپنے گھر یا اس لڑکے کے ضرور صاف ہاتھ لاسے..... یہ بھی تو ممکن تھا کہ ضرور کسی گھسی یا بنگلے پر

ڈاکہ مارا ہو..... یا کسی فلمی اداکار یا اداکارہ..... کسی کروڑ پتی کے ہاں ملازمت کرتے ہوں..... لڑکا ڈرائیور اور لڑکی ملازمہ ہو..... لیکن ایسا نہیں تھا۔ کیوں کہ دونوں مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور پھر کروڑ پتی لوگ اس قدر زور نہیں رکھتے..... اور پھر کسی فلمی اداکارہ کو چھوٹ دی گئی تھی تو اس نے اس لئے پولیس سے رسائی حاصل نہیں کی کہ انکس والے رسید طلب کرتے اور رقم کے بارے میں معلوم کرتے..... اگر اخبار میں ڈکیتی کی خبر ہوتی تو وہ انہیں اسٹیشن پر ہی قانون کے حوالے کر دیتا۔

”انکل.....! آپ کیا سوچنے لگے ہیں.....؟“ عطیہ نے کہا تو اس کے خیالات کا سلسلہ بکھر گیا۔

اس نے چونک کر جواب دیا۔ ”ممبئی میں میرے دوست کی ایک بیٹی ہے جو تمہاری ہم عمر ہوگی اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”آپ نے ہمارے بارے میں کیا سوچا اور فیصلہ کیا.....؟ آپ مجھے بھی اپنے دوست کی بیٹی کی طرح ہی سمجھتے۔“

”میں نے وہی سوچا ہے جو ایک دوست کی بیٹی کے بارے میں سوچتا ہے۔“ ٹانگیر نے کہا۔ ”بلکہ سوچنا بھی چاہئے۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ میں ایک با اصول شخص ہوں۔ ذہ بے وار شخص ہوں۔ کسی بھی ملک میں جاتا ہوں۔ وہاں کے قانون کا احترام کرتا ہوں..... قانون کی بالادستی پر نہ صرف یقین رکھتا ہوں بلکہ اس سختی سے عمل بھی کرتا ہوں..... تم دونوں جتنے دن جا ہو میرے ہاں رہ سکتے ہو۔ مجھے تم دونوں کی مہمان نوازی کر کے بہت خوشی ہوگی۔“

”انکل.....! آپ کس قدر سوچیت ہیں..... مجھے آپ سے اس خلوص اور محبت کی بالکل توقع نہیں تھی۔“ وہ فرط سرست سے بولی۔ ”میں آپ کا احسان ساری زندگی بھلا نہ سکوں گی..... ایسا لگتا ہے کہ آپ ہمارے خاندان کے فرد ہیں۔“

بنگلور میں ٹانگیر کا ایک چھوٹا سا اثاثہ تھا۔ اس نے ایک کمرے میں دکان نکال کر اسے کرائے پر اٹھا دیا



تھا۔ اس کے پاس اب کل تین کمرے تھے۔ ان تین کمروں کے ایک کمرے میں جب بھی اس کا بنگلور آتا ہوتا تھا۔ پڑوسی برکت اللہ بھائی اس کی صفائی کر دیتے تھے۔ وہ جب بھی آتا تھا۔ تن تہا ہی آرام سکون سے رہتا تھا۔ چند قدم پر بازار تھا جس میں ہندو اور مسلمانوں کے ہوٹل تھے جن میں اچھے کھانے ملتے تھے۔ یوں بھی بنگلور شہر کے ہوٹلوں کے کھانے پورے ہندوستان میں مشہور تھے۔ اس لئے وہ ان میں تینوں وقت کھا لیتا تھا۔ اس نے سوچا کہ ان دونوں کا اس کے ہاں کچھ دن تک ٹھہرنا اور انجام تک پہنچنا اس کے لئے تکلف دہ ثابت ہوگا۔ لیکن اس کے لئے سب سے بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا تھا ایک پراسٹیوٹ سراغ رساں کی حیثیت سے..... اس فرض کی ادائیگی اس کے لئے سب سے بڑی ذمہ داری تھی۔ وہ دونوں باطن میں بڑے خطرناک، پراسرار اور جرم پیشہ بھی تھے۔ ان کی گرفتاری اس کے لئے انعام تھا.....

☆.....☆.....☆

اس کا گھر کوئی پندرہ دنوں سے بند پڑا تھا۔ اس لئے کہ ان کے پڑوسی خاندان میں شادی شرکت کے لئے چنائے گئے ہوئے تھے۔ جب وہ گھر پہنچے تو کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اسے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی اور مہمانوں کی خاطر مدارات بھی کرنی تھیں۔ پھر وہ کھانا لانے بجلے کے ہوٹل گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد واپس آیا تو عطیہ نے اتنی دیر میں نہ صرف باورچی خانے کی صفائی کر دی بلکہ ایک کمرے کی صفائی کر کے اس قابل بنادیا کہ بیٹھا جاسکے۔ سہ پہر تک عطیہ نے گھر کی صفائی کر کے اس کا نقشہ بھی بدل دیا تو وہ دل میں اس کی سلیقہ مندی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ بہر حال وہ ایک ہیرا تھی۔ نایاب اور انمول ہیرا جو بہت کم گھروں میں ہوتا ہے۔ خال خال ہی ہوتا ہے۔ عورت آخر عورت ہوتی ہے..... لیکن دوسری طرف یہ کیا تھی.....

عطیہ نے رات کا کھانا اس کے منع کرنے کے  
باوجود تیار کر لیا تھا۔ جب وہ سودا سلف منگوا رہی تھی تب

میں نے اس سے کہا تھا کہ یہاں گول چانپ، بکرے کا پایا اور بریانی بہت اچھی ملتی ہے۔ اس نے ناگہان کی بات سن کر کہا تھا کہ عورت کے گھر میں ہوتے ہوئے کھانا ہٹوں سے آئے یہ بات ایک عورت کے لئے شر کا باعث ہے۔“

وہ خود اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ گھر میں  
پکا کر کھالوں۔ اس لئے کہ اسے ہونٹوں کے کھانے پسند  
نہیں تھے۔ کوئی اپنے گھر پر کھانے پر اسے مدعو کرتا تو وہ  
نکار نہیں کرتا تھا اور پھر روٹیاں پراٹھے برائیاں اور سالن  
اڑوس پڑوس میں بٹالیتا تھا۔ پڑوس میں عطاء الرحمن کی  
جو بیوی ہوئی وہ میرے لئے آلو اور قیمہ پراٹھے بنانا  
کرتی تھی۔ عطیہ نے بڑی عمدہ ایسی روٹیاں بنائی تھیں  
کہ اس کا دل خوش ہو گیا۔ مونگ مسور کی وال ایسی  
بر دست ذائقہ دار پکائی تھی کہ اس نے اپنی انگلیاں  
چاٹ لی تھیں۔

رات گیارہ بجے ان تینوں نے مل کر چائے پی۔  
 جس وقت عطیہ چائے بنارہی تھی وہ کسی بھانے سے پاس  
 میں موجود تھا اس خیال سے کہ کہیں وہ چائے میں بے  
 وفائی کی دوانہ گھول دے۔ اس کا پرس اس کے کمرے  
 میں موجود تھا۔ گوکہ عطیہ کو اس کے گھر کچھ ہاتھ نہیں لگ  
 سکتا تھا۔ پھر وہ چونک کر اور محتاط رہنا چاہتا تھا۔ اس نے  
 اندازہ کر لیا تھا کہ عطیہ سلیقہ مند اور گھڑلوڑی ہے۔ اس  
 نے بہت عرصہ چائے بنائی تھی۔ کھانے پکانے میں طاق  
 تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے اچھا کھانا پکانا بھی  
 سیک، ہنر ہے جس میں وہ بڑی ماہر تھی۔ سرفراز بھی بہت  
 خوش قسمت تھا جو ایسی رفیق سرفراز عورت کا ظاہری  
 حسن دریا نہیں ہوتا۔ اصل حسن باطنی ہوتا ہے۔

چائے پینے کے بعد وہ برتن سیٹ کر باور چلنے  
انے میں لے گئی۔ تاکہ انہیں دھو کر رکھ دے۔ کچھ دیر  
بعد جب عطیہ اس کے ساتھ والے کمرے میں سرفراز  
کے ساتھ سونے کے لئے گئی تو کسی قدر جھجک کر داخل  
ہوتی۔ دروازہ اندر سے بند نہیں کیا بلکہ بھڑکیا تھا۔ وہ  
بے کمرے میں اندھہ اکڑے باہر آیا اور ان کے

”سرفراز! تم حوصلہ کیوں ہار رہے ہو.....“

”دس بیس ہزار کے نہیں بلکہ لاکھوں کے  
ہزارات چوری ہو گئے..... لیکن تمہیں اس کا غم ہے اور  
اس کا حس..... جب میں سو رہا تھا تو تب تمہیں جاگتے  
سمجھتا تھا۔“

”تم نے ہی تو مجھ سے کہا تھا کہ تم سو جاؤ! میں  
 کاٹا رہا ہوں گا۔“ عطیہ نے جواب دیا۔ ”اب اس کا غم  
 کر کے کرنا کیا ہے.....؟ جب ایک چیز نصیب میں نہیں  
 تھی رونے دھونے اور اس کے چلے جانے سے کیا  
 حاصل ہے..... کیا رونے دھونے سے وہ چیز واپس مل  
 سکے گی؟“

”میں حیران ہوں کہ اللہ نے تمہیں کس مٹی کا بنایا ہے.....؟“ سرفراز نے کہا۔ ”میں نے تم جیسی اورت اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔“

”اب تو تم نے دیکھ لی کیا نا.....؟“ وہ شوقی سے  
 ”اب آپ باہر تشریف لے جائیں..... صحن میں  
 دو چار پانی بڑی سے اس پر گھوٹے بچ کر سوجائیں۔“  
 وہ صحن میں رکھے ہوئے مٹکے کی جانب تیزی  
 سے پانی پینے کے یہاں بڑھا تو سرفراز دروازہ کھول  
 کر باہر نکل آیا۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا ٹانگے پر انجان  
 کر کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے.....؟ کیا کسی چیز کی  
 ضرورت ہے؟“

”اندر کمرے میں گرمی بہت ہے۔ مجھے نیند نہیں  
 آ رہی ہے۔“ وہ یہ کہہ کر چار پائی پر دراز ہو گیا۔

اس کا قیاس درست ثابت ہوا تھا۔ عطیہ نے  
میں نے انڈاز سے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے  
لنگائی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر درواز  
کیا اسے کچھ دیر تک ٹینڈ نہیں آئی۔ کیوں کہ وہ دونوں  
کمرے میں سوچتا رہا۔ یہ دونوں میاں بیوی نہیں  
تھے۔ اب یہ راز ظاہر ہو گیا تھا۔ انہوں نے سفر کے  
دوران اس پر اسے آ کر کہاں بیوی ظاہر کیا تھا..... اور

اس کے ہاں آ کر عطیہ نے رات کے وقت اسے فائدہ اٹھانے نہیں دیا تھا۔ ان کے بارے میں وہ سوچتے سوچتے سو گیا۔ آنکھ کب لگی اسے پتا بھی نہیں چلا۔ اب تو اس کے لئے وہ دونوں اور پراسرار ہو گئے تھے۔

پھو پھٹنے سے پہلے ناٹنگ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھر کے سٹائے میں عطیہ کے کمرے سے عطیہ کے تیز جیزمر گروہی دہی باتوں کی گونج محسوس کی..... وہ سمجھا کہ سرفراز کسی بری نیت سے اس کے کمرے میں گھس گیا ہے اور اس سے دست درازی اور من مانیوں کرنے لگا ہے تو عطیہ برہم ہی ہو رہی ہے۔ مزاحمت اور مدافعت کر رہی ہے۔ معلوم نہیں وہ عطیہ کے کمرے میں کیسے گھس گیا۔ شاید وہ تھوڑی دیر پہلے واش روم جانے کے لئے اٹھی ہو۔ واش روم صحن میں تھا۔ اس نے اس موقع اور وقت سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ یہ تو بڑی غلط بات اور نازیبا حرکت تھی۔ وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ سرفراز ایک شریف لڑکی کو آلودہ کرے.....

میں تنگے اور دبے پاؤں صحن میں آیا تو غصیہ کی تیز آواز سن رہی تھی وہ تپے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔  
 ”میری بات کان کھول کر سنو۔ صبح ہوتے ہی..... سب سے پہلے انکل کو اپنے بارے میں سچ سچ بتا دینا..... ان سے کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا تم یہ چاہتی ہو کہ وہ ہمیں گھر سے نکال دیں.....؟ ان کا مزاج اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ سر فراز نے کہا۔

”میں نے انہیں بہت اچھا، نیک اور مخلص پایا ہے۔“ عطیہ بولی۔ ”وہ اس مشکل میں یقیناً ہماری مدد کر س گئے۔“

”اس لئے کہ انہوں نے ہمیں اپنے ہاں ٹھہرایا.....؟ تم مجھے سوچنے کی مہلت دو۔“ سرفراز نے کہا۔

”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟“ عطیہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اب سوچنے کا وقت نہیں رہا ہے۔“



”ٹھیک ہے۔ تم کہتی ہو تو میں انہیں اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دوں گا۔ لیکن یہ سب تم بھی تو بتا سکتی ہو۔“ سرفراز نے غی سے کہا۔

”میں ایک لڑکی ہونے کے ناتے ان سے یہ سب کہنا نہیں چاہتی۔“

عطیہ نے تنک کر کہا۔ ”میں کسی بہانے سے تم دونوں کو تنہا چھوڑ دوں گی۔ پھر تم انہیں سکون و اطمینان سے سب کچھ بتا دینا۔“

گا۔ ابھی وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔“

”تم سے ایک اور ضروری بات کہنا ہے؟“ عطیہ بولی۔

”کیا بات ہے؟“ سرفراز کے لہجے میں حیرت عیاں تھی۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے آج ہی پورا کر کے دکھاؤ۔“ عطیہ کے لہجے میں سراسیمگی جھلکنے لگی۔

”زیورات اور کاغذات کی چوری نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا ہے۔ میں ساری رات ایک بل کے لئے بھی سو نہیں سکا ہوں۔“ سرفراز نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ادھر تمہیں اپنی پڑی ہے۔“

”اب سوچ سوچ کر سیزن کو بی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ عطیہ نے اسے دلاسا دیا۔ ”اب تم غم کو دل سے نکال پھینکو۔ ہم دونوں مل کر حالات کا مقابلہ کریں گے۔ تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے۔“

”میں یہ چاہتا ہوں کہ بریف کیس کی بازیابی تک شادی کو اتنا امیں ڈال دو۔“ سرفراز کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”وہ کس لئے؟“ عطیہ کا لہجہ تھیر زدہ سا تھا۔

”تم مجھے عجیب و غریب شے ہو۔“ سرفراز نے جھلا کر کہا۔ ”تمہیں اپنے زیورات کے چوری ہو جانے کا ذرہ برابر بھی ملال نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا ہوتا۔ تمہیں صرف

اپنی شادی کی فکر پڑی ہے۔“ سرفراز کے لہجے میں زہر بھر گیا۔

”تم۔۔۔۔۔ یہ بات کیوں نہیں سوچتے کہ میں ایک لڑکی ذات ہوں۔ مجھے۔۔۔۔۔ اپنے زیورات اور جان و مال سے کہیں۔۔۔۔۔ زیادہ عزت و آدمی کی فکر ہے۔“ عطیہ تنک کر کہنے لگی۔ ”میں نے تم سے پہلے بھی ایک بار نہیں کئی بار کہا تھا کہ میں ایک بڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ بڑھی لکھی لڑکیاں گھروں سے نہیں بھاگتی ہیں۔ انہیں اپنے حقوق حاصل کرنا آتا ہے۔ کیوں نہ ہم اپنے اپنے دوستوں کی مدد سے باعزت طور پر شادی کر کے راستے میں آنے والی مشکلات کے خلاف سینہ پیر ہو جائیں۔“

عطیہ نے شاید سانس لینے کے لئے توقف کیا تھا۔ پھر وہ چند ثانیوں کے بعد کہنے لگی۔ ”لیکن تم نے ہمیشہ میری اس تجویز سے اختلاف کیا کہ میرے گھر والے کہیں تمہیں کسی کیس میں نہ پھنسا دیں۔“

”اس بات کا امکان تھا اس لئے تو میں شادی کے لئے تیار نہ ہوا تھا۔“ سرفراز نے درمیان میں کہا۔

”کیا یہ صرف یہ تمہارا خوف و خدشہ تھا؟“ عطیہ نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

”اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا؟ میں ایسا سینکڑوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ تمہارے گھر والے تم پر جبر و زیادتی کر کے میرے خلاف جھوٹا بیان دلا کر اغوا کا مقدمہ دائر کر دیتے۔“ سرفراز نے زہر شدہ لہجے میں کہا۔

”تم مجھے اپنی بات پوری کر لینے دو۔“ عطیہ نے بیجان زدہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد اپنا منصوبہ میرے سامنے رکھا۔ جب میں نے اس منصوبے پر عمل کرنے سے انکار کیا تو تم نے مجھے خودکشی کی دھمکی دی اور میں تمہاری بات ماننے پر مجبور ہو گئی۔ میں تمہاری ایما پر گھر سے وہ سارے زیورات لے آئی جس میں نہ صرف میری اور میری چھوٹی بہنوں کے لئے جہیز کے لئے رکھے گئے تھے بلکہ ابو کی دکان کے بھی رکھے ہوئے تھے کہ آج کل دن دہائے

دکانوں پر ڈکیتی کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ تم نے مجھے اپنے منصوبے کے بارے میں بار بار بتایا تھا کہ ہم بنگلور کے پبلے شادی کر لیں گے اور کچھ زیورات بیچ کر مکان خریدیں گے۔ پھر ہم دونوں ملازمت کر لیں گے۔ اگر ملازمت نہیں ملے تو باقی بچے ہوئے زیورات بیچ کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیں گے۔ لیکن اب تم شادی کے لئے مکر رہے ہو۔ کیا شادی کے لئے زیورات کا ہونا اشد ضروری ہے؟ کیا اس کے بغیر شادی نہیں ہوتی ہے؟“

”تم اپنی تقریر بند کرو۔“ سرفراز نے قہقہے ہوتے ہوئے کہا۔ ”آخر میں نے پچاس ہزار روپے دے دیے تھے ان زیورات کے حصول کے لئے؟“

”تو کیا وہ زیورات صرف پچاس ہزار کی مالیت کے تھے؟“ عطیہ تیزی سے بولی۔

”لیکن وہ ان پچاس ہزار کی بدولت ہی ہاتھ لگے تھے۔“ سرفراز نے چپس یہ چپس ہوتے ہوئے کہا

”اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا یا سچ کہ میری باجی الہ آباد سے اپنے سات عدد بچوں کے ساتھ اس گھر میں دھرم نامہ کر رہی ہیں جہاں وہ الماری ہے جس کی تجوری میں زیورات بھرے ہوئے ہیں۔ باجی۔۔۔۔۔ ابو سے مکان کی خریداری کے لئے مزید پچاس ہزار مانگ رہی ہیں جب کہ اب انہیں دو ماہ پہلے دو لاکھ دے چکے ہیں۔ ابو بال منول سے کام لے رہے ہیں۔ اگر باجی کو کسی بہانے سے پچاس ہزار روپے دینے جائیں تو وہ اسی دن مل جائیں گی۔ راستہ صاف ہو جائے گا اور۔۔۔۔۔“

عطیہ تیزی سے بات کاٹ کر بولی۔ ”کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ایک ماہ اور انتظار کر لو۔ اس وقت تک باجی چلی جائیں گی لیکن تم نہیں مانے اور فوراً پچاس ہزار کا بندوبست کر کے مجھے دے دیے اور کہا کہ اپنی باجی کو آج ہی دفع کر دو اور کل زیورات لے آؤ۔ ٹکٹ کا مسئلہ نہیں ہے۔ میرا ایک قلی جاننے والا ہے۔ وہ کس کاڑی کار ریویشن چاہے صرف بیس منٹ پہلے بھی

دلا سکتا ہے۔ جب کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ ہوائی جہاز سے چلتے ہیں۔ لیکن تم اس وجہ سے تیار نہ ہوئے کہ کہیں کوئی چوری نہ ہو جائے۔ ہوائی جہاز سے سامان اتارنے والے چوریاں بھی کرتے ہیں۔ یہ شکایت عام ہے۔“

”مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ زیورات اس قدر منحوس ثابت ہوں گے۔“ سرفراز غصے سے بولا۔

”یہ سب کچھ تمہاری غفلت کی وجہ سے ہوا ہے۔“ عطیہ کا لہجہ زخم خوردہ تھا۔ ”لیکن میں نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کہ تم میرے لئے ان لاکھوں کے زیورات سے کہیں قیمتی ہو۔ میں تمہاری محبت میں اندھی ہو کر خود غرض بن گئی۔ میں نے نہ صرف اپنی بہنوں کے ساتھ سفاکانہ سلوک کیا۔ ان کا مستقبل تاریک کر دیا بلکہ باپ کو بھی کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا۔ آخر کس لئے؟ صرف تمہارے لئے؟ کیا اب بھی کوئی کسر رہ گئی ہے جو تم میری محبت آزمانے کے لئے میرا بڑا امتحان لیتا چاہتے ہو۔؟ اب میرے پاس ہے کیا جو ایثار و قربان کروں۔؟“

مگر عطیہ۔۔۔۔۔! یہ بھی تو سوچو کہ میرے پاس جو سات سو روپے رہ گئے ہیں۔ اس سے کیا ہوگا۔؟

کیا اس میں ہماری گزر بسر ہو جائے گی۔ یہ رقم کب تک ساتھ دے گی۔؟“ وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

”اگر گزر بسر نہیں ہو سکتی ہے تو کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے۔؟“ عطیہ کی آواز رندہ گئی۔

”میں فاقے کر سکتی ہوں۔ بھوکى مر جاؤں گی۔ لیکن تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ کسی حالت میں بھی نہیں۔ تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ تم جس حالت میں بھی رکھو گے اس میں خوش رہوں گی۔ تم میری آزمائش کر سکتے ہو۔“

سرفراز لا جواب ہو کر خاموش ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی گفتگو سے ان کی محبت بھری کہانی اور پس منظر ٹائیکر کے سامنے آ گیا تھا۔ سرفراز کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ وہ عطیہ سے شادی کرنے سے کتر رہا تھا۔ لیکن



عطیہ ٹائیگر کے لئے اب بھی بے حد پراسرار معہ بنی ہوئی تھی۔ یہ موقع اس معہ کو صل کرنے کا نہیں تھا بلکہ اب اسے اس ڈرامہ میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس نے اس لئے عطیہ سے ہمدردی اور اپنائیت کا اظہار کیا تھا اسے معاشرے کی لڑکیوں سے اس لئے اپنائیت سی تھی وہ مظلوم ہستی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔

☆.....☆.....☆

سرفراز..... عطیہ سے آج ہی شادی کرنے پر رضامند ہو گیا تھا..... لیکن ٹائیگر بھی ایک شرط پر ان دونوں کا نکاح کرانے پر تیار ہو گیا تھا۔ لیکن اس شرط پر رخصتی کی تقریب مہینے میں باپ کے گھر میں باعزت طور پر منعقد ہوگی۔ عطیہ کے والدین اپنی بیٹی کو رسی اور روایتی طریقے سے وداع کریں گے..... عطیہ کو سمجھانے کی ساری ذمہ داری اس نے اپنے سر لے لی تھی..... سرفراز کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کیوں کہ وہ تنہا تھا۔ اس نے وقت یہ طے کیا تھا کہ مغرب کے بعد اس کے پڑوس کے رشید صاحب کے ہاں دلہا بن کواے گا۔ نکاح کے بعد اس کے اور دوست محمد احمد جو پچھلی گلی میں رہتے تھے انکے ہاں جا کر رہے گا۔ تیسرے دن وہ تینوں مہینے روانہ ہو جائیں گے۔

مغرب اور عشاء کا وقت بھی گزر گیا۔ رشید صاحب سرفراز کو لے کر نہیں آئے..... عطیہ سادگی سے دلہن بنی اس کے پڑوس کی دو ایک شادی شدہ عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ سراپا انتظار تھی۔ رات دس بجے رشید صاحب گھبرائے ہوئے اور بے حد پریشان اس کے ہاں آئے اور بتایا۔

”سرفراز جو چھ بجے حجامت بنوانے گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔“

وہ سمجھ گیا کہ اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اس نے عطیہ کے کمرے میں داخل ہو کر ان عورتوں اور لڑکیوں کو کسی حیلے بہانے سے رخصت کیا جو دلہا کے انتظار میں عطیہ کے ساتھ سوکھ رہی تھیں۔ ان

عورتوں کے جاتے ہی عطیہ نے اس کے چہرے پر نظریں کر کے جیسے سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ وہ ایک منٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے قریب آ کر کہا۔

”انکل..... آپ میری خاطر پریشان نہ ہوں۔ سرفراز جو محبت کی جاتی ہے اس کا انجام ایسا ہی عبرت ناک ہوتا ہے۔“

اسے عطیہ کی بات پر یک لخت غصہ آ گیا۔ جب وہ ایسی سمجھ دار اور دور اندیش لڑکی تھی تو اس نے گھر سے کنوین میں چھلانگ کیوں لگائی.....؟ وہ اپنا غصہ ضبط نہ کر سکا۔ ”جہیں جان بوجھ کر سرباب کے پیچھے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟“

عطیہ پر کئی خائون تک سوگواری غاری رہی۔

”آخر میں کیا کرتی انکل.....؟“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ”میری قسمت میرے چہرے سے کہیں بد قسمت ہے..... کالی پہلی لڑکیوں کے ایک تو رشتے نہیں آتے ہیں۔ اگر بالفرض رشتے آتے ہیں تو جہیز کا سوال زہر بن کر ماں باپ کے سینے میں پیوست ہو جاتا ہے۔ جہیز کی وجہ سے میری شادی نہ ہو سکی۔ میرے والد جیولری شاپ کے مالک نہیں بلکہ سیلزمین ہیں۔ کمیشن ایجنٹ بھی ہیں۔ وہ بڑے گھرانوں کی بیگمات، لڑکیوں اور فلمی اداکاراؤں کے ہاں زیورات بھیجتے ہیں لیکن اپنی بیٹیوں کے لئے زیورات خرید نہیں سکتے ہیں۔ سرفراز میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ وہ میرے باپ کی دکان ہے۔ اس نے میرے ساتھ محبت کا فریب شخص اس لئے کیا تھا کہ دکان کے زیورات کسی نہ کسی صورت سے بچھا کر کسی غیر ملک فرار ہو جائے..... اس نے ویزا، ٹکٹ اور پاسپورٹ تیار کئے تھے..... وہ مجھے بنگلور میں تنہا چھوڑ کر فرار ہو جانا چاہتا تھا..... یہ تمام باتیں بعد میں میرے علم میں آئی تھیں..... لیکن رواجی سے ایک دن پہلے ایک لڑکی نے بتائی تھیں جو میری سہیلی تھی۔ اس نے مجھے سرفراز کے ساتھ دیکھا تھا..... وہ سرفراز کو بہت قریب سے جانتی تھی۔ سرفراز نے اسے محبت کے نام پر تباہ کیا

لیکن میں چاہتی تھی کہ سرفراز کسی طرح میرا راج بن جائے..... لیکن میری آرزو پوری نہیں ہوئی۔ اس نے مجھ جیسی کئی لڑکیوں کو اپنی وجاہت، خوب صورتی اور دراز قد کے باعث تباہ و برباد کیا۔ اس اسی آئیڈیل پر پیچھے کر برباد ہوئی رہیں.....

انکل چوں کہ ان پڑھ اور سیدھی تھیں اور زمانہ شناس نہیں تھیں اس لئے دھوکا کھا گئیں..... اس دور میں ایک شخص کو اسحق بنانا اور اسے لوٹ لینا آسان نہیں تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ موقع پا کر مجھے شکار کرنا چاہا لیکن میں اسے جل دے گئی..... اس اسحق نے میرے لئے جو حال بچھایا تھا وہ خود ہی اس میں پھنس گیا..... میں نے اس پچی کے تمام پرکاش دیئے۔“

”کیا تم اپنے آپ کو بہلانے اور قریب دینے کے لئے یہ سب کچھ تو نہیں کہہ رہی ہو؟“ اس نے کہا۔

”میں اپنے آپ کو قریب دے کر کیا کروں گی.....؟“ عطیہ نے بیچکی بیچکی نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن میں اس بات سے خوش ہوں کہ میری عزت اور ذات ایک بھیڑیے اور شیطان سے محفوظ رہی۔“

”تم نہ صرف جھوٹ بول رہی ہو بلکہ مجھ سے بھی کچھ بچھا رہی ہو۔“ ٹائیگر اس پر برس پڑا۔ ”کیا یہ بات سن نہیں ہے کہ تم خود اپنے ہاتھوں سے بریف کیس چلتی گاڑی سے باہر پھینکا تھا..... جس میں گھر سے چمائے ہوئے زیورات تھے..... تم نے پہلے سرفراز کے کاندھات کا لٹافہ بریف کیس سے نکال کر اپنی اپنی کھانک لیا تھا..... آخر تم نے قیمتی زیورات باہر کیوں نکال دیئے..... کیا اس علاقے میں تمہارے منصوبے کے مطابق بریف کیس لینے کے لئے کوئی موجود تھا۔“

عطیہ اچھل پڑی اور حیرت سے اس کی آنکھیں پانی کی سی رہ گئیں..... ”تو کیا آپ اس وقت جاگ رہے تھے.....؟“

میں تو اس وقت بھی جاگ رہا تھا جب تم نے لالچاے میں بے ہوشی کی دواملائی تھی؟“

”انکل.....!“ جذبات سے اس کی آواز بھر اگئی۔ ”آپ نے اس واقعے کی جو پردہ پوشی کی ہے میں اس کا احسان عمر بھی نہیں بھولوں گی۔“

”لیکن تم نے میرے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ وہ بریف کیس پھینکا گیا تھا..... کیا وہ زیورات اس کے اصل مالک کو مل گئے.....؟“

عطیہ کے لیوں پر ایک فاتحانہ تبسم ابھر آیا۔ اس کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمکنے لگیں اور چہرہ دمک اٹھا۔

سرفراز کے دیئے ہوئے پچاس ہزار کی رقم میں سے صرف دو ہزار نکال کر کھلی زیورات خریدے گئے تھے..... باقی رقم اس نے جہیز کے لئے رکھ لئے..... اگر سرفراز مجھ سے شادی کر لیتا تو جہیز کی صورت میں واپس مل جاتی..... اس کا پاسپورٹ جو تھا ساتھ میں امریکی ڈالر جو تھے تیس ہزار ڈالر تھے..... وہ اسے بھی نہ دیتی بلکہ مستقبل کے لئے رکھ لیتی.....“

ٹائیگر دل میں عیش عیش کراٹھا..... کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”انکل میرے پاس اتنی رقم ہے کہ ٹرین سے ممبئی جاسکوں۔ آپ ٹکٹ کا بندوبست کر کے سوار کرا دیں۔“

”میں تمہیں ریل گاڑی سے نہیں بلکہ ہوائی جہاز سے بھیجوں گا۔ ٹکٹ میری طرف سے ہوگا۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”اب جب کہ تم بنگلور آئی ہو تو کیا بنگلور شہر دیکھ کر نہیں جاؤ گی..... بڑا خوب صورت شہر ہے۔“

”بہت بہت شکریہ.....“ وہ مہنویت سے بولی۔

”آپ کتنے اچھے ہیں۔“

ٹائیگر نے اسے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ تین دن تک اسے نہ صرف بنگلور شہر کی سیر کرائی بلکہ وہاں کے کھانے بھی کھلائے اور اسے گاڑی بھی کرائے پر لے کر سرنگا پٹم، ٹیپو سلطان اور حیدر علی کے مزاروں پر لے گیا۔ میوزیم دکھایا، برندان گارڈن لے جا کر رات روشنیوں کا نظارہ کرایا۔ بنگلور کا میوزیم جو ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ پھر رام گڑھ سے میسوپاک پانچ کلومیٹر کر دیئے۔ ایسا میسوپاک ہندوستان بھر میں نہیں بنتا تھا۔ یہاں میسو



پاک بنانے والے مسلمان خاندان صدیوں سے آباد ہیں اور پھر اسے پانچ ہزار کی شاہنگ بھی کرائی اس سے وعدہ لیا کہ شادی پر وہ اسے ضرور مدعو کرے گی۔  
”انگل!“ عطیہ نے کہا۔ ”آپ بھی میرے ہاں کیوں نہ مہینی چلیں؟“  
”وہ کس لئے؟“

”اس لئے کہ میں آپ جیسے محسن کو..... اپنے والدین سے ملانا چاہتی ہوں..... آپ کی بدولت میری عزت محفوظ رہی۔“

”دیکھو بی عطیہ.....!“ ٹائیگر نے بڑے پیار سے اس کا گال تھپ تھپایا۔ ”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا..... نہ یہاں میرے دوستوں اور ملنے والوں کا ایک وسیع حلقہ موجود ہے جس میں نہ صرف شکاری دوست بلکہ میڈیا سے بھی تعلق رکھنے والے ہیں..... چوں کہ ممبئی کی مشہور زندگی نہ صرف تھکا دیتی ہے بلکہ کلہو کا بیل بنادیتی ہے۔ اس لئے میں سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں ایک بار چکر ضرور لگا دیتا ہوں۔ اس لئے جب بھی آتا ہوں میرے دوست شکار کا پروگرام بناتے ہیں اور میں ان کے ساتھ شکار پر جاتا ہوں۔ جس سے مجھے ذہنی اور جسمانی سکون اور آرام ملتا ہے۔ لہذا میں معذرت خواہ ہوں..... ہاں جب میں واپس آؤں گا تب بھی تم سے اور تمہارے گھر والوں سے ملنے ضرور حاضر ہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”تو آپ شکاری بھی ہیں؟“ عطیہ خیریت سے بولی۔ ”آپ اپنی زندگی میں کتنی بار شکار کھیل چکے ہیں؟“

”ہاں..... شکار میرا شوق، میرا کاروبار اور میرا کام رہا ہے۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ”میں شکار کھیلا رہتا ہوں۔ ویسے جنگل میں متعدد مرتبہ شکار کھیل چکا ہوں۔“

عطیہ اس کی بات کی تہہ میں پہنچ نہیں سکی۔ اس نے مذاق سمجھا۔ پھر کہنے لگی۔

”میں نے افریقہ کے جنگلات میں بہت کچھ

پڑھا اور سنا ہے۔ کیا آپ کو آپ کا شوق افریقہ بھی لے گیا؟“  
”نہیں.....“ ٹائیگر نے سر ہلایا۔ ”ویسے کبھی زندگی میں موقع ملا تو ضرور جاؤں گا۔“  
”کیا میسور کا جنگل بھی افریقہ کے جنگلات کی طرح ہے؟“ عطیہ نے پوچھا۔

”افریقہ..... بنگلہ دیش کے سندربن جنگل برازیل اور جہاں جہاں بڑے جنگلات ہیں ان میں ایک قدر مشترک ہے۔“ ٹائیگر کہنے لگا۔ ”ویسے میری معلومات میسور کے جنگل کے بارے میں کچھ زیادہ ہیں..... ایک تو یہ جنگل سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا ہے اور بنگلہ دیش میں جو سندربن جنگل واقع ہے اس سے جا کر ملتا ہے..... میسور کے جنگل میں انسانوں کی بستیوں بھی موجود ہیں..... چھوٹی بڑی ندیاں جن پر دریا کا گمان ہوتا ہے..... جادو گروں، شعبد بازوں، وحشیوں اور آدم خوروں کے گاؤں بھی ہیں..... قدم قدم پر میرا پر اسرار علوم سے واسطہ پڑتا رہتا ہے..... اس کے علاوہ قاتل، چور اور ڈاکو بھی یہاں آ کر روپوش ہو جاتے ہیں تاکہ قانون کے ہاتھوں سے بچے رہیں..... اس کے علاوہ سرمایہ داروں نے یہاں عشرت کدے بنا رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں جو تاسازی کا کارخانہ اور شاید دو ایک کارخانے بھی ہیں..... کبھی ان سے سابقہ نہیں پڑا۔ وہ بڑے مرمض، خوب صورت اور نفیس اور گلاڑ ہوتے ہیں۔ وہ بڑے ماہر کاری گروں کے ہاتھوں تیار ہوتے ہیں..... یہ جوتے بازاروں میں دستیاب ہیں اور غیر ممالک بھی بھیجے جاتے ہیں۔ اس قدر قیمتی ہوتے ہیں کہ ایک عام آدمی کی قوت خرید سے باہر..... صرف سرمایہ داری خرید پاتے ہیں۔ ان کی پائیداری کا شاید ہی کسی غیر ملک کا بنا ہوا جو تاقابلہ کر سکے۔“

”کیا حکومت ان چوروں، بد معاشوں اور ڈاکوؤں پر ہاتھ نہیں ڈالتی؟“ عطیہ بولی۔  
”کوشش تو کرتی ہے..... لیکن اکا دکا ہی ہاتھ لگتے ہیں..... کیوں کہ جنگل اس قدر گھنا، تاریک ہے اور

مادی جانوروں کی بہتات ہے اس لئے پولیس اندر جانے سے خوف کھاتی ہے۔“  
آپ کا سابقہ شکار کھیلنے کے دوران مجرموں، ڈاکوؤں اور خوف ناک قسم کے جانوروں سے پڑتا رہتا ہوگا؟“

اتفاق سے نہیں..... کیوں کہ ہم شمال جنوب میں جاتے ہیں جہاں کالا ہرن..... عام ہرن..... بلیٹین اور مرغیاں کثرت سے ملتی ہیں..... پھر ہم ان کا شکار کر کے ایک طرح سے تفریح کا مقصد پورا کر کے چلے آتے ہیں۔“  
جب وہ اسے رخصت کرنے ایئر پورٹ گیا تو عطیہ اس سے لپٹ کر دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روئی رہی۔

☆.....☆.....☆

ٹائیگر اپنے دونوں دوستوں سے ملنے پر پریس کلب پہنچا۔ جہاں اس کے نہ صرف تمام دوست بلکہ شکاری دوست بھی موجود تھے جو ہر شام جمع ہوتے تھے۔ ان کے دم سے بڑی رونق رہتی تھی۔ ماحول بڑا سہانا، رنگین اور خوش گوار ہو جاتا تھا۔ وہ ان سے نہ صرف ملنے آیا تھا بلکہ شکار کا پروگرام بنانے..... تین چار مہینے شکار کا موسم اس لئے ہوتا تھا ان مہینوں میں بارش بالکل نہیں ہوتی تھی۔ برسات کے دنوں میں دلدلوں کا پتا نہیں چلتا..... اس کے علاوہ خصوصاً کالا ہرن کا شکار مقصود ہوتا تھا کہ جوان سب کو بہت مرغوب تھا۔ کالا ہرن کا شکار میسور کے جنگل میں اس لئے ممنوع نہیں تھا کہ وہ بکثرت تھا اور حکومت کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ ٹیکس ادا کرنے کی صورت میں اس کی کھال لے جانے کی اجازت ہوتی تھی۔

جب وہ پریس کلب پہنچا تو اس نے اپنے تمام دوستوں کو کلب کے کینٹین میں جو ایک بڑے کشادہ اور خوب صورت ہال کی ایک میز پر جو ایک گوشے میں تھی اور ان کے لئے مخصوص ہوتی تھی براجمان دیکھا۔ وہ حسب معمول پیپر سالہ ڈوسا کھا رہے تھے۔ ساتھ

ساتھ پائیں کرتے جارہے تھے اور نوک جھونک بھی کی جارہی تھی۔ پیپر سالہ ڈوسا اس ہال کی خاص ڈش تھی۔ یوں بنگلور کے تقریباً تمام ہوٹلوں اور ریسٹورنٹ اور کیفے میں بھی دستیاب ہوتی تھی۔ لیکن اس میں کینٹین والی بات نہ تھی۔ اس کا اپنا ایک مخصوص ذائقہ لذت تھی۔ اس لئے دو برسوں سے بلا ناغہ ہر سہ پہر یہ کھانے کے لئے آتے تھے۔

ڈرون حملہ کا سنتے ہی سارے لوگ جو ہال میں موجود تھے حواس باختہ ہو گئے۔ ان سب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ یہاں اس حملے کا کوئی تصور تک نہ تھا۔ کویتا کی اور میزوں کے لوگ بھی اپنی اپنی میزوں کے نیچے گھس گئے۔

”ڈرون حملہ.....؟“ رنگا سوامی نے کویتا کی طرف دیکھا۔ وہ سنجھل چکا تھا۔ ”نہ تو میزائل داغا گیا اور نہ.....“

”ارے یہ ڈرون حملہ.....؟“ رنگا سوامی نے کویتا کی طرف دیکھا۔ وہ سنجھل چکا تھا۔ ”نہ تو میزائل داغا گیا اور نہ.....“

”ارے یہ ڈرون حملہ نہیں تو کیا.....؟“ کویتا نے ٹائیگر کی طرف اشارہ کیا جو میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سب کی جان میں جان نہ آئی..... لوگ اپنی اپنی میزوں کے نیچے سے نکل آئے۔ کچھ ہستے، مسکراتے اور غصے کی سی حالت میں سب نے بگڑ کر کویتا سے کہا۔ ”تم اپنی شرارتوں اور حرکتوں سے باز نہیں آتی ہو..... تم نے تو ڈرا ہی دیا۔“

”ڈرانے والوں کو ڈرایا جاتا ہے..... یہ ٹائیگر..... کیا کسی ڈرون حملہ سے کم ہے..... اے دیکھو..... آیا بھی ہے تو کسی ڈرون حملے کی طرح.....“ کویتا بولی۔

ٹائیگر جب میز کے پاس پہنچا تو تمام دوستوں نے کھڑے ہو کر بڑی گرم جوشی سے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ مصافحہ کیا۔ جو مرد وہ دھنل گیر ہو گئے۔ کویتا، رادھنا اور سرسوتی نے مصافحہ کیا۔ آخر میں کویتا



نے کیا تھا۔ ٹائیگر نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا، وہ ان تینوں میں سب سے خوب صورت، پرشباب گداز بدن کی تھی۔

”کیا تم نے میرا ہاتھ ساری زندگی کے لئے تھام لیا ہے؟“ کویتا شوشی سے بولی۔

”کیا تم مجھے اتنا احق سمجھتی ہو کہ میں ایک حسین عورت کا ہاتھ ساری زندگی کے لئے تھام کر بیروں پر کبھاری ماروں گا۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”لوگ میرا ہاتھ تھامنے اور جیون ساتھی بنانے کے لئے میرے سینے دیکھتے ہیں..... بنی کرتے ہیں.....“ وہ بولی۔ ”تم بھی تو دیکھتے ہو۔ اس لئے تو آئے ہو۔“

”دنیا میں احق کی کوئی کی نہیں ہے..... اور پھر سینے کوئی نہیں دیکھتا ہے.....“ ٹائیگر بولا۔ ”میں جو سنا دیکھتا ہوں..... وہ تمہارا نہیں بلکہ کالا ہرن اور مرغایوں کا.....“

”بلیک ٹائیگر ہو اس لئے..... کالا ہرن کا خواب دیکھتے ہو.....“ کویتا راجستہ بولی۔

”تم نے آتے ہی اس سے جھگڑا شروع کر دیا۔“ راہنما ہنس کر بولی۔ ”معلوم نہیں کیوں اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا ہے.....؟“

”اس لئے کہ تم مجھے دیکھتے ہی بے ہوش نہ ہو جاؤ۔ اس لئے کہ بلیک ٹائیگر کو دیکھ کر اچھے اچھوں کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔“ ٹائیگر نے کہا۔

ٹائیگر کی کویتا سے بے حد تکلفی تھی۔ کویتا کے برابر جو خالی کرسی تھی اس پر بیٹھنے سے پہلے اس کی عریاں ممر میں کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت کالی ساڑھی اور کالے مختصر سے سیاہ بلاؤز میں تھی جس کی آستین نہیں تھیں اور گریبان بھی آگے پیچھے سے بے حد کھلا ہوا تھا۔

ٹائیگر نے اس کا چہرہ اور سراپا نظروں کی گرفت میں لیا تو وہ ایک دم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

”تم اس طرح دیکھ رہے ہو جیسے میں اس سال

کی مس ورلڈ ہوں۔“

”اگر تمہیں مس ورلڈ منتخب کر لیا گیا تو دنیا کی ساری بوڑھی اور معمر عورتوں میں خوشی کی لہر دوڑ ہو جائے گی کہ ان کی قسمت جاگ گئی ہے جو عورت اسی برس کی ہوگی وہ مس ورلڈ چن لی جائے گی۔“

”کیا میں اسی برس کی لگ رہی ہوں.....؟“ وہ تنک کر بولی۔

”اس سے دو تین برس اور زیادہ..... ویسے تمہیں بوڑھی حسینہ کا خطاب مل جائے گا۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”میں جب سو برس کی ہو جاؤں گی تب میں تم سے ہر قیمت پر شادی کر کے رہوں گی۔“

”انگو رکھنے ہیں.....“ ٹائیگر ہنس دیا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں بخش دوں گی؟“

”کون جیتا ہے تیرے سفید زلفوں سر ہونے تک۔“

”میری زلفیں سفید نہیں ہوئی ہیں بلکہ تمہارا خون سفید ہو گیا ہے۔“ کویتا نے کہا۔ ”میری سیاہ اور لمبی خوب صورت ریشمی گھٹائیں..... کیا تمہیں ان میں سفیدی نظر آ رہی ہے..... ایک تار تک چاندی کا نہیں ہے۔“

”یہ کیوں نہیں کہتی ہو خضاب کا کمال ہے.....؟“ ٹائیگر کہنے لگا۔ ”کیا میں نہیں جانتا کہ تمہاری عمر کیا ہے..... تم نا امید نہ ہو..... یہاں ایسے احق بستے اور ملتے ہیں کہ..... بالوں کا دھوکا..... عمر کا دھوکا اور جسامت کا دھوکا کھا کر شادی کر لیں گے۔“

سرسوتی نے ان کی فوک جھونک کے درمیان ویٹر کو بلایا اور اسے پیپر ڈوسا کا آرڈر دینے لگی تو ٹائیگر نے کہا۔

”کھوپے کے دودھ کی بگھار والی چٹنی بھی لانا..... میں تین سے کم نہیں کھاؤں گا..... پہلے کے بعد دوسرا.....! دوسرے کے بعد تیسرا گرم گرم..... ہر ایک کے ساتھ چٹنی ضرور آئے گی..... اس کا بل مس کویتا کے

کھاتے میں جائے گا۔“

”ایسا کرو کہ چٹنی پانچ گیلن لا کر دوے دینا.....“

”تم بل کی پروا مت کرو..... دس میں ایک..... بد بھئی کھاؤ گے تو بھی بل میں ادا کر دوں گی..... ایک بات بتا دوں..... بد بھئی ہو جائے تو فکرمات کرنا..... میں ہنسورے ہاٹھو لاکشی شیشی منگوادوں گی.....“

”ہاٹھنے کی گولی کھانے کے بجائے ایک اور سالہ ڈوسا نہ کھاؤں۔“ ٹائیگر بولا۔

”کیٹین کے بچن میں چار عدد باورچی پیپر سالہ ڈوسا تیار کر رہے تھے۔ اس لئے ویٹر فوراً ہی لے آیا۔

ٹائیگر نے چھری کا ٹاسا سنبالا اور اس کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔ سرسوتی نے کہا۔

”ٹائیگر.....! تم نے ممی میں بڑے زبردست ڈرون جمیل کئے..... ایک ایک ڈرون حملے کو سننی خیر خبر بنا کر کویتا اپنے اخبار میں چھاپتی رہی ہے..... جس نے نہ صرف صوبہ میسور بلکہ سارے ہندوستان میں دھوم مچا دی ہے..... اور پھر اودھنا ٹیلی ویژن میں ان خبروں کو عام کیا اور لوگوں کو بتایا کہ کس طرح ٹائیگر اتنے بڑے گارماے انجام دے رہا ہے۔“

”میں اپنی پلیٹی اس لئے پسند نہیں کرتا کہ مجھے شہرت کا شوق ہے نہ اس سے کوئی دلچسپی ہے۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”میں انسانیت کی خدمت کرتا ہوں۔ میرا شروع ہی سے یہ مشن رہا ہے کہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچاؤں..... دولت کی بھی ہوں اور خواہش کبھی نہیں رہی۔ اس لئے کہ نہ دینے والا چھپر بھار کر دیئے جا رہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اتنی دولت لے کر کیا کروں.....

ویسے میں ضرورت مندوں بھتا جوں اور غریبوں کی دل کوئل کر دکر رہتا ہوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی.....؟“ کویتا نے سرخ ہو کر پوچھا۔ ”جب کہ تمہارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔“

”اس لئے کہ ایک سراغ رساں کو شادی کرنا ہوا ہنگام پڑتا ہے..... اس لئے کہ وہ جیمز بانڈ کی طرح ہے

جس کی زندگی میں لڑکیاں عورتیں ہوا کے جھونکوں کی طرح آتی رہتی ہیں..... گو کہ میں اب تک بہکا نہیں ہوں۔ شادی کے بعد بہک جاؤں تو اس کے ساتھ بد دیانتی ہوگی جو میں نہیں چاہتا۔ پارسانی پر دھبا ایک مرتبہ لگ جاتا ہے..... وہ ایک بار پھل جاتا ہے تو پھسلتا ہی جاتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ سبراشیم نے سر ہلایا۔

”غلاظت کے دلدل سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔“

”یہ سوال کویتا نے مجھ سے پوچھا ہے کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی.....؟ میں یہی سوال اس سے پوچھنا چاہتا ہوں.....؟ اس کے امیدواروں کی کوئی کمی نہیں ہے..... اس جوڑی سے شادی کی تمنا میں لوگ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔“

”ابھی میری عمر شادی کی کہاں ہوئی ہے.....“ کویتا شوشی سے بولی۔ ”اگر شادی کی خواہش ہوئی تو صرف تم سے کروں گی۔“

”ویری گڈ..... میں انتظار کروں گا۔“ ٹائیگر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے قریب کر لیا۔

”کیا تم یہاں کسی خاص مشن پر آئے ہو.....؟“ سرسوتی نے دریافت کیا۔ ”کیا کسی نے تمہاری خدمات حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے؟“

”نہیں..... میں صرف شکار پر جانے کے لئے آیا ہوں..... کالا ہرن..... بطنیں اور مرغایاں..... پھر تم سب کی یاد بے اختیار کھینچ لائی ہے..... اس لئے کہ ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔“

”ایک شکاری نے دوسرے شکاری کو کھانے پر مدعو کر لیا۔“ رنگا سوامی بولا۔

”یہ شکاری کہاں سے بھ نہیں.....؟ اپنے اخبار کی نیوز ایڈیٹر..... میں ایک سراغ رساں جو درندہ صفت مجرموں اور جنگل کے جانوروں کا شکار کرتا رہتا ہوں..... ہم دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”شریکتی جی..... تم سے زیادہ خطرناک شکاری ہیں..... سیاست دانوں..... مفاد پرستوں..... مافیا اور



منشیات کا شکار کھیلتی رہتی ہیں۔ یہ لوگ جنگل کے درندوں سے کہیں خوفناک ہوتے ہیں۔ ان سے مقابلہ سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ جان کے دشمن ہوتے ہیں اور سر پر موت کی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔“ رنگا سوامی نے کہا۔

”ہاں“ سرسوتی نے سر ہلایا۔ ”میں نے کبھی اس پہلو پر غور نہیں کیا۔ جب کہ کویتا کو دو ایک مرتبہ جان سے مار دینے کی دھمکیاں مل چکی ہیں۔ لیکن اپنے مشن سے باز نہیں آتی۔ اس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال رکھی ہے۔“

زندگی کا کوئی مقصد تو ہونا چاہئے۔“ کویتا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”وہی آدمی جیتتا ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیتتا ہے۔“ ٹائیگر کا روزگار سراغ رسانی ہے جہاں اس کے قدم قدم پر خطرات اور موت منہ کھولے کھڑی رہتی ہے۔ صحافت میں جو سچائی ہے ہر برائی کا مقابلہ کرتے ہیں وہ موت سے نہیں ڈرتے ہیں۔ میں بھی نہیں ڈرتی۔ ٹائیگر نے مجھ سے دو ایک مرتبہ کہا تھا کہ موت صرف ایک بار آتی ہے اور اس کا دن، لمحہ اور وقت لکھا ہوتا ہے۔ اس لئے میں انسانی درندوں سے بالکل نہیں ڈرتی۔ حق کی بات کرتی ہوں۔ اس لئے بھی کرنا چاہئے کہ یہ صحافت کا اصول ہے۔“

”تمہارے ان گداز اور شیریں لبوں کو میں خراج پیش کر سکتا۔“ کاش۔۔۔۔۔! یہ سنہرے الفاظ تنہائی میں۔۔۔۔۔

”تمہیں کیسے معلوم کہ میرے لب شیریں ہیں۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔ ”یہ کڑوے کیلے اور زہریلے بھی ہیں؟“

”تصور میں اور انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے۔“

”تم بدمعاشی سے باز نہیں آؤ گے۔“ وہ مصنوعی غصے سے بولی۔ ”چلو۔۔۔۔۔ وقت پر پہنچ جانا۔۔۔۔۔ کھانے پر نہ میں تمہارا انتظار کروں گی۔۔۔۔۔ اور نہ

کھانا۔۔۔۔۔“

سب نے اپنا اپنا بل ادا کیا۔۔۔۔۔ کویتا نے اس کا اور اپنا۔۔۔۔۔ سرسوتی کے منع کرنے کے باوجود۔۔۔۔۔ وہ سب اس کے ساتھ پریس کلب سے نکلے۔ پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک کویتا نے اسے زوردار دھکادے کر گرا دیا۔

ٹائیگر حیران تھا کہ کویتا نے اسے دھکادے کر گرا کیوں دیا۔۔۔۔۔ وہ اس معمر کوئلہ کی رہا تھا کہ ایک کوئی سن سناتی ہوئی اس کے اوپر سے گزر گئی۔ اگر اسے کویتا نے دھکا نہ دیا ہوتا تو وہ لقمہ اجل بن چکا ہوتا۔

ٹائیگر نے سنبھل کر دیکھا۔ حملہ آور پارکنگ لاٹ سے ایک گاڑی کی اوٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ جہاں سے اس نے ٹائیگر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ گولی پریس کلب کی دیوار سے لگ کر زمین پر گر گئی۔ وہ اسے نشانہ بنانے کے لئے نشست باندھ رہا تھا کہ کویتا اس کی سرعت سے لپکی اور ٹائیگر پر گر کر اسے ڈھال بنالیا۔ دوسرا فائر بھی اس نے داغ دیا۔ اس کے باوجود کویتا خوف زدہ نہیں ہوئی۔ ٹائیگر نے اسے پرے دھکیل دیا۔ دوسرا فائر خالی گیا تھا۔ پھر وہ کھڑی ہو کر ٹائیگر کو پھر ڈھال بنانا چاہتی تھی کہ وہ تیرہ دھکا کر زمین پر گرتے وقت اس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی۔ پھر وہ خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔

کویتا سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز میں تھی۔ گورابدن تھا۔ گولی اس کے شانے پر لگی تھی جس سے خون ابل پڑا تھا جس سے نہ صرف اس کا سفید لباس بلکہ اس کا دودھیا بدن بھی خون سے نہانے لگا۔

ایک نہیں دو بدمعاش تھے۔ ان کی گاڑی پارکنگ لاٹ پر کھڑی تھی۔ وہ یہ سمجھ کہ کویتا موت کی آغوش میں جا چکی ہے۔ انہوں نے ٹائیگر کو دیکھا جو اپنی موت کی پروا کے بغیر ان کی طرف کو نڈا بن کر لپک رہا تھا۔ اسے نشانہ بنایا۔ ٹائیگر کی قسمت اچھی تھی۔ ان کے ریوالور کی نال سے شعلہ نہیں نکلا۔ صرف کلک کی آواز گونج کر رہ گئی۔ ان کے ریوالور میں شاید تین ہی

گولیاں تھیں۔ جب ان بدمعاشوں نے ٹائیگر کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ان کی گاڑی جھٹکے سے بڑھی۔ اس ہتکچہ اشارت ہی تھا۔ وہ زنانے سے آگے بڑھی اور مین روڈ پر آ کر مخالف سمت بڑھ گئی۔ چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ٹائیگر ایک دم سے رک گیا۔ اگر وہ اپنے دوستوں میں سے کسی کی گاڑی لے کر ان بدمعاشوں کا مقابلہ کرتا تو لا حاصل تھا۔ کیوں کہ وہ گاڑی جس تیز رفتاری سے گئی تھی اس نے اب تک کئی میل طے کر لئے ہوں گے۔ اس کی گرد پانا اور کس سمت کی یہ معلوم کرنا دشوار تھا۔ اس کی رگوں میں نفرت اور غصے سے لہوا ملنے لگا۔ کاش۔۔۔۔۔! اس نے سوچا۔ اس کی جیب میں ریوالور ہوتا تو وہ کویتا کو نشانہ بننے نہیں دیتا۔ ان دونوں کی کمر بڑوں میں سوراخ کر کے خون میں نہلا دیتا۔

یہ لرزہ خیز واقعہ جو ڈرون حملہ تھا چشم زدن میں پیش آیا تھا جس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ پریس کلب کے گیٹ پر مسلح چوکیدار بھی تھا۔ لیکن اس وقت پریس کلب کے احاطے میں کھڑا ایڑی پی رہا تھا۔ جتنی دیر میں وہ بندوق اپنی گیسٹ والی کوٹھری سے نکال کر لے آیا وہ بدمعاش فرار ہو چکے تھے۔ سرسوتی نے موبائل فون سے قریبی پولیس اسٹیشن پر رابطہ کیا اور وین آئی تو بدمعاشوں کی گاڑی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پولیس

دین ایک انداز سے ان بدمعاشوں کے تعاقب میں روانہ ہوئی۔ رنگا سوامی پولیس پر بگڑ گیا تاکہ ان کی گاڑی جو شام کے وقت پریس کلب کے باہر کھڑی ہوئی ہے وہ کیوں موجود نہ تھی۔ اس نے صاف صاف سب انسپکٹر سے کہہ دیا تھا کہ۔۔۔۔۔ ”آپ لوگ رشوت لینے اور کسی بے گناہ آدمی کو گرفتار کر کے تھانے لانے کے یوں لگے۔“

ٹائیگر برقی سرعت سے کویتا کی طرف لپکا۔ وہ تین چار برسوں سے اس کی نہ صرف اس کی تخلص دوست تھی بلکہ بے حد بے تکلف بھی۔ اس کے سراغ رسانی کے کارناموں کی جذباتی حد تک رسیا تھی۔ ان

دونوں میں خوب بنتی تھی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی سوچ سکتا تھا کہ اس کی جان بچانے کے لئے اپنی زندگی کی پروا نہیں کرے گی۔ اسے اپنی زندگی عزیز نہیں ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیا جذبہ تھا۔ محبت تھی۔ اس قدر ایثار۔۔۔۔۔ وہ کویتا سے شادی کرنے سے اس لئے قاصر تھا کہ ان کے درمیان مذہب کی دیوار تھی، جسے وہ گرا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی ٹائیگر۔۔۔۔۔ وہ دونوں ابھی شادی بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس نے ایک لمحے میں یہ سب کچھ سوچ لیا تھا۔ کویتا نے اس کی جان بچا کر اسے بن مول خرید لیا تھا۔ اس پر ایک ایسا احسان کیا تھا جسے وہ ساری زندگی اتار نہیں سکتا۔ اس کی عظیم محسن۔۔۔۔۔ ان درندوں نے کویتا کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس بات کا بھی خیال نہیں کہ وہ ایک عورت پر گولی چلا رہے ہیں۔

کویتا کو زخمی حالت میں بے ہوش دیکھ کر اندر سے صدمے، غصے اور نفرت سے اس کا دل جیسے پاش پاش ہوا جا رہا تھا۔ وہ کویتا کے پاس دوڑا نو ہوا گیا۔ اس نے پہلو تو نبض دیکھی لگا جیسے ڈوب رہی ہو۔ پھر اس نے سینے پر دل کی جگہ اپنا کان رکھ دیا۔ اسے آسجین کی ضرورت تھی۔ اس نے کویتا کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا۔۔۔۔۔ چند لمحوں کے بعد کویتا کے دل کی دھڑکن میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ نبض خطرے سے نکل آئی تھی۔ خون ابھی بھی زخم سے بہہ رہا تھا۔

فائرنگ سے پریس کلب کے اندر اور باہر ایک بھونچال آ گیا۔ نو فوگرافر تصویریں بنانے لگے۔ لیکن ایک افرا تفری اور چیخ و پکار سی مچ گئی۔ پریس کلب کے سبزہ زار پر جو لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سالہ ڈوسا کھا رہے تھے۔ بھگدڑ تھی کہ قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ بدمعاش فائرنگ کر کے فرار ہو گئے ہیں۔ ہر کسی کا خوف و دہشت سے برا حال تھا۔ سب سے زیادہ متاثر لڑکیاں اور عورتیں تھیں۔ وہ ایک تو بے ہوش ہو گئی تھیں۔ رادھنا اور سرسوتی ان سے کہہ رہی تھیں کہ اب خطرے کی



کوئی بات نہیں رہی..... لیکن خوف و ہراس نے انہیں حواس باختہ کر دیا تھا۔

رنگا سوامی ٹائیگر کے پاس آیا تو اس کا چہرہ بے لہو ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں نے اسپتال فون کر دیا ہے۔ بس ایسویٹس آنے والی ہے۔“ وہ غزدہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کسی کو بھی قریب نہ آنے دیں۔ حالاں کہ ایسویٹس کو اب تک پہنچ جانا چاہئے۔“

سبرانیم بولا۔ ”شام کا وقت ہے..... ٹریفک اکثر جام ہو جاتا ہے۔“

ایک پولیس وین جو اس وقت پریس کلب کے باہر آ کر رکھی تھی اس میں سے دو پولیس افسران اترے۔ اس وقت کویتا کے پاس بھیجے ہوئے لگی تھی۔ ان افسروں نے بھیڑ کو ہٹانے اور دور رکھنے کی کوشش کی۔

”اوہ..... یہ س کویتا ہیں؟“ ایک افسر نے حیرت سے کہا۔ ”ان پر بد معاشوں نے گولیاں چلائیں؟“

”مس کویتا پر نہیں بلکہ ٹائیگر پر.....“ رنگا سوامی بولا۔

”لیکن..... یہ نشانہ کیسے بن گئیں۔“ دوسرے افسر نے پوچھا۔

”مس کویتا نے ٹائیگر کو بچانے کی کوشش کی تھی..... وہ ڈھال بن گئی تھیں..... لیکن ان قاتلوں کو ایک عورت پر رحم نہیں آیا۔“

اس وقت ایسویٹس سائرن بجاتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ ایسویٹس کے اندر ڈاکٹر بھی تھے۔ اس نے فوراً ہی کویتا کو اسٹریچر پر ڈال کر اندر لائے معائنہ کیا۔ اس کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا دیا اور ڈرائیور سے کہا۔ ”فوراً اسپتال لے چلو۔“

ٹائیگر رنگا سوامی کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسپتال پہنچے ہی کویتا کو فوراً آپریشن کے لیے جایا گیا۔ کیوں کہ گولی اس کے شانے میں اتر گئی تھی۔

سبرانیم نے موبائل پر کویتا کے گھر والوں کو اس خونی حادثے کی اطلاع دے دی تھی۔ ڈاکٹروں،

سرجنوں اور نرسوں کی ایک ٹیم کویتا کے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی موجود تھی..... کویتا پر قاتلانہ حملے کی خبر نہ صرف ریڈیو لیٹن بلکہ ٹی وی لیٹن پر بھی نشر کی گئی تھی۔ صحافیوں کے علاوہ ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے اور عوام میں ہر خاص و عام اسپتال پہنچ گئے تھے..... اس لئے کہ کویتا کوئی عام عورت نہ تھی۔ ایک بڑے معروف اخبار کی نیوز ایڈیٹر تھی۔ بے باک، مندر اور بے خوف صحافی تھی۔ اس کی بڑی عزت و قدر تھی۔ بڑا عرب و دبہ تھا۔ اس کے علاوہ کالم نویس بھی تھی۔ وہ اپنے کالم میں کسی کو بھی نہیں بخشی..... سیاسی رہنماؤں، سیاسی چنڈتوں اور صاحب اقتدار کی پول کھول کر رکھ دیتی..... بے ضمیر، مفاد پرست اور مافیاء بھی اس سے ڈرتی اور اس کی جانی دشمن بھی تھی۔

اس پر جو قاتلانہ حملہ ہوا تھا اس کا یہ تاثر لیا گیا تھا کہ اس کے کسی دشمن نے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی..... لیکن اصل بات کیا تھی کسی کے علم میں نہ تھی۔ لیکن دوسرے دن سروسٹی نے جو دن ہیرالڈ کی ایڈیٹر تھی اس نے اپنے اخبار میں یہ خبر شائع کر دی کہ ممبئی کے مشہور پرائیویٹ سراغ رساں ٹائیگر میسور کے جنگل میں شکار کھیلنے آئے تھے۔ پریس کلب کی چار دیواری سے باہر آتے ہی وہ بد معاشوں نے ٹائیگر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تو کویتا نے ڈھال بن کر اپنے مہمان کو بچایا اور خود موت کی آغوش میں جاتے جاتے فحش گئی۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ اس کے شانے میں جو گولی پیوست ہوئی تھی وہ با آسانی نکال لی گئی۔ اس لئے کہ وہ زیادہ اندر نہیں گئی تھی۔

لیکن ٹائیگر دل میں حیران تھا کہ اس پر قاتلانہ حملہ کس نے کیوں اور کس لئے کیا تھا؟ اس کی آمد کی خبر ان جانے دشمن کو کس نے دی.....! اس نے اچانک شکار پر جانے کے لئے پروگرام بنایا تھا اور کسی کو بتائے بغیر روانہ ہو گیا تھا۔

ٹائیگر نے جب اس بات کا اظہار سبرانیم سے کیا تو اس نے کہا۔

”تم جس روز جنگور پہنچے اور گاڑی یعنی ٹیکسی میں ایک جوان جوڑے کے ساتھ اپنے گھر جا رہے تھے۔ تمہاری ٹیکسی کے مخالف سمت کویتا اپنی گاڑی میں اپنے دفتر جا رہی تھی اس نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ لیکن تم نے اسے نہیں دیکھا..... کویتا نے اخبار میں اپنی طرف سے خبر چھاپ دی کہ بلیک ٹائیگر میسور کے جنگل میں شکار کھیلنے ہر برس کی طرح اس برس بھی آیا ہوا ہے حکومت کرناٹک کو چاہئے کہ اس کی خدمات حاصل کرے۔ بلیک ٹائیگر..... شیر جنگال سے کہیں خطرناک ہے۔ وہ جنگال کا ٹائیگر ہے۔ ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہے۔ اس نے ممبئی میں نہ صرف بڑے بڑے خطرناک مجرموں بلکہ کئی مافیاز کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے..... حکومت کرناٹک بہت پریشان ہے کہ اب تک نہ صرف ملکی اور غیر ملکی شکاری بلکہ نو جوان لڑکیاں عورتیں اور مرد جو پراسرار طور پر غائب ہو گئے ان کا پتا نہیں چل سکا۔ یہ لڑکیاں اور عورتیں دو ماہ پیشتر میسور کے جنگل دو نئے مردوں کے ساتھ کالا ہرن اور مرغابیوں کے شکار کے لئے گئی تھیں..... ان کی پراسرار گم شدگی ایک معمہ بن گئی ہے۔ اگر بلیک ٹائیگر کی خدمات حاصل کی جائیں تو یہ معمہ با آسانی حل ہو سکتا ہے۔ وہ انہیں بازیاب کر کے اور اس گروہ کے سرغنہ کو جس نے انہیں اغوا کیا اور گروہ رہا ہے اور خیال یہ ہے کہ اس کے گروہ میں وہ قاتل، مجرم اور غنڈے بد معاش ہیں جو مفور ہیں جن کی حکومت کو بھی تلاش ہے انہیں کیفر کردار تک پہنچا کر دم لے گا..... ٹائیگر سراغ رساں نہ صرف زبردست سراغ رساں ہے بلکہ شکاری بھی ہے..... ملایا، آسام اور بنگلہ دیش کے سمندر بن کے جنگل میں اس نے خطرناک ایلے، تیندوں، شیر بھر، گینڈوں اور ریچھوں کا بھی شکار کیا ہے۔“

”لیکن ایک بات سمجھ سے بالا تر ہے کہ ایک گروہ نو جوان لڑکوں، مردوں اور نو جوان لڑکیوں عورتوں کے شکار یوں کو بھی کس لئے اغوا کر رہا ہے جو میسور کے جنگل میں موجود ہے..... کیا وہ ان سے دل بہلاتا ہے۔“

لیکن جوان لڑکوں اور مردوں کو کس لئے..... اس نے اب تک جو جوان لڑکیاں عورتیں اغوا کی ہیں اور کر رہا ہے..... کیا وہ عام قسم کی تھیں یا حسین..... یہ معمہ حل نہیں ہو سکا کہ وہ لڑکیوں، نو جوان لڑکوں، مردوں کو کس لئے اغوا کر رہا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے..... لیکن ہو سکتا ہے کہ انہیں کھلونا بنانے کے لئے..... اب تک جتنی بھی لڑکیاں اور عورتیں اغوا ہوئی ہیں وہ نہایت حسین، نو جوان، جوان سال اور بے حد پرکشش تھیں جیسے تگینے ہوں..... بہر کیف یہ ایک معمہ اور اسرار ہے۔“

”کیا یہ امکان نہیں ہے کہ وہ ان لڑکیوں عورتوں کو کسی غیر ملک میں لے جا کر فروخت یا نیلام کر دیتا ہو..... وہی..... قطر اور بھی کئی جگہ ایسی ہیں جہاں ہندوستانی حسن کی بڑی مانگ ہے۔“ ٹائیگر نے خیال ظاہر کیا۔

”اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا..... آج کا دور ایسا ہے کہ کوئی بات ناممکن ہے۔“

”کیا گائیڈ کی مدد سے بھی نہ پتا نہیں چلا کہ وہ کون پراسرار شخص ہے؟ کیا تنظیم ہے جو اس قدر منظم ہے۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”اب جب کہ میں آیا ہوں تو اس کا سراغ لگا کر رہوں گا۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”ٹائیگر.....! تم ذرا ہوشیار، چوکنا اور محتاط رہنا..... میرا خیال ہے کہ اس شخص نے بہت سارے اپنے لوگوں کو خرید کر چھوڑ رکھا ہے..... وہ تم پر کسی بھی وقت دوبارہ قاتلانہ حملہ بھی کر سکتا ہے۔“ رنگا سوامی بولا۔ ”اس حملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے یہاں آنے سے سخت پریشان ہے..... خوف زدہ ہے..... اس لئے اس نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی..... اپنی ناکامی پر بری طرح تملہا رہا ہوگا۔“

”یہ پراسرار نا دیدہ دشمن جو نہایت ذہین اور خطرناک ہے وہ قانون کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا..... مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ جب



وہ مختاط و مہربان بن جاتا ہے تو بڑے سے بڑا اور خطرناک بھی بال بیکا نہیں کر سکتا..... اس نے ہمیشہ میری حفاظت کی ہے..... میں جانے لگتی مرتبہ موت کے منہ میں جا کر آیا ہوں..... اللہ کا کرم تھا کہ میرا بال تک بیکا نہیں ہوا..... مجھ پر آج تک نہیں آئی۔ ہمارے مذہب میں موت کا ایک دن معین ہے..... نہ موت پہلے آ سکتی ہے اور نہ بعد میں..... وہ دس مرتبہ قاتلانہ حملے کیوں نہ کرے اسے کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔“

پھر وہ اور رنگ سواہی اور سبر انیم کو دیکھنے ہسپتال پہنچے۔ سب سے پہلے رنگ سواہی..... پھر سبر انیم نے باری باری اندر جا کر کویتا کی عیادت کی..... ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق نرس صرف ایک ملاقاتی کو اندر آنے دے رہی تھی۔ کویتا کے گھر والے بھی باہر راہ داری میں رکھی کرسیوں میں بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے کویتا کو دیکھ کر آنے تک کویتا کے گھر والوں سے باتیں کرتا رہا کہ کویتا کا یہ احسان ایسا عظیم ہے کہ وہ ساری زندگی بھی اتار نہیں سکتا۔ کویتا کی ماں نے کہا۔

”اگر کویتا نے تمہاری جان بچانے کے لئے اپنی زندگی کی جینٹ بھی دے دی تو نعم نہیں ہوتا خوشی ہوتی..... میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ اس کے کارن جو تمہاری زندگی بچ گئی ہم سب کتنے خوش ہوئے اور ہیں..... کیا ہم تمہارا وہ احسان بھول سکتے ہیں جو تم نے کویتا کو بچانے کے لئے اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالا تھا۔“

”میں نے کب کویتا کی خاطر جان کا خطرہ بھول لیا تھا.....؟“ ٹائیگر نے کہا۔ اس وقت اسے یاد نہیں آیا۔ ”جب تم بچلی مرتبہ تین برس پہلے بنگلور آئے تھے اس وقت ایک سیاسی پٹڑ نے پانچ اجرتی بدمعاشوں کی خدمات حاصل کی تھیں کہ کویتا کو اغوا کر کے نہ صرف اس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کر کے فلم بنا کر بازار میں پھیلا دیتا..... اس لئے کہ کویتا نے اس کے اور اس کی بہن کے خلاف اخبار میں لکھا تھا۔ دونوں کا کرپشن ظاہر کیا تھا جس سے وہ دوبارہ الیکشن جیت نہ

سکے تھے۔ کویتا جب لیکن پارک کے ریسٹورنٹ سے نکل کر پارکنگ پر آئی تھی پانچ مسلح بدمعاشوں نے اسے نرنے میں لے کر حکم دیا تھا کہ وہ خاموشی سے سائے کھڑی کالی وین میں سوار ہو جائے..... اتفاق سے تم وہاں سے گزرے تو کویتا نے تمہیں مدد کے لئے پکارا تھا..... کویتا حصار توڑ کر تمہاری طرف لپکی..... ان پانچوں بدمعاشوں کے پاس چاقو اور پستول تھے۔ تم نے چاقو والے بدمعاش کو جو تمہیں چاقو گھونپنے اور راستے سے ہٹ کر جانے کی دھمکی دیتا ہوا بڑھا تو تم نے فضا میں اچھل کر چاقو والے ہاتھ پر ایک لک لگا لی تو وہ لٹو کی طرح گھوم کر پستول والے بدمعاش پر جا گرا۔ اس بدمعاش کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گرا تو تم نے سرعت سے اٹھایا۔ دوسرے چاقو والے بدمعاش نے تمہارے بازو میں چاقو گھونپ دیا تو تم نے اس کی پیٹ میں لات ماری تو وہ اس کے ضرب کی تاب نہ لا کر لڑکھڑایا۔ زمین پر گر کر خاک چاٹنے لگا۔ دوسرے پستول والے بدمعاش نے تمہیں گولی چلانے کی مہلت نہیں دی اور اس نے فائر جھونک دیا۔ گولی تمہارے شانے کو زخمی کرنی نکل گئی۔ پھر تم نے ان بدمعاشوں پر گولیاں برسانا شروع کیں تو وہ چاروں اپنی وین کی طرف لپکے۔ چاقو والے زخمی کو چھوڑ کر فرار ہونے لگے تو تم نے فائرنگ کر کے گاڑی کا شیشہ توڑ کر دیا۔ وہ چاروں گاڑی میں سے نکل کر مختلف سمتوں میں بدحواسی اور دہشت زدہ ہو کر بھاگ نکلے۔ فائرنگ کی آواز سن کر پولیس کی موبائل آ گئی۔ اس زخمی بدمعاش کو گرفتار کر کے لے گئی۔ اس نے بتایا کہ یہ کسی کی ایما پر ان بدمعاشوں نے کویتا کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ تم ہسپتال میں تین دن زیر علاج رہے۔ کیا تمہارے اس احسان کا بدل کویتا کا احسان ہے..... نہیں کویتا کا احسان کوئی حیثیت نہیں رکھتا.....“

”اوہ آئی.....!“ ٹائیگر نے ہنس کر کہا۔ ”مجھے تو یاد بھی نہیں..... آپ نے اس معمول سے واقعہ کا ذکر کر کے شرمندہ کر دیا..... یہ خوشی کی بات ہے کہ کویتا

خفہ سے باہر ہے۔ اسے سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹروں کی تاکید ہے کہ چوبیس گھنٹے تک اسے ملاقاتی نہ ملیں تو اچھا ہوگا۔“

جب ٹائیگر کویتا کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ ہوش میں تھی۔ چہرے سے ظاہر تھا کہ اس کی طبیعت کافی مستحیل پچی ہے۔ اسے خون دیا جا رہا تھا اور ڈرپ بھی لگی ہوئی تھی۔ ٹائیگر نے محسوس کر لیا تھا کہ اس پر فحاشی جاری ہے۔ اس لئے کہ خون خاصا بہہ چکا تھا۔ ٹائیگر کو دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر دل کش مسکراہٹ کی سرخی دوڑ گئی۔

”آپ ٹائیگر ہیں۔ شیر بنگال.....“ نرس بولی۔ ”انہیں ہوش آتے ہی پہلے آپ کی فکر ہوگی۔ جب سے اب تک کوئی بیسویں مرتبہ آپ کے بارے میں پوچھ چکی اور مسلسل پوچھے جا رہی ہیں..... میں نے بتایا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ ان پر آج نہیں آئی..... لیکن شریعتی کو یقین نہیں آیا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر خیریت سے ہیں تو مجھے دیکھنے کیوں نہیں آئے..... میں نے کہا کہ ڈاکٹروں نے ملاقاتیوں حتیٰ کہ آپ کے گھر والوں کو بھی منع کیا ہوا ہے۔ لیکن انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا ہے..... کہا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں..... وہ بھی شاید اسی ہسپتال میں زیر علاج ہیں..... شکر ہے آپ آ گئے۔“ وہ کہہ کر ہنس دی۔

”وہ اس لئے بار بار پوچھ رہی تھیں کہ اس بدمعاش نے مجھے نشانہ بنادیا ہوگا..... میں زندہ نہ بچ سکا ہوں گا۔“

”میں تھوڑی دیر میں ڈاکٹر سے مل کر اور ہدایات لے کر آتی ہوں۔“ نرس بولی۔ ”آپ انہیں زیادہ بولنے مت دیں۔“

”ٹائیگر نے بستر کے پاس جا کر اس کا نرم و نازک خوب صورت اور سڈول ہاتھ اپنے ہاتھ میں تمام لیا۔

”کویتا.....! تم نے میری جان بچانے کے لئے اپنی جان کی پروا نہیں کی.....؟ مجھے بن مول خرید لیا۔“ ٹائیگر اس کا ہاتھ چوم کر بولا۔

”مجھے تمہیں اپنے سامنے زندہ سلامت پا کر کتنی خوشی ہو رہی ہے کاش.....! میں الفاظ میں بیان کر سکتی۔“

”تم صحافی ہو..... تمہارے پاس الفاظ کی کیا کمی ہے.....“ ٹائیگر نے خوش دلی سے کہا۔

”میری آنکھوں کی زبان کیا کہہ رہی ہے تمہیں اندازہ نہیں ہو رہا ہے.....؟“ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ”تم نے جب مجھے غنڈوں کے ہاتھوں اغوا ہونے سے بچایا اس دن سے تم میرے من کے خانے میں بسے ہوئے..... میں اس دن سے تمہاری.....“

”ٹائیگر اس کے چہرے پر جھک گیا تو اس کا جملہ ناکمل رہ گیا۔ اس کے ہونٹ دیر تک پیوستہ رہے اور کبھی رہتے..... باہر آہٹ سن کر ٹائیگر نے اپنا چہرہ اوپر اٹھالیا۔

”یہ کیا حرکت تھی.....؟“ کویتا نے حیا آلودہ ہو کر کہا۔

”تمہارے شریعتی ہونٹوں کی شیرینی.....“ نرس نے دروازہ کھولا تو وہ خاموش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ٹائیگر اپنے گھر میں اپنے بستر پر دراز اس نادیہ دشمن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج دوسرا دن تھا۔ وہ ہسپتال میں کویتا کے پاس بیٹھ کر بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ ابھی اس کی کمزوری پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی۔ زخم منڈل ہونے میں بھی دو تین دن لگ سکتے تھے..... رنگ سواہی اور سبر انیم بھی تھے۔ ان تینوں نے رات کا کھانا ایک ہوٹل میں کھایا۔ جب وہ گھر جا رہا تھا اس نے ایک مشکوک شخص کو تعاقب کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب اس نے رنگ سواہی کو بتایا۔ رنگ سواہی اپنی گاڑی میں اسے چھوڑنے جا رہا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ رنگ سواہی نے اسے اپنے ہاں رکنے کے لئے کہا لیکن وہ نہ مانا۔ اس نے کہا کہ وہ اس تعاقب کرنے والے بدمعاش کی خبر لے کر گھر چلا جائے گا..... پھر وہ رنگ



سوامی کے مکان کے عقبی حصے سے نکلا۔ پھر گھوم کر آیا تو اس نے اس شخص کو رنگا سوامی کے مکان کے سامنے کھڑے سگریٹ پیتے دیکھا۔ جس مکان کے سامنے وہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ زیر تعمیر تھا۔ اس میں سے گھپ اندھیرا جھانک رہا تھا۔ گلی میں نیم اندھیرا تھا۔ وہ قد آدرا تھا۔ جب وہ لمبا سا کش لیتا تو اندھیرے میں اس کی ٹھنسی سی روشنی میں اس کا چہرہ کچھ دکھائی دیتا۔ جب اس نے دوسرا سگریٹ نکال کر دیا سلائی دکھائی تو ساعت بھر کے لئے اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ وہ کوئی پیشہ ور قاتل لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر زندگی تھی اور آنکھوں سے وحشانہ پن جھانک رہا تھا۔ وہ اس زیر تعمیر مکان کے احاطے میں کھڑا اس کے رنگا سوامی کے مکان سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ گلی ویران اور سنسان بڑی تھی۔ چوں کہ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اس لئے کوئی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔ ٹائیگر گھوم کر اس کی طرف بڑھا تو اس کے ہاتھ میں کرکٹ کی گیند کے سائز کا ایک پتھر تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو بد معاش نے اس کی طرف دیکھا۔ ٹائیگر نے چشم زدن میں پتھر اس کی پیشانی پر دے مارا۔ دوسرے لمحے وہ چکراتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اس کی جیب میں ایک ریوا لور..... اور پرس تھا اس کے اوپر کی جیب میں کچھ نوٹ تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر میں موجود تھا۔

ٹائیگر نے اسی پتھر سے اس کے سر پر ایک اور ضرب لگائی تھی کہ اس کی چوٹ دماغ کے اندر تک اثر کر جائے تاکہ اس کا ذہن مفلوج ہو کر رہ جائے۔ دو دن تک ہوش میں آنے کے قابل نہ رہے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی اجرتی قاتل ہے۔ اس پر رحم نہیں آیا تھا..... پہلے تو اس نے ریوا لور چیک کیا۔ اس کی نال پر سائی لیسٹر نصب تھا..... اس کے چیمبر میں چھ گولیاں بھری ہوئی تھیں..... پھر پرس کھول کر دیکھا جو بہت پھولا ہوا تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے نوٹ تھے۔ اس کے علاوہ پونڈ کرنسی بھی تھی۔ اس نے ہندوستانی کرنسی گئی جو تین ہزار تین سو اکیس روپے تھے..... سو سو پونڈ کے

چالیس نوٹ تھے جس سے اس نے قیاس کیا کہ کسی انگریز سیاح سے اس بد معاش نے گمن پوائنٹ پر چھپنا ہے۔ پرس میں جو ہندوستانی کرنسی تھی اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کسی دکان یا گھر میں ڈکیتی کی واردات و سر راہ رہزنی بھی کی..... اس کے کاغذات سے پتا چلا کہ اس کا نام مہی پال ہے..... اس پرس میں ٹائیگر کی ایک تصویر تھی۔ ایک خط تھا جس میں تحریر تھا۔ ”مہی پال!“

میں تین ہزار کی رقم اور ایک انگریز سیاح جو میرے ہاں پر غافل ہے اس کی رقم جو تیس پونڈ کی ہے وہ سو سو کے چالیس نوٹ ہیں میں تمہیں بھیج رہا ہوں۔ ساتھ میں ٹائیگر کی تصویر بھی۔

ٹائیگر کون ہے میں تمہیں بتا دوں..... بنگال کا شیر کہلاتا ہے اور ممبئی میں پرائیویٹ سرائے رساں کا دفتر کھولے بیٹھا ہے۔ یہ بہت ہی خطرناک، نڈر اور بہادر شخص ہے۔ اس نے بنگال اور ممبئی میں بڑے بڑے خطرناک مجرموں اور قافیا کا صفایا کر دیا ہے۔ وہ ہر برس بنگلور آتا ہے تاکہ شکار اپنے دوستوں کے ساتھ کیلے۔ اس بار بھی آیا ہے۔ لیکن اس مرتبہ کرناٹک صوبہ کا گورنر اس کی خدمات حاصل کرنے والا ہے تاکہ مجھے ختم کر دے۔ اس دنیا میں وہ واحد ایسا شخص ہے جو مجھے ختم کر سکتا ہے۔ ابھی ایسا کوئی مافی کا لال پیدا ہوا ہے نا ہوگا۔ لیکن یہ بلیک ٹائیگر ایسا مافی کا لال ہے جو مجھے موت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ اس کے کارنامے میں اخبارات میں پڑھ چکا ہوں اور سن بھی چکا ہوں۔ اسے ہر قیمت پر موت کی نیند سلا نا ہے۔ تمہاری صوبہ کرناٹک میں بڑی دھماک ہے۔ تم سے نہ صرف بڑے بڑے خطرناک بد معاش کا پتہ ہے بلکہ پولیس بھی..... میں تمہیں یہ رقم پیشگی ارسال کر رہا ہوں۔ میں تمہارے کارناموں سے واقف ہوں۔ تم اب تک تین آدمیوں کو قتل کر چکے ہو..... سولہ لڑکیوں عورتوں کی

آہروریزی..... اس کے بارہ عدد ڈکیتی اور رہزنی کی وارداتیں اسی طرح تمہارے پاس دولت کی کی نہیں ہے۔

میں نے بنگلور کے دو خطرناک بد معاش چندر اور میٹھ کی خدمات حاصل کیں۔ انہیں تیس ہزار روپے بھی دینے کا ٹائیگر کو قتل کروں۔ لیکن درمیان میں وہ الو کی بھی کیتا دیوی آگئی۔ وہ ڈھال بن گئی۔ میں نے ان حرام زادوں سے کہا تھا کہ درمیان میں عورت، بچہ اور بوڑھا ہی کیوں نہ آئے اسے اڑا دو۔ لیکن وہ ٹائیگر کا بال تک بیکا نہ کر سکے۔ لیکن تم ایسا نہ کرنا۔ ٹائیگر کو قتل کرنے کی صورت میں تمہیں دو لاکھ روپے انعام دیں گے۔ نیچے نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد ٹائیگر کو اس بات سے خوشی ہوئی تھی کہ اس نے جس بد معاش مہی پال کا حشر نشر کیا اس کی یہی سزا تھی۔ یوں بھی اس نے اس بد معاش کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ہوش میں آئے۔ ہوش میں آجھی گیا تو وہ کسی قابل نہیں رہے گا۔ اس خط سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شیطان اس سے بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔

ٹائیگر کو سوچتے سوچتے کہ اس شیطان کے علاقے کا کیسے پتا چلائے اچانک اسے روندنا کا خیال آیا بومسور جنگل میں گائیڈ تھا۔

ٹائیگر کو اس کا خیال آتے ہی اس نے روندنا کے ہاں جانے اور اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ اتفاق سے آج آوار کا دن تھا۔ روندنا چوں کہ بیس برس سے گائیڈ تھا اس کی معلومات اور تجربہ جتنا تھا کسی اور کو شاید ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے منج روندنا کے ہاں جانے سے سوا سلف اور پل خریدے اور گھر جا پہنچا۔

جب اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی تو دروازہ نہیں کھلا..... البتہ اس نے گھر کے اندر کمر پھسر کی آواز سنی..... اس نے وقفے وقفے سے دو مرتبہ دستک دی..... اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دروازہ کھلنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟

پھر اس نے چند لمحوں کے بعد دروازے پر دستک دیتے ہوئے آواز دی۔ ”روندا چچا..... میں ہوں۔ وسیم احمد.....“

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا تو اس کی بیوی سادھنا کا چہرہ نمودار ہوا..... سادھنا بھی بڑی خوب صورت تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں کی ماں نہیں بڑی بہن دکھائی دیتی تھی..... اس کی عمر چالیس برس کی تھی۔ لیکن چہرے پر متناسب بدن کی وجہ سے اس پر کسی دوشیزہ کا دھوکا ہوتا تھا۔ چہرے پر بڑی تازگی اور شادابی بھی تھی۔

لیکن اب اس وقت وہ اپنی عمر سے دس بارہ برس بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بڑی با حوصلہ عورت تھی۔ حالات کا پامردی سے مقابلہ کر رہی تھی۔ وہ اور اس کی لڑکیوں کی شادی بیاہ کے لئے جہیز جمع ہو..... سادھنا کسی مر جھائے ہوئے بھول کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سرتھی تھی۔ نہ شادابی..... وہ رخصت ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں ویران تھیں اور کنائیوں میں آنسو بھرے بھرے تھے۔ وہ اسے دشت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے زور سے چوکی اور حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

”وسیم بھیا! آپ.....“ اس کی زبان حیرت اور خوشی سے لڑکھرائی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔

”جی چاچی.....!“ ٹائیگر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کیا بات ہے.....؟ آپ لوگ اس قدر ہراساں، پریشان اور خوف زدہ کیوں ہیں کہ تین چار دروازے پر دستک دینے کے باوجود دروازہ نہیں کھلا..... کیا غنڈے بد معاش آپ کی لڑکیوں کو اٹھانے کے لئے گھر میں گھنے والے تو نہیں تھے.....؟“

”نہیں..... نہیں.....“ سادھنا نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ ”اندر آئیں تو میں آپ کو بتاتی ہوں۔“

جب وہ اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ لڑکا دو رتیوں لڑکیاں ایک طرف سہی کھڑی ہوئی ہیں۔ ان



کے چہرے لے ہو ہو رہے تھے۔ آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے اسے دیکھا ان کی جیسے جان میں جان آئی۔

”انکل!.....! سب سے بڑی لڑکی بولی۔“ اس وقت آپ نے یہاں آ کر بڑی کرپاکی..... میں بتائیں سکتی کہ آپ کے آنے سے ہمیں ایک نئی شہتی اور زندگی ملی ہے۔“ اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ دوسری لڑکیاں بھی جذباتی ہو گئیں۔

ٹائیگر نے سادھنا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”کیا بات ہے۔ مجھے بتائیں چاچی!.....! روندا چچا کہاں ہیں؟“

وہ قریب آ کر اس کے کانوں میں سرگوشی سے آہستگی سے بولی۔ ”وہ اندر ہیں..... ان کی جان کو خطرہ ہے۔“

”کس سے.....؟“ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

”شیطان سے.....“

”شیطان سے؟..... میں سمجھا نہیں..... شیطان کون ہے! کہاں ہے؟“

”تمہارے چاچا ہی تمہیں بتائیں گے کہ شیطان کون ہے۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا تو اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ ”دوباروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

”گھبرانے اور خوف زدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں.....“ ٹائیگر نے جیب سے ریوا اور نکال لیا۔ ”شیطان آئے یا اس کا باپ..... میں اسے بھون دوں گا۔“ آپ لوگوں پر آنچ نہیں آئے گی۔“

”مجھلی لڑکی دوڑ کر اس کے سینے سے آگلی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو ٹائیگر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”میری چھوٹی بہن!.....! روروتی کیوں ہو؟ میں نے کہا نا کہ وہ تم میں سے کسی کا بال تک بکا نہیں کر سکتا۔ تمہارے پتا جی کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ تم

سب کی رکھشا بھگوان کرے گا۔“ ٹائیگر نے دلاسا دیا۔ پھر اس نے سودا سلف اور پھل کے تحیلے سادھنا کی طرف بڑھایا۔

”آپ لوگوں کے فقی چہروں سے ایسا لگ رہا ہے کہ کئی دنوں سے کھانا پینا چھوٹ چکا ہے۔ بھوک پیاس مر گئی ہے..... چولہا ٹھنڈا رہنے لگا ہے۔ اب آپ غم، فکر اور خوف بالکل چھوڑ دیں۔ اب آپ سہارا اور لاوارث نہیں رہے۔ آپ لوگ جلدی سے پہلے تو ناشتہ اور چائے بنائیں۔ میں دودھ، انڈے، ڈبل روٹی، چائے پتی، چھینی اور ضرورت کی چیزیں لایا ہوں۔ تیل اور گھی بھی ہے..... چاول اور آٹا بھی..... پھل بھی..... کسی چیز کی ضرورت اور کمی رہ گئی ہے تو وہ منگوائیں.....“ اس نے بیوے میں سے سوسو کے دس نوٹ نکال کر سادھنا کی طرف بڑھائے۔

سادھنا نے اس کے ہاتھ سے رقم نہیں لی۔ وہ جذباتی ہو کر منہ پر بلور رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ لڑکیاں بھی ماں کو دیکھ کر رونے لگی تھیں۔ اس نے بڑی لڑکی رتنی کے پاس جا کر اس کے ہاتھ میں نوٹ دیئے۔

”رتنی بہن!.....! تمہاری ماں بہت زیادہ خوف زدہ اور پریشان ہے۔ لہذا تم ناشتا تیار کرو اور کھانا بھی..... ہم سب ایک ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کریں گے۔ دوپہر کا کھانا بھی..... میں اس وقت تک یہاں موجود رہوں گا۔ جب تک اطمینان و سکون نہیں ہو جاتا..... میں تمہارے پتا جی سے ملنے اندر جا رہا ہوں۔“

وہ اپنی بات کا رد عمل دیکھنے کے لئے نہیں رکھا۔ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا۔ روندا چارپائی پر خوف زدہ حالت میں لیٹا ہوا اس کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ قدرے پرسکون اور اطمینان بخش سا نظر آیا۔ اس کے پیچھے سادھنا آ کر بولی۔

”ناشتے میں دیر ہے..... میں پہلے چائے بنا لاتی ہوں۔“

روندا اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں رکھی کرسی سادھنا

چارپائی کے پاس رکھ کر چلی گئی۔ ٹائیگر نے اسے ہاندانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ صرف گائیڈ ہی نہیں ایک طرح سے شکاری بھی تھا..... دراز قد..... مضبوط کمرتی جسم کا مالک..... وجہ یہ بھی..... ایک شیر کی مانند..... صرف ایک ڈیڑھ برس کے عرصے میں ایک بوڑھے شیر کی طرح لگ رہا تھا۔ ڈھلک گیا تھا۔

وہ ٹائیگر کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چومنے اور آنکھوں سے لگانے لگا اور بولا۔

”بیٹا!.....! تم اتنا رہن کر آئے ہو..... مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں کوئی پینا دیکھ رہا ہوں..... میری زندگی نہ صرف خطرے میں ہے بلکہ میری پتی اور بیٹیوں لڑکیاں اور لڑکے بھی.....“

”کس سے.....؟“ ٹائیگر نے حیرت سے پوچھا۔ ”چاچی کس شیطان کے بارے میں کہہ رہی تھیں..... وہ شیطان کون ہے.....؟“

”یہ وہی شیطان ہے..... درندہ مفت..... جس کی درندگی اور شیطانی انسانیہ کے لئے بدترین داغ بن چکی ہے..... نہ صرف حسین و جمیل لڑکیاں عورتیں..... نوجوان لڑکے مرد..... ملکی غیر ملکی سیاح مرد اور عورتیں اغوا کر کے ریغمال بنائے جا رہی ہیں..... میں اس شیطان کی قید میں دو ماہ رہا ہوں..... میں ایک ہفتہ قبل اس کی قید سے فرار ہوا ہوں..... میرے تعاقب میں اس کے غنڈے بد معاش اور خون خوار کتے بھی لگے ہوئے تھے..... اپنی جان بچاتا کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوا ہوں..... رات کے دو بجے پہنچا ہوں..... اس نے میری رہائی کے لئے ایک شرط رکھی تھی میں لڑکیوں کو اس کے حوالے کر دوں..... ورنہ میرے آدمی انہیں اغوا کر کے لے آئیں گے..... دنیا کی کوئی طاقت انہیں بچا نہیں سکتی.....

روندا نے سانس لینے کے لئے توقف کیا۔ سادھنا چائے اور بسکٹ لاکر رکھ گئی۔ جب وہ چلی گئی تو ٹائیگر نے پوچھا۔

”یہ جنگل میں کہاں رہتا ہے..... اس کی سکونت

کا آج تک پتا نہیں چل سکا کوئی کھوج نہیں لگا سکا۔“ ”مجھے بھی اس کا علم بالکل نہ تھا۔ حالاں کہ میں بیس برس سے اس جنگل میں گائیڈ ہوں اور اس کے چپے سے واقف ہوں..... لیکن یہ جنگل سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا نہ صرف گنجان بلکہ تاریک اور چاروں سمتوں تک ہے..... اتفاق سے مجھے کبھی اس جزیرے پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا جو جنوب کی مغربی سمت واقع ہے۔ وہ جزیرہ گھنے درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب مجھے قید کر کے لے جایا گیا..... اس جزیرے کا علم شاید ہی کسی کو ہو..... ایک بہت بڑی حویلی اور ایک شان دار اور وسیع و عریض کھوٹی بھی ہے..... مجھے جس حصے میں قید کیا ہوا تھا وہاں سے اس لئے نکل کر فرار نہیں ہو سکا تھا کہ خون خوار شکاری کتے دن رات پہرہ دیتے ہیں..... صرف وہی آمد و رفت کر سکتا ہے جن کے پاس شیطان کا دیا ہوا ایک چری نشان ہو..... اس سے ایک ایسی خوشبو پھوٹی ہے اور وہ نشان دن رات میں ایسا چمکتا ہے کہ کتے دیکھ کر ڈرنا تک بھول جاتے ہیں۔ اس کی روک ٹوک نہیں کرتے ہیں۔ وہ کہیں بھی آ جا سکتا ہے..... یہ خون خوار کتے جو جسامت میں گینڈے نما ہیں تربیت یافتہ ہیں۔

اس حویلی میں ایک جدید ترین فلم اسٹوڈیو بنا ہوا ہے۔ ایک کمرے میں میں نے سو سے زائد طاقت ور اور جدید ترین قسم کے جزیئر دیکھے..... وہاں کسی کو بھی سگریٹ پینے اور دیا سلائی اور لائٹر رکھنے کی اجازت نہیں..... اس کے آدمی جو تمباکو نوشی کے عادی ہیں وہ ایک مخصوص کمرے میں آ کر کر سکتے ہیں..... اس کے علاوہ نہ صرف خفیہ کمرے بھی نصب ہیں اور ٹی وی سیٹ بھی آن ہیں۔ وہاں میری عمر کے دو آدمی تھے جنہیں رنگا پٹم سے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ ہم بیٹیوں کا کام اسٹوڈیو میں صفائی اور لائٹنگ درست کرنا ہوتا تھا..... تقریباً روز ہی ممنوعہ فلم کی شوٹنگ ہوتی تھی..... تیرہ چودہ اور سولہ برس کی لڑکیاں اور جو اس سال عورتیں بھی ان فلموں کا کردار



شدت غم سے مری ہر سانس بوجھل ہوگی  
اس قدر لئے کی تم سے آرزو کل ہوگی  
(آستر.....کراچی)

پیاس وہ تھی، کہ ”سمندر“ سے بھی نہ بجھے پانی  
اور وہ تھا، کہ اک ”قطرہ“ بھی نہ دیتا تھا  
خود ہی مائل تھا، اپنے بھی درمیان وہ دعا  
کسی اور سمت جانے کا رستہ بھی نہ دیتا تھا  
(سائل دعابخاری.....بصیرپورا کاٹھہ)

اے میرے احساس جنوں کیا مجھے دینا  
دریا اے بخشا ہے صحرا مجھے دینا  
اک درد کا میلہ کہ لگا ہے دل و جاں میں  
اک روح کی آواز کو رستہ مجھے دینا ہے  
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالیار)

ہوئی شام تو آنکھوں میں بس گیا تو  
کہاں گیا ہے میرے شہر کے مسافر تو  
میں جانتا ہوں کہ دنیا تجھے بدل دے گی  
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بظاہر تو  
(مونا جاوید.....حیدرآباد)

رسم سجدہ بھی اٹھا دی ہم نے  
عظمت عشق بڑھادی ہم نے  
دل کو آنے لگا بسنے کا خیال  
آگ جب گھر کو لگا دنی ہم نے  
(فائزہ.....کراچی)

میری آوارگی لوگو نہیں بے جا قسم لے لو  
اگر تم دیکھتے اس کو، تو میرے ہم قدم ہوتے  
(عاقب بشیر.....لاہور)

شا ہے ریت پہ چل کے تم اکثر مسکراتے ہو  
کہو تو اب کی بار میں زمیں گی دھول بن جاؤں  
(محمد علی.....لاہور)

اسے کہنا کہ جفت اور طارق کا نہیں ہم سے واسطہ کوئی  
ہمیں تو جب بھی لگی صرف لگی، بس تقسیم ہوئے  
(احمد علی.....لاہور)

☆☆

## قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

ہوٹوں کی مسکراہٹ بنوں یا فقط دعا ہو جاؤں  
بھی تو میں بھی تیرے ہوٹوں سے یونہی ادا ہو جاؤں  
بھی دل کرے تو ڈھونڈ لینا آواز دے کر مجھے جاناں  
یونہی بے خیالی میں اگر تم سے میں دور ہو جاؤں  
(مریم ماہ منیر.....لاہور)

ہم تو سمجھے تھے دل گلی ہوگی  
اس کو الفت نہیں کبھی ہوگی  
کیا سے کیا ہو گیا ہے پل بھر میں  
اب تو ہر حال میں خوشی ہوگی  
(واجد گیلانی.....کراچی)

تیری نظروں کے تیروں نے میرے دل کو گھائل کر دیا  
کچھ کہہ نہ سکا تجھ کو تیری قربت نے پاگل کر دیا  
(عثمان غنی.....پشاور)

جس سے بندھے تھے دونوں وہ غم نہیں رہے ہیں  
تم نہیں رہے ہو، ہم نہیں رہے ہیں  
فکر معاش نے تو جذبوں کو روند ڈالا  
ناش و گرنہ ہم بھی کچھ کم نہیں رہے ہیں  
(رابعہ باسط مظہر.....گوبرخان)

مجھ سے بچ کر خوش رہتے ہو میری طرح سے تم جھوٹے ہو  
اک ٹہنی پر چاند نکلا تھا میں یہ سمجھا تم بیٹھے ہو  
مجھ کو شام بتا دیتی ہے تم کیسے کپڑے پہنے ہو سحر  
تم تھا دنیا سے لڑو گے بچوں سی باتیں کرتے ہو  
(احسان سحر.....میانوالی)

میں تیرے ہر بات ادھوری لگتی ہے  
میں تیرے برسات ادھوری لگتی ہے  
میں جاناں ہو جب بھی تیری یادوں میں  
مجھ کو میری ذات ادھوری لگتی ہے  
(بلقیس خان.....پشاور)

حیرت اور خوشی سے میرا برا حال تھا..... فرار ہونے کا  
سنہرا موقع تھا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ یہ تو میں نے  
دیکھا تھا کہ ندی کنارے موٹر بولٹ وغیرہ ہوتی تھیں۔  
پھر میں ندی کنارے جانے کے لئے راہ داری سے  
گزر رہا تھا کہ ایک سنوائی چیخ سنی راہ داری میں اندھرا  
تھا..... کمرے میں اتنی روشنی ہو رہی تھی کہ اندر کا ذرہ  
ذره دکھائی دیتا تھا۔ بستر پر میں نے اس شیطان کو ایک  
چودہ برس کی لڑکی کے ساتھ دیکھا۔ آخر اس بھیرے  
نے درندگی سے اس پر چڑ پالی۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔  
پھر اس نے خنجر اٹھا کر اس کو بے ہوشی میں دیکھ کر اس  
کے سینے پر اس کی نوک سے سینے سے لے کر ناف تک  
ایک گہر ڈالی..... جب اس زخم سے خون رسنے لگا تو  
اسے سینے اور چائے لگا۔ پھر اس نے یک لخت اس کی  
نبض دیکھی اور بڑبڑایا..... ”ارے..... یہ تو مر گئی.....  
بے ہوشی کی حالت ہی میں..... اس لئے اس کا کرم  
گرم خون سرد ہونے لگا..... اس کا گوشت کیسا نرم اور  
ملائم ہے۔“

پھر اس نے اس لڑکی کو بازوؤں میں اٹھالیا.....  
پھر اسے لے کر کمرے سے باہر آیا۔ اور پھر ایک  
دوسرے کمرے میں کھس گیا، اس کمرے میں بھی روشنی  
ہو رہی تھی۔

میں ایک ستون کی آڑ میں چھپ گیا تھا اس لئے  
اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ جب میں آگے بڑھنے  
لگا تو معا میری نگاہ میز پر پڑی جس میں ایک پھولا ہوا  
بٹا اور دو بڑا ڈانگھٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جانے مجھے کیا  
خیال آیا..... ہمت آئی کہ میں نے اسے اٹھالیا۔ مجھے  
اس کمرے کے سامنے سے گزرا پڑا۔ جس میں وہ لڑکی  
کی لاش لے کر گھسا تھا۔ میں نے اس کمرے کے  
سامنے جو ستون تھا۔ اس کے عقب میں کھڑے ہو کر  
جھانکا۔ میری رگوں میں خون نجد ہو گیا۔ وہ مدح خانہ  
تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ لڑکی کا سر فرش پر گرا  
ہوا تھا۔ اس نے اس لڑکی کو زنج کر دیا تھا۔  
(جاری ہے)

بقی تھیں..... کم سن اور نوجوان عمر کی معصوم لڑکیاں جب  
ہدایت کار کی بات نہیں مانتی تھیں جبر و زیادتی سے عکس  
بندی کی جاتی تھیں..... وہ شیطان بھی شوٹنگ پر موجود  
ہوتا تھا..... ان فلوں کے مرد و کردار حیوانوں کی طرح  
تھے جنہیں دیکھ کر لڑکیاں کانپ جاتی تھیں۔ ان کے  
لئے فرار کی راہ نہیں ہوتی تھی۔

ایک اور بات جو میرے علم میں آئی تھی وہ یہ کہ  
میسور کے جتنے بھی اسپتال تھے..... سرکاری بھی.....  
لاوارث مردوں کو مردہ خانوں سے لایا جاتا تھا..... جو  
سڑکوں پر حادثے کی نذر ہو کر موت کے منہ میں چلے  
جاتے تھے وہ پراسرار طور پر عائب ہو کر یہاں پہنچ جاتے  
تھے..... اس کے علاوہ جو بارش، طوفان اور سیلاب سے  
مرنے والوں کو بھی.....

اس نے حویلی کے ایک سرے پر مردہ خانہ بنا  
رکھا ہے..... یہ مردہ خانہ ایئر کنڈیشن ہے۔ وہ ان  
مردوں کا کیا کرتا ہے علم نہ ہو سکا..... نہ میں نے اس  
بات کی کوشش کی..... نہ تو مجھے منوعہ فلوں کی عکس بندی  
سے کوئی دلچسپی تھی نہ لڑکیوں اور عورتوں سے..... میں تو  
وہاں فرار ہونے کے لئے منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس تاک  
میں تھا کہ وہ منقش چرمی بیج کسی طرح حاصل کروں۔  
اس کا حصول آسان نہیں تھا۔

وہ بظاہر ایک مہذب انسان دکھائی دیتا تھا.....  
اسے کوئی شیطان کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کی  
باتوں سے اندازہ لگانا مشکل تھا۔ جب اس نے بھی  
پال کے سامنے میری رہائی کی شرط رکھی کہ میں اپنی  
لڑکیوں کو اس کے حوالے کر دوں ورنہ یہی پال اور اس  
کے آدمی انہیں اغوا کر کے لے آئیں گے تو میری نیند  
حرام ہو گئی۔

دوسرے دن اتفاق سے شوٹنگ سے واپس  
آتے سے بھگوان نے میرے حال پر ترس کھایا۔  
میرے پیر سے فرش پر گر گئی کوئی چیز لگائی۔ میں نے  
جھک کر دیکھا۔ وہ منقش چرمی بیج تھا۔ جانے کس کا  
تھا..... کسی کا بھی تھا مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔





مگر ہماری تمنا کو مر ہی جانا تھا  
(رانا حنیف عاطر.....جھوٹو)

ساحل دل سے یادوں کی کشتیاں بھی لے جانا  
ملن کی خوشیاں فرقت کی تلخیاں بھی ساتھ لے جانا  
وہ رنگ و بو اور سندیے جو قید ہیں کتابوں میں  
وہ خط وہ گلاب اور وہ تلیاں بھی لے جانا  
تیری پلکوں پہ چمکتے ستارے اور ان آنکھوں میں چھلکی  
ٹوٹے ہوئے سینوں کی کرجیاں بھی لے جانا  
سانسوں میں بس گئی ہیں جو لبو میں رچ گئی ہیں  
رگ و جاں میں پٹی یہ ویرانیاں بھی لے جانا  
تیرے غم میں پٹی ہوئی یہ اداسیوں پہروں اداس رکتی ہے  
دکھ درد کی وہ سبھی نشانیاں بھی لے جانا  
تمہارے جھوٹے سہارے کہیں اور مغرور نہ کر دیں مجھے  
لفظوں کی یہ ناتواں سی بیساکھیاں بھی لے جانا  
(انتخاب: نوشین خان.....کوٹ مظفر-ملی)

اب جو درد ہوا ہے تو احساس ہوا ہے ہم کو  
کہ وہ شخص میرے دل کے قریب کتنا تھا.....  
جو وہ کہتا تھا وہی عکس ابھرتا تھا اس میں  
میرے دل کا آئینہ بھی عجیب کتنا تھا.....!  
اس کی آنکھوں میں دھنک رنگ خواب تلے جس کے  
وہ شخص بھی لوگو! خوش نصیب کتنا تھا  
شب بھر کٹی، اپنی تو..... تارے گنتے.....  
اس کے پہلو میں خوش، رقیب کتنا تھا  
جب اس نے مجھے چھوڑا تو دل میں اتر آیا سکوت مرگ  
روح میں جو پھیلا تھا، سناٹا حبیب کتنا تھا  
ہر دعا فلک سے، بے نیل و مرام لوٹ آئی تھی دعا  
نصیب بھی اپنا اس شب بد نصیب کتنا تھا  
(ساحل دعا بخاری.....بصیر پور-اداکاؤہ)

مجھے یاد رکھو گے یا تم بھلا دو گے؟  
اس جرم محبت کی بولو کیا سزا دو گے؟

لے کر آئے ہیں دامن میں امید کے گلاب  
کیا تم ان سب گلابوں کو جلا دو گے؟  
خون جگر سے لائے ہیں چہرے پہ نکھار  
کیا میری ہر نگاہ کو آج تم بھلا دو گے؟  
تمہارا دل تو در حقیقت گھر ہے ہمارا  
اب ہمارے گھر میں کسی اور کو بسا دو گے؟  
(اقصی رباب.....فیصل آباد)

دن ہی نہیں اہل روح بھی مرا کرتے ہیں  
فرخون کے گھر میں موسیٰ بھی پلا کرتے ہیں  
بن جاتے ہیں جو الاؤ میں مشل کوہ  
برسات میں اکثر وہی گھر جلا کرتے ہیں  
ہاتھ نہیں پھیلاتے جو سفید پوش  
بدلے میں بھیک کے وہ موت لیا کرتے ہیں  
وہ قطرہ نہ سنبھالا جا سکا تم سے  
دیرا آنسوؤں کا ہم پیا کرتے ہیں  
(انوری رمضان.....پنڈ دادخان)

آج پھر اس کی یاد آئی ابھی ابھی  
دل پھر بے قرار ہوا ابھی ابھی  
اپنا تو سب کچھ لٹا چکے ہیں ہم  
لے وہ بھی سر بازار ابھی ابھی  
جوں عشق کی بات نہ کرے کوئی  
جس بیک سرکار ابھی ابھی  
وہ جو ہمیں زخم دے چکے تھے  
ہو کے کامل آئے ہیں ابھی ابھی  
یادوں کے پھول سوکھ چکے ہیں فارسیہ  
انگلیوں سے آب کئے ابھی ابھی  
(فارسیہ تبسم.....ٹھیک موڈ تصور)

تمہارا نام کچھ ایسے میرے ہونٹوں پہ کھتا ہے  
اندھیری رات میں چھپے  
اچانک چاند بادل کے کسی کونے سے باہر چھانکتا ہے

اور سارے منظروں میں روشنی پھیل جاتی ہے  
کلی، جیسے لرزتی اوس کے قطرے پہن کر سکر جاتی ہے  
تو خوشبو باغ کی دیوار سے روکے نہیں رکتی  
اسی خوشبو کے دھاگے سے مرا ہر چاک سلتا ہے  
تمہارے نام کا تار امری سانسوں میں کھتا ہے  
تمہیں میں دیکھتا ہوں جب سفر کی شام سے پہلے  
کسی موسم کے دامن میں کسی خواہش کے پہلو میں!  
تو اس خوش رنگ منظر میں تمہاری یاد کا راستہ

نجانے کس طرف سے پھونٹا ہے  
اور پھر ایسے مری ہر راہ، کے ہم راہ چلتا ہے  
کہ آنکھوں میں ستارے کی گزر گاہیں بنتی ہیں  
دھنک کی لکھنیاں سی  
تمہارے نام کی ان خوشنما حرفوں میں دھلتی ہیں  
(انتخاب: نایک محمد عظیم رضوی.....کھاریاں)

آج کچھ سنبھلے سے دل کی حالت عجیب ہے  
غمگین ہے طبیعت دل رنگ و چاہت عجیب ہے  
اس کی باتیں اس کی آنکھیں بدل رہی ہیں  
لگ رہا ہے شب بھر قریب ہے  
توڑ کر قسمیں وہ بدل رہا ہے نگاہیں  
میں سمجھ گیا اب اس کے پاس رقیب ہے  
بھلا کر مجھے اب رہتا ہے وہ اب خوش  
اور مجھے وہ فرض دیا جس کا نہ کوئی طیب ہے  
مسلل میرے دل پر غم یار کے ستم ہیں  
یوں لگتا ہے، احسان کہ اب میری موت قریب ہے  
(احسان سحر.....زادے خیلانوالہ)

تعلق ٹوٹ جائے گا میرا سارے زمانے سے  
میرے اپنے خفا ہوں گے تجھے اپنا بنانے سے  
تمہارے ساتھ رہنے سے مجھے تسکین ملتی تھی  
بہت تکلیف ہوتی ہے تمہارے دور جانے سے  
میرے گھر کو جلا دینا مگر یہ ذہن میں رکھنا  
اجالا مل نہیں سکتا کسی کا گھر جلانے سے

ایک ذرا سی بات پر انگوٹوں کا وہ چھاگل نکلا  
کیا کہیں کسی کو یہ دل بھی کتنا پاگل نکلا  
چار سو پچھل گئی تھی ایک بات کہ جب  
جھونکا ہوا کا خوشبو کے مقابل نکلا  
بے اختیار کہی تھی وہ حسیں مسکراہٹ پہ لیکن  
زبان سے کھلتا ہر پھول داد کے قابل نکلا  
چاہا تھا حنائی رنگ سجالیں ہاتھوں پر مگر  
میری پوروں پہ میری آنکھوں کا کاجل نکلا  
پیڑ جو میں نے چٹا کڑی دھوپ میں سائے کے لئے  
موسموں کے عذابوں کا وہ گھائل نکلا  
تمنا تھی تیرے ساتھ موج موج لہرانے کی  
میرا وہ خواب تو بس ریت کا ساحل نکلا  
سوئے دیئے تھے سارے اختیار جسے میں نے  
وہی ہاتھ میرے ارمانوں کا قاتل نکلا  
واچا! وہ جسے ناز تھا اپنی خود داری پہ بہت  
ہاتھ میں کاسہ لئے درد کا وہ مائل نکلا  
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گینوی.....کراچی)

سنور گیا تو مقدر سنور ہی جانا ہے  
غموں کا قرض کسی دن اتر ہی جانا ہے  
ملاں کرتے بھی آخر تو کس لئے کرتے  
یہ دل بصورت شیشہ بکھر ہی جانا ہے  
ہماری دوستی صدیوں پرانی دھوپ سے تھی  
گلاب بن کے ہمیں تو نکھر ہی جانا تھا  
شہر میں ڈھونڈتا رہتا وہ لوکری کب تک  
اسے تو لوٹ کے مایوس گھر ہی جانا تھا  
وہ فاصلوں میں کہیں بھی نظر نہیں آیا  
اسے تو مجھ کو پریشان کر ہی جانا تھا  
خیال شاخ کنول پر ہے تازگی عاطر



ہماری جان جائے گی تو پھر یہ جان جاؤ گے  
کہ حاصل کچھ نہیں ہوتا کسی کا دل دکھانے سے  
(غائب بشیر..... لاہور)

جو تجھے پسند آئے جو تیرے قریب ہو  
یارب کوئی تو ایسا سجدہ نصیب ہو  
یہ معجزہ بھی دیکھوں گے تیرا ہو کرم  
میری شفاعت کو کھڑا تیرا حبیب ہو  
اس راہ اطاعت میں یہ مرتبہ عطا کر  
ہو تیرا جو رقیب وہی میرا رقیب ہو  
جب تک یہاں رہوں حمد و ثناء لکھتا رہوں  
پھر کے اور مدینے میں پڑھنا نصیب ہو  
(الس اتیاز احمد..... کراچی)

سنبھال رکھا تھا جن کو دل میں خزیوں کی طرح  
ڈبو گئے جاتے ہوئے دل ناتواں وہ سنیوں کی طرح  
رات ساری وہ بن کے پٹنا رہا مرے ساتھ ساتھ  
روشن کیا ہوئی چھپ گیا پردہ نشینوں کی طرح  
سیلاب درد گزر ہی جاتے ہیں مگر بعد اس کے  
رہ جاتی ہے غلش کوچہ جاناں میں یکینوں کی طرح  
چیمپئیں جو کبھی مست ہوائیں تیرے ریشی آجکل کو  
تو زلف لہزائے گالوں پہ ترے نازینوں کی طرح  
اے عہد وفا کی ڈھلتی بجھتی بے رنگ سی شام  
تو کبھی حسین تھی نگاہوں میں مری ماہ جبینوں کی طرح  
تم ہونا کے خمار میں تو ہم حجابوں کے حصار میں  
دونوں ہیں اپنے عہد پر پختہ عازمینوں کی طرح  
ہم نے جو کیں بے گئی سی حرکتیں بے ارادہ سی گفتگو  
کر گئیں روشن دل صحرا وہ آب گیسوں کی طرح  
(عصمت اقبال..... منگل ڈیم)

بات جو دل کی سنو گے تو ہار جاؤ گے  
ہم جیسا چاہنے والا پھر کہاں سے لاؤ گے  
جان دینے کی بات تو ہر کوئی کرتا ہے

زندگی بنانے والا کہاں سے لاؤ گے  
جو اک نظر دیکھو گے تم ہمیں  
تو ہر طرف صرف ہم ہی کو پاؤ گے  
یقین اپنی محبت پہ اتنا ہے مجھے  
میری چاہت کو دیکھو گے تو لوٹ آؤ گے  
میری آنکھوں کے سمندر میں ڈوب جاؤ گے  
تم کہیں جانا بھی چاہو تو جا نہ پاؤ گے  
(نورین اعظم..... راولپنڈی)

خود اپنے لئے بیٹھ کے سوچیں گے کسی دن  
یوں ہے کہ تجھے بھول کے دیکھیں گے کسی دن  
بھٹکے ہوئے پھرتے ہیں کئی لفظ جو دل میں  
دنیا نے دیا وقت تو لکھیں گے کسی دن  
اے جان تیری یاد کے بے نام پرندے  
شاخوں پہ تیرے درد کے اتریں گے کسی دن  
جانی ہے جمیل کی گہرائی کہاں تک  
آنکھوں میں تیری ڈوب کے دیکھیں گے کسی دن  
خوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے  
ایک نظم تیرے واسطے لکھیں گے کسی دن  
سوئیں گے تیری آنکھ کی صورت میں کسی رات  
سائے میں تیری زلف کے جاگیں گے کسی دن  
(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالہار)

بے وفاؤں سے دل لگانا مجھے اچھا نہیں لگتا  
ہر بات پر کرنا بہانہ مجھے اچھا نہیں لگتا  
پہلے تو کہہ کر اپنا دل جیت لینا اس کا  
پھر کہہ کر بیگانہ مجھے اچھا نہیں لگتا  
وعدہ کر کے جانا کہ میں واپس آؤں گا  
بعد جانے کے واپس نہ آنا مجھے اچھا نہیں لگتا  
یہ دنیا دیکھ نہیں سکتی دو دوستوں کو نوری  
اس لئے تو کہتا ہوں کہ زمانہ مجھے اچھا نہیں لگتا  
(غلام نبی نوری..... کھڈیاں خاص)

☆☆

نظرؤں کے بیچ  
جھپٹیں تلاش کرتا  
مشکل تو ہے

پرہیز نہیں ہے  
زندگی کی اندھیرا راتوں میں  
روشنی کی خواہش کرنا  
پت جھڑکے موسم میں  
امید بہار کھنا  
دشمنوں کے جھڑمٹ میں  
روشنی کی تلاش کرنا  
مشکل تو ہے

پرہیز نہیں ہے

(مریم ماہ نمبر..... لاہور)

دکھ نہ ہوتے تو مر گئے ہوتے  
ہم نہ روتے تو مر گئے ہوتے  
شب گزاری ہے آسمان تلے  
گھر جو ہوتا تو گھر گئے ہوتے  
حق کا پرچم اگر اٹھا لیتے  
کتنے لوگوں کے سر گئے ہوتے  
دشمنوں نے کیا کرم، ورنہ  
دار اپنے ہی کر گئے ہوتے  
پھر نہ ملتا سراغ اپنا ابھی  
حوصلے جب بکھر گئے ہوتے  
اوڑھ رکھا ہے بھوک کو ہم نے  
ورنہ فاقے سے مر گئے ہوتے

ساتھ دیتا جو ناخدا اپنا  
بار ہم بھی اتر گئے ہوتے  
جب اٹھاتا نقاب رخ سے وہ  
بھول سارے سنو گئے ہوتے  
دید ہوتی نہ گر حکیم اس کی  
غواب آنکھوں سے مر گئے ہوتے  
(حکیم خان حکیم..... کمال پور موٹی)

کون ہے جو غم سے دو چار نہیں  
دل ٹوٹ کے ریزہ ریزہ ہو گیا آخر

زندگی ریت کی دیوار نہیں  
نفرتیں ملتی ہیں دنیا میں ہمیں  
ایک ملتا ہی ہمیں پیار نہیں  
جو مرے گھر کو جلادے آکر  
(محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد)

میرا ایسا تو کوئی یار نہیں  
تیرے ملنے سے قرار آتا ہے  
دل کسی کا بھی طلب گار نہیں  
بات رانا ہے بچنے کی ایسی  
زندگی بچ ہے وفادار نہیں  
وقت جیسے.....  
سو گئے پتے پر جم سا  
گیا ہے.....

اور..... یہاں.....  
سوائے خالی پن کے  
کچھ بھی.....  
نہیں ہے.....  
(شفیق شبکی..... سیالکوٹ)

کل میرے گھر جو آیا چاند  
ایک سے کو ٹھہرا چاند  
درد کے گہرے دریا میں  
ڈوب نہ جائے میرا چاند  
تارو تم تو ٹھیک ٹھیک  
تم نے تو دیکھا ہوگا چاند  
جھانک رہی تھی سوچ میری  
کروں، کروں، رویا چاند  
سورج ہم کو چھوڑ گیا  
پیلے آگن، پیلا چاند  
گتے آنسو ساتھ گرے  
جب لکھا چاند  
آنکھیں پھٹکتی جاتی تھیں  
چاندنی بن کر اترا چاند  
ہم نے ساتھ قمر تیرے  
پہلی بار یہ دیکھا چاند  
(چوہدری قمر جہاں علی پوری..... ملتان)

☆ ☆



# ما فوق الفطرت

عمران قریشی - کونینہ

اسٹیڈیم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا، تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی کہ اچانک دونوں مدمقابل رنگ میں آگئے اور ایک دوسرے کو فتح پانے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لئے زور آزمائی شروع کردی کہ پھر اچانک ایسا ہوا کہ.....

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی اور جاندار، اشرف المخلوقات انسان پر سبقت لے سکتا ہے

**گزشتہ** کچھ دنوں کے دوران جانور نے دنیا کے مقبول ترین باکسروں زولو اور بیگٹر کو شکست دے دی۔ اب یہ نیویارک کے سب سے بڑے ہڈن ہال میں دنیا کے عجیب و غریب مقابلے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ کروڑوں پر مشتمل شائقین بلیک میں ٹکٹ خریدنے کو تیار ہیں۔ لیکن ہڈن ہال کا ٹکٹ دستیاب نہیں ہو رہا۔ گزشتہ کچھ دنوں کی چپقلش کیا رنگ لائی ہے۔ اس کے نتیجے کے لئے صرف ایک دن باقی رہ گیا ہے۔ کیا جانور انسان کو ہرا کر چیمپئن شپ کا اعزاز حاصل کر پائے گا۔ شاید ایسا ہو جائے اور اگر ایسا ہو گیا۔ تب اشرف المخلوقات کہلانے والے انسان پر ایک جانور سبقت حاصل کر لے گا۔ یاد رہے گزشتہ کچھ ایام کے دوران یہ جانور انسانوں پر سبقت حاصل کرتا چلا آیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کل چیمپئن شپ کا اعزاز رکھنے والے ہارڈی ڈوم کو ہرا پاتا ہے..... یا نہیں..... لیکن گزشتہ روز شائع ہونے والے انٹرویو میں ہارڈی ڈوم کچھ نروس دکھائی دیتا تھا۔ انٹرویو کے دوران متعدد بار اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور وہ جانور کے تذکرے پر جھنجھلا اٹھا۔ عوام جانور کو ما فوق الفطرت قرار دے رہی ہے۔ بلکہ ایک افریقی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جانور میں ڈمبا

دیوتا کی روح حلول کر گئی ہے اور اب انسانوں کو یقینی شکست سے ہمکنار کر دے گی۔ بہر کیف کل کے مقابلے سے پہلے مزید کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن مقابلہ یقیناً سنسنی خیز ثابت ہوگا۔ ہڈن ہال والوں کا کہنا ہے کہ ”آج سے پہلے بھی اتنی زیادہ تعداد میں کسی بھی مقابلے کے ٹکٹ فروخت نہیں ہوئے۔ یہ ریکارڈ سیل ہے۔ اس لئے مقابلے کا اہتمام بھی معیار کے مطابق ہوگا۔“

نیویارک ٹائمز 1970ء

یہ گدھانما جانور ایک پاکستانی نژاد جعفر کی تخلیق تھا۔ جعفر جسے عرف عام میں امریکی چیف کے نام سے پکارتے تھے۔ پچیس سالہ نوجوان تھا۔ اس کا باپ مسلمان جو کہ پاکستان کا رہنے والا تھا۔ جبکہ ماں افریقی تھی۔ اور اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ افریقہ کے ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں جعفر کی پرورش ہوئی۔ اس کا بوڑھا باپ چاول کی کاشت کا کام کرتا تھا۔ لیکن زمین کسی اور کی ہونے کی وجہ سے آمدنی محدود تھی۔ شادی سے پہلے جعفر کے باپ نے مختلف جگہ نوکری تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن شہریت نہ ہونے کے بدولت مقصد میں ناکام رہا۔ پھر اس کی ملاقات سیاہ فام





لڑکی ڈینی سے ہوئی۔ کچھ ہی ملاقاتوں کے بعد جعفر کے باپ نے جس کا نام جہانگیر تھا۔ ڈینی سے شادی کر لی اور اس کے آبائی ٹاؤن لوئی ٹاؤن شفٹ ہو گیا۔ جہاں جعفر کے علاوہ دو لڑکیاں سوئی اور یعنی پیدا ہوئیں۔ جانور کی تلاش کا آغاز کرنے سے پہلے یہ بتانا چلوں کہ کہانی کے کرداروں کے نام اور رہائی علاقوں کے نام مکمل طور پر تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔

بہر حال جانور کی تلاش کے دن آسان سیاہ بادلوں سے مکمل طور پر گھرا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بارش کی پیشن گوئی کر رہی تھی۔ جعفر اپنے ٹاؤن سے کچھ دور کھاد کی مختصر منڈی میں موجود تھا۔ اس کے پاس زمیندار کا ٹریکٹر کھڑا تھا۔ جس میں کھادی بوریاں دھری جا چکی تھیں۔ ٹریکٹر کے پیچھے مختصر ٹرالر بھی نصب تھا۔ بارش ہونے کے پیش نظر جعفر نے آنے سے پہلے بڑی سی تریال ٹرالر میں رکھ دی تھی۔ یہ احتیاط اب کام آ رہی تھی۔ اس نے کھادی رقم ادا کرنے کے بعد تریال کو کھاد کی بوریوں کے اوپر ڈال دیا۔ اور ٹریکٹر کی جانب چل دیا۔ ٹریکٹر کی سیٹ کے اوپر لوہے کی مختصر چھت بنی ہوئی تھی۔ اور سامنے کی جانب بارش سے بچنے کے لئے مختصر شیشہ بھی موجود تھا۔ بارش موسلا دھار انداز میں برسنے لگی۔ دور موجود پہاڑوں پر بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ لیکن جعفر مطمئن تھا۔ بارش اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ کھادی بوریوں کے اوپر تریال تھی ہوئی تھی۔ اور اس کی سیٹ کے اوپر لوہے کی چھت بنی ہوئی تھی۔ وہ بارش سے مکمل طور پر محفوظ تھا۔ ابھی وہ انکیشن میں چابی گھومانے نہیں پایا تھا کہ اچانک قریبی پرچون کی دکان سے اس کے ٹاؤن کا لڑکا نمودار ہوا۔ اس نے چلاتے ہوئے جعفر کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اور ہاتھوں میں موجود راشن کے تھیلے سنبھالے ہو اس کی جانب بھاگتا چلا آیا۔ جعفر نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ پھر انکیشن میں چابی گھما کر ٹریکٹر کو اسٹارٹ کر دیا۔ لڑکا قریب آچکا تھا۔ اس کا نام ڈونی تھا۔ بارش طوفانی انداز اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس مختصر بھاگ دوڑ

کے دوران ڈونی مکمل طور پر بھیگ گیا تھا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی جعفر سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم ٹاؤن واپس جا رہے ہو؟“ جعفر نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”تو اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کیا میں بھی تمہارے ہمراہ ٹاؤن کی جانب جاسکتا ہوں۔ بس ملنا ممکن نہیں ہے۔“ جعفر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے خوش اسلوبی کے ساتھ جواب دیا۔

”کیوں نہیں..... پیچھے ٹرالر میں بہت جگہ خالی پڑی ہے۔ تم ٹرالر کے اندر بیٹھ کر تریال کو اپنے اوپر اوڑھ لو۔ طوفانی بارش اور سرد ہوا تمہارا کچھ بھی نہیں لگاڑ سکے گی۔“ ڈونی نے مسنونانہ نگاہوں سے جعفر کی جانب دیکھا۔ پھر راشن کے تھیلے اٹھائے ٹرالر کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ ٹرالر کے اندر کھادی بوریوں کے درمیان کافی جگہ خالی پڑی تھی۔ اس نے کھادی بوریوں کو ترتیب دیا اور ان کے درمیان بننے والے مختصر جگہ کے درمیان اپنا سامان رکھ کر تریال کو اچھی طرح اوپر اوڑھ لیا۔ جعفر نے مسکراتے ہوئے ٹریکٹر کی گیسر ڈال کر کھڑک چھوڑ دیا۔ ٹریکٹر جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ کھادی منڈی سے لوئی ٹاؤن تک باقاعدہ سڑک موجود نہیں تھی۔ یہ سڑک کچی کچی تھی۔ بارش کی بدولت کچھڑے بھری جا رہی تھی۔ لیکن طاقتور ٹریکٹر کسی قسم کی دشواری کا ساما نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ سڑک پر ہلکی رفتار میں با آسانی آگے بڑھنے لگا۔ کھادی منڈی سے کچھ آگے مختصر گھروں اور دکانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ پھر میدانی علاقہ شروع ہوا اور اس کے بعد افریقہ کا گھنا جھنگل..... جنگل کے درمیان مختصر پگڈنڈی پر ٹریکٹر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بارش کی سائڈزوں سے پڑنے والی پھوار سے جعفر کو سردی کا احساس ستانے لگا۔ اس نے ٹریکٹر کی رفتار کو آہستہ کیا۔ پھر نیچے موجود سیٹ پر سے گرم شال نکال کر اوڑھنے کی کوششیں کرنے لگا۔ وہ شال کو جسم کے گرد لپیٹنے کے دوران ایک ہاتھ کے ساتھ اسٹیرنگ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس طرح اس کا دھیان دو جانب بٹ جاتا تھا۔

اچانک درختوں کے درمیان میں سے کوئی چیز تیر کی مانند باہر نکلی اور ٹریکٹر کے فرنٹ شیشے کے ساتھ ٹکرائے کے بعد اسی تیز رفتاری کے ساتھ دوسری جانب موجود درختوں کے درمیان غائب ہو گئی۔ جعفر نے گھبرا کر بریک پر پاؤں رکھ دیئے۔ اچانک بریک لگنے کی بدولت ٹریکٹر کچھڑے بھری پگڈنڈی سے پھسلتا ہوا پگڈنڈی سے نیچے اترتا چلا گیا۔ پھر ٹریکٹر کا پچھلا پیہر کچھڑے بھرے ہوئے بہت بڑے دلدل نما گڑھے کے درمیان پھنس گیا۔ جعفر نے پریشان نگاہوں سے گڑھے کی جانب دیکھا۔ پھر ایسی لیسر پر دباؤ دہانے لگا۔ ٹریکٹر کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے لگے۔ پھر اچانک ہی پیہر گڑھے سے باہر نکل آیا۔ جعفر نے طویل سانس لیتے ہوئے پیچھے ٹرالر کی جانب دیکھا۔ ڈونی تریال کو اٹھائے قریبی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جعفر نے چلا کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی جاندار چیز ٹریکٹر کے فرنٹ شیشے سے ٹکرائی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز تھی۔ تم باہر آؤ۔ اسے قریبی درختوں میں ڈھونڈتے ہیں۔ وہ یقیناً کہیں قریب ہی چھپ گئی ہوگی۔“

ڈونی نے اثبات میں سر ہلایا اور تریال کو ہٹا کر ٹرالر سے نیچے اتر آیا۔ اس کے بعد ان دونوں نے طوفانی بارش کے درمیان تمام ارد گرد کا جنگل چھان مارا۔ لیکن وہاں کسی بھی قسم کا کوئی جاندار موجود نہیں تھا۔ کچھ دیر کی تلاش کے بعد دونوں مایوس قدموں کے ساتھ ٹریکٹر کی جانب چل دیئے۔ جعفر نے ٹریکٹر کو اسٹارٹ کیا اور ڈونی تریال کو ہٹا کر اپنی جگہ پر بیٹھ کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ اب کی دفعہ وہ دونوں کسی بھی دشواری کے بعد لوئی ٹاؤن پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

جعفر کا گھر لوئی ٹاؤن کے درمیان میں چند گئے درختوں کے درمیان بنا ہوا تھا۔ اس نے گھر کے سامنے ٹریکٹر کو روکا۔ اور نیچے اتر کر لکڑی کا دروازہ کھولنے لگا۔ ڈونی بھی ٹرالر سے نیچے اتر آیا۔ لکڑی کے دروازے کے ساتھ کھاد۔ بیج اور کھیتی باڑی کے اوزار

رکھنے والا کمرہ بنا تھا۔ جعفر اور ڈونی نے تریال کے نیچے سے کھادی بوریاں نکالنی شروع کر دیں۔ بارش کا زور ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اب بوند باندی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی۔ تقریباً دس کے قریب بوریاں نیچے اتارنے کے بعد جب جعفر نے آگے کی بوریاں ختم کرنے کے بعد پیچھے موجود بوریوں کا رخ کیا۔ تب ”اؤک اؤک“ کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس نے حیرت بھری نگاہوں سے تریال کے نیچے موجود مختصر بوریوں کی جانب دیکھا۔ کچھ اندھیرے کے درمیان اسے ایک ننھا منھا گدھے کا بچہ بوریوں کے درمیان بیٹھا نظر آیا۔ وہ حیرت انگیز طور پر اپنے منہ سے ”اؤک اؤک“ کی آواز نکال رہا تھا۔ اتنی دیر میں ڈونی اپنی بوری کمرے میں چھوڑ کر واپس آ گیا اور استغنامیہ نگاہوں سے جعفر کی جانب دیکھنے لگا۔ جعفر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میرے دوست..... یہاں تو ایک ننھا منھا گدھے کا بچہ موجود ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تمہارے راشن کے تھیلے کے اندر سے گاجر نکال کر کھانے میں مصروف ہے۔“

”گدھا اور گاجر.....“ ڈونی حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ پھر چھلانگ لگا کر ٹریکٹر پر چڑھ گیا۔ اس نے جھٹکے کے ساتھ تریال کو ہٹا دیا۔ مختصر بوریوں اور راشن کے بکھرے ہوئے تھیلوں کے درمیان کنگرو کا چھوٹا سا بچہ اپنے اگلے دونوں ہاتھوں کے درمیان گاجر تھامے معصوم نگاہوں سے دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”اؤک اؤک.....“ اس نے ڈونی اور جعفر کی جانب دیکھتے ہوئے منہ سے آواز نکالی۔ جعفر نے زور دار قہقہہ لگایا۔ پھر بولا۔ ”کیوں میرے ننھے مہمان..... تم کب خاموشی کے ساتھ ٹرالر میں گھس آئے۔ یہ غیر قانونی بات ہے۔ اور تم نے ڈونی کے راشن کا تھیلہ بھی تباہ کر دیا۔“ کنگرو کے بچے نے حیرت بھری نگاہوں سے جعفر اور ڈونی کی جانب دیکھا۔ پھر ہاتھ میں موجود گاجر کو ایک جانب پھینک کر آگے بڑھ کر جعفر کے ہاتھ کو



اپنے اگلے چھوٹے ہاتھوں میں تھام کر لمبی تھوٹی سی ساتھ چونسے لگا۔ جعفر نے اس عمل کے دوران گہرا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ہر اقدام میں جارحانہ پہلو کے بجائے محبت کا سمندر موجزن تھا۔ جعفر نے مسرت بھرے انداز میں جانور سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کنگرو نے حلق سے ”اُوک اُوک“ کی آواز نکالی۔ اور آگے بڑھ کر ڈوٹی کے راشن سے بھرے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر گارباہر نکالی اور کھانے لگا۔ اس کی جسامت بمشکل ایک فٹ سے کچھ زیادہ رہی ہوگی۔ کان گدھے کی مانند بڑے تھے۔ اور گلے میں سنہرے رنگ کی مضبوط زنجیر پھنی ہوئی تھی۔ جس پر اوڈین سرکس کا نام تحریر تھا۔ جعفر نے ڈوٹی کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

”میرے نئے دوست کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“ ڈوٹی بولا۔

”یہ سرکس کا سدھایا ہوا کنگرو دکھائی دیتا ہے۔“ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو۔ تب اسے واپس اوڈین سرکس والوں تک پہنچا دیتے ہیں۔“ جعفر نے انکار میں سر ہلایا اور بولا۔ ”اب یہ ممکن نہیں رہا۔ جب میں کھادی یوریاں لینے مٹی کا رخ کر رہا تھا۔ تب میں نے سرکس والوں کے قافلے کو شہر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب تک تو وہ شہر پہنچ بھی گئے ہوں گے۔ بالفرض اگر انہوں نے دوبارہ لوٹی ٹاؤن کا رخ بھی کیا۔ تب بھی اپنے معصوم دوست کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ اب یہ میرے ساتھ رہے گا۔“ ڈوٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔ کنگرو کے بچنے کا چرچم کرنے کے بعد تھیلے کے اندر ہاتھ مارا اور دوسری گاجر نکال کر چبانے لگا۔ جعفر اور ڈوٹی اس کی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس دیے۔

کھادی کی یوریاں کو گودام کے اندر ایڈجسٹ کرنے کے بعد جعفر اور ڈوٹی نے گودام کے ایک کونے کو اچھی طرح صاف کیا اور کنگرو کے بچے کو زنجیر کی مدد سے کھونٹے کے ساتھ باندھ دیا۔ ڈوٹی نے سامان کے تھیلے

اٹھائے اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ جبکہ جعفر اپنے گھر کے رہائشی حصے کی جانب چل دیا۔ باپ کو بچے کی یوریاں رقم اور کھادی کی یوریاں کا حساب کتاب دینے کے بعد اس نے ٹریکٹر کو اسٹارٹ کیا اور زمیندار کے گھر پر آنے کے بعد جب اس نے دوبارہ ڈوٹی کے ہمراہ گودام کا رخ کیا۔ تب انہوں نے کنگرو کو بے تاب پایا۔ وہ بھوکا دکھائی دیتا تھا۔ ڈوٹی اپنے ہمراہ گاجروں کا تھیلہ لایا تھا۔ اس نے گاجریں جانور کے آگے ڈال دیں۔ پھر جعفر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ یہ گاجروں کے علاوہ اور کیا کچھ کھا سکتا ہے؟ آج تو میرے پاس صرف گاجریں ہی موجود ہیں۔“

جعفر بولا۔ ”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ کنگرو آسٹریلیا کے جنگلات میں پایا جاتا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے ٹاؤن میں آسٹریلیئن نژاد باکسریلی بیکر رہائش پذیر ہے۔ کنگرو کو اس کے پاس لئے چلتے ہیں۔ وہ ہمیں اس کی پرورش سے متعلق مفید مشاورات سے نواز سکتا ہے۔“ ڈوٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور کنگرو کی زنجیر تھامے گودام سے باہر ٹاؤن کی جانب چل دیا۔ باہر مطلع مکمل طور پر صاف ہو چکا تھا اور اب شدید جس کی بدولت دم گھٹنا محسوس ہونے لگا تھا۔ بیلی بیکر کا لکڑی سے بنا مختصر گھر ٹاؤن سے کچھ ہٹ کر دریا کے کنارے واقع تھا۔ وہ اپنے وقت کا ہیوی ڈیٹ چیمپئن رہ چکا تھا۔ اب بوڑھا ہونے کے بعد ریٹائرمنٹ کی پر مردہ اور گم نام زندگی افریقہ کے اس مختصر ٹاؤن میں بسر کر رہا تھا۔ یہاں اس کی زندگی گزر بسر کا کوئی معقول ذریعہ موجود نہیں تھا۔ وہ ٹاؤن کے بچوں کو باکسنگ کی مشق کروا تھا۔ جس کا اسے ناہونے کے برابر معاوضہ مل جاتا تھا۔ جب ان دونوں لڑکوں نے بیلی بیکر کے لکڑی سے بنے گھر کے احاطے میں قدم رکھا۔ تب مکان کا احاطہ ٹاؤن کے لڑکوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ باکسنگ کی پریکٹس کرنے میں مصروف تھے۔ جعفر اور ڈوٹی کے ہمراہ کنگرو کو اچھلتے کودتے گھر کے احاطے

داخل ہوتا دیکھ کر سب لڑکے ان کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان کے چہروں پر حیرت کے علاوہ جوش کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ بیلی بیکر نے بھی حیرت کی نگاہوں سے کنگرو کی جانب دیکھتے ہوئے جعفر سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

”جف اسے کہاں سے پکڑ کر لائے ہو؟ مجھے یہ سرکس کا سدھایا ہوا کنگرو دکھائی دیتا ہے۔“ جعفر مسکراتے

”آپ کا اندازہ درست ہے۔ جعفر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میرا معصوم دوست اوڈین سرکس کا سدھایا ہوا کنگرو ہے۔ اس کے گلے میں سرکس والوں کا بگ موجود ہے۔ یہ وہاں سے فرار ہو کر ہمارے پاس چلا آیا ہے۔“

بیلی بیکر نے آگے بڑھ کر کنگرو کے سر پر ہاتھ پھرا۔ اس نے فوراً بیلی بیکر کے دونوں ہاتھوں کو تھام اور پھر بیلی تھوٹی کے ساتھ جو منا شروع کر دیا۔ لڑکوں نے زار وارت قبضہ کر لیا۔ اور کنگرو کے بچے کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

جعفر بولا۔ ”انگل بیکر ہمیں کنگرو کے متعلق کچھ معلومات درکار ہیں۔ مثلاً یہ کیا کھاتا ہے۔ کہاں رہائش رکھتا ہے۔ اسے کن وقتوں میں آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ آپ کا تعلق اس کے دیس سے ہے۔ اس لئے ہمارے خیال کے مطابق آپ کو ضرور معلومات ہوں گی۔“ بیلی بیکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔

”اس میں کوئی شک نہیں۔ کنگرو کا تعلق آسٹریلیا سے ہے اور میں اس کے متعلق کافی معلومات رکھتا ہوں۔ یہ کھانے میں گھاس، بنری، کیلے اور بسکٹ پاکیٹ وغیرہ سب کھا سکتا ہے۔ رات کے علاوہ دن میں تقریباً پانچ گھنٹے آرام کرتا ہے۔ علاوہ ازیں لمبی دوڑ لگانے کا شوقین ہے۔ ایک بات مزید جو تم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگی۔ وہ بھی بتائے دیتا ہوں۔ کنگرو پیدائشی باکسر ہوتا ہے۔ میں جوانی میں جب ہیوی ویٹ باکسر تھا۔ تب میرے پاس سدھایا ہوا ایک کنگرو موجود تھا۔ میں اس کے ہاتھوں میں گلوڑ باندھ دیتا تھا۔ اور وہ

میرے ساتھ باکسنگ کھیل کھیلتا تھا۔“ بیلی بیکر نے ہاتھوں کو مکوں کی صورت دیتے ہوئے بتایا۔ ”لیفٹ ہک پر رائٹ ہک۔۔۔۔۔ اس کے بعد زپ۔۔۔۔۔؟“ لڑکوں کے چہرے خوشی سے تھماتے لگے۔ جعفر کے ساتھ موجود ڈوٹی نے پوچھا۔

”یہ زپ کیا ہوتا ہے؟“ بیلی بیکر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”رائٹ اور لیفٹ ہک کے بعد آخری زور دار وار کو زپ کرنا کہتے ہیں۔ یہ ہک وار آخری وار کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر حریف کو بچ بچا جائے تب وہ زپ ہو جاتا ہے اب میں تمہیں پریکٹس کر کے دکھاتا ہوں۔“ پھر اس نے اپنے شاگردوں کی جانب گھومتے ہوئے ایک لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اپنے گلوڑ مجھے دو۔“ لڑکے نے ہاتھوں میں موجود گلوڑ اسے تھمادیے۔ بیلی بیکر نے آگے بڑھ کر دونوں گلوڑ تھوڑی سی محنت کے ساتھ کنگرو کے ہاتھوں میں باندھ دیے۔ کنگرو کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرنے لگے۔ پھر اس کے منہ سے ”اُوک اُوک“ کی آواز ابھری۔ اور وہ پرفیشنل باکسروں کی طرح اپنے پچھلے دو پاؤں پر اچھلتے لگا۔ بیلی بیکر نے مسکراتے ہوئے اپنے دوسرے شاگرد بے گلوڑ مانگے۔ اور ہاتھوں میں پہن کر کنگرو کے بچے کے سامنے آکھڑا ہوا۔ پھر بولا۔

”آؤ میرے نئے ساتھی۔۔۔۔۔ ایک ہلکا سا مقابلہ ہو جائے۔ لیکن خیال رکھنا میرے ناک کی ہڈی کمزور ہے۔ کہیں اسے توڑ نہ دینا۔“ لڑکوں نے دل کھول کر قبضہ کر لیا اور ماضی کے ہیوی ڈیٹ باکسر نے بھی اپنے پاؤں پر اچھلتا شروع کر دیا۔ لڑکے مکمل دلچسپی کے ساتھ جانور اور انسان کو دیکھتے لگے۔ بیلی بیکر مسکراتے ہوئے بولا۔

”آؤ میرے دوست میاں سامنے آ جاؤ۔“ لڑکوں نے ادھر ادھر ہٹ کر جگہ خالی کر دی۔ اور کنگرو اچھل کر بیلی بیکر کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر مسرت کے تاثرات ابھرنے لگے تھے۔ بیلی



بیکر نے آگے بڑھ کر لیفٹ بک اس کے چہرے پر رسید کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نکلرو نے چہرہ بائیں جانب گھما کر وار خالی کر دیا۔ پھر پھرتی کے ساتھ رائٹ بک کا استعمال کرتے ہوئے سابقہ ہیوی ویٹ کی داہنی پسلیوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ یہ خطرناک داؤ تھا۔ لیکن اس کے سامنے اپنے وقت کا بہترین باکسر موجود تھا۔ اس لئے وہ جھکاؤ دے کر صاف بچ گیا۔ نکلرو اپنے ہی زور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ تب بلی بیکر نے ہلکا سا گھونہ جانور کے چہرے پر رسید کر دیا۔ نکلرو نے اس کے گلوز میں پوشیدہ ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام اور ”اوک اوک“ کی آواز نکالتے ہوئے چومنا شروع کر دیا۔ تمام لڑکے مکمل تحویت کے عالم میں یہ سنسنی خیز مقابلہ دیکھنے میں مصروف تھے۔ نکلرو کی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

بلی بیکر پر جوش لہجے میں بولا۔  
”یہ واقعی حیرت انگیز طور پر خدا داد صلاحیتوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اسے پالش کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ میں بخوبی کر سکتا ہوں۔ پہلے اس کا نام تجویز کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں مغلڈا اٹھیک رہے گا۔ یہ جنگلی جانور ہے۔ اور مغلڈا جنگل کے مقدس دیوتا کا نام ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“ اس نے جعفر کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جعفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔  
”انگل بیکر کیا ہمارا نکلرو باکسنگ کھیلنا سیکھ جائے گا۔“ بیکر نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بے شک..... یہ ایک اچھے باکسر کی تمام صلاحیتوں کا مالک دکھائی دیتا ہے۔ لیکن بہر حال اسے کچھ نہ کچھ مزید سیکھنا ہوگا۔ جس کے لئے میری خدمات حاضر ہیں۔“

پھر مغلڈا کی تربیت کا آغاز ہو گیا۔ چھ بجے سے لے کر رات آٹھ بجے تک جعفر اور ڈوٹی فارغ ہوتے تھے۔ وہ اس فارغ اوقات کے دوران مغلڈا کو ہمراہ لے کر بیکر کی تربیت گاہ کا رخ کرتے وہاں سخت تربیت کا آغاز ہوتا۔ بلی بیکر کو یہ جان کر بہت حیرت

ہوتی کہ مغلڈا کسی مجھے ہوئے باکسر سے کم حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ باکسنگ کے پیشتر اسرار و رموز سے ماسرار طور پر آگاہی رکھتا تھا۔ کم و بیش دو ہفتوں کی تربیت کے دوران مغلڈا نے بلی بیکر کے ایک سال سے تربیت لیتے تمام لڑکوں کو ہرا دیا۔ وہ ایک مجھے ہوئے تربیت یافتہ کھلاڑی کے طور پر اپنا نام نمایاں کرنے لگا۔ لونی ٹاؤن میں سالانہ میلے کا آغاز ہونے والا تھا۔ اس موقع میلے میں باکسنگ کے کھیل کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ باکسنگ کے کھیل میں ارد گرد کے تقریباً پندرہ ٹاؤن کے لڑکے حصہ لیتے تھے۔ بلی بیکر کا ارادہ اس کھیل میں شرکت کرنے کا تھا۔ وہ اس کھیل کا جبوری کامبر تھا۔ لیکن اس سال اس کی نظر انتخاب مغلڈا کے چہرے تک محدود تھی۔ وہ اسے کھیل کا زور بنانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جب ٹاؤن سے باہر گئے درختوں کے درمیان بنے وسیع و عریض میدان کے درمیان میلے کا افتتاح ہوا۔

لونی ٹاؤن کے تمام افراد میلے میں شرکت کر رہے تھے۔ میلے سے ایک دن پہلے جعفر اور ڈوٹی نے مغلڈا کو نیلے رنگ کی مختصر بنیان زیب تن کی۔ اور نیلے والے میدان کی جانب چل دیئے۔ بلی بیکر کے مختصر شاگردوں کی بدولت یہ بات تمام ٹاؤن میں پھیل چکی تھی کہ نکلرو کا وہ بچہ جو گزشتہ کچھ دنوں سے تمام لونی ٹاؤن کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ ٹاؤن کے سب سے بڑے میلے میں باکسنگ کے کھیل میں شرکت کرنے والا ہے۔ اس دن تمام میلے والوں کی توجہ کا مرکز باکسنگ کا کھیل رہا۔ درختوں کے درمیان رسیاں باندھ کر کلوڑی کے انچ کی منظر کشی کی گئی تھی۔ مقابلے کا آغاز صبح دس بجے ہوا۔ مختلف ٹاؤن کے مختلف لڑکے آتے گئے اور ہار کر رنگ سے باہر نکلے گئے۔ شام چار بجے جس لڑکے کا انتخاب ہوا۔ اس کا نام ہنری تھا۔ اور اس کا تعلق قرہبی ٹاؤن سے تھا۔

ہنری جسامت کے لحاظ سے چار فٹ چھ انچ جبکہ مضبوط بدن کا مالک ہونے کے علاوہ سفاک

طبیعت کا حامل لڑکا تھا۔ اس کے مقابلے میں مغلڈا کا تجربہ بہت چھوٹا اور طبیعت میں انکسار پایا جاتا تھا۔ ظاہری طور پر مغلڈا مقابلے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن باکسنگ کا یہ مقابلہ فنی اسٹائل تھا۔ یہاں قانون وغیرہ کا کچھ زیادہ غلغلہ نہیں تھا۔ صرف طاقت کا استعمال زیادہ تھا۔ اور طاقت کسی کے پاس بھی ہو سکتی تھی۔ ہنری کے نمایاں پوزیشن لینے کے بعد جب کمپیر نے اعلان کرنے والے انداز میں مجمعے میں موجود مزید باکسروں کو آکسائے کے لئے انچ پر آنے کی دعوت دی۔ تب مجمعے پر گھمبیر خاموشی طاری رہی اور کسی نے بھی رنگ پر آنے کی کوشش نہیں کی۔

تب بلی بیکر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ تمام مجمعے کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ مغلڈا اس کے ہمراہ نہیں تھا۔ اسے مجمعے کے درمیان بیٹھنا ناممکن نہیں تھا۔ وہ درختوں کے جھنڈے سے کچھ دور کھلے میدان میں ہنفر اور ڈوٹی کے پاس بیٹھا چوک بار کھار ہا تھا۔ بلی بیکر نے رنگ میں داخل ہو کر مائیک ہاتھوں میں تھا۔ پھر سنجیدہ لہجے میں مجمعے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میں ہنری کو آج کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ یقیناً یہ ایک اچھا اور مجھ ہوا باکسر ہے۔ لیکن میں آج کے دن بڑے کے طور پر ایک مختلف مقابلے کا اہتمام کرنا چاہتا ہوں۔ جسے آپ سب بھی یقیناً پسند کریں گے۔ سب سے پہلے میں مقابلہ جینے والے وز کے لئے انعام کا اعلان کرتا ہوں۔ وہ انعام پچاس ڈالر کی صورت میں بری جیب کے اندر موجود ہے۔ اس کے علاوہ اب ہنری کے حریف کا نام مغلڈا ہے۔ جو جنگلوں کے دیوتا کا باعزت نام ہے۔ نام کی مناسبت سے ہنری کا حریف انسان نہیں بلکہ جانور ہے۔“

مجمعے میں چہ میگوئیوں کا آغاز ہو گیا۔ لونی ٹاؤن کے تمام لوگ مغلڈا کی شخصیت سے واقفیت رکھتے تھے۔ اگر کچھ لوگ نہیں رکھتے تھے۔ تو وہ باہر کے مختلف ٹاؤن کے لوگ تھے۔ بلی بیکر بولے جارہا تھا۔ ”وہ میرا سدھایا ہوا نکلرو ہے اور ہمارے ٹاؤن کے مختلف لڑکوں کے

ساتھ مقابلے میں اول نمبر حاصل کر چکا ہے۔ میں باکسنگ کے کھیل کی جبوری اور خاص طور پر ہنری سے اجازت طلب کرتا ہوں کہ وہ مقابلے کا آغاز کرنے کے لئے مجھے اجازت دیں۔ تاکہ ایک ایسے مقابلے کا آغاز کیا جائے۔ جو آج کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ دیکھا گیا اور نہ ہی سنا گیا۔ جبوری کے سرکردہ افراد میں پہلے کا درجہ میں خود رکھتا ہوں۔ لیکن بقایا دو کی منظوری کی بھی ضرورت کو لازمی قرار دیتا ہوں۔“ جبوری کے دو ارکان اٹھ کر انچ پر چڑھتے چلے آئے۔ ان دونوں کا نام جون اور ڈین تھا۔ دونوں کا تعلق باکسنگ کے شعبے سے رہ چکا تھا۔ جون مائیک ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

”کیا یہ مقابلہ صرف تفریح طبع کے لئے ہوگا۔ یا پھر مکمل مقابلے کی حیثیت کا اختیار رکھتا ہوگا۔ میرے خیال میں صرف تفریح کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ مقابلہ سخت اور مکمل ہونا چاہئے۔“

بلی بیکر بولا۔ ”صرف تفریح کے لئے میں تمیں قصبوں کے واحد وز کا مذاق نہیں بنانا چاہتا۔ یہ مسلم حقیقت ہے کہ میرا سدھایا ہوا نکلرو ایک مکمل حریف ثابت ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس مقابلے کو مستقل سلسلے کے لئے منتخب کر لیا جائے۔ بہر حال میزبانی گاہوں میں ایک دلچسپ مقابلہ ہوگا۔“ جون نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اپنے دوسرے ساتھی ڈین کی جانب دیکھنے لگا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں.....“ ڈین بولا۔ ”ہنری باکسنگ کا مقابلہ جیت چکا ہے۔ اب اگر تجربے کے طور پر ایک جانور سے مقابلہ کرنے کو تیار ہوتا ہے تب کچھ مضائقہ نہیں ہوگا۔ ہنری تم کیا کہتے ہو؟“ اس نے ہنری کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

”اگر جبوری اقرار میں فیصلہ دے چکی ہے تب میرے کچھ کہنے کے لئے باقی کیا بچا ہے۔“ اس نے غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ وہ ایک جانور کے ساتھ مقابلے کرنے کو اپنی ہنک سمجھتا تھا۔ لیکن جبوری کا فیصلہ بہر حال آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لئے اقرار کرتا ہوں۔ بلی بیکر نے اگلی رو میں بیٹھے اپنے شاگرد کو اشارہ



کیا کہ وہ جعفر اور مغلڈا کو اسٹیج کی جانب لائے۔ پھر مجھے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”مجھے یقین ہے کہ آپ اس دلچسپ مقابلے سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔ یہ یقیناً نوعیت کے لحاظ سے منفرد مقابلہ ہوگا۔ میں جیوری کے ارکان کو اپنی سیٹوں پر واپس بیٹھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اور ہنری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جس نے ہماری بات مان کر ایک ایسے مقابلے کے لئے ہاں کر دی۔ جو آج سے پہلے کہیں منعقد نہیں ہوئے۔“

جمع زور دار تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ اتنی دیر میں بیلی بیکر کا شاگرد جعفر ڈوئی اور مغلڈا کے ہمراہ مجھے میں داخل ہوا۔ لوگوں کی نظریں بے اختیار مغلڈا کی جانب اٹھ گئیں۔ جو مجھے میں داخل ہونے کے بعد شوق بھری نگاہوں سے رنگ کی جانب دیکھنے میں مگن تھا۔ اس نے ہاتھوں میں گلوڑ پہنے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر اب صرف بیلی بیکر اور ہنری موجود تھے۔ جیوری کے بقیہ دوئوں ارکان اپنی سیٹوں کی جانب واپس جا چکے تھے۔

”حاضرین..... میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔ اگر آپ میرے تربیت یافتہ کنگرو کو اسٹیج پر آنے کے لئے راستہ دیں گے۔ تاکہ مقابلے کا باقاعدہ افتتاح کیا جاسکے۔“ لوگوں نے فوراً راستہ چھوڑنا شروع کر دیا۔

ہنری حیرت بھری نگاہوں سے مغلڈا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ رنگ کے پاس پہنچ کر مغلڈا نے بھی چھلانگ لگائی۔ اور تقریباً ہوا میں اڑتا ہوا رنگ کے درمیان میں آکھڑا ہوا۔ بیلی بیکر دوبارہ ہنگام ہوا۔ ”میں یہاں یہ بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ عام مقابلوں کی طرح یہ مقابلہ مختلف راؤنڈز پر مشتمل نہیں ہوگا۔ ہار اور جیت کا فیصلہ دونوں حریفوں میں سے ایک کے ناک آؤٹ ہونے پر ہی ہوگا۔ اب یہ سلسلہ طوالت اختیار کرتا ہے۔ یا پھر منٹوں کے اندر مکمل ہوتا ہے۔ اس کا انحصار دونوں حریفوں پر ہوگا۔ مغلڈا صرف بیکر کہنے پر الگ کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اصولوں کی پاسداری کرتا چاہتا ہے۔“ بیلی بیکر نے مائیک کو نیچے موجود لڑکے کے حوالے کیا۔

اور رنگ سے باہر نکل کر اگلی رو میں موجود انما کر ہی پڑا بیٹھا۔ ریفری نے پہلے ہنری کے دونوں گلوڑ چیک کیے اس کے بعد جھجکتے ہوئے مغلڈا کی چیکنگ کی۔ پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے راؤنڈ شروع کرنے کی وٹل بجا دی۔

ہنری نے اپنے پاؤں پر پنجوں کے بل اچھلنا شروع کر دیا۔ اس کے دونوں گلوڑ چرے کا محاصرہ کرے ہوئے تھے۔ پھر جیسے بجلی چمکتی ہے۔ اس طرح ایک ہی اس نے آگے بڑھ کر لیفٹ ہک مغلڈا کی پھلیوں کے درمیان مارنے کی کوشش کی۔ مغلڈا نے پھرتی کے ساتھ ایک جانب ہٹتے ہوئے وار خالی جانے دیا اور اپر کٹ اس کے چرے کے دائیں جبڑے پر رسید کر دیا۔ ہنری کو رنگ کھومتا ہوا دکھائی دیا۔ اور وہ کھڑا کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا چلا گیا۔ مجھے والوں کے منہ سے تحسین آمیز آوازیں خارج ہوئیں اور ریفری نے کتنی گنتی شروع کر دی۔ ابھی کتنی تھوٹک پوری نہیں ہوئی تھی کہ ہنری سنبھل کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے منہ کے دانے کے پاس سے خون کی لکیر بہہ کر سفید بنیان کو سرخ کرنے لگی۔ اور چہرہ بڑکریا ہوا گیا۔ اس نے دوبارہ پیچھے پنجوں پر اچھلنا شروع کر دیا۔ اس دفعہ پہلے مغلڈا نے کی۔ اس نے اچھل کر لیفٹ ہک ہنری کی پھلیوں پر رسید کیا۔ پھر ہاتھ روکا نہیں۔ بلکہ لگا تار بارش کی طرح اس کی پھلیوں پر برساتنا شروع کر دیا۔

ہنری کی ہمت پہلے ہی پٹخ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ چار پانچ پنج لگا تار گنتی کی بدولت وہ دوبارہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر چلا گیا۔ اس کے ناک سے خون بہہ کر رنگ کی زمین کو سرخ کرنے لگا۔ مجھے میں تحیر آمیز خاموشی طاری ہو گئی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک سرس کا سدھایا ہوا جانور تربیت یافتہ باکسر کو ناک آؤٹ کر دے گا۔ یہ بات بیلی بیکر کے وہم و گمان سے بھی پرے تھی۔ اتنی جلدی مقابلے کا اختتام..... اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس مختصر لڑائی کے دوران وہ یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا۔ کہ مغلڈا خدا داد صلاحیتوں کا

نمونہ تھا۔ جنہیں اگر مختصر محنت کے بعد جاگ کر کیا جاتا۔ تو ہاتھ اچھے باکسروں کے چھکے چھڑوا سکتا تھا۔

جعفر نے خوشی سے بے قابو ہو کر مغلڈا کا نام لے کر نعرہ لگایا۔ اور پھر تمام مجمع مغلڈا کے نعرے لگانے لگا۔ جیوری کے باقی دونوں ارکان ڈین اور جون کے منہ جیت کے مارے کھلے ہوئے تھے۔ بیلی بیکر نے اپنی بیٹ کو چھوڑتے ہوئے مائیک کو تھا۔ پھر رنگ کے درمیان میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

حاضرین..... آپ مقابلے کی اہمیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگا چکے ہوں گے۔ میرا سدھایا ہوا کنگرو خدا داد صلاحیتوں کا حامل ہے۔ اس نے اپنے سے بڑی لڑکے باکسر سے مقابلہ کر کے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایسا بخوبی کر سکتا ہے۔ آج میں اس مقابلے کو مستقل مقابلے کی صورت دیتا ہوں۔ جیوری کے دونوں ارکان یقیناً میرے اس فیصلے کی حمایت کریں گے۔ اگر نہیں..... تو ابھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں۔“ جیوری کے ارکان خاموش بیٹھے رہے اور مجھے نے ان کی خاموشی پر اپنی خوشی کا اظہار شور مچاتے ہوئے کیا۔

☆.....☆.....☆

تین سال مزید گزر گئے۔ یہ مقابلہ مقبول ترین حیثیت اختیار کرنے لگا۔ ان تین سالوں کے دوران مغلڈا کی قدامت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ وہ اب ماڑھے چھ فٹ کا لمبا تڑنگا اور صحت مند کنگرو تھا۔ اس پاس کے تقریباً تمام قصبوں کے باکسروں کو شکست دے چکا تھا۔ اور اس کی شہرت قصبوں سے بہت کر قریبی شہروں تک پھیلنے لگی تھی۔ لیکن ان مقابلوں کی بدولت بیلی بیکر یا جعفر کو مالی معاملات میں خاطر خواہ فائدہ نہ ہوسکا۔ سوائے اس کے کہ وہ کنگرو کی بدولت کسی حد تک جانے پہچانے جانے لگے تھے۔ کریوں کے اوائل میں اور بہار کی شروعات کے پہلے دنوں میں جون میری سرس والوں نے قصبے میں ایسے ڈالے تب مغلڈا کی شہرت سے مسحور ہو کر بیلی بیکر کی جانب کھچے چلے آئے۔ جون میری سرس

کے کرتا دھرتا کا نام میری جون تھا۔ وہ ایک اسیڑمعر اور تجربہ کار انسان تھا۔ مختصر سلام دعا کے بعد اس نے اپنے آنے کا مدعا یوں بیان کیا۔

”میں مغلڈا کی شہرت کے معلق بن کر یہاں آیا ہوں۔ ایسے جانوروں کی میری سرس کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ اگر آپ اسے میرے ہاتھوں فروخت کرنا چاہیں تو میں مقول معاوضہ دینے کے لئے تیار ہوں۔“ بیلی بیکر مسکراتے ہوئے بولا۔

”سوئے کا انڈہ دینے والی مرغی کو میں یکمشت ذبح کرنے کو بے وقوفی قرار دیتا ہوں۔ آپ بھلا مجھے اس کی کیا قیمت دے جائیں گے۔ پچاس ہزار ڈالر..... یا پھر ایک لاکھ ڈالر..... کل نہیں تو پیرس وہ ختم ہو جائیں گے۔ لیکن ایک مستقل رقم دینے والا جانور تمہارے پاس بحفاظت موجود رہے گا۔ اور تم تمام زندگی فائدہ حاصل کرتے رہو گے۔ میں گھائے کا سودا کرنے کو تیار نہیں ہوں۔“ میری جون اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”مجھے فائدہ یا نقصان کی پرواہ نہیں ہے۔ میں صرف اپنے سرس کو چھلتا چھوٹا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری نگاہ میں اگر کوئی اور سودا جتم لے رہا ہے۔ تو بلا جھجک مجھے بتا سکتے ہو۔ میں سودے پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“

”یہ بات ہوئی ناں.....“ بیلی بیکر پر جوش لہجے میں بولا۔ ”ہمارے باکسنگ کے ایکٹ کو تمام قصبوں میں سراہا جا رہا ہے۔ بلکہ کچھ عرصہ پیشہ تریو یا رکیٹی وی کا نمائندہ بھی لوئی ٹاؤن آتا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ باکسنگ کے اس مقابلے کوئی وی پر جگہ دینے کی پوری کوشش کرے گا۔ یہاں یہ بات بتاتا چلوں کہ مقابلے کا اہتمام تمبر کے اوائل میں کیا جاتا ہے۔ یعنی آج سے تقریباً پانچ مہینے بعد..... میں نے اسے ہاں کہہ دی ہے۔ اس لئے تم مغلڈا کی اہمیت کا اندازہ لگاسکتے ہو۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں افریقہ کے جنگلوں کے سب سے بڑے دیوتا مہادیوتا کی روح طول کر چکی ہے اور اب یہ ناقابل تخیر ہے۔ میرے پاس باکسنگ سے



متعلق ایک ایسا ایک موجود ہے۔ جسے اگر تمہاری سرکس کی زینت بنایا جائے۔ تب سرکس کی شہرت کے علاوہ اچھے خاصے معاوضے کا باعث بن سکے گا۔ لیکن مجھے ایک کی کامیابی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں صرف اپنے معاوضے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ جو میرے اندازے کے مطابق صرف ہمارے ایک کا آدھا ہونا چاہئے۔ یعنی اگر ایک ایک میں تیس ہزار ڈالر کا فائدہ ہوتا ہے تب ان ہزار ڈالر میں سے پانچ سو ڈالر ہمارے ہوں گے۔“

”یہ بہت زیادہ ہیں۔“ میری جون بات درمیان میں کاٹتے ہوئے بولا۔ ”کچھ کمی و بیشی کے متعلق بات کرو۔“

”میری موجودہ رقم فرض کردہ ہے۔“ بلی بیکر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ٹکٹ کی فروخت پر میرا لڑکا بیٹھے گا۔ جتنی آمدنی ہوگی۔ اس کا آدھا میرا ہوگا۔ یہ یاد رکھو کہ ٹکٹرو کا مالک میں نہیں ہوں۔ بلکہ وہ لڑکا ہے۔ جو ٹکٹ کی فروخت پر بیٹھے گا۔ ہم ٹکٹ کی فروخت سے ملنے والی رقم کو مزید آدھا کریں گے۔ مجھے نہیں معلوم ایسی صورت میں ہم دونوں کے حصے میں خاطر خواہ رقم آتی ہے یا نہیں۔۔۔۔۔۔ بہر کیف ہم سرکس میں ایک کروانے کو بخوش تیار ہیں۔“ ٹیکر خاموش ہو گیا۔

”میں اس تجربے کے لئے رضامندی کا اظہار کرتا ہوں۔“ جون میری اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اس ایکٹ کی بدولت کچھ منافع کم سکوں گا۔ لیکن بہر حال مقبولیت حاصل کرنے کے لئے سودا بڑا نہیں ہے۔ تم اپنے ساتھی کے ساتھ بات چیت کرلو۔ معاہدے کی شق پر دہتھ کے بعد تم کسی اور کمپنی یا پھر میڈیا کے ساتھ سرکس والوں کی اجازت کے بغیر کام نہیں کر پاؤ گے۔ بعد ازاں یہ ایکٹ صرف جون میری سرکس کے لئے مختص ہوگا۔“ بلی بیکر نے اثبات میں سر ہلادیا۔

چاند کی چودھویں تاریخ تھی۔ ہر جانب نہری چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ رات ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا اور پہاڑی سرسبز چوٹی پر جعفر اپنی محبوبہ ماریا کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ ماریا اس کے تباہی لڑکی تھی۔ اس کا تباہی تو قیر چاولوں کی تجارت کا کام کرتا تھا۔ وہ پاکستان سے اعلیٰ کواٹی کے چاول برآمد کر کے افریقہ پہنچانے کا کام کرتا تھا۔ کام اچھا چل نکلا تھا۔ اس لئے گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ جعفر اور ماریا بچپن سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ لیکن جعفر کا تباہی تو قیر اس رشتے سے ناخوش تھا۔ وجہ جعفر کی بے کاری تھی۔ جبکہ ماریا قبول صورت ہونے کے علاوہ اچھی خاصی بڑھی لکھی اور سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ اور کسی بھی لحاظ سے یہ جوڑی آپس میں نہیں ملتی تھی۔ کچھ دنوں سے ماریا گھر میں سازش کی بو محسوس کر رہی تھی۔ ماں اور باپ کی سرکوشیاں معنی خیز گفتگو، راز و نیاز نے اسے بہت کچھ سوچنے بجھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے چھپ کر ان کی بات چیت سننے کی کوشش کی۔ تب سب رازوں پر سے پردے اٹھنے چلے گئے۔ ان کی بات چیت کا برف ماریا تھی۔ اور وہ دونوں ماریا کی متنگی خاموشی کے ساتھ ایک کاروباری تاجر کے لڑکے سے کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ لڑکے کا اصل نام غالباً جونی تھا۔ جبکہ اصل نام جینیہ تھا۔ ماریا ایک پارٹی کے دوران اس سے ملاقات کر چکی تھی۔ نہایت ہی ادب و احترام کا لڑکا تھا۔ شراب ایسے پیتا تھا جیسے پانی۔۔۔۔۔۔ اس وقت پہاڑی چوٹی پر دونوں کی موجودگی کا مقصد موجودہ صورت حال کے متعلق تبادلہ خیال کرنا تھا۔ ماریا جعفر کو جنید کے متعلق سب کچھ بتا چکی تھی۔ اب تقبیبی نگاہوں سے جعفر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جعفر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”ان تمام حالات کی وجہ میری غربت ہے۔ تمہارے والدین کو پیسے کے ساتھ پیار ہے۔ میرے پاس نہیں ہے۔ اس لئے ان کی نگاہوں میں میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جنید ایک ادب و احترام اور شرابی قسم کا عیاش لڑکا ہے۔ لیکن چونکہ صاحب حیثیت ہے۔ اس لئے

دولت کی ریل پیل اس کی ان تمام کمزوریوں پر پردہ پوشی کر دیتی ہے۔ میں نے جب سے آنکھ کھولی ہے۔ پیسے کی اہمیت کو اپنے قصبے کے علاوہ ہر جگہ پر پروان چڑھتے دیکھا ہے اور اب وہ وقت بھی آ گیا ہے۔ جب دولت کی دیوی مجھ پر مہربان ہونے والی ہے۔ ملحد کی صورت میں۔۔۔۔۔۔ ایک کمزور اور معصوم جانور کی شکل میں۔۔۔۔۔۔ میں دنیا کو دکھا دوں گا کہ یہ دنیا اور اس میں پائی جانے والی انسانوں کی کمزوریاں کتنی وقتی اور کمزور ہیں۔ دولت کمانا اور کمزوروں کا ہاتھوں سے اڑا دینا بالکل بھی مشکل نہیں ہے۔

لیکن میں تمہارے ماں باپ کی منت سماجت کرنے کو بالکل بھی تیار نہیں ہوں۔ رشتے داری کے لحاظ سے تم پر پہلا حق میرا بنتا ہے۔ وہ اگر حق تلفی کرنے کے حلق سوچ رہے ہیں تو میں انہیں منع نہیں کروں گا۔ بھٹے تم سے محبت ہے۔ میں تمہیں آگ میں دیکھتے کنوئیں میں چلا گیا لگاتے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن میرے خیال کے مطابق تمہارے ماں باپ مجھ سے کئی گنا زیادہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود آگ میں دیکھتے کنوئیں کی حدت کو چاہتے سے قاصر ہیں۔ تو پھر ٹھیک ہے۔ ان کے حکم کے آگے سر جھکا کر انہیں بتادو کہ ان کا فیصلہ کتنا غلط ہے۔ بدلے میں تمہیں اور مجھے اپنی زندگیوں کی نعمتوں کو فراموش کرنا ہوگا۔“

”یہ مجھے منظور ہے۔ لیکن جھک کر پتھر کے بتوں سے ہیک لگتا قبول نہیں ہے۔“ ماریا آنسوؤں بھری نگاہوں سے تمام باتوں کو سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ثبت تھے اور جعفر کی باتوں میں پوشیدہ بغاوت کی لہر کو محسوس کر کے اس نے مایوسی کے ساتھ اپنے سر کو جھکایا اور اٹھ کر ڈھنگے قدموں کے ساتھ ٹاؤن کی جانب چل دی۔

دوسرے دن صبح جعفر اپنے تباہی تو قیر احمد سے ملاقات کے لئے گھر پہنچ گیا۔ تو قیر احمد نے قہر بھری نگاہوں سے جعفر کی جانب دیکھا۔ پھر آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب جعفر بولا۔

”مجھے سرکس میں ایک خوب صورت ایکٹ کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اور میں کل اگلے بیکر کے ہمراہ نیویارک جانے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ یہاں آنے کا مقصد صرف آپ لوگوں کو الوداع کہنا ہے۔ شاید اب ہماری ملاقات میں کچھ تاخیر ہو جائے۔ کیونکہ میرے کام کی نوعیت کچھ طویل ہے۔“ تو قیر احمد نے ترم انگیز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتی۔ تم ڈھنگ کا کوئی کام کیوں نہیں کرتے ہو۔ تمام لوئی ٹاؤن میں ایک تماشائے ہوئے ہو۔ ایک حقیر ٹکٹرو کو لے کر گلیوں میں گھومتے ہو۔ اب سرکس میں کام کرنے کی بات کر رہے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ میرے ساتھ چاولوں کا کام کرو۔ کچھ ہی دنوں میں اچھی خاصی رقم کے مالک بن جاؤ گے۔“ جعفر طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

”مجھے اگر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا موقع ملا۔ تب میں کوشش کروں گا کہ کسی کے سہارے کے بغیر اپنے زور بازو کی بدولت کھڑے ہونے پاؤں۔ کسی کا ہاتھ تمام کر چلنا مجھے کبھی بھی گوارا نہیں رہا۔ شاید میری اسی سوچ کی بدولت آج میری حیثیت آپ سے کچھ کم ہے۔ لیکن میرے خیال کے مطابق وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ کل کو بدل بھی سکتا ہے۔ صرف انسان کی نیت صاف ہونی چاہئے۔ بہر حال میری گزشتہ روز ماریا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ آپ اس کی متنگی جنید کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ میں جنید کی اگلی پچھلی زندگی کے متعلق اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا کردار کبھی بھی اچھا نہیں رہا۔ وہ ایک ادب و احترام اور بد مزاج لڑکا ہے۔ خدا کے واسطے ماریا جیسی پاکیزہ اور معصوم لڑکی کو اس کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور مت کیجئے۔ آپ کو بعد میں پچھتنا پڑے گا۔“

تو قیر احمد چہرہ غصے کی بدولت سرخ ہوتا چلا گیا۔ پھر جب وہ بولے۔ تو آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہت رکھتی تھی۔

”اب تم مجھے غلط اور صحیح فیصلے کے متعلق سمجھاؤ



گئے۔ یعنی میں بے وقوف ہوں۔ اور تم عقلمند..... مجھے یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔ اب فوراً سے پیشتر یہاں سے دہج ہو جاؤ اور جانے سے پہلے یہ بات یاد رکھنا کہ میں جو تمہاری نگاہوں میں بے وقوف ہوں۔ بے وقوف ہونے کے باوجود ایک اچھے اور معزز پیشے کا کاروباری ہوں۔ لیکن تم کیا ہو؟ ایک معمولی کنکرو کے مالک..... سرکس میں ایکٹ کرنے والے جو کہ..... اگر عقلمند ہو۔ تو اپنی حیثیت کو درست کرو۔ پھر بات کرنا۔“ تو قیر صاحب نے بات مکمل کی۔ پھر پاؤں شیخ کر کھڑے ہوئے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

دوسرے دن صبح سویرے بلی بیکر اور جعفر نے لوٹی ٹاؤن کو خیر باد کہہ دیا۔ ٹاؤن کے بڑے بوڑھوں کے علاوہ جعفر کے باپ اور بہنوں نے بھی اسے ایسا کرنے سے منع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جعفر نے سنی ان سنی کر دی۔ اسٹیشن پر مثلاً کوئی مال گاڑی کے ڈبے میں بند کرنے کے بعد جعفر نے باپ کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔ ”میں جلد از جلد پیسے بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ آپ اپنا اور میری بہنوں کا خیال رکھئے گا۔ آمدن زیادہ ہونے کے فوراً بعد میں آپ کو مجبور کروں گا کہ آپ کھیتوں میں کام کرنا چھوڑ دیں۔ آپ کی عمر اب اس قابل نہیں کہ کھیتوں کی سختیاں جھیل سکیں۔ لیکن بہر حال ابھی تک میرے اختیار میں اس سے زیادہ نہیں کہ ایکٹ سے حاصل ہونے والی زیادہ تر رقم آپ کو بھجوا سکوں۔“ باپ نے اسے اپنے سے جدا کرتے ہوئے جواب دیا۔

”زمیندار اور زمین کا تعلق ایسا نہیں ہوتا۔ جسے چھوڑا جاسکے۔ اس تعلق کے درمیان عمر بھی حائل نہیں ہو پاتی۔ میں مرتے دم تک زمین پر چلا رہا ہوں گا۔ چاہے تمہاری آمدنی اتنی زیادہ ہو جائے جب میں تمام لوٹی ٹاؤن کی زمینیں ہی کیوں تا خرید لوں۔ لیکن رہوں گا میں تب بھی زمیندار ہی.....“ جعفر نے مجبور ہو کر باپ کی جانب دیکھا۔ وہ عزم و استقلال کی ایسی برچھائی دکھائی دیا۔ جو ناقابل شکست تھی۔ ٹرین نے روانگی کی

وسل دی۔ بلی بیکر کنکرو کو چوک بار اور کھیل کھلانے کے بعد دونوں کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔ جعفر نے باپ کے ساتھ بغل گیر ہو کر آنکھوں میں آنے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔ پھر محبت بھرے لہجے میں بولا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کوشش کروں گا کہ تمام نہ سہی..... لوٹی ٹاؤن میں واقع اپنی زمینوں کو خریدنے کی جن پر آپ کام کرتے ہیں۔ اور جو زمیندار کی ملکیت ہیں۔“ باپ نے منکراتے ہوئے جعفر کے سر پر ہاتھ رکھ دیے۔ ٹرین نے دوبارہ وسل دی اور وہ دونوں پھرتی کے ساتھ اپنے ڈبے پر چڑھتے چلے گئے۔ ٹرین نے پلیٹ فارم کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ جعفر کے باپ نے آنکھوں میں آنے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور اسٹیشن سے باہر کی جانب چل دیا۔ اس مختصر وقت کے دوران وہ بڑھاپے کی ان منزلوں کو محسوس کر پایا تھا۔ جس سے اب تک نا آشنا تھا۔ اس کا جوان سالہ خون اپنی ذمہ داریوں سے دلہرا دشت ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر چکا تھا۔ کہاں زمینوں کی آمدن..... اور کہاں سرکس میں معمولی ایکٹ کی آمدن..... وہ اپنے لڑکے کے فیصلے میں مطمئن نہیں تھا۔

دوسری جانب جعفر کو یہ فکر لاحق تھی۔ کہ اس کا بوڑھا باپ زمینوں کی سختیوں کو بھلا کیونکر جھیل پائے گا۔ اس کی آرام کرنے کی عمر بھی زمینوں پر کام کرنا..... اس کی بیماری کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ لیکن جعفر کو مکمل یقین تھا کہ ایکٹ سے حاصل ہونے والی آمدن اتنی تو ضرور ہوگی۔ جس سے اس کے علاوہ گھر کا خرچہ بھی چل سکے۔ تب یقیناً اس کا باپ زمینوں پر کام کرنے سے اجتناب کرے گا۔ بہت سی سوجھ بچھیں تھیں۔ لیکن اس لمحے اس کے پاس ان کا حل موجود نہیں تھا۔ اس لئے اس نے سوچوں کو دماغ سے پرے جھٹک کر ٹرین کی کھڑکی سے باہر گزرتے کھیتوں کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔

دوسرے دن دوپہر تین بجے متیوں نیویارک ریلوے اسٹیشن پر اتر گئے۔ جون میری سرکس کا ٹرک اسٹیشن کے باہر موجود تھا۔ کنکرو کو ٹرک کے پچھلے حصے

میں منتقل کرنے کے بعد بیکر اور جعفر ڈرائیور کے ساتھ زینٹ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ یوں یہ مختصر قافلہ شہر سے باہر پہنچ جان میری سرکس تک جا پہنچا۔ یہاں خیموں اور پتھروں میں بندھے جانوروں کا شہر آباد تھا۔ جون نے بظور اور بیکر کا پر جوش استقبال کیا اور دونوں کو ان کے خیموں کی جانب بھیجنے کے بعد مغلڈا کو قریبی پنجرے میں بند کر دیا۔

یہاں سے کہانی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں بانسنگ کنکرو کا یہ ایکٹ نہایت مقبول ہونے لگا۔ ایکٹ کی مقبولیت کے ساتھ بیکر اور جعفر کے معاوضے میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ تقریباً ایک سال کے مختصر عرصے کے دوران جعفر نے گاؤں میں واقع کافی حد تک زمینیں خرید لیں۔ اب وہ مطمئن تھا۔ اس کا باپ بے یار و مددگار نہیں تھا۔ بلکہ اس کے کہنے کے مطابق اب اس نے زمینوں پر کام کرنے کے لئے چند نوکر بھی رکھ لئے تھے۔ اس ایک سال کے دوران اسے ماریا کی جانب سے صرف ایک خط موصول ہوا۔ جس میں اس نے اپنی شادی کی اطلاع دی۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔

جون میری سرکس کا دائرہ کار نیویارک کے تمام چھوٹے بڑے شہروں اور ارد گرد کے مشہر قصبوں تک محدود تھا۔ ایسے ہی ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں سرکس کے دوران ایک ایسا ناقابل فراموش واقعہ پیش آیا۔ جس نے اخباروں کی دنیا میں تھلکہ مچا کر رکھ دیا۔ ہوا کچھ یوں..... کہ اس دن موسم ابر آلود تھا اور ہوا میں خشکی کا تناسب بتدریج بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس حوالے سے سرکس میں تماشائیوں کی تعداد کچھ کم ہی تھی۔ بہر حال مختلف ایکٹ گزرنے کے بعد جب فائنلنگ کنکرو کے ایکٹ کی ابتدا ہوئی۔ تب ہال میں موجود مختصر تماشائیوں نے تقریباً سانس روک لئے۔ بیکر ہاتھ میں مائیک تھا اسے رنگ میں داخل ہوا۔ پھر تماشائیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ یقیناً باکسر کنکرو کو دیکھنے کے لئے بے

چشمین ہوں گے۔ میں آپ کی بے چینیوں میں مزید اضافے کا باعث نہیں بننا چاہتا۔ اس لئے مقابلے کا افتتاح کرنے سے پہلے حسب معمول اعلان کرتا ہوں کہ اگر رنگ میں سے کوئی تماشائی میرے سدھائے ہوئے کنکرو سے بانسنگ کا مقابلہ کرنا چاہے تب میں پانچ سو ڈالر جیتنے والے کو دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ یاد رہے مقابلہ راؤنڈ پر مشتمل نہیں ہوگا بلکہ ٹاک آؤٹ کرنے والے کو رنگ کا جیمپن قرار دیا جائے گا۔“

رنگ کے مختصر تماشائیوں میں خاموشی چھا گئی۔ زیادہ تر تماشائی کنکرو کو لڑتے دیکھ چکے تھے اور وہ جانتے تھے کہ کنکرو بانسنگ کے مقابلے میں تقریباً ناقابل خیر تھا۔ اس وقت حال کے مختصر تماشائیوں کے درمیان نیویارک کے سب سے بڑے اخبار نیویارک ٹائمز کے اسپورٹس سیکشن کا ایڈیٹر جیس لی بھی موجود تھا۔ وہ کنکرو کے بانسنگ ایکٹ کی شہرت کے متعلق سن کر یہاں آیا تھا۔ اس کے فوٹو اس کی مختصر انٹرویو کے لئے..... لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ اس کے قریب ہی بانسنگ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ایک ایسا شخص بھی موجود تھا۔ جس کے ساتھ اس کی رقابت کا ایسا سلسلہ چلتا تھا۔ جو کبھی بھی ختم نہیں ہونے والا تھا۔ مختصر اعلان کی صورت حال کے بعد وہ شخص لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے کنکرو کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوں۔“ جیس کو فوراً احساس ہو گیا کہ وہ اس وقت شراب کے نشے میں دھت تھا۔ بلی بیکر کی آواز مائیک میں سنائی دی۔

”تب پھر آپ رنگ میں آجائیے، تاکہ مقابلے کی باقاعدہ شروعات کی جاسکے۔“ جیس نے اپنی سیٹ کو چھوڑنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر واپس بیٹھ گیا۔ وہ ایسے سنہرے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ صبح کے اخبار کی بڑی سرخی اپنے ذہن میں ترتیب دے چکا تھا۔ ”عالمی ٹل ویٹ جیمپن کا اعزاز رکھنے والا ہارڈی ڈوم“ گزشتہ روز ایک معمولی جانور کے ساتھ نبرد آزما..... سرخی کے نیچے رنگین



تصویروں کی بھر مار جن میں ہارڈی ڈوم کو ننگرو سے مار کھاتے دکھانا جیسے تجربہ کار رپورٹر کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لیکن اسے ننگرو کے متعلق سوچ کر انفس محسوس ہو رہا تھا۔ اب سے کچھ دیر بعد اس کا جو حال ہونے والا تھا۔ اس کے متعلق اگر جانور کو پتا چل جاتا۔ تو وہ فوراً رنگ کو چھوڑ کر جنگلوں کی جانب بھاگ جاتا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی۔ ہارڈی ڈوم تقریباً نشے میں دھت تھا۔ ہو سکتا ہے کہ سرکس کی دنیا میں دھوم مچانے والا سدھیا ہوا ننگرو اپنی موت آپ مرنے سے بچ جاتا۔ اگر ایسا ہو جاتا۔ تب ہارڈی ڈوم کے لئے تقریباً ڈوب مرنے کا مقام ہوتا۔ ایک جانور سے شکست کھانے کے بعد اسے یقیناً ہانگ کی دنیا کو چھوڑ دینا چاہئے تھا۔ اسے مزید یاد آیا کہ موجودہ ٹاؤن ہارڈی ڈوم کی جائے پیدائش کا درجہ رکھتا تھا۔ یقیناً وہ یہاں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کی نیت سے آیا ہوگا۔ موسم ابر آلود ہونے کی بدولت ہال میں اندھیرے اور روشنی کا ملا جلا تناسب پایا جاتا تھا۔ اس لئے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ہارڈی ڈوم کو پہچانا نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ موجود اس کے ٹاؤن کے دوست اس بات سے بخوبی آگاہی رکھتے تھے کہ جانور کا مقابلہ عالمی ٹڈل ویٹ چیمپئن کا اعزاز رکھنے والے ہارڈی ڈوم سے ہونے والا تھا۔ جب ہارڈی ڈوم نے لڑکھڑاتے ہوئے رنگ کے اندر قدم رکھا۔ تب بیلی نے اسے خوش آمدید کہتے ہوئے رنگ کے ایک سائیڈ میں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ پھر ایک جانب موجود گلوڑ اٹھا کر اسے تھما دیئے۔ اور مائیک اٹھاتے ہوئے بولا۔

”میرے خیال کے مطابق کپڑے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ننگرو کو اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اس کے مقابلے نے پینٹ اور شرٹ پہن رکھی ہے یا پھر نیکر۔۔۔۔۔ لیکن میں پہلے بتا دوں کہ تمہاری ٹوٹ پھوٹ کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہوگی۔ اب بھی وقت ہے۔ اگر واپس سیٹ کی جانب جانا چاہو تو بخوشی جاسکتے ہو۔“

ہارڈی نے زیر لب کوئی گندی گالی دی۔ پھر گلوڑ پہننے لگا۔ سرکس کے اندر کی جانب موجود دروازے کے آگے لگے ہوئے پردے کا کچھ حصہ چاک ہوا۔ اور مغلڈا ہاتھوں میں گلوڑ پہنے نمودار ہوا۔ ہال میں موجود تماشا بینوں نے شور مچا کر اس کا استقبال کیا۔ رنگ کے قریب پہنچ کر اس نے چھلانگ لگائی اور حسب معمول رسیوں کو پھلانگ کر رنگ کے درمیان میں آکھڑا ہوا۔ بیلی بیکر نے دونوں کے گلوڑ چیک کئے اور پیچھے ہٹ کر راؤنڈ شروع ہونے کی دہلی بجا دی۔

ہارڈی نے اگلے بیچوں پر اچھلنے کی کوشش کی۔ لیکن زیادتی شراب نوشی کی بدولت لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے اپنے آپ کو فوراً سنبھال لیا اور آگے بڑھ کر پناہ نامکام مغلڈا کے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ مکے میں شدت نہیں تھی۔ اس کے باوجود مغلڈا نے چہرہ ایک جانب کرتے ہوئے وار خالی جانے دیا اور لیفٹ ہک ہارڈی کی دہائی پسلیوں پر رسید کر دیا۔ سکے کی شدت کی بدولت ہارڈی کو اپنا شراب سے بھرا معدہ الٹا محسوس ہوا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن مقصد میں ناکام رہا۔ اور فوارے کی صورت میں شراب منہ سے باہر نکل کر رنگ کو بھگونے لگی۔ ہارڈی کے پاؤں میں لرزش پیدا ہوئی۔ اور وہ رنگ کے درمیان گرنا چلا گیا۔ تماشا بینوں کے شور سے سرکس کا ماحول گونگ اٹھا۔ بیکر نے کتنی گنی شروع کی۔ لیکن کتنی ابھی پانچ تک نہیں پہنچی تھی کہ ہارڈی سر جھٹک کر دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جسم پر موجود شرٹ آدھی سے زیادہ گیلی ہو گئی تھی۔ معدہ کی حد تک خالی ہونے کی بدولت اسے اپنے اوسان بحال ہوتے محسوس ہونے لگے۔ اس نے ایک دفعہ پھر اپنے سر کو جھٹکا اور آگے بڑھ کر تابلو زکوں کی بارش کر دی۔ مغلڈا ”اوک اوک“ کی آواز نکالتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی کمر رسیوں کے ساتھ جا لکرائی۔ ہارڈی نے آگے بڑھ کر سیدھے ہاتھ کا پناہ تلاش اس کے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ لیکن مغلڈا ا

بھاری ہارڈی کے ساتھ لپٹ گیا۔ وہ ایسا کر کے اس کے کونوں سے مہو نظر رہنا چاہتا تھا۔ ہارڈی نے اپنے ہاتھ کو اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی۔ لیکن مغلڈا کی گرفت مضبوط تھی۔ اور ہارڈی کسی حد تک نشے میں دھت تھا۔ مغلڈا نے اپنا ہک محبت کی شدت سے مغلوب ہو کر اس کے چہرے کو چومنا شروع کر دیا۔ ہال میں موجود لوگوں نے زور دار تہنہ لگایا۔ اور مغلڈا کے حق میں نعرہ لگانے لگے۔

ہارڈی نے جھنجھلا کر اپنے آپ کو مغلڈا کی گرفت سے آزاد کیا اور غصے کی حالت میں اندھا دھند کونوں کی بوجھاڑ کر دی۔ مغلڈا اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو اس کے حملوں سے بچاتا رہا۔ پھر اس نے سیدھے ہاتھ کا ایک مکا پوری طاقت کے ساتھ ہارڈی کے چہرے پر رسید کر دیا۔ ہارڈی چاروں شانے جت زمین پر گرنا چلا گیا۔ بیلی بیکر نے کتنی شروع کی۔ لیکن ہارڈی کا جسم بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس مختصر لڑائی کے دوران بیکر اس بات سے بخوبی آشنا ہو گیا تھا کہ مغلڈا کا تریف کوئی عام انسان نہیں تھا بلکہ ایک منجھا ہوا پاکر تھا۔ جس کا رنگ کی دنیا سے رشتہ کافی عرصے سے تھا۔ رپورٹر جیسے اس نے لڑائی کی تصاویر مختلف زاویوں سے اتاری تھیں۔ ہارڈی کو زمین پر گرتے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے علاوہ مسرت کے تاثرات ابھرنے لگے۔ اور اس کے علاوہ ایک ایسے منصوبے کا تانا بانا بھی۔ جس نے بعد ازاں ننگرو کو عالمی ٹڈل ویٹ چیمپئن کی صف میں لا کھڑا کیا۔

دوسرے دن نیویارک ٹائمز اخبار کے اسپورٹس ایڈیٹر کی صف اول کی سرخیوں میں پہلی سرخی موجود تھی۔ اس نے اسپورٹس کی دنیا والوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

گرتی کچھ یوں تھی۔

جانور نے عالمی ٹڈل ویٹ چیمپئن شپ کا اعزاز حاصل کر لیا۔

نیچے تفصیل موجود تھی۔

گزشتہ روز جیری ٹاؤن میں سرکس کے معمولی

ایکٹ کرنے والے جانور نے عالمی ٹڈل ویٹ چیمپئن کا اعزاز رکھنے والے ہارڈی ڈوم کو پچاس کے قریب افراد کے سامنے ہرا دیا۔ نیویارک ٹائمز کا اسپورٹس ایڈیٹر بذات خود وہاں موجود تھا۔ مقام پہلے راؤنڈ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ہانگ سے متعلق رکھنے والے ننگرو نے پہلے راؤنڈ کے دوران ہارڈی کو ناک آؤٹ کر دیا۔ نیچے مقابلے کی باقاعدہ تفصیل موجود تھی۔ جس میں اس بات سے مکمل طور پر پردہ پوشی کی گئی تھی کہ ہارڈی مقابلے کے دوران نشے میں دھت تھا۔ تفصیل کے ساتھ صورت حال کو رنگین تصویروں کے ساتھ مزین کیا گیا تھا۔ جیسے ہی نیویارک ٹائمز کا اسپورٹس ایڈیٹر ریلیز ہوا۔ اس کے کچھ دیر بعد ہی ہارڈی کے علاوہ اس کے منجھ اور نیویارک ٹائمز کے اخبار کے فون کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ لوگ خبر کی تصدیق کے لئے فون کر رہے تھے۔ وہ مغلڈا نامی ننگرو سے ملنا چاہتے تھے۔ جس نے ٹڈل ویٹ چیمپئن کو ایک ہی راؤنڈ کے دوران ہرا کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ کچھ لوگ ہارڈی کو ختم بھوی یعنی جبری ٹاؤن کی جانب کھڑے ہوئے جہاں جون میری سرکس کے بڑے پنجرے میں مغلڈا بند تھا۔ لوگوں نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے کھانے کے لئے کیلے اور چوک بار چاکلیٹیں دیں۔ مغلڈا نے خوش ہو کر ان کے ہاتھ پر بیار دیا۔ دوسری جانب نیویارک ٹائمز کے اسپورٹس ایڈیٹر کے لمبے چوڑے آفس کے درمیان کرسیوں پر اس وقت تین افراد کے درمیان دنیا کا سب سے عجیب و غریب معاہدہ طے پا رہا تھا۔ ایڈیٹر جیس بیلی بیکر اور جعفر۔۔۔۔۔ ایڈیٹر جیس ہمکا تھا۔

”تم دونوں کو یہاں بلانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں نے جبری ٹاؤن کی مختصر فائٹ کے دوران یہ بات بخوبی محسوس کر لی تھی کہ مغلڈا کے اندر خدا داد صلاحیتیں موجود ہیں۔ تم دونوں اس بات سے یکسر نادانف ہو کہ اس وقت فائٹ کے دوران جس انسان کو شکست دی ہے۔ وہ کوئی عام انسان نہیں تھا بلکہ ٹڈل ویٹ چیمپئن شپ کا درجہ رکھنے والا ہارڈی ڈوم تھا۔“ بیکر



اور جعفر کی آنکھیں حیرت کی بدولت پھٹنے لگیں۔ جیسے مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہارڈی ڈوم فائٹ کے دوران مکمل طور پر نشے میں دھت تھا۔ اس لئے مغلڈا کو شاید زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔ لیکن میرے اندازے کے مطابق اگر وہ جدوجہد کرے۔ تب ہارڈی کو باقاعدہ رنگ کے درمیان ہرا سکتا ہے۔ سوچو اگر ایسا ہو جائے۔ تب میرے علاوہ تم دونوں بھی دنیا کے امیر ترین انسان بن جاؤ گے۔ کیا خیال ہے؟“ جیسے خاموش ہو گیا۔ بیکر بولا۔

”لیکن جناب ایسا بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔ میں باکسنگ کے شعبے سے تقریباً تیس سال منسلک رہا ہوں اور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ باکسنگ کے مقابلے کے لئے وزیر اسپورٹس کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس اجازت کے لئے کسی جیتے جاگتے انسان کا سامنے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جانور کو وزیر اسپورٹس بھلا کیوں اجازت دینے لگا۔“

”یہ سب میرا کام ہے۔“ جیسے درمیان میں بات کاٹ کر بولا۔ ”کرل بیوش کے ساتھ میرے تعلقات اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ عوام کے دلوں میں ہمدردی کے جذبات ابھارنے کے لئے ہمیں کچھ مختصر اقدامات کرنے ہوں گے۔ جن میں سرفہرست قدم میڈیا کی مدد سے ملحق ہے اور میڈیا کے سرکردہ افراد میرے حامی ہیں۔“ بیکر نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”لیکن آپ یہ سب کیوں چاہتے ہیں۔ کیا صرف پیسے کے لئے..... یا پھر شہرت کے لئے.....؟ یہ سب کچھ تو آپ کے پاس اس وقت بھی موجود ہیں۔“ جیسے بولا۔

”شہرت کے لئے..... اور کچھ پیسے کے علاوہ میں ہارڈی کو ہارتے ہوئے بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ کہ وہ اس کھیل کے لئے نا اہل ہونے کے باوجود ایک ایسے اعزاز کو ہتھیائے

ہوئے بیٹھا ہے۔ جس کا حق دار وہ نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ تمہیں یا پھر نیو یارک کی کروڑوں پر مشتمل عوام کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ ہارڈی کی پشت پناہی اظہر دروزلہ کی سب سے بڑی تنظیم مافیا کر رہی ہے۔ اس کے سربراہ کا اصل نام کوئی نہیں جانتا۔ فرضی نام انکل نوٹو ہے۔

وہ ہر سال کروڑوں روپے کے جوئے کا اہتمام کرتا ہے۔ باکسنگ کے موجودہ کھیل پر..... نیو یارک میں باکسنگ کے کھیل کے شائقین کی تعداد کو شمار کرنا ناممکن ہے۔ تم خواہ اندازہ کر سکتے ہو۔ کہ جوئے کی اہمیت ان دنوں کتنی بڑھ جاتی ہوگی۔ لیکن اس جوئے میں جیت انکل نوٹو کے منظور نظر کی ہوتی ہے۔ اگر آج ہارڈی ڈوم ہے۔ تو کل بونی مارے بھی ہو سکتا ہے۔ اور کل اگر سونی مارے ہے۔ تو پرسوں کوئی بھی لپکا لپکا ہو سکتا ہے۔ میرے خیال کے مطابق اسپورٹس جیسے صاف شفاف شعبے کو گندہ کرنے والی ہستی صرف اور صرف انکل نوٹو کی ہے۔ میں اسے تباہ ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے دماغ میں سوال ابھرے گا..... بھلا کیسے.....؟ تو پوچھتے بغیر بتائے دیتا ہوں۔ انکل نوٹو جیسی چالاک اور صاحب حیثیت شخصیت کسی بھی جانور پر پیسہ لگانے سے گریز کرے گی۔ ظاہر ہے وہ مغلڈا کے مد مقابل پر پیسہ لگائے گا۔ لیکن اس دفعہ مغلڈا کے مد مقابل کی بار ہوگی اور یوں اسے ہارتے ہوئے دیکھ کر مجھے دلی سکون محسوس ہوگا۔ وہی بات مقابلے کے اہتمام کی..... تو اہتمام کرنا میرے لئے مشکل نہیں ہے۔ لیکن جیسے میں پہلے بتا چکا ہوں۔ اس سے پہلے کچھ مراحل سے گزرنا ہوگا۔ ویسے بھی ہمارے پاس ابھی کافی وقت بڑا ہے۔ باکسنگ کے بڑے مقابلے میں تقریباً ایک سال باقی ہے۔“

”ہم دونوں تیار ہیں۔“ بیکر اور جعفر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر اب میری ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اس معاملے کو مکمل طور پر راز داری کے ساتھ سرانجام دینا ہے۔ اپنے معمولات زندگی میں فرق نہیں آنے

دیا۔ سرس میں جو ایکٹ کر رہے ہو۔ وہ کچھ دنوں تک کرتے رہو۔ لیکن جب بھی میں بلاؤں گا تب تمام کام چھوڑ کر چلے آنا۔ سب سے پہلے ہمیں لائنس کے اصول کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ معمولی مرحلہ ہے۔ میں بونی کرل بیوش کو اس بات پر آمادہ کر لوں گا کہ وہ ہمیں جانور سے متعلق لائنس دے دے۔ بصورت دیگر جانور کو رنگ کے اندر لانا ممکن نہیں ہوگا۔“ جعفر اور بیکر نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر کمرے سے باہر کی جانب چل دیئے۔

وہ تمام رات جعفر اور بیکر نے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر سوچتے ہوئے گزاری۔ جعفر کا کہنا تھا کہ منصوبہ بے کار ہے۔ ایک جانور کسی مڈل ویٹ چیمپئن شپ کا اعزاز رکھنے والے انسان سے کیونکر لڑ سکتا ہے۔ وہ تو سرس میں ایکٹ کرنے والا معصوم جانور ہے۔ اگر خدا داد صلاحیتوں کا حامل ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کسی تربیت یافتہ انسان کو ہرا کر مڈل ویٹ چیمپئن شپ کا اعزاز چیمپئن سکے۔ کچھ ایسی ہی سوچ بیکر کی بھی تھی۔ وہ تیس سال تک باکسنگ کے شعبے سے منسلک رہ چکا تھا۔ تیس سال میں سے چندہ سال چیمپئن شپ کا اعزاز اس کے ہمراہ رہا تھا اور وہ جانتا تھا اس کے لئے اسے کتنی سخت جدوجہد کرنا پڑنی تھی۔ کیا ایک جانور ایسی جدوجہد کا تحمل ہو سکتا ہے۔ ناممکن.....؟ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ وہ یہ جو اکیلے کر دیکھنا چاہتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ جیسے کی واقفیت کچھ اور رنگ لا دکھائی۔ اس لئے بیکر نے آنکھیں موئد لیں۔

دوسرے دن جعفر کو گھر والوں کی جانب سے خط موصول ہوا۔ جس میں دل دہلا دینے والی خبر موجود تھی۔ ماریا نے خودکشی کر لی تھی۔ جعفر نے بیکر کے ہمراہ لوئی ٹاؤن کا رخ کیا۔ لوئی ٹاؤن کے بچے بچے کی زبان پر جو کہانی رقص کر رہی تھی۔ اس کہانی کا سین جعفر تھا۔ تمام لوئی ٹاؤن ان دونوں کی محبت سے آتشا تھا۔ اور وہ ماریا کی خودکشی کو جعفر کے ساتھ منسلک کر رہے تھے..... کچھ

ایسی ہی بہر کیف جب جعفر تعزیت کے لئے تیار کے گھر گیا۔ تب اسے باتوں کے درمیان ایک عجیب بات معلوم ہوئی۔ ماریا نے خودکشی کرنے سے پہلے خطوں کا مختصر پلندہ جعفر کے نام چھوڑا تھا۔ جولاک کے ذریعے بند کیا گیا تھا۔ جعفر کا تیار اپنی لڑکی کی موت کے بعد اب اپنے کئے پر شرمندہ تھا۔ اور لڑکی کی آخری خواہش کو اہمیت دینے کے لئے تیار تھا۔ یہ خط انہیں ڈاک کے ذریعے موصول ہوئے تھے۔ جعفر نے خطوں کا پلندہ اٹھایا۔ اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے بے تابی کے ساتھ پارسل کو کھولا۔ اور خطوں کو نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ تقریباً چندہ کے قریب خطوں میں اس کے علاوہ اور کوئی بات لکھی نہیں دکھائی دی کہ اس کے اپنے شوہر کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہیں۔ اور وہ اس پر بے تحاشا تشدد کر رہا ہے۔ لیکن سولویں خط میں ایک ایسی بات موجود تھی۔ جس نے جعفر جو چونکا کر رکھ دیا۔ وہ انکل نوٹو کا نام تھا۔ جعفر نے خط علیحدہ کیا۔ اور باقی خطوں کو احتیاط کے ساتھ پارسل میں رکھنے کے بعد خط کا مطالعہ شروع کیا۔ لکھا تھا۔

میرے محبوب: آج کا خط شاید میرا آخری خط ہوگا۔ یہ تمام خط تمہیں ارسال کرنا ممکن نہیں ہیں۔ کسی نہ کسی طور تمہیں پہنچانے کی کوشش کروں گی۔ جنید کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا اصرار ہے کہ میں غلط قسم کے لوگوں سے تعلقات استوار کرنا یکھوں۔ مختصر کپڑے، شراب نوشی اور عیارانہ طبیعت..... یہ سب کچھ میرے اختیار سے باہر ہے۔ روزانہ کے لڑائی جھگڑوں سے میں تنگ آ چکی ہوں۔ لیکن ابو کے غلط فیصلے کا کوئی بھی حل میرے دماغ میں موجود نہیں ہے اور مسئلہ کو سلجھانا میرے اختیار سے باہر ہے۔ شاید مجھے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ کچھ دنوں سے جنید میرے ساتھ نرم سلوک روا رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے اس کے رویے میں سازش کی بو آتی محسوس ہو رہی ہے۔ اس کا رویہ مشکوک ہے۔ وہ گھٹنوں کسی پر اسرار شخص کے ساتھ



فون پر بات چیت کرتا رہتا ہے۔ میں نے سننے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ زیادہ نہ سمجھ پائی۔ سوائے اس کے کہ وہ فون پر موجود شخص کو پاس کہہ کر پکارتا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے ایک دفعہ انکل نوٹو کہہ کر بھی مخاطب کیا تھا۔ نہ جانے یہ انکل نوٹو کون ہے؟ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میری زندگی کا خوشگوار ترین لمحہ رات کا وہ پہر ہوتا ہے۔ جس میں..... میں تمہیں خط لکھتی ہوں۔ اس کے علاوہ تمام دن تلخ ترین ہوتا ہے۔

یہاں تک پہنچ کر خط بند ہو گیا۔ پھر جب دوبارہ شروع کیا گیا۔ تب لکھا تھا۔ رات گیارہ بجے جب جنید کمرے میں داخل ہوا۔ تب مکمل طور پر شراب کے نشے میں دھت تھا۔ اس کے ہمراہ ایک لمبے چوڑے قد و قامت کا شخص بھی موجود تھا۔ جس کے چہرے پر خباثت ثبت تھی۔ جنید نے اس کا تعارف انکل نوٹو کے نام سے کروایا۔ انکل نوٹو نے ہوس بھری نگاہوں سے میرے سر ایلے کا جائزہ لیا۔ اور جنید کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ میں کچھ کچھ معاملے کی تہ تک پہنچ چکی تھی۔ اس لئے میں نے بھی جنید کے ہمراہ کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن جنید نے دھکا دے کر مجھے کمرے کے درمیان میں انکل نوٹو کی جانب دھکیل کر دروازے کو جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ میں جیتنی چلاتی دوبارہ دروازے کی جانب لپکی۔ لیکن انکل نوٹو نے باز کی مانند جھپٹ کر مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ تمام رات مجھ پر کیسے گزری۔ میں بتا نہیں سکتی۔ لیکن گھر پہنچتے ہی میں نے پہلا کام تمہیں خط لکھ کر پورا کیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کروں گی۔ شاید زندگی کا خاتمہ..... زندہ رہ کر اب میں نے کرنا بھی کیا ہے۔ لیکن اتنی دعا ضرور کرتی ہوں کہ خدا تمہیں خیر و عافیت کے ساتھ رکھے۔ اور اگر مجھے دوبارہ زندگی نصیب ہو..... تب خدا مجھے تمہارے ساتھ نصیب کرے۔

خط ختم ہو گیا۔ جعفر کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ وہ نیکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ماریا پر گزرنے والے حالات وہ بیکسر

ناواقف رہا تھا۔ انکل نوٹو کی گھناؤنی سازش اس کے دماغ پر گہرے تاثر چھوڑتی جا رہی تھی۔ اسے اس کی شخصیت سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اور جسے کی شدت سے اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں جھنجھکی اٹھیں۔ پھر اسے بیکہ کا خیال آیا۔ وہ یقیناً باہر اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ جفر اچھل کر بستر سے نیچے اترا اور ہاتھ روم کی جانب چل دیا۔

دوسرے دن وہ دونوں دوبارہ جون میری سرکس پہنچ گئے۔ ان دونوں کی غیر موجودگی کے دوران باکسنگ کے ایک کووٹنی طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ بیکر کی عدم موجودگی کے دوران مغلڈا باکسنگ کرنے سے صاف انکار کر دیتا تھا۔ بیکر اس کا استاد تھا۔ اور معصوم جانور اپنے استاد کے اشاروں پر تاج کر کے محسوس کرتا تھا۔ بہر حال شام کو بیکر اور جعفر کو چپس کا فون موصول ہوا۔ اس نے دوسرے دن جعفر اور بیکر کو اپنے آفس میں آنے کی دعوت دی۔ اور خوشخبری بھی سنائی کہ دونوں کی غیر حاضری کے دوران اس نے وزیر اسپورٹس سے نیلی بیکر کے لئے لائسنس حاصل کر لیا ہے۔ اب صرف لائسنس پر بیکر کے دستخط بقیہ رہ گئے تھے۔ دوسرے دن بیکر اور جعفر نے اس کے آفس کا رخ کیا۔ لائسنس پر دستخط کئے۔ اور اب تقابلیہ نگاہوں سے جیس کی جانب دیکھنے لگے۔

”ابھی تک بہت سے مراحل باقی ہیں۔“ وہ بولا۔ ”تمہیں قانونی طور پر لائسنس دلوانا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ تمہارا حق تھا۔ لیکن جانور کو لائسنس دلوانا نہایت مشکل عمل ثابت ہوگا۔ بہر حال جانور کی مقبولیت کے لئے میں نے زوم ٹی وی کے پروگرام منیجر سے بات چیت کی ہے۔ بچوں کی مختصر ٹیلی فلم کے لئے اس نے ٹکڑو کو سائنس کرنے کی حای بھری ہے۔ اب تم دونوں کے لئے پیسوں کی ریل پیل شروع ہونے والی ہے۔ لیکن اس بات کو بھول نہیں جانا کہ ہمارا مقصد ہارڈی کو شکست دینا ہے۔ اور ہارڈی کے سربراہ کا نام انکل نوٹو ہے۔“ جعفر کی آنکھیں غصے کی بدولت سرخ

ہونے لگیں۔ وہ چمکارتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”انکل نوٹو مجھے کہاں مل سکتا ہے۔ میرا اور اس کا معاملہ ذاتی حدود کو تقریباً پھیلاؤ چکا ہے۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا ہوں۔“ جیس نے حیرت بھری نگاہوں سے جعفر کی جانب دیکھا۔ پھر بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اس نے تمہارے گھرانے کی کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی کی ہوگی۔ وہ لڑکیوں کا رسیا ہے۔ میری اور اس کی دشمنی بھی اس حد تک محدود ہے کہ اس نے میری ہونے والی بیوی کو بیچ شہر سے اغوا کر لیا۔ دوسرے دن اس کی لاش کوڑے کے ڈرم سے اس طرح لی کہ اس کے تمام جسم کو سگریٹوں کے ساتھ داغا گیا تھا۔ بعد ازاں عزت لوٹنے کے بعد کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا گیا۔ اگر بات ایسی ہی ہے تو تم فکر نہیں کرو۔ میں ہر لحاظ سے تمہارے ساتھ ہوں۔ اب ہم تینوں کا مقصد اسے کیفر کر دیا تک پہنچانا ہوگا۔“ جعفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ماریا کی داستان بیان کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر حزن و دملال کے تاثرات ابھرنے لگے۔ چہرہ خون کی گردش کی بدولت سرخ ہونے لگا۔ اور انھوں کی مٹھیاں جھنجھکی اٹھیں۔ اس کی کہانی سننے کے بعد جیس نے اسے دلا سادیا۔ پھر بولا۔

”میرے اندازے کے مطابق جنید یقیناً انکل نوٹو کے پوشیدہ وجود سے واقفیت رکھتا ہوگا۔ لیکن ہمیں اسے چھیڑنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ہم پہلے ہارڈی کو شکست دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جو بھی ڈل ویت چیمپئن کا اعزاز حاصل کرے گا۔ انکل نوٹو اسے خریدنے کی پوری کوشش کرے گا۔ چاہے وہ جانور ہی کیوں نہ ہو۔ ہم تھوڑی سی شد و دم کے بعد مغلڈا کو اس کے ہاتھوں فروخت کر دیں گے۔ بعد ازاں چیمپا کر کے اس کے ٹھکانے کا پتا لگانے کی کوشش کریں گے۔“ جیس خاموش ہو گیا۔

تب بیکر بولا۔ ”اور زوم ٹی وی کی ٹیلی فلم کی کیا کہانی ہے؟“

”زوم ٹی وی کا پروگرام منیجر جوگی میرا کلاس فیلو

ہے۔ میں نے اسے مختصر ٹیلی فلم کی وہ کہانی سنائی۔ جو کچھ عرصہ قبل میں نے لکھنی شروع کی تھی۔ یہاں یہ بھی بتانا چلوں کہ میں کافی طویل عرصے سے زوم ٹی وی کے لئے لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ ملین بچوں کے لئے پہلی دفع لکھ رہا ہوں۔ وجہ صرف مغلڈا کو مقبولیت دلوانا ہے۔ ہارڈی کے ساتھ مقابلے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے عوام میں..... خاص کر بچوں میں کچھ نہ کچھ مقبولیت حاصل ہو۔ میں بچوں کی ٹیلی فلم پر کام کر رہا ہوں۔ ایک ہفتے کے بعد شوٹنگ متوقع ہوگی اور امید کرتا ہوں کہ تقریباً دو مہینے کے بعد ٹیلی فلم ریلیز کر دی جائے گی۔“ نیلی بیکر اور جعفر نے اثبات میں سر ہلادیا۔

ایک ہفتے کے بعد جیس نے نیلی بیکر اور جعفر کے ہمراہ اسپورٹس کے وزیر کرل چیوس سے ملاقات ہوئی۔ مدعا سننے کے بعد کرل انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہائمن..... میں تم لوگوں کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ کاش میں تمہارے کسی کام آ سکتا۔ لیکن اس سلسلے میں میرا جواب صرف نہیں ہوگا۔“

”معتقول بات ہے۔“ جیس سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تم ہمیں انکار کی وجہ بتاؤ گے اگر وجہ معتقول ہوئی تو ہم اصرار نہیں کریں گے۔“

کرل بری طرح چونکا۔ ”وجہ..... کیا مطلب.....؟“

جیس طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”تاکہ میں نیویارک ٹائمز کے پچیس لاکھ قارئین کے سامنے اس فائٹ کے سلسلے میں تمہارا نقطہ نظر پیش کر سکوں۔ میرے قارئین مفت خوراک فنڈ کے معاملے میں بہت حساس ہیں۔ اور میں اپنے خصوصی ایڈیشن میں اس فائٹ کے سلسلے میں تمہارا نقطہ نظر پیش کر کے انہیں تمہارے خلاف کر دوں گا۔“

”وجہ..... وجہ.....“ کرل بڑبڑایا۔ پھر چونک کر بولا۔ ”ہاں باکسنگ کے قوانین و ضوابط.....“

”میں بھی جانتا ہوں کہ ریاست نیویارک میں باکسنگ کے قوانین و ضوابط کیا ہیں؟“ جیس بولا۔ ”بلکہ



وہ اس وقت بھی میرے پاس موجود ہیں۔ اس نے بریف کیس کھول کر کتابچہ کھولا۔ پھر بولا۔ ”اس میں کوئی ایسی شق موجود نہیں ہے۔ جس کی رو سے ایک انسان اور کنکرو میں پندرہ راؤنڈ کی ٹائٹل فائٹ غیر قانونی ہو۔“

”درست ہے۔ ایسی احتقانہ بات لکھی بھی نہیں جاسکتی۔ یہ خیال کسی کو آ بھی نہیں سکتا۔“ کرٹل سر ہلا کر بولا۔

”ہمیں آیا ہے۔“ جیس نے سیدہ ٹھونک کر کہا۔ ”بات صرف اتنی ہے کہ قانون انسان اور کنکرو کے درمیان مقابلے کو منع نہیں کرتا۔ اور پھر وہ کنکرو جو عالمی چیمپئن کو ایک بار ناک آؤٹ کر چکا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن قانون بنانے والوں کے ذہن میں یہ تو نہیں تھا کہ انسان جانوروں سے لڑیں گے۔“ کرٹل احتقانہ انداز میں بولا۔

”وہ اگر زندہ ہوتا تو یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا کہ جانور بھی اس کے بنائے ہوئے ضابطوں کے مطابق لڑ سکتے ہیں۔ اس نے ضابطے بنائے تھے اور جو بھی حقوق ضابطوں کا احترام کرے۔ وہ باکسر ہے۔ اور باکسنگ کا اہل ہے۔“ جیس نے دلیل دی۔

”دیکھو بھائی..... خواہ مخواہ بحث نہیں کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ قانون کیا ہے؟ اور اس کے نفاذ کا طریقہ کار کیا ہے۔ اب میں اسے تبدیل تو نہیں کر سکتا۔“

”تمہیں معلوم ہے کرٹل..... کہ یہ قانون کب پاس ہوا تھا۔“ جیس نے پوچھا۔

”میرے خیال میں بہت پہلے کی بات ہے۔“ کرٹل گڑبڑا کر بولا۔

”ہاں ستمبر 1920ء کو..... اور کون سا سال ہے۔“

”1970ء“ کرٹل نے زچ ہو کر کہا۔

”تو گویا یہ قانون پچاس سال پرانا ہے۔ اور جدید دور کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ تمہیں معلوم ہے گزشتہ نصف صدی میں سپریم کورٹ نے آئین میں کتنی ترامیم کی ہیں؟“

”نہیں مجھے نہیں معلوم.....“ کرٹل اور گڑبڑایا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اسے ہر جانب سے گھیرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جیس نے بریف کیس کھول کر ایک فہرست باہر نکالی۔ جس میں سپریم کورٹ کے ان فیصلوں کا حوالہ تھا۔ جو آئین سے متصادم تھے۔ کرٹل نے اس پر ایک نظر ڈالی اور میز پر رکھ دیا۔

”اب ہم مقابلے کی اہمیت والے ضابطوں پر گفتگو کریں گے۔“ جیس نے ایک اور کاغذ نکالا۔ اور اس پر نظر ڈالی۔ ”باکسر کی عمر اکیس سال ہونی چاہیے۔ وہ معاشرے میں ناپسندیدہ نہ ہو۔ سز یافتہ مجرم نہ ہو۔ اس کے ناپسندیدہ لوگوں سے مراد نہ ہوں۔ وہ.....“

”ایک منٹ دوست.....“ کرٹل میز پر گھونسا مارتے ہوئے بولا۔ ”ہاں اکیس سال سے کم عمر باکسر کو پندرہ راؤنڈ کے مقابلے کی اجازت نہیں ہے جبکہ تمہارے کنکرو کی عمر دس سال ہے۔ میں کسی دس سال کے باکسر کو مقابلے کا لائسنس نہیں دے سکتا۔“

جیس نے دوبارہ بریف کیس کھولا۔ اور کرٹل تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اندر ہی اندر لڑ رہا تھا کہ خدا جانے اسے اس بار تھیلے سے کیا برآمد ہوگا۔

”میرے پاس بروکس زولو جینل گارڈن کے پروفیسر جونز کا حلیہ بیان موجود ہے۔“ جیس بولا۔ ”وہ جانوروں کا سرجن رہ چکا ہے۔ اس نے انسانوں اور جانوروں کی عمر کے موازنے کے سلسلے میں تحقیقی کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں اوسط عمر معیار کا کام دیتی ہے۔ انسان کی اوسط عمر 80 سال ہے۔ پروفیسر جونز کے بیان کے مطابق اگر کوئی بلی تیرہ سال تک زندہ رہتی ہے تو وہ انسانی اعتبار سے 90 سال کی ہے۔ کتے کی عمر ایک سال انسان کے سات سال کے مساوی ہوتا ہے۔ کنکرو اور انسان کی عمر کے درمیان ایک اور چار کی نسبت ہے۔ اس اعتبار سے مغلڈا کی عمر 32 سال ہوتی۔ یہ عمر ایک ایسے باکسر کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ جس نے ساری عمر اپنی صحت کا خیال رکھا ہو۔ زندگی میں کبھی شراب اور سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا ہو۔“ پھر اس نے وہ کاغذ کرٹل

کی جانب بڑھایا۔ جس میں تحقیق کے شواہد موجود تھے۔ کرٹل بری طرح بوکھلا گیا۔

”اے..... ایک منٹ..... دیکھ کچھ کرنے سے پہلے.....“ وہ بری طرح ہکھلانے لگا۔ ”کیا تم مجھے تباہ کرنا چاہتے ہو۔“

”کرٹل یاد رکھو۔ یہ 1970ء ہے۔ کم از کم ایک کروڑ افراد نے ٹی وی کے ذریعے مغلڈا اور سائیکلون رابرٹ کی فائٹ دیکھی ہے۔ وہ اب دیکھنا چاہتے ہیں کہ مغلڈا ہارڈی ڈوم کا کیا حشر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس فائٹ کے ذریعے بیس کروڑ الٹرا غریب بچوں کے مفت خوراک فنڈ میں پنچیں گے۔“ کرٹل کوڑھینگ کشن کا عہدہ بہت عزیز تھا۔ اس عہدے سے اس کا نام اخبارات کی زینت بنتا رہتا تھا۔ ”تم مجھے ملازمت سے نکلوانا چاہتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ نیویارک ٹائمز تمہاری پشت پناہی کر رہا ہے۔ گورنر اتنی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس جب میں یہ چھاپوں گا کہ ٹریننگ کشن نے اس فائٹ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ جس کی آمدنی ایک فلاحی ادارے کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ تو گورنر تم سے ناخوش ہوگا۔ اس کے بعد گورنر کو ووٹ کون دے گا۔ اور ظاہر ہے کہ گورنر کا زلہ تم پر ہی گرے گا۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھو کہ مغلڈا کے شیجروں کو لائسنس تم نے ہی دیا تھا۔“

”کیا..... کیا مجھے نہیں معلوم..... میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔ میں انہیں جانتا بھی نہیں.....“ کرٹل بری طرح بوکھلا گیا۔

”کچھ عرصہ قبل 19 اپریل کو تم نے اسے دستخط سے نیلی بیکر اور جعفر کو لائسنس دیا۔“ جیس مسکراتے ہوئے بولا۔

”اوہ..... مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کنکرو کے مالک ہیں۔ اور کنکرو کی باکسنگ کے شعبے میں آزمانا چاہتے ہیں۔ ورنہ میں صاف انکار کر دیتا۔“

”بہر حال کرٹل تم اچھی طرح سوچ لو۔ معاملہ

غریب بچوں کے مفت خوراک فنڈ کا ہے۔ تمہیں اچھی خاصی چیلنجی حاصل ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں میرا اخبار بھی حاضر خدمت ہوگا۔ تمہارے متعلق ایک لمبا چوڑا لیچر منتظر رہے گا۔“ کرٹل جھنجھلا کر بولا۔

”میں پہلے بتا چکا ہوں۔ مجھے اپنی نوکری عزیز ہے۔ اور نوکری پر حرف آئے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے بحالت مجبوری صاف انکار کرتا ہوں۔ میرے خیال میں سوچنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔“ کرٹل حتیٰ لچھے میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی.....“ جیس کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ”ہم اور لحاظ سے کوشش کریں گے۔ لیکن مغلڈا کا مقابلہ ہارڈی ڈوم سے ہو کر رہے گا۔ چاہے لائسنس کے بعد..... لیکن ہم کروا کر دیں گے۔“ جیس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور پاؤں پختہ ہوا باہر نکل گیا۔ بیکر اور جعفر اس کے پیچھے تھے۔

جب یہ تینوں نیویارک ٹائمز کے آفس میں داخل ہوئے۔ تب ان کے کرسیوں پر بیٹھنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جیس نے آگے بڑھ کر ریسپورنڈ کیا۔ پھر سمجھتا ہی تھا۔

”ہیلو..... کون کرٹل..... اچھا تو تمہیں بچوں کے فنڈ کا خیال آ گیا۔ ٹھیک ہے۔ فکر مت کرو۔ تمہارے متعلق لیچر کی تیاریاں میں آج ہی سے شروع کر دیتا ہوں۔ لیکن پہلے سچ بتاؤ کہ اچانک تمہارا ارادہ بدلنے میں ایسی کون سی طاقت کار فرما ہے۔ جو میرے اخبار سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ اس کے بغیر لیچر پر کام نہیں کروں گا۔“ پھر دوسری جانب کی بات سننے کے بعد اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرنے لگے۔ اور اس نے جھٹکے کے ساتھ ریسپورنڈ کر ڈیل پر رکھ دیا۔

”کیا ہوا.....؟“ بیکر نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”وہ مغلڈا کے متعلق لائسنس دینے کے لئے تیار ہے۔ اور ایسا اس نے انکل نوٹو کے کہنے پر کیا ہے۔“



ہے تاجرت کی بات..... میرے خیال میں انکل تو ابھی  
جوا کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر جوے میں ہار ڈی  
ہار گیا۔ تب نکلر و انکل تو نوکا منظور نظر ہوگا۔“  
”اب ہمیں مزید کیا کرنا ہوگا؟“ بلی بیکر نے  
پوچھا۔

”مڈل ویٹ چیمپئن شپ سے بانگ سے  
لئے تیاریاں.....“ جیس بولا۔ ”لیکن اس سے پہلے  
میں وہ فہرست حاصل کروں گا۔ جن کی بدولت  
لڑائیاں مرتب کی جاتی ہیں۔ دیکھو وہ فہرست کیا  
کہتی ہے؟“ بیکر اور جعفر نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور  
باہر کی جانب چل دیئے۔

ایک مہینے کے بعد فہرست ان کے ہاتھوں میں  
تھی۔ مغلڈا کو ہار ڈی سے مقابلہ کرنے سے پہلے مزید دو  
افراد کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا۔ نیویارک کا زولو اور  
واشنگٹن کا بیکر..... لسٹ مرتب ہوتے ہی اخباروں نے  
دھوم مچادی۔ مغلڈا ایک ایسا باکسر ہے جس کا کوئی حریف  
نہیں..... وہ محبت کا دیوتا ہے۔ انسانوں کو باکسنگ  
چھوڑنی ہوگی۔ وہ ایک پھر تیز بندر ہے۔ ہار ڈی کو  
دانتوں پسینہ آجائے گا۔ یہ مقابلہ سخت ترین ہوگا۔ ان  
تمام سرخیوں میں نیویارک ٹائمز سر فہرست رہا۔ وہ  
نمایاں طور پر مغلڈا کے حق میں خبریں شائع کر رہا تھا۔  
چونکہ نیویارک کا سب سے بڑا اخبار تھا۔ اس لئے نا  
چاہنے کے باوجود باقی تمام چھوٹے اخبار اس کی پیروی  
کرنے پر مجبور تھے۔ مقابلے کی تیاریاں عروج پر تھیں۔  
تینوں مقابلوں کا اہتمام تین مختلف شہروں میں کیا گیا  
تھا۔ پہلا مقابلہ واشنگٹن کے جنس ہال میں مرتب کیا گیا  
تھا۔ جس میں مقابلے کے انتظامات کے سلسلے میں بہت  
زیادہ مصروف تھا۔ پریس سیٹوں کے لئے بیرونی ممالک  
تک سے درخواستیں ملتی تھیں۔ صرف آسٹریلیا سے تیس  
رپورٹر آ رہے تھے۔ آمدنی کو تیس لاکھ ڈالر تک پہنچانے  
کے لئے جیس کو بہت زیادہ دماغ سوزی کرنا پڑی۔ پھر  
اسے عطیات سیکشن والا آئیڈیا سوچا۔  
پریس سیکشن کی پہلی پانچ قطاریں ان لوگوں کے

لئے مخصوص کر دی گئیں۔ جو مفت خوراک فنڈ میں ایک  
ہزار ڈالر عطیہ دیتے۔ اس کے بعد کی دس قطاریں ڈھائی  
سو ڈالر فی نشست کی تھیں۔ رنگ سائیز کی فٹنس سوڈا  
والی تھیں۔ سب سے کم ریٹ پچیس ڈالر تھے۔ جیس نے  
مغلڈا کے ہی رستاروں کا خاص خیال رکھا تھا۔ ان کے  
لئے دس ہزار پچیس موجود تھیں۔ ریٹ پانچ ڈالر تھا۔  
انجمن انداد بے رحم حیوانات نے تمام انتظامات کا  
جائزہ لیا۔ اور انہیں تسلی بخش قرار دیا۔ انہوں نے  
جانوروں کے سرجن کو رنگ کے باہر موجود رہنے کی  
خصوصی اجازت دی۔ اس کے علاوہ مغلڈا کی حفاظت  
کے سلسلے میں انتظامات کئے گئے۔

اس وقت زولو ہال کے اندر بنے کمرے میں  
موجود تھا۔ پہاڑی مانند جسامت رکھنے والے زولو کا  
وزن ایک سو چالیس پاؤنڈ تھا۔ جسم طاقتور اور سانچے  
میں ڈھلا ہوا تھا۔ کمرے کے دوسرے حصے میں مغلڈا  
کے علاوہ جعفر بیٹھا تھا۔ جعفر کے چہرے پر پریشانی کے  
تاثرات ابھر رہے تھے۔ بیکر صبح سے غائب تھا۔ یہ عجیب  
انہونی تھی۔ جعفر اچھی طرح جانتا تھا کہ بیکر کی عدم  
موجودگی میں مغلڈا لڑنے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔  
اور اب بیکر کی عدم موجودگی اس بات کا اظہار کر رہی تھی  
کہ مقابلہ ملتوی کرنا ہوگا۔ پھر ناؤ نسر نے مقابلے کا  
اعلان کرنا شروع کر دیا۔ زولو نے نفرت بھری نگاہ مغلڈا  
پر ڈالی۔ جو زمین پر بیٹھا کیلے کھانے میں مصروف تھا۔  
پھر اٹھ کر کمرے سے حق ہال کی جانب چل دیا۔  
جعفر نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ پونے گیارہ  
بجے والے تھے۔ مقابلہ شروع ہونے میں صرف پندرہ  
منٹ باقی تھے۔ ہال کمرے کا دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھلا  
اور جیس کمرے میں داخل ہوا۔

”بلی بیکر کہاں ہے؟“ اس نے چھوٹے ہی  
پوچھا۔ جعفر نے لاعلمی میں سر ہلایا۔  
”کیا یہ بلی بیکر کے بغیر مقابلہ کرے گا۔“  
جعفر نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”پھر میرے خیال میں  
مقابلے کا فیصلہ جیوری زولو کے حق میں دے دے گی۔“



جعفر اسے تلاش کرو۔ ”ورنہ سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔“

دوسری جانب بلی بیکر کے اغوا کا منصوبہ اس خوبصورتی سے بنایا گیا کہ وہ خود بھی اس سے بے خبر نہ رہ سکا۔ وہ ایک زرد سیڈان کے قریب سے گزرا۔ کار کے پاس دو مرد اور پرکشش لڑکی گفتگو میں مصروف تھے۔ بیکر کو دیکھتے ہی وہ تینوں اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”ہیلو جیک.....“ ایک مرد نے اسے مخاطب کیا۔ ”تم یہاں کب آئے؟“

”اوہ جیک ڈارلنگ.....“ لڑکی بے حد خوش ہو کر چینی اور بیکر سے لپٹ گئی۔ بیکر کا خیال تھا کہ وہ لوگ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ کچھ کہنے والا تھا کہ کسی نے اس کی ہپ پاکٹ سے پستول نکال کر اس کی کمر سے لگا دیا۔

”مسکراتے رہو دوست.....“ اس کے کانوں میں آواز سنائی دی۔ ”صرف ہم ہی تمہیں دیکھ کر خوش نہیں ہوئے ہیں۔ تم بھی خوش ہوئے ہو۔ لہذا تمہیں بھی اظہار مسرت کرنا چاہئے۔ خاموشی کے ساتھ کار میں بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہیں یہاں کے قابل دید مقامات کی سیر کروائیں گے۔“ بیکر نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے اغوا کیا جا رہا ہے۔ سڑک پر ٹریفک کی ریل چل رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر لوگ کثرت سے آ جا رہے تھے۔ قریب ہی ایک ٹریفک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس کو تلاش کو با آسانی ناکام بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن پیچھے کھڑے شخص نے یہ بات بھائی لی۔

”تمہیں دوست..... ایسا نہ کرنا۔ ورنہ سیدھے مردہ خانے پہنچ جاؤ گے۔“ زندگی بلی بیکر کو بھی بہت عزیز تھی۔ چنانچہ وہ کار میں بیٹھ گیا۔ رپورٹ والا اس کے ہمراہ اگلی سیٹ پر بیٹھا۔ لڑکی ڈرائیور کے ساتھ تھی۔ کار آگے بڑھی۔ لیکن رفتار بہت کم تھی۔ جیسے انہیں کوئی جلدی نہ ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ تفریح کی غرض سے نکلے ہوں۔ پولیس افسر کے قریب سے کار گزرتی تو لڑکی

نے اس کی جانب ایک مسکراہٹ اچھال دی۔ اور ہاتھ لہرانے لگی۔ بیکر کو یقین ہو گیا کہ وہ لوگ اسے ٹھکانے لگانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔

”تم لوگ چاہتے کیا ہو؟“

”صرف تمہاری رقابت میرے دوست.....“

اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے.....“ پستول والے نے جواب دیا۔

”اور اگر میں مدد کے لئے چیختا..... تو تم کیا کرتے۔“

”تمہیں گولی مار کر مردہ خانے پہنچا دیں۔“

جواب ملا۔ بیکر خاموش ہو گیا۔ وہ یقیناً ایسا کر سکتے تھے۔ اتنے زیادہ ٹریفک میں ان کی کار کا پتا بھی نہیں چلتا۔ کار سیکنڈ بلاک تک ہائی وے پر چلتی رہی۔ پھر انہوں نے ایک سائیڈ اسٹریٹ میں موڑ کر گاڑی روک دی۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیئے گئے۔ کافی دیر تک خاموشی رہی۔ ٹھیک گیارہ بجے لڑکی نے ریڈیو آن کر دیا۔ ریڈیو پر مردانہ آواز ابھری۔ ”لجے میں سن رہی تھی۔“

”ہاں وہ آ رہے ہیں۔ مغلڈا جھوٹی جھوٹی جیتیں لگا کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ جعفر اور جیس بھی ہیں۔ لیکن بیکر نہیں آ رہا۔ شاید وہ پیچھے رہ گیا ہے۔ زولو پہلے ہی رنگ میں موجود تھا۔ وہ تھوک رہا ہے۔ ارے..... یہ کیا..... یقیناً کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ مغلڈا آگے بڑھنے کے لئے تیار نہیں..... جعفر اس کی زنجیر کھینچ رہا ہے۔ لیکن مغلڈا اچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ اسے شاید کسی کی تلاش ہے۔“

”اوہ..... وہ بے چارہ مجھے تلاش کر رہا ہے۔“

بیکر دھکی لجے میں بولا۔

”ٹھیک سمجھ۔“ ڈرائیور بولا۔

اناؤنسر بول رہا تھا۔ ”وہ اسے کھینچ رہے ہیں۔“

جعفر اور جیس..... بلی بیکر کا کچھ بتائیں..... یقیناً کچھ گڑبڑ ہے۔ لیکن میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ مغلڈا انروں دکھائی دیتا ہے۔ وہ تینوں رنگ میں داخل ہو گئے ہیں۔ مغلڈا رنگ کے درمیان میں کھڑا ہے۔ اور چاروں

جانب دیکھ رہا ہے۔ اس کے دونوں ساتھی اسے دستانے پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں دشواری پیش آ رہی ہے۔ وہ اسے تختہ چارہ ہیں۔ چمکار رہے ہیں۔ لیکن مغلڈا بری طرح چل رہا ہے۔ شاید بیکر کے نہ ہونے کی وجہ سے..... ایک منٹ..... میں ذرا دیکھ لوں..... جی ہاں جعفر کا کہنا ہے کہ مغلڈا ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ بیکر بیمار ہو گیا ہے۔“

”بیمار ہو گیا ہے۔ لعنت ہو تم پر.....“ بیکر غرایا۔

”وہ میرے بغیر نہیں لڑے گا۔“

”ہمارا بھی یہی خیال تھا۔“ پستول والے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اناؤنسر کی آواز سنائی دی۔ ”مغلڈا اکو دستانے پہنا دیئے گئے ہیں۔ ریفری دونوں باکسروں کو آخری ہدایات دینے کے لئے رنگ کے درمیان میں بلا رہا ہے۔ کمال ہے مغلڈا وہاں جانے پر آمادہ نہیں ہے۔ اسے مجبور کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر وہ ہمیشہ اپنے حریف کو کس کرتا ہے۔ لیکن آج اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ پریشان ہے۔ آرزو ہے.....“

”تم پر لعنت ہو۔ مجھے جانے دو۔“ بیکر گڑگڑایا۔

”شٹ اپ“ لڑکی نے ڈانٹا۔ اور ریڈیو کی آواز بڑھادی۔

”وہ اپنے کارز میں واپس آ چکے ہیں۔ لجے گھٹی جی۔ زولو رنگ کے درمیان میں آ گیا ہے۔ لیکن مغلڈا اپنے کارز میں کھڑا ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔ شاید بیکر کو تلاش کر رہا ہے۔ زولو اس کی جانب بڑھا۔ مغلڈا کے ہاتھ جھکے ہوئے ہیں۔ وہ لڑنا نہیں چاہتا ہے۔ ممکن ہے مغلڈا نے گھٹی کی آواز نہ سنی ہو۔“

بیکر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں جانتا تھا یہی ہوگا۔“

اناؤنسر بولا۔ ”ریفری نے زولو کو اشارہ کیا۔ کہ وہ مغلڈا پر گھونے برائے۔ لیکن مغلڈا اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ رسیوں پر ہیں۔ وہ اچھل

اچھل کر چاروں جانب دیکھ رہا ہے۔ یقیناً وہ بیکر کے لئے بے تاب ہے۔ زولو کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کہ وہ کیا کرے۔ مغلڈا اسے نظر انداز کر رہا ہے۔ زولو ایکشن میں آگے بڑھا۔ لیکن مغلڈا اچھے ہٹ کر اس سے دور ہو گیا ہے۔ تماشائیوں میں بے چینی کی لہر دوڑنے لگی ہے۔ آپ شور سن رہے ہیں۔ مغلڈا کے کارز کی جانب سے جیس اور جعفر اسے اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ لڑے۔ لیکن مغلڈا انہیں نظر انداز کر رہا ہے۔ اب مغلڈا ہاتھوں اور پیروں پر بیٹھ گیا ہے۔ اور تماشائیوں کے درمیان جھانک رہا ہے۔

”میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔“ بیکر روہانسا ہو کر بولا۔ اور دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”تمہیں دوست۔ بس تھوڑی دیر اور برداشت کرو۔“ پستول والے نے سرد لہجے میں تنبیہ کی۔ اناؤنسر کی آواز آ رہی تھی۔

”کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ چار پاؤں پر بیٹھا ہوا مغلڈا ایک حقیر کنگرو دکھائی دے رہا ہے۔ کتنی کا سوال ہی نہیں..... کیونکہ زولو ابھی تک اسے ہاتھ نہیں لگا پایا۔ تماشائی احتجاج کر رہے ہیں۔ اب ہونگ شروع ہو گئی ہے۔ ریفری دوبارہ مغلڈا کی جانب بڑھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے وہ مغلڈا کو نال قرار دینے والا ہے۔ جی ہاں..... وہ اعلان کرنے والا ہے۔ اوہ..... اوہ.....“

”اچانک اناؤنسر کی پیمان سے بھری آواز ابھری۔“ ارے..... زولو..... نیچے گر گیا۔ مغلڈا دوسری جانب جا رہا تھا کہ زولو اچانک درمیان میں آ گیا۔ مغلڈا نے اس کی جانب دیکھے بغیر ہاتھ گھمادیا۔ جی ہاں..... وہ یقیناً رائٹ کک تھا۔ جو زولو کے چہرے پر لگا۔ اور زولو نیچے گر گیا۔ سیں..... تماشائی چیخ رہے ہیں..... داد دے رہے ہیں۔ ریفری کتنی گن رہا ہے۔ لیکن زولو ساکت ہے۔ آٹھ..... نو..... دس اور زپ..... میرا خیال ہے کہ مغلڈا اداکاری کر رہا تھا۔ اسے بیکر کی تلاش نہیں تھی۔ وہ صرف مناسب اوپننگ کی



تلاش میں تھا۔ زولو جال میں آ گیا۔ اور وہ پرفیکٹ رائٹ تھا۔ زولو اب بھی ساکت پڑا ہے۔ تالیوں کی آواز آپ سن رہے ہوں گے۔“ واقعی وہاں تالیوں کی آواز کے علاوہ اب اور کوئی آواز نہیں تھی۔

بیکر خوشی سے چیخ اٹھا۔ ”وہ یقیناً راستے میں آیا ہوگا۔ مغلڈا کا موڈ خراب ہو۔ تو وہ یقیناً ایسا ہی خوفناک ہو جاتا ہے۔“

انڈنسر بول رہا تھا۔ ”مغلڈا جانور نہیں بلکہ مافوق الفطرت ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں ڈومبا دیوتا کی روح حلول کر چکی ہے۔ اور اب وہ ناقابل تسخیر ہو چکا ہے۔“

لڑکی نے ریڈ یو کا ٹین بند کر دیا۔ پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”گاڑی کا دروازہ کھولو۔ اور اسے باہر دھکیل دو۔ اسکیم ناکام ہو گئی ہے۔“ پتول والے نے سر اثبات میں ہلایا اور دروازہ کھول کر بیکر کو باہر دھکیل دیا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی کار دور جا چکی تھی۔ وہ جینس ہال سے تقریباً تمام چار بلاک دور تھا۔ اس سرک سے اٹھتے ہی ہال کی جانب دوڑ لگا دی۔

لوگ مغلڈا کی نئی حکمت عملی اور بد قسمت زولو کے عجیب و غریب ناک آؤٹ ہونے پر تبصرے کر رہے تھے۔ جعفر، جیس اور مغلڈا ابھی تک رنگ میں موجود تھے۔ بیکر ہانپتا ہوا رنگ میں داخل ہوا۔ تب ایک دلگداز منظر دیکھنے میں آیا۔ مغلڈا نے بیکر کو بے تابانہ انداز میں اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ اور پیار کرنے لگا۔ اس کے حلق سے ”اؤک اؤک“ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ محبت کا وہ عجیب و غریب اور پراثر مظاہرہ دیکھ کر بیشتر تماشاویوں کی آنکھیں بجک گئیں۔ اس بار بریس نے اس خبر کو نمایاں جگہ دی۔ لیکن اندر کہانی صرف جیس کے کالم میں چھپی۔ جعفر نے اسے فون پر بیکر کے اغوا کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ واردات میں ملوث دونوں افراد پکڑے نہیں جاسکے۔ زردیڈن اچوری کی ثابت ہوئی۔ جیس کا کہنا تھا کہ اس واردات کے پیچھے یقیناً اگلے نو نو کا ہاتھ موجود رہا ہوگا۔ لیکن بات عقل سے بالا تھی کہ کچھ دن پہلے

اس نے مغلڈا کو بائنگ لڑنے کا لائسنس دلوانے کی کوشش میں مدد کی۔ لیکن اب اس مقابلے کے دوران اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ مزید اور ہستی صرف ہارڈی ڈوم تھی۔ جسے مقابلہ روکنے میں دلچسپی ہو سکتی تھی۔ مکمل ثبوت نہ ہونے کی بدولت کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ بہر کیف مغلڈا اپنی سیڑھی پتھر دوخو بی چڑھ گیا تھا۔ اب صرف دو مزید سیڑھیاں باقی تھیں۔ پھر وہ یقیناً عالمی چیمپئن شپ جیت لیتا۔ لیکن دوسرے دن جب بیکر اور جعفر نے اس وسیع و عریض اصطبل کا رخ کیا۔ جہاں مغلڈا رہائش پذیر تھا۔ تب انہیں اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے محسوس ہوئے۔ اصطبل خالی تھا۔ مغلڈا وہاں موجود نہیں تھا۔ رات کے کسی پہر اسے اغوا کر لیا گیا تھا۔ جعفر اور بیکر نے جیس کو فون کیا۔ جیس نے دونوں کو اپنے دفتر آنے کا حکم دیا۔ دونوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ ہی دیر میں دفتر پہنچ گئے۔ ان کے چہروں پر ہوا نیاں اڑ رہی تھیں اور شکل پر پریشانی کے تاثرات ثبت تھے۔ جیس نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر پانی کا گلاس ان کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”مخل رکھو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ پریشان ہونے سے معاملہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ پانی پیو اور مجھے تفصیل سے آگاہ کرو۔“ دونوں نے ایک ہی کھونٹ میں پانی پی لیا۔ پھر بیکر بولا۔

”وہ اصطبل میں موجود نہیں ہے۔ کل رات کو تھا۔ لیکن آج صبح جب ہم نے اصطبل کا دروازہ کھولا۔ تب وہ اندر نہیں تھا۔ اصطبل کا دروازہ لاک نہیں تھا کیونکہ باہر چوکیدار موجود رہتا ہے۔“ جیس نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”اور چوکیدار اس وقت کہاں ہے؟“ ”معلوم نہیں۔“ بیکر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن اصطبل سے باہر نہیں تھا۔ ہمیشہ باہر ہی ہوتا ہے۔“

”اصطبل کا نام بتاؤ۔“ ”ریانسز کا اصطبل۔“ بیکر نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“ جیس بولا۔ ”آؤ ذرا ریانسز کے اصطبل کا چکر لگا آئیں۔ دیکھیں چوکیدار کیا کہتا ہے۔“ بیکر اور جعفر نے اثبات میں سر ہلایا اور کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ریانسز کے اصطبل کے باہر چوکیدار موجود نہیں تھا۔ لیکن اب دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھٹکھٹانے پر اصطبل کے مالک ریانسز نے دروازہ کھولا۔ بیکر اور جعفر کو دیکھتے ہی وہ پریشان لہجے میں بولا۔

”تم دونوں کہاں تھے؟ اصطبل میں مغلڈا موجود نہیں ہے۔ چوکیدار بھی غائب ہے۔ لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تم دونوں کے نام یہ خط موصول ہوا ہے۔ یہی دینے کے لئے جب میں نے اصطبل کا رخ کیا۔ تب میں نے مغلڈا کو غائب پایا۔ جیس نے آگے بڑھ کر خط کا لفافہ اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ پھر سرد لہجے میں بولا۔

”لفافے پر ڈاک کا ٹکٹ موجود نہیں ہے۔ یہ تمہیں کیسے موصول ہوا۔“ اصطبل کا مالک گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”جناب۔۔۔۔۔ اصطبل سے ملحق میرا آفس ہے۔ صبح جب میں نے آفس کھولنے کے لئے سیڑھیوں کا رخ کیا۔ تب یہ سیڑھیوں کے پاس پڑا تھا۔ اوپر ان دونوں کا نام لکھا تھا۔ اس لئے میں نے انہیں دینے کے لئے۔“ جیس نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ پھر لفافے کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔ اوپر بیکر اور جعفر کا نام لکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اوپر اور کسی قسم کی تحریر موجود نہیں تھی۔ جیس نے لفافے کو چاک کیا۔ اور اندر موجود کاغذ کے ٹکڑے کو باہر نکال لیا۔ اس پر مختصر تحریر موجود تھی۔ لکھا تھا۔

”مغلڈا ہمارے قبضے میں ہے۔ جانور کی دستیابی کے لئے آپ کو دس لاکھ ڈالر کی رقم کا انتظام کرنا ہوگا۔ یہ رقم تحویل میں ڈال کر آج رات بارہ بجے سوئی لائن میں بننے والے کٹر لائن میں رکھ دینا۔ ہم وہاں سے وصول کر لیں گے۔ آپ یقیناً جان گئے ہوں گے کہ اس کٹر

لٹان میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے راستے بے تحاشا ہیں۔ اس لئے ہمیں ٹرپ کرنے کی کوشش نہیں کیجئے گا۔۔۔۔۔ بصورت دیگر جانور ٹکڑوں کی صورت میں آپ کو وصول ہوگا۔“

خط ختم ہو گیا۔ جیس نے خط کو تہہ کر کے جیب کے اندر رکھا۔ پھر ریانسز سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”اصطبل کے چوکیدار کا ایڈریس بتاؤ۔ اور کیا وہ اعتباری آدمی تھا۔۔۔۔۔ یا نہیں۔۔۔۔۔“ ریانسز بولا۔

”اسے یہاں کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ شاید دو مہینے یا پھر تین۔۔۔۔۔ مجھے صحیح طرح یاد نہیں ہے۔ میں ایڈریس بتائے دیتا ہوں۔“ اس نے اصطبل سے کچھ فاصلے پر واقع رہائشی آبادی کا ایڈریس بتا دیا۔ ”جیس نے اثبات میں سر ہلایا اور چوکیدار کے گھر کی جانب چل دیا۔ بیکر اور جعفر اس کے ہمراہ تھے۔ اصطبل سے باہر نکلنے کے بعد جعفر پریشان لہجے میں بولا۔ ”اگر ہم مغلڈا تک نہ پہنچ پائے۔ تب نتیجہ کیا نکلے گا۔“ جیس مسکراتے ہوئے بولا۔

”مغلڈا کی دوسری لڑائی کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ اگر فائٹ کے دوران مغلڈا دستیاب نہیں ہو سکا۔ تب عوام ہمارے سر بھڑا دے گی۔ ہماری کمزوریوں کو سامنے رکھ کر مجرم نے منصوبہ بنایا ہے۔ اب اگر ہم مغلڈا تک نہ پہنچ پائے تب ہمیں دس لاکھ روپے کی رقم مجرم کے حوالے کرنا ہوگی۔ تاکہ مغلڈا کو رنگ تک لایا جاسکے۔“ بیکر بات کاٹ کر بولا۔

”لیکن کل فائٹ کا اہتمام ہے۔ کیا ایک دن کے اندر ہم مغلڈا کو تلاش کر پائیں گے؟“ ”کوشش کر سکتے ہیں۔ ورنہ فائٹ ملتوی کروانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن ایسی صورت میں مغلڈا کے نمبر کم ہو جائیں گے۔“

چوکیدار کا فلیٹ رہائشی علاقے کے درمیان میں واقع تھا۔ فلیٹ کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ لیکن تالا معمولی نوعیت کا تھا۔ جیس کی جیب میں لوہے کی مڑی ہوئی تار موجود تھی۔ اس نے جیب میں سے تار باہر



نکالی۔ اور تالے کے سوراخ میں ڈال کر گھمانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں تالا کھل گیا۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور فلیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ فلیٹ چھوٹا لیکن نہایت گندا اور بدبودار تھا۔ تمام سامان درہم برہم بڑا تھا۔ بدبو کے علاوہ فلیٹ میں کچھ اور مخصوص بو بھی موجود تھی۔ جیسے نے ایش ٹرے کو چپک کیا۔ پھر کمراتے ہوئے بولا۔ ”شاید میں مجرم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب ہمیں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں رقم کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم دونوں رقم سے بھرے بیک کو کٹر لائن میں رکھ آنا۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔“ بیکر اور جعفر نے حیرت بھری نگاہوں سے جیس کی جانب دیکھا۔ پھر بیکر بولا۔ ”تو کیا ہم دس لاکھ ڈالر جیسی خطیر رقم یوں آسانی سے مجرم کے ہاتھوں میں تھما دیں گے۔ یہ کچھ عقلمندانہ فیصلہ نہیں ہوگا۔“

”اچھے اور برے میں تمیز کرنا مجھے آتا ہے۔ تم دونوں بس وہی کچھ کرتے جاؤ۔ جو میں کہتا ہوں۔“ بیکر اور جعفر نے اثبات میں سر ہلادیا۔

رات بارہ بجے وہ دونوں سوئی لائن میں نو تعمیر شدہ کٹر لائن کے وسیع و عریض جال کے سامنے موجود تھے۔ یہ تمام کٹر لائن انڈر گراؤنڈ کافی وسیع و عریض ہونے کے علاوہ جدید تھی۔ کٹر لائن کے اندر چھوٹی موٹی گلیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بیک کو اٹھانے کے لئے مجرم کس راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ سوچنا ناممکن تھا۔ کٹر لائن نمبر پندرہ کے کھلے ہوئے مین ہول کے سامنے پہنچ کر بیکر نے جیب میں سے نارچ باہر نکالی۔ اور جعفر کو بیک ہاتھوں میں تھما کر اندر اترنے کا حکم دیا۔ جعفر نے احتیاط کے ساتھ بیک کو گلے میں لٹکایا۔ اور دوسرے ہاتھ میں نارچ تھامے کٹر کے اندر موجود سیڑھی کے ذریعے نیچے اترنے لگا۔ نیچے گھب اندھیرا تھا۔ چونکہ کنسرکشن ابھی جاری تھی۔ اس لئے کٹر میں پانی موجود نہیں تھا۔ جعفر نے نارچ کی روشنی ارد گرد ڈالتے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا۔ کٹر لائن نمبر پندرہ کا حدود اربعہ کسی وسیع و عریض چوک سے کم نہیں تھا۔ یہاں مختصر گلیوں کے

سروں کا اختتام اور آغاز ہوتا تھا۔ جعفر نے دیوار کے ساتھ بیک کو رکھا اور پچھرتی کے ساتھ میڑھیاں چڑھتا ہوا کٹر سے باہر نکل آیا۔ بیکر اس کا منتظر تھا۔ جعفر نے نارچ اسے تھمائی اور حالات نامول ہونے کا اشارہ کر کے دونوں شہر کی جانب چل دیئے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے کپڑے تبدیل کئے۔ اور بستر میں گھس گئے۔ جیس کی ہدایات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ صبح سے پہلے اس کے ساتھ رابطہ نہ کیا جائے۔

صبح منہ اندھیرے اٹھنے کے فوراً بعد انہوں نے جیس کے آفس کا رخ کیا۔ جیس خلاف توقع آفس میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ جعفر اور بیکر کو دیکھتے ہی وہ بولا۔

”مجھے امید ہے کہ تم دونوں کی رات اچھی گزری ہوگی۔ اگر نہیں..... تو یقیناً آج کا دن تو اچھا ہی گزرے گا۔ رات کو میسر بھلا دو۔“

”جناب آج فائٹ کا دن ہے۔“ بیکر بے چین لہجے میں بولا۔ ”کیا گزشتہ رات مغلڈا دستیاب ہو پایا..... یا نہیں..... اگر ایسا ہوا ہے۔ تو ہمیں فوراً فائٹنگ کی تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔ بصورت دیگر فائٹنگ کو ملتوی کر کے مغلڈا کی دستیابی کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔“ بیکر کے خاموش ہوتے ہی جیس ہنستے ہوئے بولا۔

”کسی پر تو بیٹھ جاؤ۔ اتنی جلدی اچھی نہیں ہوتی۔ پہلے ناشتہ کرو۔ اس کے بعد گزشتہ رات کے واقعات کے متعلق تفصیل بتاؤں گا۔“ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور چڑا اسی ناشتے کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ میز کے گرد برتنوں کو ترتیب دیتے لگا۔ بیکر اور جعفر نے نا چاہتے ہوئے بھی ناشتے کا آغاز کر دیا۔ جیس مطمئن انداز میں ناشتہ کر رہا تھا۔ اس لئے تقریباً آدھا گھنٹہ ناشتے میں لگ گیا۔ صبح کے نو بجتے والے تھے۔ گیارہ بجے فائٹنگ کا آغاز ہونا تھا۔ وقت کم تھا۔ لیکن جیس کو پرواہ نہیں تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے سگریٹ سلگایا۔ اور دھواں کمرے میں پھینک کر بولا۔

”مجھے شروع ہی سے اصطبل کے مالک ریانسز پر شک تھا۔ لیکن ثبوت کی عدم موجودگی کے باعث اسے گرفتار کرنا ناممکن نہیں تھا۔ جب میں نے تم دونوں کے ہمراہ ریانسز سے ملاقات کی۔ تب اس کے ہاتھوں میں بہت مہنگے برائڈ کا سگریٹ سلگتا دیکھا۔ یہ مہنگا ہونے کے علاوہ نایاب بھی ہے۔ ریانسز سے ملاقات کے بعد جب ہم نے چوکیدار کے فلیٹ کا رخ کیا۔ تب مختصر تلاشی کے دوران مجھے فلیٹ میں موجود ایش ٹرے میں اسی برائڈ کے سگریٹ کے ٹکڑے دستیاب ہوئے۔ چوکیدار اتنا مہنگا اور کم یاب سگریٹ مینے کی جہارت نہیں کر سکتا تھا۔ اور ریانسز ایسا کم یاب سگریٹ اسے تحفے میں بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ریانسز کا چوکیدار کے فلیٹ میں آنا جانا تھا۔ اب تم دونوں خود سوچ سکتے ہو کہ اگر اصطبل کا مالک اصطبل کے چوکیدار کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہے۔ تو اس کے پیچھے اس کے کچھ مقاصد بھی کارفرما ہو سکتے ہیں اور ان مقاصد کا اندازہ آپ اس وقت بخوبی لگا سکتے ہیں۔ جب چوکیدار چوڑی میں ملوث ہو۔ ثبوت کو پختہ کرنے کے لئے میں نے تم رقم دونوں کے ہاتھوں میں تھمائی اور خود ریانسز کی نگرانی کرنے لگا۔ رات ساڑھے گیارہ بجے اس نے تم دونوں کا پیچھا کیا۔ اور میرے اندازے کے مطابق اس نے رقم سوئی لائن کی کٹر میں سے ہتھیلی۔ تب میں نے اسے گرفتار کر کے مغلڈا کے متعلق پوچھ گچھ کیا۔ وہ بتانے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ لیکن کچھ تشدد کے بعد تیار ہو گیا۔ منصوبہ اس کا تیار کردہ تھا اور مغلڈا ریانسز اصطبل سے کچھ دور واقع دوسرے اصطبل میں نقید تھا۔ جو اس کا ہائر کردہ تھا۔“ جیس خاموش ہو گیا۔

”لیکن اگر تمہارا اندازہ غلط ہو جاتا۔ اور مجرم ریانسز کے علاوہ کوئی اور ہوتا۔ تب رقم ہاتھوں سے نکل جاتی۔“ بیکر نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں اکل ایسا ہو سکتا تھا۔ لیکن میں رقم کے بیک میں اتنی کثیر رقم رکھنے کے لئے شروع ہی سے آمادہ نہیں تھا۔ اس لئے بیک کو خالی کاغذوں سے بھر کر تمہارے

ہاتھوں میں تھما دیا۔ کیوں کیا خیال ہے؟“ دونوں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اور اٹھ کر مقابلے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ جہاز بران کی سیٹیں مخصوص تھیں۔ اور اب مغلڈا کا مقابلہ واشنگٹن کے بیکر کے ساتھ ہونا تھا۔

واشنگٹن کا بی بال ہال تماشا بیوں سے کھچا کچھ بھرا ہوا تھا۔ مقابلہ شروع ہونے میں تقریباً پونہ گھنٹہ باقی تھا کہ اچانک جیس کی نگاہ ایک ایسے آدمی پر پڑی۔ جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام میکس تھا۔ وہ بیٹا ناز کے علاوہ ٹیلی ویژن پر بھی مہارت رکھتا تھا۔ باسنگ کے حلقے میں اس کی شہرت اچھے الفاظ میں نہیں ہوتی تھی۔ اس کا پیشہ پیسے لے کر پیشہ ور باکسر کو زپ کرنا تھا۔ یہاں بی بال ہال میں اس کی موجودگی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔ حالاں کہ ہال میں سیکورٹی کا انتظام جدید ترین اور سخت تھا۔ لیکن میکس کو واردات کرنے کیلئے کسی قسم کے ہتھیار کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے تیز نگاہوں کا کام لیتا تھا۔ جیس نے پریشان نگاہوں سے جعفر اور بیکر کی جانب دیکھا۔ وہ ہال کمرے سے فسلک چھوٹے کمرے میں موجود تھا۔ جیس تیز قدموں کے ساتھ ان دونوں کی جانب چل دیا۔ بیکر اور جعفر نے تعجبی نگاہوں سے جیس کی جانب دیکھا۔ تب جیس بولا۔

”جب تک میں واپس نہیں آتا ہوں۔ تب تک مغلڈا کو باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ وہاں اس کے وجود کو خطرہ ہے۔ میں جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“ جعفر اور بیکر نے حیرت بھری نگاہوں سے جیس کی جانب دیکھا۔ لیکن پوچھا کچھ نہیں۔ جیس ہال کمرے سے ہوتا ہوا دروازے سے باہر نکلا۔ اور کسی پکڑ کر سترہ بی ایسٹ اسٹریٹ کی جانب چل دیا۔ یہاں ایک پیشہ ور مجرم چلو کی رہائش موجود ہے۔ جیس کی ہدایت پر ایک دفعہ اسے حوالات ہو چکی تھی۔ پھر جیس کے کہنے پر ہی اسے دوبارہ رہا کر دیا گیا تھا۔ اب وہ جیس کا مرید تھا۔ اسے مختلف اور عجیب و غریب کاموں میں مہارت حاصل تھی۔ ان میں سے ایک کام دانتوں کے ذریعے



مختصر چہرا بھینکا تھا۔ وہ اتنی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ ننھے چہرے کو سامنے کی جانب اچھالتا تھا۔ کہ انجان بندہ یقین نہیں کر پاتا تھا۔ وہ چہرا سامنے موجود لکڑی کے دروازے میں سوراخ کر دیتا تھا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ چہرے کو بندوق کے ذریعے سے بھینکا گیا ہے۔ سترہ لی ایٹ اسٹریٹ میں بنے مختصر گھروں کے درمیان چمکو کا گھر موجود تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر اس نے دروازہ کھولا۔ وہ دبلا پٹلا ننھی شخص تھا۔ بال پتلے اور لمبے تھے۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ موجود تھا۔ اور ہونٹ مضبوطی کے ساتھ بچھے ہونے کے باعث ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ جیس کو دیکھتے ہی اس نے گھبرا کر تمام دروازہ کھول دیا۔ اور پریشان نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

مچلو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری یہاں آمد تمہارے لئے خطرے کا باعث نہیں بنتی۔ بلکہ مجھے ایک کام کے سلسلے میں تمہاری مدد درکار ہے۔ مچلو نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔

”اندر آجائے ہم بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں“  
 ”تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔ معاملہ بہت  
 گھمبیر ہے۔ تمہیں فوراً میرے ہمراہ چلنا ہوگا۔ میں  
 گاڑی میں تمہیں حالات سے آگاہ کروں گا۔“ چلو نے  
 اثبات میں سر ہلایا اور گھر کو لاک کر کے جیس کے ہمراہ  
 سامنے موجود میکی میں بیٹھ گیا۔ میکی تیز رفتاری کے  
 ساتھ ہی بال بال ہال کی جانب روانہ ہوئی۔ تب جیس گھمبیر  
 لہجے میں بولا۔

”تم جانتے ہو گے کہ آج بی بال ہال میں بیگھر  
اور مللڈا کے درمیان مقابلہ ہونے والا ہے۔ نیویارک  
ٹائٹس سے فسلک ہونے کی وجہ سے تمہیں یہ بھی معلوم  
ہوگا کہ اس مقابلے کے پیچھے میرا بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ پایا  
جاتا ہے۔“ پھلور نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب جیمس  
دوبارہ بولا۔ ”اور انڈر ورلڈ کے ساتھ وقت گزاری کی  
بدولت تم میکس سے بھی واقفیت رکھتے ہو گے۔“ پھلور  
چونک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔

”میکس بہت خطرناک اور سنگدل انسان ہے۔  
میں معاملے کے متعلق کچھ کچھ اندازہ لگا چکا ہوں۔ لیکن  
اگر آپ روشنی ڈال دیں۔ تو بہتر ہوگا۔“

”وہ اس وقت بی بال بال میں موجود ہے۔“  
جیسں بولا۔ ”میرے دوست مغللہ کی حمایت کے لئے..... وہ مغللہ کو پناہ نازیبا ملی پتھی کے ذریعے ناک آؤٹ کرنا چاہتا ہے۔ اور میں ایسا نہیں چاہتا۔ اس لئے تمہارے پایا ہوں۔“ نچلنے سے مسکراتے ہوئے جیسں کی جانب دیکھا۔ پھر جیب میں سے مٹی بھر چھرے باہر نکال کر منہ میں ڈال لئے۔ کچھ دیر نہیں بلکے بلکے چاہتا رہا۔ پھر اس نے بچ کے چھلکے کی مانند چھرے کو باہر اگل دیا۔ ایسا اس نے اپنے اگلے دانتوں کی مانند کیا تھا۔ نیکی ٹریفک کی سرخ بتی کی بدولت رکی ہوئی تھی۔ چھرا گولی کی مانند نچلنے کے منہ سے باہر نکلا۔ اور سامنے موجود سائن بورڈ پر لگی لڑکی کی تصویر کی آنکھ میں جا لگا۔ جیسں نے تعریف لگائی تھی ہوں سے نچلنے کی جانب دیکھا اور مطمئن انداز میں سرسٹ کے ساتھ گرا کر آنکھیں موند لیں۔

جب وہ دونوں بی بال ہال میں داخل ہوئے۔ تب مقابلہ شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ تب ہنگر رنگ کے درمیان میں موجود تھا۔ لیکن جعفر اور بیکر مغلڈا کے ہمراہ ہال سے منسلک کمرے میں بیٹھے تھے۔ میکس ہال کی سب سے اگلی سیٹوں کے درمیان میں براہمان تھا۔ جیس نے مخلو کو اشارے کے ذریعے میکس کے وجود سے آگاہ کیا۔ اور خود ہال سے منسلک چھوٹے کمرے کی جانب چل دیا۔ جعفر اور بیکر اس کے منتظر تھے۔ جیس نے انہیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اور خود بھی رنگ کی جانب چل دیا۔ باہر اناؤنسر مغلڈا کا نام پکار رہا تھا۔ مغلڈا کو ہال میں داخل ہوتے دیکھ کر بچوں اور عورتوں نے خوشی سے مغلوب ہو کر چیخنا چلاتا شروع کر دیا۔ مغلڈا نے رنگ کے پاس پہنچ کر چھلانگ لگائی۔ اور تقریباً اڑتا ہوا رنگ کے درمیان میں آکھڑا ہوا۔ جیس نے چورنگوں سے میکس کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھوں میں سیاہ چشمہ لگائے ہوئے اگلی رو

کے درمیان بیٹھا مکمل انہماک کے ساتھ مغللہ کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ مچکڑ کا وجود لوگوں کے جھوم میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آج کی فائنٹ کو کوکر کرنے کے لئے فی وی کے کمرہ میں..... اخبار کے رپورٹروں کے علاوہ قلم سے تعلق رکھنے والے اداکار بھی ہال میں موجود تھے۔

ریفری نے دونوں پائکروں کی تلاش لینے کے بعد فائنٹ شروع کرنے کی سیٹی بجا دی۔

بیسگر تیر کی مانند اسٹول سے کھڑا ہوا۔ اور باڑی  
مانند مغلڈا پر چھٹا۔ مغلڈا نے اس سے بچنے کے لئے  
چھپے بٹا شروع کر دیا۔ بھر بالکل اچانک ہی اپر کٹ اس  
کی دائمی پسپوں پر رسید کیا۔ بیسگر کا منہ خون کی شدت کی  
بدلت سرخ ہونے لگا۔ اسے اپنا سانس سینے میں اٹکتا  
مخس ہوا۔ لکے کی شدت اس کی توقعات سے زیادہ  
تھی۔ لیکن اس نے سر کو جھک کر اس احساس کو زائل  
کیا۔ بیسگر کے ساتھ ہی جی رہے تھے۔ ”بچو بیسگر..... یہ  
آسان حریف ثابت نہیں ہوگا۔“

لیکن توہین کے احساس اور بے پناہ غصے نے بیگلر کو دیوانہ بنادیا اور اس کے دونوں ہاتھ مشینی انداز میں حرکت کرنے لگے۔ لیفٹ..... رائٹ..... سونک..... چپ..... اپرٹ..... ٹیچ اس بری طرح چیخ رہا تھا کہ زمین لرزنی محسوس ہونے لگی تھی۔ جیس کی لگا ہیں میکس پر مرکوز تھیں۔ وہ آنکھوں سے عینک اتار چکا تھا۔ اور اب اس کوشش میں تھا کہ کب مفلذہ کی لگا ہیں بیگلر سے ہٹ کر رنگ سے باہر قماشائیوں کی جانب رخ کرتی ہیں۔

جیس پریشان ہو گیا۔ اسے میکس کی آنکھوں کی قوت پر یقین تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ملحد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو کوئی عام شخص بھی اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جانور ایسے موقع پر عموماً آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ پھر اچانک ہی وہ سب کچھ ہو گیا۔ میکس نے پھجلی کی مانند تڑپ کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ اور شدت درد کی بدولت چیختے چلانے لگا، ہائے میری آنکھ..... ڈاکٹر کو بلاؤ..... مجھے شوٹ کیا گیا ہے۔“

رپورٹر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن وہ اس کا ہاتھ چہرے سے نہیں ہٹا سکتے تھے۔ ”میں اندھا ہو گیا ہوں۔ مجھے اسپتال لے چلو۔“ وہ چیخے جا رہا تھا۔ اینجیل پولیس والے حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے ارد گرد کے لوگوں کی تلاشی لیتی شروع کر دی۔ لیکن وہاں کسی کے پاس ہتھیار موجود نہیں تھا۔ کچھ دیر میں بی بال ہال کا ڈاکٹر وہاں آ گیا۔ اور میکس کو اسٹریچر پر ڈال کر باہر لے جایا گیا۔ سب لوگ اس ہنگامے میں اس قدر متحہ تھے کہ ان میں سے اکثر نے کلکزی پینچنے کی آوازیں نہیں سنی۔

اس کے بعد کھٹک کی آواز سنائی دی۔ جیسے تناور درخت زمین پر گرا ہو۔ لوگ رنگ کی جانب متوجہ ہوئے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ مغللہ اپنے ساتھ فضا میں بلند کئے فتح کا اعلان کر رہا ہے۔ ریلوے گھنٹی گن رہا تھا۔ اور بیگلر زمین پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ گھنٹی کے چند متماشائی تھے۔ جنہوں نے ناک آؤٹ ہونے کا وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ چلا چلا کر لوگوں کو بتا رہے تھے۔ وہ مغللہ کا شارٹ ریٹ چوہ تھا۔ جس نے بیگلر کے ہوش و حواس جھین لئے تھے۔ اس وقت پہلا راؤنڈ شروع ہوئے صرف ایک منٹ اور اٹھارہ سیکنڈ ہوئے تھے۔ ہال میں اب ہیجان برپا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ مغللہ کو کوئی نہیں ہرا سکتا تھا۔ پھر ڈاکٹر آیا اور اس نے اعلان کیا کہ میس کو چھڑے والی بندوق سے ہٹ کیا گیا ہے۔ اس نے چھڑے بھی دکھائے۔ پھر چیف آف پولیس نے اعلان کیا کہ کوئی بھی شخص اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ ہر شخص کی تلاشی لی جائے گی۔ لیکن تلاشی کا نتیجہ مفصل تھا۔ کسی شخص کے پاس کوئی تھیار نہیں پایا گیا۔ جسے بیکر سے مخاطب تھا۔

”لوٹائی کا کیا ہوا؟“ بیکر مسکراتے ہوئے بولا۔  
 ”پیپٹ پر لیفٹ اور چہرے پر رائٹ.....  
 بیکر.....“ میکس کے چلانے پر اس کی طرف متوجہ ہوا  
 تھا کہ اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ باکسر کو ہر وقت اپنے  
 حریف پر نظر رکھنی چاہئے۔ قصور اس کا اپنا تھا۔ ورنہ کچھ  
 دیر اور مقابلہ کر لیتا۔ لیکن بہر حال جیت مللڈا کے



نصیب میں لکھی ہوئی تھی۔“

”مجھے یہ سب کچھ غیر حقیق دکھائی دیتا ہے۔ اب تک جتنے بھی باکسر مظفر عام پر آئے ہیں۔ وہ مغلڈا کو ہاتھ لگائے بغیر ناک آؤٹ ہوتے چلے گئے ہیں۔ پہلے راؤنڈ سے آگے کوئی نہیں بڑھ سکا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ کیا کوئی جانور بافوق الفطرت ہو سکتا ہے؟ ناممکن۔۔۔۔۔ بات کچھ اور ہے۔ لیکن سامنے نہیں آ رہی۔“ جیسے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

دوسرے دن کے اخبارات رنگین تصویروں کے ساتھ مغلڈا کی تصویروں سے بھرے پڑے تھے۔ بیکر اور جعفر کی تصویروں کے علاوہ ان دونوں کے تفصیلی انٹرویو شائع کئے گئے۔ سوالات تقریباً ایک جیسے تھے۔ مغلڈا کیا کھاتا ہے۔ وہ کہاں پیدا ہوا؟ آپ دونوں کو کیسے دستیاب ہوا؟ کتنے عرصے سے باسکٹ لڑ رہے ہیں، اس کی عمر کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ کیا وہ بارڈی ڈوم جیسے کھلاڑی کو زپ کر سکے گا۔ مغلڈا کی تیاریوں کی تفصیل کیا ہے؟ میکس والا معاملہ کیا تھا۔ کیا میکس مغلڈا کو پھانسی کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ ایسا کر لیتا تب کیا ہوتا۔ اور کیا جانوروں میں پھانسی کرنا اثرات داخل ہو سکتے ہیں۔ میکس کی آنکھوں کو نقصان پہنچانے میں آپ کا کتنا عمل دخل ہے۔ بیکر اور جعفر نے انہیں وہی جوابات دیئے۔ جن کے متعلق جیسے انہیں پہلے ہی بتایا تھا اور نیویارک ٹائمز نے جو رپورٹ مرتب کی وہ یوں تھی۔

انسان بمقابلہ جانور۔

گزشتہ کچھ دنوں کے دوران جانور نے دنیا کے مقبول ترین باکسر وڈو اور بیکر کو شکست دی۔ اب نیویارک کے سب سے بڑا ہال۔۔۔۔۔ ہڈن ہال میں دنیا کے عجیب و غریب مقابلے کا اہتمام کیا جا چکا ہے۔ کروڑوں پر مشتمل شائقین بلیک میں ٹکٹ فروخت کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن ہڈن ہال کا ٹکٹ دستیاب نہیں ہو رہا۔ گزشتہ کچھ دنوں کی چیچکیش کیا رنگ لائی ہے۔ اس کے نتیجے کے لئے صرف ایک دن باقی رہ گیا ہے۔ کیا جانور انسان کو ہرا کر چیمپئن شپ کا اعزاز

حاصل کر پائے گا۔ شاید ایسا ہو جائے۔ اور اگر ایسا ہو گیا۔ تب اشرف المخلوقات کہلانے والے انسان پر جانور سبقت حاصل کر لے گا۔

یاد رہے۔ گزشتہ کچھ ایام کے دوران یہ جانور لگاتار انسانوں پر سبقت حاصل کرتا چلا آیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کل چیمپئن شپ کا اعزاز رکھنے والے بارڈی ڈوم کو ہرا پاتا ہے۔۔۔۔۔ یا نہیں۔ لیکن گزشتہ روز شائع ہونے والے انٹرویو میں بارڈی ڈوم کچھ زبوں دکھائی دیتا تھا۔ انٹرویو کے دوران متعدد بار اس کی زبان لڑکھرائی اور وہ جانور کے تذکرے پر جھنجھلا اٹھتا تھا۔ نیویارک کی عوام جانور کو بافوق الفطرت قرار دے رہی ہے بلکہ ایک افریقی نے تو یہاں تک کہہ ڈالا ہے کہ جانور میں ڈومبا دیوتا کی روح گھس گئی۔ اور اب انسانوں کو نفسی شکست سے ہمکنار کر دے گی۔ بہر کیف کل کے مقابلے سے پہلے مزید کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن مقابلہ یقیناً سنسنی خیز ثابت ہوگا۔ ہڈن ہال والوں کا کہنا ہے کہ آج سے پہلے بھی اتنی زیادہ تعداد میں کسی بھی مقابلے کے ٹکٹ فروخت نہیں ہوئے۔ یہ ریکارڈ سیل ہے اس لئے مقابلے کا اہتمام بھی معیار کے مطابق ہوگا۔

نیویارک 1970ء

مقابلے کا افتتاح

3 جولائی 1970ء کی رات۔۔۔۔۔ تاروں بھرا آسمان تھا۔ دن بھر شدید گرمی رہی تھی۔ اور اب بھی گرمی تھی۔ لیکن قابل برداشت۔۔۔۔۔ ہڈن ہال میں ایک لاکھ دس ہزار تماشاخیوں کا ہجوم تھا۔ فائٹ دیکھنے والے ہجوم کا انداز بہت خوفناک ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی کو زخمی ہوتے دیکھنے کی امید میں آتے ہیں۔ وہ تشدد کے رسیا ہوتے ہیں۔ فائٹ شروع ہونے سے پہلے ہی ان کے اعصاب کشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر شخص نامعلوم سی تشویش میں مبتلا ہوتا ہے۔ ابتدائی مقابلے ہو چکے تھے۔ تماشاخی اب تک اچھی خاصی خوریزی دیکھ چکے تھے۔ لیکن دوسری جانب وہ بے چینی کے ساتھ

اصل مقابلے کا انتظار بھی کر رہے تھے۔ عطیہ سیکشن میں بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ ان میں اداکار تھے۔ فلم پروڈیوسر تھے۔ کروڑ پتی تاجر تھے۔ اور گینگسٹر بھی تھے۔ اس سیکشن میں نشست حاصل کرنا کسی عام آدمی کی استطاعت سے باہر تھا۔ رنگ کے اطراف میں چار اسٹیل کے پلیٹ فارم ٹاورز تھے۔ وہاں کیرہ مین مناسب ترین زاویوں کی تلاش میں مصروف تھے۔ اور کیرے مسلسل حرکت میں تھے۔ کچھ فوٹو گرافر عطیہ سیکشن میں بیٹھے افراد کی تصویریں کھینچ رہے تھے، اداکارا کین خاص طور پر ان کی توجہ کا مرکز تھیں۔ پیچھے ہوں کا ہجوم تھا۔ گٹار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سبھی کبھی کوئی سر پھراگانے گانے لگتا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے سامنے بھی آواز ملانے لگتے تھے۔ جیسے اس وقت کئی حیثیتوں میں مصروف عمل تھا۔ وہ اس فلیٹ کا پروڈیوسر تھا۔ مفت خوراک فنڈ کا چیئرمین تھا۔ اور نیویارک ٹائمز کا اسپورٹس ایڈیٹر اور کالم نویس تھا۔ وہ ادھر ادھر گھوم کر مختلف سیکشنوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ رنگ سائڈ میں افاہن گردش کر رہی تھیں۔ جو ہر فائٹ میں دہرائی جاتی ہیں۔ انکل ٹوٹو نے ریفری کو خرید لیا ہے۔ بارڈی ڈوم جان بوجھ کر ہار جائے گا۔ بچ کو خائف پارٹی خرید چکی ہے۔ مغلڈا کے کھانے میں زہریلی دوا ملائی جا چکی ہے۔ تربیت کے دوران بارڈی کا بایاں ہاتھ مجروح ہوا ہے۔ لیکن اس بات کو اب تک چھپایا گیا ہے۔ سب سے زور دار افواہ یہی ہے کہ مغلڈا کو کنگ روٹس ہے۔ بلکہ ایک چالاک باکسر ہے۔ جس نے ٹنگرو کی کھال پہن رکھی ہے۔ پھر ریفری رنگ میں داخل ہوا۔ اور جیسے نے سکون کا سانس لیا۔ ریفری فلیپس پندرہ سال سے اس شعبے سے منسلک رہ چکا تھا۔ وہ دیانت دار فلیپس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں تھا۔ آج تک اسے کوئی خرید نہیں پایا تھا۔ اس کی موجودگی اس بات کی ضمانت تھی کہ مقابلہ صاف ستھرا ہوگا۔ جیسے اپنی نشست پر بیٹ گیا۔ تماشاخی دم سادھے ہوئے تھے۔ پھر اچانک اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اٹھا۔

بارڈی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہال میں داخل ہوا۔ وہ لوگ رنگ میں داخل ہوئے اور اپنے کارنر کی جانب بڑھ گئے۔ تماشاخی حلق بھاڑ کر چیمپئن کو داد دے رہے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ بارڈی کبھی بھی مقبول اور ہر دلعزیز نہیں رہا تھا۔ لیکن آج پہلی بار اس کی مقبولیت سامنے آ رہی تھی۔ ہر سیکشن میں ہر شخص کھڑے ہو کر اس کا استقبال کر رہا تھا۔ بارڈی ہاتھ اٹھا کر داد خیمین کا جواب دے رہا تھا۔

پھر اسٹیڈیم کے دوسرے حصے سے ”اوک۔۔۔۔۔ اوک“ کی حیرت زدہ آوازیں ابھریں۔ کچھ خوف زدہ ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ مغلڈا کے قافلے کی آمد کا اعلان تھا۔ سب لوگ کھڑے ہو کر مغلڈا کو دیکھنے لگے۔ لیکن تالیاں کسی نے بھی نہیں بجائیں۔ بیکر نے مغلڈا کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ اور مغلڈا اچھل اچھل کر آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر کار وہ طلسم حیرت ٹوٹا۔ آسٹریلین تماشاخیوں کے سیکشن کی جانب سے مغلڈا کے حلق میں نعرے سنائی دیئے۔ پیوں کے ہجوم کی طرف سے موسیقی نے مغلڈا کا استقبال کیا۔ لیکن یہ سب کچھ عام تماشاخیوں کو متاثر نہیں کر سکا اور وہ تمام آوازیں دم توڑتی چلی گئیں۔ مغلڈا نے مخصوص انداز میں چھلانگ لگائی اور ہوا میں اڑتا ہوا رنگ میں داخل ہو گیا۔ جو کچھ نظروں کے سامنے تھا۔ وہ تماشاخیوں کے لئے نیا نہیں تھا۔ اب کارنر میں ایک جانب انسان تھا۔ سیاہ آنکھوں، گھٹکھریا لے بالوں اور خوب صورت جسم والا انسان۔۔۔۔۔ دوسری جانب ایک جانور تھا۔ چوڑا سینہ۔ مضبوط شانہ۔۔۔۔۔ مہوئی اور رسی دم۔ مختصر اور پٹکے بازو۔ وہ ناپسند معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کو اس لمحے وہ زمانہ قدیم کا کوئی دیوپیکر پرندہ لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک پیچھا داسا ابھرا۔ کاش اس نے یہ سب کچھ نہ کیا ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مہمبا کے ساتھ اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ وہ سمجھ گیا کہ تماشاخیوں نے پہلی بار بارڈی کا اس قدر والہانہ استقبال کیوں کیا ہے۔ پیوں اور آسٹریلیا سے آئے ہوئے لوگوں کے سوا مغلڈا کا استقبال کسی نے بھی نہیں



کیا۔ کیوں..... شاید وہ خوفزدہ تھے۔ کم تر مخلوق نے اشرف المخلوق یعنی انسان کی برتری کو پہچان لیا تھا۔ ممکن ہے ایک دن زمین پر انسانوں کی جگہ ننگروں کی حکمرانی ہو۔ تماشا نیوں کا رد عمل مغلڈ اسے ان کا کھنڈاؤ اور ان کی خوفزدہ ہنسی..... سب کچھ نسل پرستی کی علامت تھا۔ چھٹ ننگروان کے لئے انسانی شکست کی علامت تھا۔ لاشوں میں دبا ہوا خوف شکست ابھرا آیا تھا۔ ہر شخص سہا ہوا تھا۔ کچھ لوگ سوچ رہے تھے کہ کاش وہ فائٹ دیکھنے نہ آئے ہوتے۔ اب بیکر مغلڈ کو دستانے پہنارہا تھا اور جیس اس عمل کو بخور دیکھ رہا تھا۔ ہارڈی کے کارنر میں یہی کام اس کا اسٹنٹ سرانجام دے رہا تھا۔ تماشا نیوں میں ایسے بھی تھے۔ جو یہ یاد کر رہے تھے کہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اس سے زیادہ کیا کیا عجیب واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ انسان نے چاند پر قدم رکھا ہے۔ نسل ارتقاء کا عمل ٹیسٹ ٹیوب تک آ پہنچا۔ سائنس نے ہر فرسودہ تصور کو باہمال کر دیا ہے۔ یہ تو محض ایک ننگرو ہے۔ جس نے خود کو ایک باکسر ثابت کر دیا۔

گھٹی بجتے والی تھی۔ کچھ باکسر رنگ میں اتر گئے۔ یہ وہ باکسر تھے۔ جو دونوں میں سے کسی ایک باکسر سے مستقبل میں لڑنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے دونوں باکسروں سے ان کے کارنر میں جا کر ہاتھ ملایا۔ مغلڈ نے ان میں سے دو کی خصوصی پذیرائی کی اور انہیں بوسہ محبت سے نوازا۔ پھر دلی تعارف ہوا۔

خواتین و حضرات، عالمی مڈل ویٹ چیمپئن ہارڈی ڈوم..... اس نے ہارڈی کی جانب اشارہ کیا۔ جس کا تعلق افریقہ کے قبیلے کا موگا سے ہے۔ وزن ایک سو ساٹھ پونڈ..... ہارڈی نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔ اور تھرکے لگا۔ مجھے نے چیخ کر اسٹیڈیم سر پر اٹھایا۔ یہ سب ہارڈی کے حق میں ہیں۔ جیس نے اپنے قریب بیٹھے جعفر سے کہا۔ ”اگر مغلڈ اجیت گیا۔ تب ان کا رد عمل کیا ہوگا؟“

”وہی ہوگا..... جو مغلڈ کے ہارنے پر ہوگا۔“

جعفر یولا۔ اناؤنسر کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اور سامنے والے کارنر میں سنڈی آسٹریلیا کا باسی..... چلنجر مغلڈ!..... وزن 159 پونڈ..... جواب میں دہی دہی سی تالیوں..... اور خوفزدہ ہنسی ابھری۔ پھر اچانک پیوں کے سیکشن میں سے کسی نے بوسہ مرگ والا گیت گانا شروع کر دیا۔ جلد ہی تمام ہی ہم آواز ہو گئے۔ اب اسٹیڈیم بوسہ مرگ کی لے پر گونج رہا تھا۔ بیکر نے مغلڈ کو اسٹول سے اٹھایا تاکہ وہ اس داؤ کے جواب میں ہاتھ بلند کرے۔ ایک لمحے کے لئے مغلڈ نے جیس اور جعفر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد اور بھروسے کا تاثر تھا۔ جیسے وہ جانتا ہو کہ وہ دونوں اس کے دوست اور حامی ہیں۔

”اے خبیث جانور..... اب اگر رنگ میں اترنا تویر انجام اچھا نہیں ہوگا۔“ پریس سیکشن میں سے کسی نے زہریلے لہجے میں چیخ کر کہا۔ اس بار جیس کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ صحیح مغلڈ کے لئے کس قدر معاندانہ جذبات رکھتا ہے۔ جیس سوچنے لگا۔ اگر مغلڈ نے پہلے ہی چیخ میں ہارڈی کو ناک آؤٹ کر دیا تو کیا ہوگا؟ لوگوں نے تیس لاکھ ڈالر صرف پندرہ سیکنڈ کے لئے تو نہیں دیے۔ پھر اسے خیال آیا کہ لوگوں نے تیس لاکھ ڈالر یہاں اپنی موجودگی کے لئے ادا کئے تھے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ سکیں۔ اور پھر لوگوں کو بتا سکیں کہ جس وقت مقابلہ ہوا۔ وہ اسٹیڈیم میں موجود تھے۔ اناؤنسر رنگ سے باہر نکل گیا۔ ریفری نے دونوں باکسروں کو آخری ہدایات دینے کے لئے رنگ کے وسط میں بلایا۔ ہارڈی باوقار انداز میں آگے بڑھا۔ اس کی چال میں جیتے جیسے جیتی اور مستعدی تھی۔ مغلڈ ایک ہی جست میں رنگ کے درمیان میں پہنچا۔ ہارڈی کے ساتھ اس کا اسٹنٹ پگنی تھا۔ جبکہ مغلڈ کے ساتھ بیکر..... جعفر کارنر کے باہر رسیوں پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ جیس نے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ پریشان تھا۔ دونوں باکسروں نے ایک دوسرے کے دستانے چھوئے..... اور اپنے کارنر میں چلے آئے۔ گھٹی

بجتے والی تھی۔

ہارڈی کی پشت اپنے حریف کی طرف تھی۔ وہ اپنے کارنر میں بیگی کی ہدایات غور سے سن رہا تھا۔ گھٹی کی آواز سننے ہی وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور فائٹنگ پوز میں رنگ کے وسط میں آ کھڑا ہوا۔ لیکن مغلڈ پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ اس کا لیفٹ ہارڈی کے کان پر پڑا۔ ساتھ ہی ٹائٹل رائٹ چوہ جڑے پر..... ہارڈی کے کولہوں کے بل اس طرح گرا کہ اس کی ایک ٹانگ کو لمبے کے نیچے دہی ہوئی تھی۔ مغلڈ اچھے ہٹا اور رسیوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں اور تھوٹی کے تاثر کو اگر کوئی مفہوم دیا جاسکتا تھا تو وہ مایوسی کا تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ گویا اس کی دانست میں اسے کمزور حریف سے لڑا کر ایک بہت بڑی خوشی سے محروم کر دیا گیا ہے۔ لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹائم کیپر ناک ڈاؤن کاؤنٹ میں مصروف تھا۔ جیس بھی بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوہ مائی گاڈ.....“ وہ پر جوش لہجے میں یولا۔ صرف دوسرا چیخ..... پھر اچانک اسے خیال آیا۔ اور اس نے اپنے ٹیلی گرافٹ سے چیخ کر کہا۔ ”ہارڈی دو پونوں کے بعد نیچے گر گیا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے۔ اپنے ہوش و حواس ٹھو بیٹھا ہے۔ میرے خیال میں ٹھیل ختم ہو چکا ہے۔ مغلڈ نے ابتداء میں ہی اسے ڈھیر کر دیا ہے۔“ ریفری ہارڈی کی طرف بڑھا۔ اس نے لنتی شروع کر دی۔ چار..... پانچ..... چھ..... سات پر ہارڈی نے کسی نہ کسی طرح اپنی دہی ہوئی ٹانگ باہر نکالی۔ اور چاروں ہاتھوں پاؤں پر اٹھا۔ آٹھ پر اس نے اپنے سر کو زور سے جھکا اور نوپراٹھ کھڑا ہوا۔ ریفری نے اسے چند سیکنڈ کی روایتی مہلت دی۔ اور ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے مغلڈ کو رنگ میں آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن ہارڈی فوراً مغلڈ اسے لپٹ گیا۔ نتیجے میں اسے کئی بوسے برداشت کرنے پڑے۔ ہارڈی لپٹا رہا اور بوسہ بازی پر مغلڈ کو برا بھلا کہتا رہا۔ لیکن مغلڈ نے اسے سزا نہیں دی۔ شاید وہ اس مقابلے سے پوری طرح لطف اٹھانے کے موڈ میں تھا۔ پھر شاید مغلڈ کی کھروری

زبان اور بھیگا ہوا بوسہ ہارڈی کو پوری طرح خوش و ہواس میں لے آیا۔ ریفری نے انہیں الگ کیا۔ ہارڈی پیچھے ہٹا تو وہ خود پر بڑی حد تک قابو پا چکا تھا۔ اس کی خود اعتمادی بحال ہو چکی تھی۔ لوگ اس کے حق میں غرے لگا رہے تھے۔ اور وہ خود واحد ٹھنڈی کا کام کرتا رہا۔ وہ رنگ میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس نے مغلڈ پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ صرف جھکائیوں اور پیٹیتروں سے کام چلاتا رہا۔ لوگوں کے حوصلے افزا غرے اسے ہمیز کر رہے تھے۔ ہر شخص چیخ رہا تھا۔ کہ وہ مغلڈ اسے دور کر رہے۔ وہ اپنی مہارت پھرتی اور جہلت سے پوری طرح کام لے رہا تھا۔ ویسے بھی اس فائٹ کے لئے اس نے واقعی بہت محنت کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی ٹانگیں پوری طرح اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ وہ مغلڈ اسے فتح کر بھاگتا رہا۔ جیس نے دل میں شکر ادا کیا کہ فائٹ پہلے پندرہ سیکنڈ میں ختم نہیں ہوئی۔ اپنی مرضی کے خلاف اس کے دل میں دوبارہ یہ خواہش ظاہر ہوئی۔ کہ کاش ہارڈی جیت جائے۔ اور وہ اپنی اس خواہش پر حیران ہوا۔ اس کی ہمدردیاں ہارڈی کے ساتھ تھیں۔ شاید انسانی رشتہ تمام نفرتوں کی دیواریں گرا کر ہادی آ گیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ اس بھرے ہوئے رخ نے مغلڈ کو نہ صرف الجھا دیا تھا بلکہ وہ مایوس بھی تھا۔ شاید مسئلہ اس کے لئے نیا تھا۔ اسے پہلی بار ایسا حریف ملا تھا۔ جو اس پر حملہ نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اس سے بھاگ رہا تھا۔ وہ نیم دلی سے ہارڈی کا تعاقب کر رہا تھا۔ جیس نے اندازہ لگایا کہ مغلڈ اصورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے دوبارہ ہارڈی پر ہاتھ چلایا۔ لیکن ہارڈی کے متحرک ہونے کی وجہ سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ راؤنڈ ختم ہونے کی گھٹی بجی۔ تو ہارڈی اپنے کارنر کے قریب تھا۔ وہ اپنے اسٹول پر ڈھیر ہو گیا۔ کیونکہ اس کا سانس اکھڑ گیا تھا۔

اسٹیڈیم تالیوں سے گونج رہا تھا۔ لوگ ہارڈی کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ ہارڈی کے کارنر میں بیگی اسے سمجھا رہا تھا۔ جبکہ راؤنڈ ختم ہونے کے بعد ہارڈی کا



سینڈ اس کی ٹانگوں کی ماش کر رہا تھا۔ ہارڈی کی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ پہلے جھٹکے سے پوری طرح سنبھل چکا ہے۔ دوسری طرف مللڈا اپنے کارز میں رسیوں پر ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ بار بار سر ہلا رہا تھا۔ اور جیس کے خیال میں ہارڈی کو غصے سے گھور رہا تھا۔ شاید اس کے خیال میں ہارڈی صحیح معنوں میں ایک کھلاڑی کی طرح مقابلہ نہیں کر رہا تھا۔ بیکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھینکتا ہوتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں اس کا کان کھینچ کر اس میں ہدایات انڈیل رہا تھا۔

”ایزی بوائے ایزی..... اس کا انتظار کرو۔ اگلی بار وہ بچ نہیں سکے گا۔ وہ ساری رات بھاگ نہیں سکتا اور رنگ میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہوتی۔ جہاں آدمی منہ چھپا سکے۔“ جیس نے یہ بات محسوس کی کہ بیکر اور جعفر راز دارانہ انداز میں ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے تھے۔ دوسرا راؤنڈ پہلے راؤنڈ جیسا ثابت ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار ہارڈی گرا نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خود کو بجا کر نفسیاتی برتری حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔ اس کے منہ پر کبھی فی الوقت صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ وہ ناک آؤٹ نہ ہو۔ اس نے ہارڈی کو یہی ہدایات دیں تھیں کہ بھاگتے رہو۔ پہلے راؤنڈ کے ناک ڈاؤن کے نتیجے میں تماشاخیوں کو بھی صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بے صبرے پن کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ عام حالات میں تو وہ ہارڈی کو محض ہونٹک کے ذریعے ناک آؤٹ کر دیتے۔ چنانچہ ہارڈی اپنی پانچ میل یومیہ دوڑ کی مشق کو بروئے کار لا رہا تھا۔

مللڈا کی پیشانی پر ایک گہری لکیر نمودار ہو گئی تھی۔ جیس کے خیال میں بات صرف اتنی سی تھی کہ مللڈا کو جنگی حکمت عملی کے ایک سنگین مسئلے کا سامنا تھا۔

بلکہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہارڈی نے مللڈا کو اس کام سے محروم کر دیا تھا جو اسے بائسنگ میں ملتا تھا۔ لڑنے کے لئے دو کنگروں کا ہونا ضروری ہوتا ہے جبکہ یہاں ایک کنگرو کھیلنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ لیکن

ہارڈی کی طرح ایک تیز رفتار باکسر کے پیچھے بھاگنا ایک مختلف بات تھی۔ مللڈا کو بھاگنے کے بجائے جست لگانا ہوتی تھی اور ہارڈی اس دوران پلٹ کر دائیں بائیں جانب ہو جاتا تھا۔ مللڈا کی جست میں فٹ کی تیزی جبکہ رنگ میں مربع فٹ کا تھا۔ یعنی مللڈا کی چھلانگی کی سمت کا اندازہ لگانا اور مخالف سمت بھاگ لینا۔ چنانچہ راؤنڈ کے پہلے سینڈ میں یہ منظر دیکھنے میں آتا کہ رنگ کے ایک طرف مللڈا ہے دوسری طرف ہارڈی اور درمیان میں ریفری..... اور اسٹیڈیم جتھوں اور تالیوں سے گونج رہا ہے۔ اب ریفری ہارڈی کے کارز کی طرف بڑھا وہ ہارڈی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن تماشاخیوں کے شور میں سننا ممکن نہیں تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ وہ ہارڈی کو خبردار کر رہا تھا کہ وہ مقابلہ کرے۔ ورنہ اسے نا اہل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ریفری اور پنکی کے درمیان کچھ تند و تیز گفتگو ہوئی۔ مللڈا نے اس بار اسٹول پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ بیکر اب بھی اس کے کانوں میں ہدایات انڈیل رہا تھا۔ اور مللڈا بار بار سر جھٹک رہا تھا جیسے وہ سخت غصے میں ہو۔ وہ کچھ زور بھی دکھائی دیتا تھا۔ جیس کے اسٹینٹ نے ٹیلی گرافٹ کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ ”مللڈا اب پہلے کی طرح سرد مزاجی کا مظاہرہ نہیں کر رہا۔ لیکن یہ کتنا مشکل ہے۔ کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اور اس کا ارادہ کیا ہے۔“

”وہ کچھ نہیں سوچتا۔ جیس نے اسٹینٹ کو ٹوکا۔ وہ انسان نہیں کنگرو ہے۔ اگر ہارڈی اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ تو وہ یقیناً اسے زپ کر دے گا۔ لیکن اگر ہارڈی پندرہ راؤنڈ تک بھاگتا رہا۔ تو تمہیں اور مجھے شہر کو چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔“ پھر اس نے بیکر کو پکارا۔

”اسے سمجھاؤ..... کہ اپنی جگہ کھڑا رہے۔ اس کا پیچھا کرنا بے کار ہے۔ اس صورت میں اگر ہارڈی خود اس کے قریب نہ آیا۔ تو ریفری اسے مجبور کرے گا۔“ بیکر تلخ لہجے میں بولا۔

”تم ہی سمجھاؤ..... وہ انگریزی نہیں سمجھ پاتا۔“ راؤنڈ کے آغاز کی گھنٹی بجی تو لوگوں نے چیخ چیخ کر

مللڈیم سر پر اٹھالیا۔ یہ تیسرا راؤنڈ تھا۔ اور اس سے پہلے مللڈا کی کوئی فائٹ تیسرے راؤنڈ میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ یہ ہارڈی کے لئے ایک علامتی فتح تھی اور تماشائی اس کا اظہار کر رہے تھے۔ اسے داد دے رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہارڈی چاہے نہ جیتے..... لیکن ناک آؤٹ نہ ہو۔ فکری انتشار نے جیس کو اندر سے ہلا دیا۔ وہ ہارڈی کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہارڈی اسی طرح اپنے پیروں پر کھڑا رہے۔ تاکہ تماشاخیوں کو اپنے پیروں کا زیاں کا احساس نہ ہو سکے۔ لیکن دوسری طرف وہ مللڈا کو فٹ پاب ہوتا بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر فائٹر مللڈا کے دماغ نے مسئلے کا ایک حل سوچ لیا۔ اس مرتبہ گھنٹی بجتے ہی رنگ کے وسط کے بجائے اس نے اپنے حریف کے کارز کی جانب چھلانگ لگائی۔ ہارڈی ابھی اسٹول سے اٹھ کر کھڑا ہی ہو رہا تھا۔ کہ مللڈا اس کے سر پر جا پھینچا۔ مللڈا نے شارٹ رائٹ ایکٹ مار کر اسے گرا دیا۔ اب کی دفعہ ہارڈی آٹھ تک گنتی کے بعد اٹھ سکا۔ اس دوران اس کا اسٹینٹ پنکی ڈاؤن فاول چیخ رہا۔ لیکن ریفری نے اس احتجاج کو مسترد کر دیا۔ کیونکہ راؤنڈ شروع ہو چکا تھا اور اپنا دفاع کرنا ہارڈی کی اپنی ذمہ داری تھی۔ اٹھنے کے فوراً بعد ہارڈی نے مللڈا سے لپٹنے کی کوشش کی۔ لیکن مللڈا نے ٹین اسٹریٹ لیفٹ اور پیسلوں میں ایک رائٹ چوپ کے ذریعے اسے روک دیا۔ اب ہارڈی کو اپنی ٹانگیں لڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔

تماشاخی ہارڈی سے چیخ چیخ کر التجائیں کر رہے تھے کہ وہ مللڈا سے دور رہے۔ لیکن ہارڈی کی ہاتھ کھانچا تھا اور پھر مللڈا نے اسے گھیر بھی لیا تھا۔ اس لئے ہارڈی نے چہرہ انی کہنیوں کی اوٹ میں چھپا لیا۔ لیکن مللڈا نے جسم پر لیفٹ ہک کے ذریعے اس کا دفاعی حصار توڑا اور شارٹ رائٹ چوپ کے ذریعے اسے گرا دیا۔ ہارڈی نو تک گنتی کے بعد بمشکل سنبھلا۔ لیکن اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ تاہم وہ اٹھ کر کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہ دوبارہ مللڈا سے لپٹ گیا۔ اپنے

قدموں پر کھڑے رہنے کی اب یہی ایک صورت تھی۔ مللڈا ایک بار پھر کامیابی کے احساس سے سرشار تھا۔ اس لئے اس کا دل اس مختلف قسم کے کنٹرول کی محبت سے لبریز ہو گیا۔ جس نے اس سے مقابلہ کر کے اسے لطف کی ساعتیں فراہم کی تھیں۔ اس نے ہارڈی کو بوسوں سے نہلا دیا۔ ریفری نے انہیں چھڑایا۔ لیکن ہارڈی پھر مللڈا سے لپٹ گیا۔ ہارڈی نے اس کے جسم پر دھڑکنا چاہا۔ تو مللڈا نے اسے جکڑ کر بے بس کر دیا۔ ہر تماشائی اپنی سیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ ہارڈی اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہے..... ہاری ہوئی جنگ..... ریفری نے ایک دفعہ پھر انہیں چھڑایا..... ہارڈی نے الگ ہوتے ہی پیچھے ہٹنے کی کوشش کرنے کے بجائے پیچ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مللڈا جھکاٹی دے گیا۔ ہارڈی ایک دفعہ پھر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن انداز سے پتا چلتا تھا کہ اس بار وہ اٹھنے والا نہیں ہے۔ لیکن گنتی سات تک پہنچی تھی کہ راؤنڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ مللڈا صرف تین سینڈ کے فرق سے عالمی ٹیٹل ویٹ چیمپئن بننے بننے رہ گیا۔

ہارڈی کا اسٹینٹ پنکی اور اس کے دوسرے ساتھی رنگ میں اتر آئے۔ وہ اسے گھسیٹ کر کارز تک لائے۔ انہوں نے سہارا دے کر ہارڈی کو اسٹول پر بٹھایا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔ یہ بات طے تھی کہ ہارڈی نے اس فائٹ کے لئے بھرپور محنت کی تھی۔ کیونکہ وہ امو نیا سو گھٹے ہی بہت تیزی کے ساتھ ہوش میں آ گیا۔ ریفری اور ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے کی غرض سے آئے کہ وہ مقابلہ جاری رکھ سکتا ہے یا نہیں۔ اس مرحلے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر انہیں جانے کا اشارہ کیا۔ اور ہسٹریائی انداز میں مللڈا کو گالیاں دینے لگا۔ اب ہارڈی نہیں چل سکتا۔ جیس نے اپنے اسٹینٹ سے پر جوش لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ پیچ میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ مللڈا نے سرکس میں اسی پیچ کے ذریعے ہارڈی کو ناک آؤٹ کیا تھا۔“



گھٹی جیتے ہی ہارڈی اسٹول سے اٹھا اور کسی نہ کسی طرح مغلڈا کے جھپٹنے سے بچ نکلا۔ اس کے ساتھی چیخ رہے تھے۔

”ہو ہارڈی..... بچو اس سے.....“ لیکن توہین کے احساس اور بے پناہ غصے نے ہارڈی کو دیوانہ کر دیا تھا۔ وہ مغلڈا پر حملہ آور ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ مشینی انداز میں حرکت کرنے لگے۔ لیفٹ۔ رائٹ۔ اپرکٹ..... جیب۔ سونگ..... مجمع پر جوش انداز میں چیخنے لگا۔ ہر شخص کو احساس تھا کہ وہ ہارڈی کی بے جگری کے علاوہ مغلڈا کے دفاع کی ایک غیر معمولی اور بے نظیر مظاہرہ دیکھ رہے ہیں۔ اس کی بالنگ اس کے پیترے اور جھکانیاں غضب کی تھیں۔ پھر اس نے مونیج پا کر ہارڈی کی کپٹی بھی تھپتھادی۔ پہلی بار اس کی تھوپی پر آسودگی کا تاثر نظر آیا۔ آخر کار تھک ہارڈی ہارڈی اس سے لپٹ گیا۔ مغلڈا نے اسے آخری بار چوما۔ وہ بوسہ مرگ تھا۔ کیونکہ بیک کے حلق سے فاسخانہ چیخ نکلی۔

”کھیل ختم..... یہ بوسہ مرگ ہے۔“ بیکر دیوانہ وار چیخ رہا تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ریفری نے مغلڈا کے کاندھے پر چھکی دیتے ہوئے بریک کہا۔ تو مغلڈا اصول کے مطابق پیچھے ہٹا۔ ہارڈی کے لئے یہی لمحہ ہوش مندی کا ثابت ہوا۔ اس کے کانوں پر اپنے کارنر کی طرف سے آنے والی آوازیں پڑیں۔

”ہارڈی بھاگو..... خدا گمے لئے اس سے دور بھاگو.....“ اور ہارڈی بھاگ اٹھا حالانکہ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اس کے باوجود اس نے مغلڈا کو ایک بار پھر اپنا تعاقب کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس بار ٹیمپٹین میں طاقت نہیں تھی۔ لیکن وہ پہلے سے زیادہ ہوش مند تھا۔ وہ رفتار کی کمی کا ازالہ اپنی چھری اور تیز مڑنے کی صلاحیت سے کر رہا تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ میں شطرنج کے تمام مہروں کا انداز اپنایا۔ پیدل، فزریں، نیل، رخ اور سب سے عجیب چال گھوڑے کی چال..... کیونکہ وہ اچانک اپنی سمت تبدیل کر لیتا۔ اس راؤنڈ کے دو منٹ اسی آنکھ

بجلی میں گزر گئے۔ ہارڈی کی کوشش تھی کہ کسی طرح مغلڈا کا توازن بگڑ جائے۔ پھر اسے موقع مل گیا۔ جھکانی کی وجہ سے مغلڈا کا توازن بگڑ گیا۔ وہ اس وقت دفاع کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ تھکے ہوئے انسان نے مغلڈا کے پیٹ میں دو شیخ مارے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے شیخ میں جان نہیں ہے۔ اس لئے وہ پھرتی کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ تاکہ بقاء کے دوڑ دوبارہ شروع کر سکے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مغلڈا کو ہٹ کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ شیخ بے جان بھی لیکن بہر حال ایک اعزاز سے کم نہیں تھے۔ پھر وہ سب کچھ اتنی سرعت کے ساتھ ہوا کہ کوئی بھی کچھ سمجھ نہیں سکا۔ صرف ماہرین ہی اس غیر معمولی نتیجے کا اندازہ لگا سکے۔ جیسے چند لمحے مغلڈا کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے اسٹنٹ سے کہا۔

”میرے خدا مغلڈا کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ مر رہا ہے۔“ مغلڈا اب پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اور ریسیوں کے سہارے لٹکا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر تھے اور آنکھوں میں حیرت کا واضح تاثر۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر تھوپی پر ڈھلک گئے۔ جیسے کو ایسا لگا کہ مغلڈا کے چہرے کا تاثر اس بچے کے تاثر سے ملتا چلتا ہے۔ جیسے اس کے کسی بزرگ نے پہلی بار مارا ہو۔ وہ تاثر جسمانی تکلیف اور کسی کا بھرم ٹوٹنے کی اذیت سے عبارت تھا۔ جیسے کوئی خوش فہمی دور ہو گئی ہو۔ جیسے کوئی سناٹا ٹوٹ گیا ہو۔ جیسے کوئی عزیز اور محبوب ہستی دعا بے گئی ہو۔ جیسے اس تاثر کے علاوہ بھی کچھ دیکھا۔ مغلڈا کے قدموں کے پاس فرش پر بیکر نے جلدی سے توبہ پھینکا کیونکہ مغلڈا کا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔

”میرے خدا وہی ہوا نا.....“ بیکر تقریباً رو دیا۔ ”آہ بے چارہ مغلڈا..... میرا ننگر مسئلہ ختم ہو گیا۔“ اس کی آواز میں درد تھا۔ لہجے میں کرب اور اذیت.....؟ ریفری نے مغلڈا اور ہارڈی کو دوبارہ لڑنے کا اشارہ کیا۔ لیکن مغلڈا اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ وہ ریسیوں سے ٹیک

لگائے کھڑا تھا۔ اور اب اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہ رہے تھے۔ اس کی تھوپی بھگ گئی تھی۔ تماشائی کچھ بھی نہیں سمجھ پارہے تھے۔ ہر طرف دہی دہی سرگوشیاں گونج رہی تھیں پھر بیکر کی آواز فصاحتیں ابھری۔ اس کے لہجے میں درد بھری التجا تھی۔

”خدا کے لئے اب اسے ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہ میرا عزیز ترین دوست ہے۔ میرے دکھوں کا ساتھی..... برے وقتوں کا..... رفیق..... خدا کے لئے.....“ اب وہ بری طرح سسک رہا تھا۔ ہارڈی کو ناقابل فہم سا احساس ہوا۔ کہ پانسہ پلٹ چکا ہے۔ وہ جنگجوؤں کے انداز میں مغلڈا کی جانب بڑھا۔ لیکن وہ اب بھی محتاط تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں یہ بھی مغلڈا کی کوئی چال نہ ہو۔ مغلڈا کے ہاتھ اب بھی پیٹ پر تھے۔ اس نے اپنے دفاع کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ہارڈی نے اپنی پچی پچی قوت جمع کرتے ہوئے اس کے دونوں پہلوؤں میں ایک لیفٹ ایک رائٹ مارا۔ مغلڈا اچاروں پیروں پر فرش پر بیٹھ گیا۔ اب وہ باکسر نہیں صرف ایک ننگر تھا..... ایک چوپایہ.....

تماشاویں نے نعروں نے اسٹڈیم کو ہلا کر رکھ دیا۔ ”میرے خدا.....“ جیسے کراہا۔ ”یہ تو ڈھیر ہو گیا۔ اٹھو مغلڈا..... مردود..... تمہیں بالکل چوٹ نہیں آئی۔“

اب ہارڈی چیخ چلا رہا تھا۔ ”اٹھو ذلیل جانور..... تاکہ میں تیری مزید ٹھکانی کر سکوں۔“ یہ وہ موقع ہوتا ہے جب لوگ بھڑک اٹتے ہیں۔ مجمع فساد یوں کے گردہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا پھر اچانک پیوں کے کشن میں ہونٹک شروع ہوئی۔ خود فریبی میں جتلا لوگوں نے اپنے ہیر وکی مذمت شروع کر دی۔ ریفری بھی الجھ گیا۔ مغلڈا کے دستانے رنگ کے فرش کو چھو رہے تھے۔ لیکن وہ جسمانی تکلیف میں نہ ہونے کے علاوہ زخمی بھی نہیں تھا۔ ہاں بہت زیادہ دھکی دکھائی دیتا تھا۔ بہر حال ریفری نے خود کو سنبھال اور ہارڈی کو کاندھوں سے تھام کر دور ہٹا دیا۔ دہریزی ڈاکٹر مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے

کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ٹائم کیپر کے حواس کسی نہ کسی طرح برقرار رہے تھے۔ اس نے ہارڈی کے بیٹھے ہی ناک ڈاؤن کا خیال رکھا۔ چنانچہ ریفری نے لگتی شروع کی اور دس پر ختم کر دی لیکن مغلڈا نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ اس بار تماشاویں کے شور میں کسی سمندری طوفان کی سی گھن گرج تھی۔ ہارڈی کے ساتھیوں نے اسے کاندھوں پر اٹھالیا۔ اور رقص کرنے لگے۔

بیکر رنگ میں داخل ہوا۔ گھٹنوں کے بل مغلڈا کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور اس کا سراپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ اسے تختہ پھار رہا تھا۔ پیار بھری سرگوشیاں کر رہا تھا۔ پھر وہ مغلڈا کو اس کے کارنر میں لے گیا۔ لیکن مغلڈا اب چار پیروں پر چل رہا تھا۔ اناؤنسر نے اعلان کیا۔ ”ٹائم دو منٹ 29 سیکنڈ۔ چوتھا راؤنڈ، وز بائی اے ناک آؤٹ اینڈ اسٹیل ٹیمپٹین ہارڈی ڈوم.....“ اب ہارڈی کے سامنے درجنوں مائیکروفون تھے اور اس سے سوالات کئے جا رہے تھے۔ ایک پولیس والا مغلڈا کے کارنر میں چلا آیا۔ پھر بولا۔ ”اسے یہاں سے لے جاؤ۔ ہم کوئی مشکل کھڑی نہیں کرنا چاہتے۔“ لیکن اسی وقت دہریزی ڈاکٹر رنگ میں داخل ہوا۔ اور اس نے مغلڈا کا معائنہ شروع کر دیا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ جیسے نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ڈاکٹر چند لمحے مغلڈا کے پیٹ کو جگہ جگہ سے دبا تارہا۔ وہ جانتا تھا کہ تکلیف ہوگی۔ تو دبانے کا رد عمل بھی ہوگا۔ پھر ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے اعلان کیا۔ ”یہ ٹھیک ٹھاک ہے۔“ اور مغلڈا اینڈ کینی رنگ سے باہر نکل آئی۔ کسی نے بھی ان کی جانب توجہ نہیں دی۔ وہ سب ہارڈی کی فتح یابی کی خوشی میں سرشار تھے۔ بیکر بری طرح درود رہا تھا۔ جیسے اور جعفر پیچھے تھے۔

اگلی صبح جیسے ناشتے کی میز پر نیویارک ٹائمز کا تازہ ایڈیشن دیکھ رہا تھا۔ پہلے صفحے پر ننگر وکی وہ تصویر تھی۔ جس میں وہ ہارڈی ڈوم کے قدموں میں ریگ رہا تھا۔ جیسے اس تصویر کو دیکھ کر گوارا نہ تھا۔ اور بڑبڑا رہا



تھا۔ نیویارک ٹائمز کے علاوہ بیشتر اخبارات نے شکست کے دہانے سے فتح یابی کی صورت میں ابھرنے والی جیمپن کی تعریف کے بل باندھے تھے۔ انہوں نے ہارڈی ڈوم کے حوصلے اور اسٹینا کو سراہتے ہوئے اسے عظیم ترین فائٹر قرار دیا۔ صرف نیویارک ٹائمز کے تجربہ کار باسنگ رائٹر جوز نے کنکرو کے اچانک ڈھیر ہو جانے کو تعجب انگیز قرار دیا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس سلسلے میں اس وقت تک کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جب تک آدمی کنکرو کے اندرونی سسٹم اور اس کی ذہنی کیفیات اور رویوں سے واقف نہ ہو۔ بہر حال غریب بچوں کے مفت خوراک فنڈ میں تیس لاکھ ڈالر کا اضافہ جیمس کی بہت بڑی فتح تھی۔

جیمس ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھا۔ کہیں کچھ گڑبڑ تھی۔ جعفر بے ضرر لڑا تھا۔ بیکر ملڈ کے ساتھ تخلص تھا۔ پھر اچانک اسے انکل ٹوٹو کا خیال آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس معاملے میں انکل ٹوٹو نے کوئی گڑبڑ کی ہو۔ اس نے ملڈ کی غذا میں کوئی ملاوٹ کر دی ہے۔ اور اب بیٹھا ہنس رہا ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ ملڈ رنگ میں داخل ہوا تھا۔ تو بالکل چاک و چوبند تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا۔ وہ بالکل اچانک ہوا تھا۔ دروازہ کھلا اور چڑ اسی نے اسے بتایا کہ باہر کچھ لوگ اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ جیمس نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے اسے بھیجے کا اشارہ کیا۔ اور کرسی کے ساتھ کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔

”دروازہ بند کر دو۔“ جیمس گھمبیر لہجے میں بولا۔ بیکر نے دروازہ بند کر دیا۔ اور خاموشی کے ساتھ جعفر کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے کا ماحول کشیدہ تھا۔ خاموشی تکلیف دہ ہوئی جارہی تھی۔ جیمس نے جھپٹی ہوئی نگاہوں سے بیکر کو دیکھا۔ پھر بولا۔

”چلو اب شروع ہو جاؤ۔ کیا ہوا تھا؟“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جیسے فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کہ جواب کون دے گا۔ پھر بیکر گلا کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔

”آپ نے اخبار میں درست لکھا مسٹر جیمس۔۔۔۔۔ ہارڈی بار بار اٹھتا رہا۔ دوسری طرف ملڈ اے بے پروا ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ شور و غل ہو۔ بہر حال ہارڈی کو مومن مل گیا۔ اور اس نے دو شی ایسے مارے ایسے شیخ جو کسی کو بھی ناک آؤٹ کر سکتے ہیں۔ وہ شیخ فاول لائن سے نیچے مارے گئے تھے۔ لیکن ریفری تو بے نہ دے سکا۔ اس کے باوجود ملڈ اٹھ جاتا۔ لیکن ریفری نے گنتی بہت تیزی سے گنی۔۔۔۔۔“

”بکواس مت کرو۔“ جیمس غرایا۔ دونوں نزوں دکھائی دینے لگے۔ ”تم ایک اسپورٹس ایڈیٹر کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ اصل بات اگل دو۔ ورنہ پولیس میں رپورٹ کرو اور تم دونوں کو حوالات بھجوا دوں گا۔“ جعفر ہمت کر کے بولا۔

”جناب بات یہ ہے کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے۔ آپ یقین کریں گے کہ ملڈ اکو زندگی میں پہلی دفعہ کسی نے شیخ مارا ہے۔“ جیمس سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”کیا مذاق کر رہے ہو؟“ وہ غرایا۔ ”تمہارا مطلب ہے۔ پانچ سال میں ملڈ نے کبھی شیخ نہیں کھایا۔ یہ ناممکن ہے۔ تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔“ جعفر نے بیکر کی جانب دیکھا۔ پھر بولا۔

”جھوٹ بولنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ملے والا۔۔۔۔۔ بات یہ ہے جناب۔۔۔۔۔ کہ اس فائنٹ سے پہلے جو کچھ ہوتا رہا۔ وہ سب محض ایک ایک تھا۔ جیسا سرکس میں ہوتا ہے۔ کنکرو کی فطرت ہے۔ آپ سے ایک بار مارو بیچتے۔ پھر وہ کبھی دوبارہ سر نہیں اٹھائے گا۔ کبھی مقابلہ نہیں کرے گا۔ وہ فطری طور پر بہت حساس جانور ہے۔“ بیکر بات درمیان میں کاٹ کر بولا۔

”مجھے ملڈ اسے پہلے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ میں نے ایک کنکرو کو تین سال تربیت دی۔ ایک بار میں نے اس کی زنجیر سرکس کے ایک آدمی کے ہاتھ میں تھما دی اور کوڈ کی کام میں مصروف ہو گیا۔ کنکرو مجھ سے مانوس تھا۔ اس لئے میری غیر موجودگی کو محسوس کر کے

زور ہو گیا۔ اس نے میرے ساتھی کو گھونسا مارا۔ جبلی طور پر میرے ساتھی کا ہاتھ بھی چل گیا۔ اس کے بعد کنکرو دوبارہ کبھی نہیں لڑا۔ اس نے کبھی دستا نہیں پہنے۔ ہرے تین سال بر باد ہو گئے۔ کنکرو اندر سے بہت بڑک جانور ہوتا ہے جناب۔۔۔۔۔“

جیمس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ملڈ کے دکھ اور آنسوؤں کا معہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ لیکن تم نے کہا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے تنگدلی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اور فطری طور پر باکسر ہوتے ہیں۔“ جیمس نے اعتراض کیا۔

”یہ درست ہے جناب۔۔۔۔۔ وہ یا تو کسی مادہ کنکرو کے لئے لڑتے ہیں۔ یا سرداری کے لئے۔۔۔۔۔“ بیکر نے بتایا۔ ”اور جیسے ہی ان میں سے کسی ایک کو کوئی ٹھیک ٹھاک شیخ لگتا ہے۔ وہ ہارن مان لیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ آئندہ کے لئے کسی ہم جنس سے نہیں لڑتا۔ منع ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے۔۔۔۔۔ یہ ہے کنکرو کی فطرت۔۔۔۔۔ اسے لڑانا ہے۔ تو اس کا یہ بھرم رکھنا ہوگا۔ کہ وہ ناقابل تہذیب ہے۔ جہاں یہ بھرم ٹوٹا۔ وہیں وہ ہمیشہ کے لئے سرگوا ہو۔ عام انسانوں کی بھی یہی فطرت ہے مسٹر جیمس۔۔۔۔۔“

جیمس کو اپنے ہاتھ پاؤں پھولنے محسوس ہوئے۔ پھر وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”لیکن ملڈ عام کنکروؤں سے مختلف تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی مہارت دیکھی ہے۔“

”یہ درست ہے جناب۔۔۔۔۔ وہ واحد کنکرو ہے۔ جو کھلاڑی تھا۔ اور اس کھیل سے محبت کرتا تھا۔ لیکن جناب فطرت سے مبرا تو وہ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ مجھے اس کے مقابلے میں دفاع کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ پیدائشی باکسر تھا۔ لیکن بہر حال کنکرو تھا۔ اب اس کی مہارت صرف ماضی کی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اور ایک بات بتاؤں۔۔۔۔۔ اگر کاموگا میں ہارڈی اس کے مقابلے میں اپنے اصل نام سے آتا۔ تو میں کبھی بھی وہ مقابلہ نہ ہونے دیتا۔ میں

اسے پانچ سو ڈالر دے دیتا۔ پروفیشنل کا معاملہ تو آپ جانتے ہی ہیں جب تک ناک آؤٹ نہ ہو۔ کوئی باکسر کسی بھی وقت ہٹ کر سکتا ہے۔ دنیا میں کوئی باکسر ایسا نہیں گزرا۔ جس نے کبھی شیخ نہ کھایا ہو۔ یقین کیجئے کہ جب میں نے آپ کے کالم میں پڑھا کہ وہ عالمی ٹیٹل ویٹ چیمپئن تھا۔ تو میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ میرے لئے ملڈ ابی سب کچھ تھا۔ وہ میری روزی تھا۔ اور میرے بڑھاپے کی ضمانت بھی۔۔۔۔۔ اگر ہارڈے نے اس دن اسے شیخ کر دیا ہوتا۔ تو میں تباہ ہو جاتا۔“ جیمس کے جسم میں پسینہ پھوٹ پڑا۔ پھر وہ جھنجھلائے لہجے میں بولا۔

”لیکن تم نے بعد میں اسے پروفیشنل باکسروں سے بھی لڑوایا۔“ اس دفعہ بیکر خاموش رہا۔ وہ دونوں پتھر کے جسے کی طرح گم سم بیٹھے تھے۔ اور تیس سے نظریں چرا رہے تھے۔ جیمس پھر گیا۔

”بتاؤ نا۔۔۔۔۔ تم لوگوں نے کیا کیا۔“ آخر کار بیکر ہمت کر کے بولا۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مسٹر جیمس۔۔۔۔۔ ہم تو ایک ایک ترتیب دے رہے تھے۔ ملڈ اکا ہر مقابلہ ایک ایک تھا۔ بھلا ایک کنکرو عالمی ویٹ چیمپئن کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ”کیونکہ یہ بات چیمپئن کے لئے توہین آمیز تھی۔ آپ کے کالم نے ہمیں کامیابی کی راہ دکھائی۔ ہمارا مقصد صرف انکل ٹوٹو سے بدلہ لینا تھا۔ کیونکہ وہ جعفر کی محبوبہ کا قاتل تھا۔ میرا تعلق باسنگ کے شعبے سے گہرا رہ چکا تھا۔ مجھے اس کے اسرار و رموز پر گہری تحقیق تھی۔ اور میں اس بات سے بخوبی واقفیت رکھتا تھا کہ باسنگ میں پیسہ اہمیت رکھتا ہے۔ اکثر باکسر پیسے کی بدولت خریدے اور بیچے جاتے ہیں۔ ہم نے پیسہ کمانے کے فوراً بعد باکسروں کو خریدنا شروع کر دیا تاکہ ملڈ اکو کوئی بھی نقصان نہ پہنچانے پائے۔“

”یعنی ملڈ اکا کی ہر فائنٹ طے شدہ تھی۔ تم دونوں لفٹکے۔ چور زلیل۔۔۔۔۔؟“



”مسٹر جیس آپ ہمیں برا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہارڈی ایسی ہی فائنٹس کے ذریعے چمپئن بنا ہے۔ اس کی چودہ میں سے نو فائنٹس کو پرموٹ ہی کرنا چاہئے تھا۔ لیکن تم خود غفلت نہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ تم ہارڈی اور انکل نوٹ کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ معاف کرنا۔۔۔ اس فراڈ کا آغاز بھی تمہارے کام سے ہی ہوا تھا۔“

”لیکن تم لوگوں نے باکسروں کو اس بات پر رضامند کیسے کیا کہ وہ مغلڈا کو ہٹ نہیں کریں گے۔ وہ تمہیں ڈبل کر اس بھی کر سکتے تھے۔“ انسان بہت ہی لالچی ہوتا ہے۔ مسٹر جیس۔۔۔ آپ دولت سے ہر چیز خرید سکتے ہیں ہم انہیں منہ مانگی رقم دیتے تھے کیونکہ ہمارے عزائم بلند تھے۔ کہیں کہیں ہمیں ایسے انسانوں سے بھی واسطہ پڑا جنہیں ہم خرید نہیں سکے۔ جو انسانی وقار کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ایسے مومن پر ہم نے اپنے تربیت یافتہ باکسروں کو استعمال کیا۔ لیکن فرضی ناموں سے۔۔۔ تو مسٹر جیس یہ صرف ایک ایکٹ تھا۔ ہم نے کوئی بددیانتی نہیں کی۔ آپ تھیٹر ڈرامہ دیکھتے ہیں۔ ایک اداکار دوسرے اداکار کو شوٹ کر دیتا ہے۔ شوٹ ہونے والا ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ مر گیا ہے۔ لیکن وہ مرنا نہیں ہے۔ تو یہ بددیانتی تو نہیں ہوئی نا۔۔۔؟“ اس نے پر امید نگاہوں سے جیس کی جانب دیکھتے ہوئے بتایا۔

”عجیب منطق ہے۔“ جیس نے محسوس کیا کہ اس غیر منطقی منطق کے سامنے اس کا فلسفہ اخلاقیات دھرے کا دھرا گیا ہے۔

”گو یا تم متعدد جعلی ناک آؤٹ کے ذریعے فائنٹس تک پہنچے۔“

”نہیں مسٹر جیس۔۔۔ وہ ناک آؤٹس جعلی نہیں تھے۔“ بیکر نے احتجاج کیا۔ ”ہم نے ہر باکسر کو صرف اس بات پر مجبور کیا تھا کہ وہ مغلڈا کو ہٹ نہیں کرے گا۔ انہیں اپنا دفاع کرنے کا حق تھا۔ لیکن وہ مغلڈا کی مہارت کے سامنے ٹک نہیں سکے۔ مغلڈا نے ان میں سے ہر ایک کو زپ کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ جیس اس دفعہ مسکرا کر بولا۔ ”میں سمجھ گیا۔ اب اہم ترین سوال۔۔۔ ہارڈی اپنے ٹائٹل کا دفاع کر رہا تھا۔ اس نے فائنٹس کے لئے محنت بھی کی تھی۔ یہ بھی طے تھا کہ وہ مغلڈا کو ہٹ کرے گا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے اسے بھی خریدنے کی کوشش کی۔“ دونوں خاموش ہو گئے اور نظریں چرانے لگے۔ جیس کو احساس ہوا کہ ابھی حقیقت پوری طرح سامنے نہیں آئی۔ پھر بیکر خنڈ اسانس لے کر بولا۔

”کی تھی۔۔۔ لیکن ہارڈی نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا تھا کہ ”مغلڈا کی تھوخی کا نقشہ بگاڑ دے گا۔ اور اسے اپنے شیخ سے واپس آسٹریلیا پہنچا دے گا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔“

جعفر خیر نے لہجے میں بولا۔ ”لیکن فائنٹس سے پہلے تم دونوں کے چہرے پر کچھ اور قسم کا اطمینان بھی پایا جاتا تھا۔ اس کے متعلق بھی کچھ بتاؤ۔“ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ تکلیف دہ اور شرمناک خاموشی۔ جیس میز پر گھونسا مارتے ہوئے بولا۔

”حقیقت اگل دو۔ ورنہ۔۔۔؟“

”حقیقت یہ ہے کہ جب ہارڈی نے انکار کیا۔ تب ہم نے انکل نوٹ کو ہاتھوں مغلڈا کو بیچ دیا۔“

جیس حیرت زدہ لہجہ میں چلایا۔ ”کیا تم نے۔۔۔؟ بھلا تم نے ایسا کیوں کیا۔“

”ہم جانتے تھے کہ اس فائنٹس کے بعد مغلڈا لڑائی کے قابل نہیں رہے گا۔ اسے صرف چڑیا گھر والے قبول کریں گے۔ دوسری جانب انکل نوٹ جیسے لوگوں کو اپنی اتالی بے حد اہم ہوتی ہے۔ وہ ہارنا کو اوار نہیں کرتے۔ اور ریکارڈ کے مطابق مغلڈا ایک جیتنے والا گھوڑا تھا۔ اس لئے اس نے ہمیں مغلڈا کو خریدنے کی آفر کی۔“ جیس بات درمیان میں کاٹ کر بولا۔

”اور قیمت کیا طے پائی؟“

”میں لاکھ ڈالر۔۔۔“ بیکر بولا۔ ”لیکن مغلڈا ابھی

تک ہمارے پاس ہے۔ ہماری پلائنگ کچھ اور ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ جیس نے تابانہ لہجہ میں

پوچھا۔

”جعفر اپنی محبوبہ کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ ہمارا منصوبہ اسی مناسبت سے ہے۔ انکل نوٹ مغلڈا کو حاصل کرنے کے لئے بیٹاب ہے۔ ہم اس سے بالمشافہ ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کہنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے ہمیں گل ریس کورس اسٹیڈیم میں بلایا ہے۔ وہ مغلڈا کو جانتا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے اپنے ورکرڈ پر اعتماد نہیں کرے گا۔ اس لئے خود آنا ہوگا۔ آسان سا مٹا ہونے کے بعد ہم اگلے اقدام کا تعین کریں گے۔“ جیس نے اثبات میں سر ہلایا اور خفیف آواز میں انہیں اگلی پیش قدمی کے متعلق ہدایات دینے لگا۔

ریس کورس اسٹیڈیم شہر سے باہر ویرانے میں واقع تھا۔ یہاں گھوڑوں کا بہت بڑا مصلیٰ ہونے کے علاوہ گھوڑوں کی سالانہ ریس کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ آبادی کا دور دور تک نام و نشان موجود نہیں تھا۔ شاید اسی لئے انکل نوٹ نے جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ بیکر، جعفر اور مغلڈا کے ہمراہ تقریباً بارہ بجے اسٹیڈیم پہنچ گیا۔ مغلڈا

کے سر پر بہت بڑا ہیٹ موجود تھا۔ اس ہیٹ کو پلاسٹک کی ڈوری کے ذریعے گردن کے ساتھ باندھا گیا تھا۔

مغلڈا ہیٹ پہنہ بہت مضحکہ خیز دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس سیاہ ہیٹ کے نیچے سیاہ رنگ کا ریو اور اس کا ج ٹیپ کے ذریعے چسپاں کیا گیا تھا۔ یہ ریو اور کل طور پر لوڈ تھا۔

علاوہ ازیں گولیوں کی مناسب مقدار تھیلے میں باندھ کر چسپاں کی گئی تھی۔ اسٹریم کے باہر انکل نوٹ کے گارڈ کا دستہ موجود تھا۔ انہوں نے جعفر اور بیکر کی تلاشی لی اور

دونوں کو اسٹیڈیم میں جانے کی اجازت دے دی۔ اسٹیڈیم کے ہال کمرے کے درمیان میں انکل نوٹ اپنے تین عدد سرج آدمیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ اس نے اپنا

چہرہ نقاب کے ذریعے چھپایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کا بریف کیس بھی موجود تھا۔

جس میں یقیناً رقم موجود تھی۔ جعفر اور بیکر کو دیکھتے ہی اس نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”خوش آمدید میرے دوستو۔۔۔ تم میںوں کی

دل سے قدر کرتا ہوں۔ تم نے وہ کام کر دکھایا۔ جو کوئی عام انسان نہیں کر سکتا۔ اور مغلڈا کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ یہ وہ جانور ہے جو عالیشان محل میں رکھنے کے قابل ہے۔ اگر یہ کچھ دیر اور اپنے آپ کو ہارڈی سے دور رکھ لیتا۔ تب یقیناً جیت اسی کی ہوتی۔ اس بریف کیس کے اندر میں لاکھ ڈالر موجود ہیں۔ جانور میرے ماتحت کے حوالے کر دو۔“ انکل نوٹ نے بریف کیس بیکر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

بیکر نے جعفر کو اشارہ کیا۔ اور خود آگے بڑھ کر بریف کیس کو تھام لیا۔ پھر بٹن دبا کر ڈھکنے کھولنے لگا۔

جوش کی بدولت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ انکل نوٹ اور اس کے تینوں ماتحت دھچکی کے ساتھ اس کی حرکات کا معائنہ کر رہے تھے۔ اس مختصر وقت کے دوران جعفر

مغلڈا کے سر سے ٹوپی اتار چکا تھا۔ اس نے پھرتی کے ساتھ گولیوں سے بھری ہوئی پٹیلی کو اپنی جیب میں ڈالا

اور ریو اور کو ہاتھ میں تھام لیا۔ اب جو اس نے بیکر کی جانب دیکھا۔

تب وہاں عجیب و غریب تماشا پایا جاتا تھا۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ نوٹ چپک کرتے ہوئے بیکر

نے تمام نوٹ اچانک ہی ہوا میں اچھال دیئے تھے۔ اب ہال کا تمام فرش نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور

وہ نوٹوں کو سمیٹنے کے لئے پاگلوں کی طرح پاؤں چلا رہا تھا۔ انکل نوٹ اور اس کے ساتھی عسلی نگاہوں سے اسے

دیکھ رہے تھے۔ ان تینوں کی توجہ کامرکز بیکر تھا۔ وہ جعفر کو بیکر فرموش کر چکے تھے۔

جعفر نے ریو اور کو سیدھا کیا اور انکل نوٹ کے سر کا تھنہ لے کر فائر داغ دیا۔ اس کے تینوں ساتھیوں نے

ریو اور کو سیدھے کرنے کی کوشش کی۔ بیکر نے ہاتھ میں موجود بریف کیس ان کی جانب اچھال دیا۔ بریف

کیس پہلے آدمی کے سینے پر لگا۔ اور اس کے ہاتھوں سے ریو اور دور دور جا گرا۔ جعفر نے ریو اور کے ٹن کو تیزی کے ساتھ دبا نا شروع کر دیا۔ ہال زور دار فائرنگ کی

آواز سے گونج اٹھا۔ تینوں آدمیوں کو ریو اور استعمال



انکل نو نو کی لاش کو چیک کرتے ہیں۔ اس نے آگے بڑھ کر سٹھ شدہ چہرے پر سے نقاب اتار دیا۔

اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے چیخ نکلتی پئی۔ وہاں کرمل..... کی لاش موجود تھی۔ اسپورٹس کے وزیر کرمل چیخ کی لاش..... سب کچھ غیر متعین تھا۔ لیکن انکار کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس لئے لاش کو اٹھایا گیا۔ اور ہال کو بند کر دیا گیا۔ آدھا دن کاغذی کارروائی کے دوران گزر گیا۔

شام کو تیس کو فون موصول ہوا۔ جیس نے ریسیور اٹھانے کے بعد پوچھا کہ اب دوسری جانب کسی کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ بولنے والا اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”تم شاید اپنی کامیابی پر خوش ہو رہے ہو گے۔ لیکن تمہاری بھول ہے..... انڈر ورلڈ کے سربراہ کو ختم کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ جسے مار کر خوش ہو رہے ہو۔ وہ ایک ڈمی تھا۔ اور ایسے بہت سے افراد یہاں موجود ہیں جنہیں ہم وقتاً فوقتاً ڈمی کے طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔ فون کو ٹریس کرنے کی کوشش نہیں کرنا۔ یہ ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ کا نمبر ہے۔ کرمل چیخ سے ہم بھی نالاں تھے۔ وہ ایک عیاش فطرت انسان تھا۔ جس نے نہ جانے کتنی عورتوں کی عزتیں لوٹ کر ان کے پیچھے موجود لوگوں کو ہمارے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس لئے ہم نے پیچھا چھڑانے کے لئے اسے تمہارے سامنے پیش کر دیا۔ تمہارے دونوں ساتھیوں کا قصہ یقیناً یہی تھا۔ شاید تمہارا بھی..... بہر کیف ہمارا مقصد کسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا نہیں ہے۔ اس لئے مطمئن رہو آئندہ کم از کم ہمارے درمیان عورتوں کے مسئلے پر ہنگامہ آرائی نہیں ہوگی۔“ فون اچانک ہی بند ہو گیا۔

جیس حیرت بھری نگاہوں سے ریسیور کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر اس نے طویل سانس لیتے ہوئے ریسیور کو کرڈل پر رکھ دیا۔

کرنے کا موقع نہیں مل سکا اور تینوں تڑپتی پھیلیوں کی مانند زمین پر گر کر سناٹ ہو گئے۔ بیکرنے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو دونوں ہاتھوں سے پونچھا اور زمین پر بکھرے ہوئے نوٹوں کو بریف کیس میں ڈالنے لگا۔

لیکن اچانک ہی اسٹیڈیم کے دروازے کی جانب سے فائرنگ کی آواز سنائی دینے لگی۔ بیکرنے جعفر سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ ہال کمرے کے دروازے کو اندر سے مضبوطی کے ساتھ بند کر دے۔ جیس پولیس والوں کے ہمراہ اسٹیڈیم میں پہنچ گیا ہے۔ اب شاید پولیس والوں اور انکل نو نو کے آدمیوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

انکل نو نو کے آدمی گھبراہٹ کے عالم میں ہال کمرے کا رخ بھی کر سکتے تھے۔ کچھ نوٹ اکٹھے کرنے کے بعد بیکر کو اندازہ ہو گیا کہ نوٹ جعلی ہیں۔ اس نے جھنجھلا کر بریف کیس کو انکل نو نو کی لاش کے پاس پھینک دیا۔ پھر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”مرتے ہوئے بھی دھوکہ دے گیا۔ خیر اس کی موت کسی بہت بڑی کامیابی سے کم نہیں ہے۔“

پھر باہر فائرنگ بند ہو گئی اور کچھ دیر بعد ہال کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا اور جیس نے چیختے ہوئے ان دونوں کی خیریت دریافت کی۔ بیکرنے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ جیس پولیس والوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ پھر بولا۔

”باہر حالات ہمارے قابو میں ہیں۔ اندر کے متعلق بتاؤ۔“ بیکر مسکراتے ہوئے اسے حالات بتانے لگا۔ پولیس والوں نے فرش پر پڑے ہوئے نوٹوں کو چیک کیا۔ وہ واقعی نقلی تھے۔ جیس کے چہرے پر ابھرنے کے تاثرات ثبت تھے۔ مغلطہ ایک جانب کھڑا حیرت بھری نگاہوں سے تمام افراد کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

جیس پریشان لہجے میں بولا۔ ”سب کچھ بہت آسانی کے ساتھ ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ انڈر ورلڈ مافیا کا بے تاج بادشاہ کتے کی موت مارا گیا۔ کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ بات حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ بہر حال

